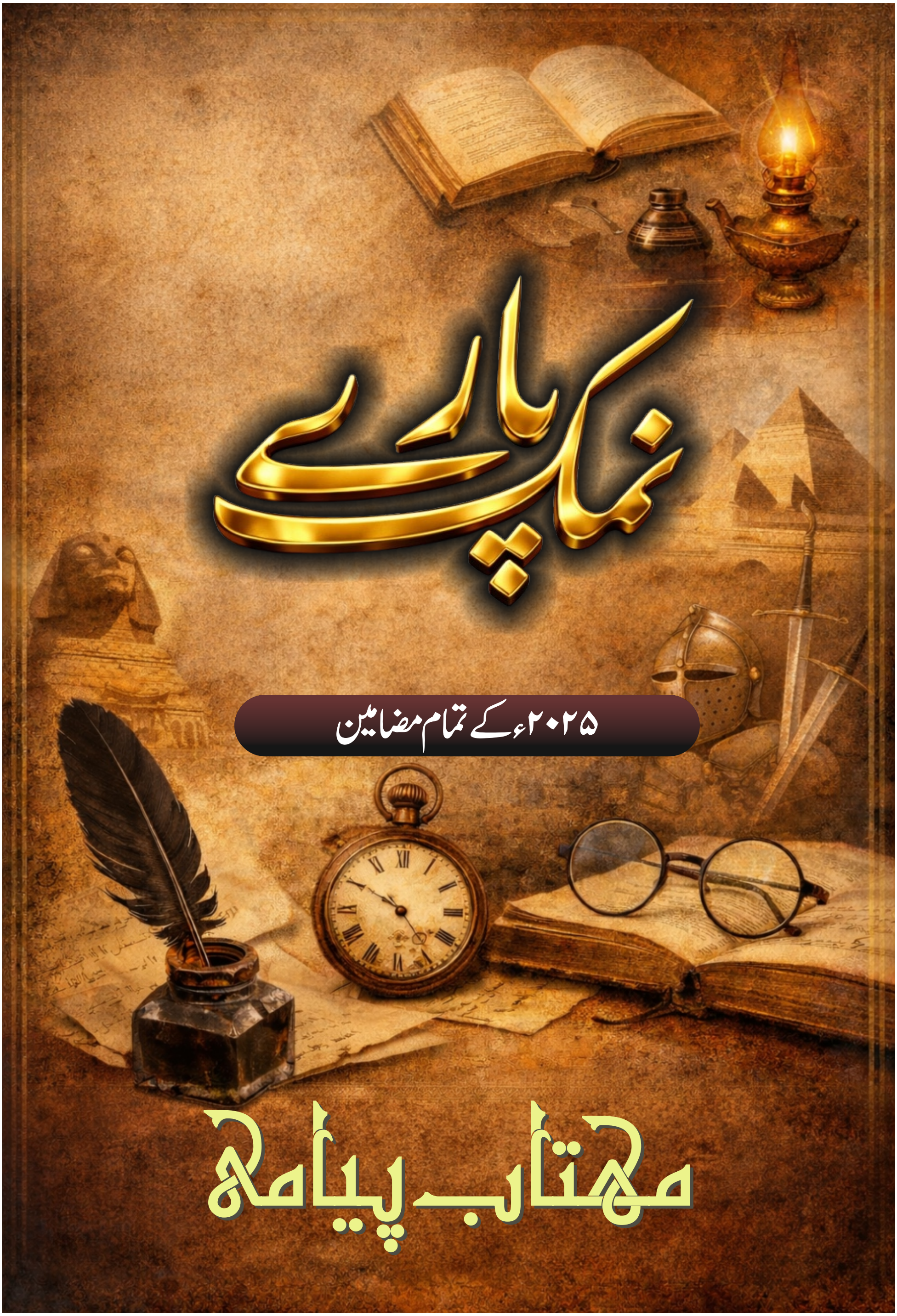

نمک پارے
۲۰۲۵ء کے تمام مضامین
مہتاب پیامی

2025ء کے تمام مضامین

نمک پارے

مہتاب پیامی

ترتیب

بھلائی کے درخت

''تفہیم قرآن'' ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور کا مستقل کالم ہے اور کالم نگار ہیں ''مولانا حبیب اللہ بیگ ازہری''۔ پیش نظر شمارے میں آپ نے ''حسنِ اخلاق'' کے موضوع پر مضمون قلم بند کیا ہے، مضمون اگرچہ مختصر لیکن لائق عمل ہے۔ برسبیل تذکرہ ہم کہنا چاہیں گے کہ ''تفہیمِ قرآن'' کے حوالے سے مولانا محمد حبیب اللہ بیگ ازہری کسی تعارف کے محتاج نہیں، جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں بحیثیت استاذ خدمات انجام دے رہے ہیں، انہوں نے اپنی زندگی قرآن کریم کی تعلیم، تحقیق اور تفسیر کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ ان کی قرآنی خدمات کئی جہات پر مشتمل ہیں، جن میں تدریس، تحقیق، تصنیف اور عوامی وعظ و نصیحت شامل ہیں۔ ان کا اندازِ تدریس علمی و تحقیقی ہوتا ہے، جس سے طلبہ کو قرآن کی گہرائی اور وسعت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مختلف قرآنی موضوعات پر تحقیقی مضامین تحریر کرتے رہتے ہیں، اکثر مضامین ماہ نامہ ''اشرفیہ'' میں شائع ہوتے ہیں، تفہیم قرآن کا یہ تحریری سلسلہ قارئین میں بے حد مقبول ہے، ان کی تحریریں گہرے علمی تجزیے اور محققانہ انداز کی حامل ہوتی ہیں، جو قرآن فہمی کے شوقین افراد کے لیے نہایت مفید ہیں۔ عوام میں قرآنی شعور بیدار کرنے کے لیے جلسوں میں بھی شریک ہوتے ہیں اور جمعہ کے خطابات میں بھی قرآن فہمی کے نکات، قرآن کی روحانی، اخلاقی اور فقہی جہات کو اجاگر کرتے ہیں۔ ان کی تقریریں سننے والوں کو قرآن پر غور و فکر کرنے اور اس کے احکام پر عمل کرنے کی طرف راغب کرتی ہیں۔ ماہنامہ ''اشرفیہ'' میں ان کے لکھے گئے مضامین قرآنی علوم پر تحقیق کا ایک مستند ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔ ان تحریروں میں وہ جدید علمی و تحقیقی انداز میں قرآنی نکات کی وضاحت کرتے ہیں اور دورِ حاضر کے چیلنجز کے

تناظر میں ان کی تطبیق پیش کرتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے تحریر کیا، مولانا ازہری نے ”حسنِ اخلاق“ پر قرآنی آیات کے حوالے سے گفتگو کی ہے جو انتہائی معنیٰ خیز ہے۔ ہم اپنی اس تحریر میں اسی ”حسنِ اخلاق“ کے عنوان پر احادیث کریمہ کی روشنی میں چند باتیں تحریر کریں گے:

احادیث نبویہ میں حسن سلوک پر بہت زیادہ زور دیا گیا ہے۔ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے عمل سے حسن سلوک کے جو اعلیٰ ترین نمونے پیش کیے رہتی دنیا تک ان کی مثالیں پیش نہیں کی جاسکتیں۔ ہم یہاں ایسی چند احادیث پیش کرنے کی سعادت حاصل کریں گے جن سے حسن سلوک کی اہمیت واضح ہوتی ہے:

اکمل المومنین:

اخلاق انسانی زندگی کا وہ آئینۂ جمال ہے جو نہ صرف انسان کی ذات کو نکھارتا ہے بلکہ کائنات کو بھی حسین اور خوش گوار بناتا ہے۔ اسلام میں حسنِ اخلاق کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اخلاق وہ زیور ہے جو انسان کی شخصیت کو نکھارتا، اس کے کردار کو سنوارتا اور اسے دنیا و آخرت میں کامیابی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔حسنِ اخلاق کا نور جب کسی انسان کے وجود میں اترتا ہے، تو وہ خود کو دوسروں کے لیے باعثِ راحت اور رحمت بنالیتا ہے۔ وہ نہ صرف اپنے عمل سے خیر و بھلائی کے دیے جلاتا ہے، بلکہ اپنے رویے سے لوگوں کے دلوں میں محبت، شفقت اور الفت کے بیج بوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ایمان کی تکمیل کو اخلاق کی عمدگی کے ساتھ جوڑا ہے۔ ارشاد گرامی ہے:

”أَكْمَلُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا أَحْسَنُهُمْ خُلُقًا
وَخِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ“ . رَوَاهُ التِّرْمِذِيُّ

(مشکاۃ المصابیح، باب عشرۃ النساء، الفصل الثانی، 972/2)

یعنی کامل ایمان والا وہ ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو، اور تم میں سب سے

بہترین وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ سب سے بہتر سلوک کرتے ہیں۔

یہ حدیث ہمیں نہ صرف حسنِ اخلاق کی اہمیت بتاتی ہے بلکہ اس بات پر بھی زور دیتی ہے کہ اصل نیکی اور بھلائی اس کے گھر والوں، خصوصًا اس کی شریکِ حیات کے ساتھ حسنِ سلوک میں ظاہر ہوتی ہے۔

ایمان محض ظاہری عبادات کا نام نہیں، بلکہ یہ دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والا وہ نور ہے جو بندے کے کردار میں نرمی، محبت، اور خیر خواہی کو پروان چڑھاتا ہے۔ جو شخص اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت رکھتا ہے، اس کی زبان میٹھے بول بولتی ہے، اس کی آنکھیں ہمدردی اور غم گساری کے نور سے چمکتی ہیں اور اس کے رویے میں دوسروں کے لیے راحت اور سکون کا سامان موجود ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اخلاقِ حسنہ کو دین کی بنیاد قرار دیا۔ ارشادِ گرامی ہے:

"إِنَّمَا بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ صَالِحَ الأَخْلاقِ ."

(مسند احمد:8952)

یعنی مجھے اس لیے مبعوث کیا گیا ہے کہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کروں۔

تاریخ وسیرت سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اخلاق کی اعلیٰ ترین منزل پر فائز ہے۔ آپ نے ہمیشہ درگزر سے کام لیا اور امت کو ہمیشہ درگزر سے کام لینے کا ہنر سکھایا، آپ نے بتایا کہ دوسروں کے جذبات کا احترام کس طرح کیا جائے، آپ نے سمجھایا کہ اپنے برتاؤ کی خوشبوؤں سے کیسے معاشرے کو مہکایا جا سکتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "بہترین مرد وہ ہے جو اپنے گھر میں بہترین ہو۔"

یہ حقیقت ہے کہ انسان کی اصل شخصیت کا اندازہ اس کے گھریلو تعلقات سے ہی ہوتا ہے۔ باہر کی دنیا میں تو ہر شخص اچھا بننے کی کوشش کرتا ہے، مگر حقیقت میں اچھا وہی ہے جو اپنے قریبی رشتوں کے ساتھ حسنِ سلوک رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مصطفیٰ کریم علیہ الصلاۃ

والسلام نے فرمایا کہ ”تم میں سب سے بہتر وہی ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا ہو“۔

اور جب شریکِ حیات کا ذکر ہو تو اس کی محبت، عزت اور حقوق کا خیال رکھنا مرد کی شرافت اور عظمت کی نشانی ہے۔ خود پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازدواجی زندگی میں حسنِ سلوک کی اعلیٰ ترین مثالیں قائم کی ہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جس بے مثال وفاداری کا ثبوت آپ نے پیش کیا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جس بے نظیر محبت کا اظہار فرمایا، تاریخ انسانی اس کی مثال پیش کرنے سے آج بھی قاصر ہے۔ بے شک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و کردار کی روشنی آج بھی ہر رشتے کو بنانے، سنوارنے اور نبھانے کے لیے کافی ہے۔

نرمی کا حسن:

انسانی رویے کا تمام حسن و جمال نرمی، محبت اور شفقت میں پوشیدہ ہے۔ نرم لہجہ، شائستہ انداز، اور مہربان دل نہ صرف دلوں کو جیت لیتا ہے بلکہ انسان کو خدا کے قریب بھی کر دیتا ہے۔ اس دنیا میں اگر کوئی چیز سخت دلوں کو پگھلا سکتی ہے، دشمن کو دوست بنا سکتی ہے، اور بکھرے ہوئے رشتوں کو جوڑ سکتی ہے، تو وہ نرمی اور حسنِ سلوک ہی ہے۔ یہی وہ خوبی ہے جس کی تاکید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بارہا فرمائی اور خود اپنے عمل سے دنیا کے سامنے ایک بہترین مثال پیش کی۔ ارشاد فرمایا:

”إِنَّ الرِّفْقَ لَا يَكُونُ فِي شَيْءٍ إِلَّا زَانَهُ، وَلَا يُنْزَعُ مِنْ شَيْءٍ إِلَّا شَانَهُ.“(الصحیح لمسلم، كِتَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالآدَابِ، باب فضل الرفق، 22/8، رقم الحدیث:2594)

نرمی جس چیز میں بھی ہو، اسے خوبصورت بنا دیتی ہے اور جس چیز سے نکال دی جائے، اسے بدنما کر دیتی ہے۔

اور ارشاد فرمایا:

"إِنَّ اللهَ رَفِيقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ، وَيُعْطِي عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِي عَلَى الْعُنْفِ، وَمَا لَا يُعْطِي عَلَى مَا سِوَاهُ." (ایضاً، 22/8، رقم الحدیث: 2593)

یعنی بے شک اللہ تعالیٰ نرمی کرنے والا اور نرمی کو پسند فرمانے والا ہے، اور نرمی پر وہ کچھ عطا کرتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا اور نہ ہی کسی اور چیز پر دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نرمی صرف ایک اچھا رویہ نہیں، بلکہ یہ خدائی صفت ہے، اور جو اس صفت کو اپناتا ہے، وہ اللہ کی رحمت اور برکتوں کا مستحق بن جاتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ نرم خوئی نے وہ معرکے سر کیے ہیں جو سختی اور جبر سے کبھی سر نہ ہو سکے۔ اگر ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں قدم قدم پر نرمی اور بردباری کے حسین اور تابندہ نقوش ملتے ہیں، وہ دشمن جو آپ کے خون کے پیاسے تھے، وہی آپ کی شفقت اور نرم رویے کے اسیر ہوتے نظر آتے ہیں۔ طائف میں جب قدم مبارک زخمی ہو گئے، فرشتوں نے پیش کش کی کہ وہ اس قوم کو تباہ کر دیں، مگر ہمارے آقا تو رحمۃ للعالمین ہیں، فرمایا: نہیں، میں امید رکھتا ہوں کہ اللہ ان کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا کرے گا جو اس کے واحد ہونے کا اقرار کریں گے۔

شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

طائف میں مصطفیٰ کے کرم کی ہوا چلی
پتھر چلے اُدھر سے، اِدھر سے دُعا چلی

یہ تھا وہ صبر، وہ نرمی، اور وہ حسنِ سلوک جس نے صدیوں کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو مینارۂ نور میں تبدیل کر دیا۔

یہ مشاہدہ ہے کہ جہاں نرمی محبت کی فضا قائم کرتی ہے، وہیں سختی اور درشتی انسان کو

تنہائی کی کھائی میں دھکیل دیتی ہے۔ ایک سخت گیر شخص لوگوں کو اپنی سخت مزاجی سے بدظن کر دیتا ہے، وہ نہ صرف دوسروں کے لیے باعثِ اذیت بنتا ہے بلکہ خود بھی ایک تنگ اور بوجھل زندگی گزارتا ہے۔ جب کہ اس کے بالمقابل نرم خو شخص خود بھی خوش و خرم رہتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی راحت و رحمت کا باعث بنتا ہے۔

ہم روزمرہ زندگی میں دیکھتے ہیں کہ سخت لہجے سے بات بگڑ جاتی ہے، معمولی جھگڑے بڑے تنازعات میں بدل جاتے ہیں، اور محض ایک درشت جملہ کسی رشتے کی بنیادیں ہلا دیتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "نرمی وہ نعمت ہے جس سے دنیا اور آخرت میں بھلائی ہی بھلائی ہے، اور جس چیز سے نرمی نکال دی جائے، وہ بگاڑ اور تباہی کا شکار ہو جاتی ہے۔

نرمی کا آغاز گھر سے ہوتا ہے۔ اگر والدین اپنے بچوں کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آئیں، تو وہ اعتماد اور عزتِ نفس کے حامل بنتے ہیں۔ اگر میاں بیوی کے درمیان نرمی ہو، تو گھر جنت کا نمونہ بن جاتا ہے۔ اگر استاد اپنے شاگردوں سے نرمی برتے، تو وہ علم کی روشنی کو کھلے دل سے قبول کرتے ہیں۔ معاشرتی سطح پر نرمی امن اور محبت کی بنیاد رکھتی ہے۔ ایک اچھا حکمران وہی ہوتا ہے جو رعایا کے ساتھ نرم رویہ رکھے۔ ایک کامیاب تاجر وہی ہوتا ہے جو معاملات میں نرمی اختیار کرے۔ یہاں تک کہ دین کی تبلیغ میں بھی نرمی کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اللہ کی رحمت انھی لوگوں کے قریب آتی ہے جو دوسروں پر رحم کرتے ہیں، ان کے ساتھ نرمی اور محبت کا برتاؤ کرتے ہیں، اور سختی و جبر سے گریز کرتے ہیں۔

اگر ہم دنیا اور آخرت میں کامیابی چاہتے ہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ لوگ ہمیں پسند کریں، ہم سے محبت کریں، اور ہمیں دعاؤں میں یاد رکھیں، تو ہمیں اپنے لہجے میں نرمی، رویے میں شفقت، اور مزاج میں بردباری پیدا کرنی ہوگی۔ یاد رکھیے، نرمی روشنی ہے، اور سختی اندھیرا۔ روشنی کو اپنا لیجیے، تاکہ دنیا اور آخرت دونوں جگمگا اٹھیں۔

زندگی کی سب سے حسین صفت-رحمت:

رحمت، وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو دلوں کو جوڑتا، نفرتوں کو مٹاتا اور دنیا کو محبت اور امن کا گہوارہ بنا دیتا ہے۔ یہی وہ صفت ہے جس کے بغیر انسانیت ادھوری اور معاشرہ بے روح ہوتا ہے۔ جو شخص دوسروں کے لیے رحمت کا سبب نہیں بنتا، وہ نہ صرف انسانیت کے تقاضے پورے کرنے میں ناکام رہتا ہے، بلکہ خود بھی اللہ کی رحمت سے محروم ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

لَا يَرْحَمُ اللهُ مَنْ لَا يَرْحَمُ النَّاسَ. (مسلم:2319)

یعنی: "اللہ اس پر رحم نہیں کرتا جو لوگوں پر رحم نہیں کرتا۔"

یہ حدیث ایک ایسے اصول کی نشان دہی کرتی ہے جو نہ صرف دینی تعلیمات کا بنیادی جز ہے بلکہ دنیا میں امن، سکون اور محبت کی ضمانت بھی ہے۔

اگر کائنات کے بکھرے ہوئے رنگوں کو ایک نظر دیکھا جائے، تو ہر چیز میں اللہ کی رحمت کی جھلک نظر آتی ہے۔ ماں کی ممتا میں، باپ کی شفقت میں، آسمان کی رفعت میں، زمین کے وسعت میں، بارش کی بوندوں میں، ہواؤں کے جھوکوں میں، درختوں کے سائے میں، ہر مقام پر ہر چیز انسان پر اللہ کی رحمت کی علامت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو دوسروں کو معاف کر دیتا ہے، ان کی غلطیوں سے درگزر کرتا ہے، اور لوگوں کی تکالیف کو اپنی تکلیف سمجھ کر ان کے دکھوں کو بانٹتا ہے، وہی اللہ کی رحمت کا حقیقی مستحق بنتا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی رحمت و شفقت کی عملی تفسیر تھی۔ اللہ تعالیٰ نے خود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو "رحمت للعالمین" کے لقب سے نوازا، ہمارے آقا کی رحمت صرف مسلمانوں یا اہلِ عرب کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ ہر انسان، ہر جان دار، حتیٰ کہ چرند پرند اور درختوں تک کے لیے عام تھی۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ دنیا ایک خوب صورت اور پرامن جگہ بنے، تو ہمیں اپنے دلوں

میں رحم، شفقت اور ہمدردی پیدا کرنی ہوگی۔ ایک ایسے معاشرے کا تصور کرنا اور اس کی تشکیل کے لیے کام کرنا ہوگا جہاں والدین اپنے بچوں کے ساتھ شفقت برتیں، استاد اپنے شاگردوں پر سختی کے بجائے نرمی اختیار کرے، دولت مند غربا اور ضرورت مندوں پر رحم کریں، طاقت ور کمزوروں کو سہارا دیں، حکمران اپنی رعایا کے لیے سراپا رحمت بن جائیں، اور اگر ایسا ہو جائے تو یقیناً یہ دنیا جنت کا نمونہ بن سکتی ہے۔

جس دل میں رحم نہ ہو، وہ سخت اور بے جان ہو جاتا ہے۔ ایسا شخص دوسروں کے لیے نہ محبت رکھتا ہے، نہ ہمدردی۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو کمتر سمجھتا ہے اور اپنی ذات کے خول میں قید ہو جاتا ہے۔ ایک بے رحم شخص اپنے گرد دیواریں تو کھڑی کر لیتا ہے، لیکن ان دیواروں کے اندر تنہائی، غم اور اندھیرا ہوتا ہے۔ حدیثِ نبوی ہمیں خبردار کرتی ہے کہ جو رحم نہیں کرتا وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔ کیا کوئی خسارے کا سودا اس سے بڑا ہو سکتا ہے؟ دنیا کی ہر چیز انسان کو مل سکتی ہے، لیکن اگر وہ اللہ کی رحمت سے محروم ہو گیا، تو وہ سب کچھ پا کر بھی خالی ہاتھ رہ جائے گا۔

اگر ہم اللہ کی رحمت کے طلب گار ہیں، تو ہمیں خود بھی رحم دل بننا ہوگا۔ چھوٹوں پر شفقت، بڑوں کا احترام، محتاجوں کی مدد، بیماروں کی تیمارداری، مظلوموں کی حمایت، یہ سب وہ راستے ہیں جو ہمیں اللہ کی رحمت تک پہنچاتے ہیں۔ یاد رکھیے، دنیا کی سب سے حسین چیز محبت اور رحم ہے۔ یہ جتنی تقسیم کی جائے، اتنی ہی بڑھتی ہے۔ آئیں، ہم بھی اپنی زندگی کو اس نور سے منور کریں، تاکہ اللہ کی رحمت ہمارے شاملِ حال ہو اور ہم دنیا و آخرت میں کامیاب ہو سکیں۔

مسکرانا بہت ضروری ہے:

دنیا میں ہر چیز کی قدر و قیمت اس کے حجم اور مادی حیثیت سے جانچی جاتی ہے، مگر کچھ چیزیں ایسی ہیں جو بظاہر معمولی نظر آتی ہیں، لیکن ان کی معنویت آسمان کی بلندیوں کو چھوتی ہے۔ ایک نرم لہجہ، ایک مسکراہٹ، ایک ہمدردانہ نظر، یا کسی کو محبت بھرا اسلام کہنا — یہ سب

وہ اعمال ہیں جو دیکھنے میں تو بظاہر بہت چھوٹے ہیں مگر حقیقت میں بے حد قیمتی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا:

لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا، وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلْقٍ.(الصحيح لمسلم، كِتَابُ الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالآدَابِ، بَابُ اسْتِحْبَابِ طَلَاقَةِ الْوَجْهِ عِنْدَ اللِّقَاءِ،37/8،رقم الحديث:2626)

کسی نیکی کو ہرگز معمولی نہ سمجھو، چاہے وہ تمھارا اپنے بھائی سے مسکراتے ہوئے ملنا ہی کیوں نہ ہو۔

یہ حدیث ایک ایسا سنہری اصول ہے جو ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ نیکی کا کوئی بھی عمل حقیر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات ایک چھوٹا سا نیکی کا کام بھی دلوں کو بدل سکتا ہے، زندگیوں میں خوشیاں بکھیر سکتا ہے، اور اللہ کی رضا کے دروازے کھول سکتا ہے۔

مسکراہٹ بظاہر بہت چھوٹی چیز ہے، مگر انتہائی قیمتی نیکیوں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ انسانی چہرہ جذبات کا آئینہ ہوتا ہے۔ چہرے پر خوشی کی روشنی ہو، نرم لہجے کی مٹھاس ہو، تو سامنے والے کا دل خود بخود کھنچنے لگتا ہے۔ جگر مراد آبادی نے یوں ہی تو نہیں کہا کہ:

صداقت ہو تو دل سینوں میں کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

ہمارے آقا کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراہٹ کو صدقہ قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

”تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ صَدَقَةٌ.“(ترمذی، رقم الحدیث1956)

یعنی ”تمھارا اپنے بھائی کے لیے مسکرانا بھی صدقہ ہے۔“

کافی عرصہ پہلے اس عنوان پر تین شعر کی ایک مختصر نظم کہی تھی، جسے یہاں پیش کر دینا مناسب ہو گا۔

فرمایا ایک بار یہ میرے رسول نے
تحفے تم اپنے دوست کو دیتے رہا کرو
سن کر یہ بات عرض کیا ایک شخص نے
وہ کیا کرے کہ طاقتِ تحفہ نہ جس میں ہو؟
یوں لب کشا ہوئے مرے سرکارِ ذی وقار
"ایسا بھی تو نہیں کہ تبسم نہ دے سکو"

بظاہر تو یہ معمولی سا عمل ہے لیکن کسی مایوس دل کے لیے امید کی کرن بن سکتا ہے، کسی تھکے ہارے انسان کے لیے حوصلے کا ذریعہ بن سکتا ہے، اور کسی پریشان حال شخص کی خزاں رسیدہ حیات میں بہارِ جاودانی کا خوش گوار جھونکا ثابت ہو سکتا ہے۔

یاد رکھیے نیکی کے لیے ہمیشہ بڑے وسائل یا عظیم کارنامے ضروری نہیں ہوتے۔ بعض اوقات ایک چھوٹا سا عمل بھی بے حد بابرکت ہو سکتا ہے۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص نے راستے سے ایک کانٹے دار شاخ ہٹائی، اللہ نے اس کی اس معمولی نیکی کو پسند فرمایا اور اسے جنت عطا کر دی۔ ایک اور حدیث میں آقا کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی عورت کا ذکر کیا جو صرف ایک پیاسے کتے کو پانی پلانے کی وجہ سے مغفرت کی حق دار بن گئی۔

مسکراہٹ کی طرح اچھے الفاظ بولنا بھی بڑی نیکی ہے، بعض اوقات کسی مایوس انسان کے لیے چند ہمدردی بھرے الفاظ اس کے دل کی اجڑی دنیا کو آباد کر سکتے ہیں۔

نیکی بھرے ان اعمال کی عظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ. (الزلزال:7)

یعنی جو ذرہ برابر (بھی) نیکی کرے گا، وہ اسے دیکھ لے گا۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ نیکی چاہے کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ اسے

کبھی ضائع نہیں فرماتا۔ بعض اوقات ہمارے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ کہ صرف بڑی عبادات ہی ہمیں اللہ کے قریب کر سکتی ہیں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اگر چھوٹے اعمال بھی اخلاص وللّٰہیت کے جذبے کے ساتھ کیے جائیں تو انسان کو بڑے درجے تک پہنچا سکتے ہیں۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا کہ نیکی کا انتظار نہ کرو، بلکہ خود سے پہل کرو۔ اگر تمھارے پاس کچھ نہیں تو کم ازکم اپنے چہرے کی مسکراہٹ اور نرم مزاجی ہی دوسروں کو دے دو، کسی کو دعا ہی دے دو، کسی کو راستہ ہی بتا دو، کسی کی غلطی پر نرمی ہی اختیار کرلو، کسی چھوٹے بچے کو پیار ہی کرلو، کسی بیمار کی عیادت ہی کرلو۔ یہ سب چھوٹی چھوٹی نیکیاں ہیں مگر اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کا اجر بہت بڑا ہے۔ اس حدیث کا پیغام واضح ہے کہ نیکی کا کوئی عمل معمولی نہیں۔ ایک چھوٹا سا حسنِ سلوک، ایک مسکراہٹ، یا چند ہمدردی کے بول بھی ہمارے اعمال کے میزان کو بھاری کر سکتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہر لمحہ نیکی کی تلاش میں رہیں، اور جہاں بھی موقع ملے، بھلائی کے درخت لگاتے جائیں۔

جی چاہتا ہے کہ اس موضوع پر اور کچھ لکھا جائے، لیکن صفحات کی تنگی دامن گیر ہے، آئندہ پھر کبھی اس موضوع کے دیگر گوشوں پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ مئی 2025ء)

(تحریر 25/ مارچ 2025ء)

مدح محبوب کا دیوان ہے قرآن مجید

وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ۔

غور تو کرو! وہ کون ہے جس کا نام آسمانِ نیلی فام پر ایسا چمکا کہ اس نے آفتاب کو بھی شرما دیا، ہواؤں کی لَے میں ایسا گونجا کہ ساعتوں کو زندگی عطا کر دی، اس نام نے بے ناموں اور گم ناموں کو نام ور بنایا، اس نام اور اس نام والے کے ذکر کو اتنی رفعت عطا ہوئی کہ انسانی عقل اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے، وہ نام نامی ہے مصطفیٰ جانِ رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا نام "محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ یہ وہ نام ہے جو محض "نام" نہیں بلکہ نفس بن کر اُمت کے سینوں میں اتر چکا ہے۔

ربِ جلیل کا فرمانِ عالی شان "وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ" (الم نشرح:4) ایک ایسا آسمانی اعلان ہے جو صرف فضاؤں میں نہیں گونجتا، بلکہ تقدیر کے اوراق، اذان کے نغموں، نماز کے تشہد، خطبوں کے جملوں، اور عاشقوں کے دلوں کی دھڑکنوں میں گونجتا ہے۔ یہ آیت مبارکہ ایک ابدی مہر ہے کہ اے محبوب! جب بھی کوئی ہمیں پکارے گا، وہ تمھیں بھی پکارے گا، جب بھی ہمارا نام بلند ہو گا، تمھارا نام بھی ہو گا۔ اذان کی بلند ہوتی ہوئی صدائیں، کعبے کے گرد طواف کرتے ہوئے لبیک کے نعرے، منبر سے گونجتے ہوئے خطبے، دلوں، دعاؤں اور دنیاؤں میں ہر مقام پر گونجتا ہوا ہمارے آقا کا نام ایسا ہے جس کی تمثیل ممکن نہیں۔ وہ نام جتنا بلند و بالا اور بزرگی کا حامل ہے نہ آج تک کوئی نام اس منزل تک پہنچ سکا نہ آئندہ کبھی پہنچے گا۔ تمام صحابہ اور تابعین کے اقوال اس راز کی نقاب کشائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ ذکرِ

محمدی، ذکرِ الٰہی سے جدا نہیں ہو سکتا۔

سوچیے تو سہی! کیا یہ مقام کسی اور کو ملا؟ کیا کسی اور کے نام کے ساتھ رب نے اپنا نام جوڑا؟..... نہیں! یہ صرف اُس ہستی کا حصہ ہے، جس نے مکہ کے ریگزاروں سے اُمت کو خدا کی طرف بلایا، جس کی ہر آہ، ہر سجدہ، ہر دعا میں صرف امت کی فکر تھی، اور رب نے اُس کی یاد کو ایسا دوام عطا فرمایا جو وقت کی گردش سے ماورا ہے۔ دنیا میں صداؤں کا رنگ بدلتا ہے، اقوام ابھرتی ہیں اور مٹتی ہیں، شہنشاہوں کے نام تاریخ کی قبروں میں دفن ہو جاتے ہیں، مگر ایک نام صرف ہمارے آقا کا ایسا ہے جو تاریخ کی ہر صبح کا آفتاب روشن نظر آتا ہے۔ اگر کبھی کسی شاعر کے دل میں خیال آئے کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرے، تو اسے پہلے آسمان کی گواہی لینا ہوگی، کیوں کہ ذکر تو وہی ہے جو عرش سے شروع ہو اور دل کی زمیں پر اترے۔

پس جان لو کہ جب رب کائنات خود ارشاد فرما دے کہ: ”ہم نے تمھارا ذکر بلند کر دیا“، تو زمین و آسمان کے ہر ذرّے، ہر صدا، ہر خامشی کو یہ اقرار کرنا ہو گا کہ: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم سب تیرے ذکر کے خادم ہیں۔

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ

یاد رکھو! نام محض پکارنے کے لیے نہیں ہوتے، نام کسی وجود کی شناخت، صفات کی زبان، اور معنی کی روح ہوا کرتے ہیں۔ جب کسی عام انسان کا نام ہو، تو وہ صرف تلفظ کا ہنر ہوتا ہے۔ مگر جب ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہو تو وہ نسبتِ الٰہیہ کا جلال بن جاتا ہے۔ جب خالقِ کائنات خود کسی کا نام اپنے نام سے جوڑ دے، جب اذان کے ہر جملے کے بعد اس نام کی خوشبو آئے، جب کائنات کے خالق کی رحمت اور رافت کے الفاظ، اسی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف میں نازل ہوں تو سمجھ لو، یہ کوئی معمولی نام نہیں، یہ اسمِ اعظم کے بعد سب سے برگزیدہ اسم ہے۔

قرآن کہتا ہے: ”بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ“ (التوبہ:128)

ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

"اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دو اسما سے پکارا جو صرف اسی کے لیے مخصوص ہیں، اور وہ کسی بشر کے لیے استعمال نہ ہوئے تھے"۔

(بحوالہ الرازی، التفسیر الکبیر، تحت آیۃ التوبۃ:128)

یہ رؤف و رحیم دو نام، اللہ تعالیٰ کے اسماے حسنہ میں سے ہیں، لیکن رب نے ان کو اپنے پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کے طور پر ذکر فرمایا۔ تو یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ یہ محض صفت نہیں، بلکہ عطائے ربانی ہے۔ رب تبارک و تعالیٰ گویا خود گواہی دیتا ہے کہ جس طرح میں بندوں پر رؤف ہوں، ویسا ہی میرا نبی بھی ہے۔ جس طرح میں رحم کرنے والا ہوں، وہ بھی میری رحمت کا عکس ہے۔

اب آئیے اسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف، یہ وہ نام ہے جسے آسمانوں نے پہلے سنا، پھر زمین پر گونجا۔ یہ وہ نام ہے جس کا مطلب ہی ہے: "بہت زیادہ تعریف کیا گیا" اور جب تعریف خود رب کرے، تو پھر کلامِ بشر کی کیا حیثیت؟

رب نے اپنے نبی کو کبھی "یا محمد" کہہ کر نہیں پکارا بلکہ ہمیشہ فرمایا: "یا أیها الرسول" "یا أیها النبي" گویا خود اپنے بندوں کو ادب کا قرینہ سکھاتے ہوئے فرمایا کہ جب میرے محبوب کا ذکر آئے تو بے ادبوں کی طرح نام لے کر نہ بلاؤ بلکہ "یا أیها الرسول" "یا أیها النبي" کہہ کر پکارو۔

دیگر انبیا کا ذکر کرنا ہوا تو کہیں "یا آدم" کہا، کہیں "یا نوح" فرمایا، کہیں "یا موسیٰ" سے خطاب کیا تو کہیں "یا عیسیٰ" سے، مگر جب پروردگار عالم نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا تو فرمایا: "یا أیها الرسول، یا أیها النبي، یا ایها المزمل، یا ایها المدثر، طٰہٰ، یٰسٓ" یعنی جتنے نام، اتنی نسبتیں، اور ہر نسبت ربانی رنگ میں ڈوبی ہوئی۔

چشمِ عقیدت و محبت سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ جب ان کا ذکر ہوتا ہے تو الفاظ جھک جاتے ہیں، ان کا نام آتا ہے تو قاری کی آواز لرزنے لگتی ہے، کیوں کہ وہ رب کے محبوب ہیں۔

دیکھو، محبوب اور محب میں کیسی نسبت ہے کہ جب ''أشهد أن لا إله إلا الله'' کہا جائے تو فوراً'' وأشهد أن محمدًا رسول الله ''کہنا لازم ہو جاتا ہے، یہ نسبتِ توحید اور نبوت کا ایسا جوڑ ہے جسے کوئی زبان، اور کوئی زمانہ جدا نہیں کر سکتا۔ یہی وہ نسبت ہے جس کی وجہ سے گناہ گاروں کو امید کا چراغ روشن نظر آتا ہے، عاشقوں کو حیاتِ تازہ ملتی ہے اور امت کو نجات کا سامان فراہم ہوتا ہے۔ یہی وہ نام ہے جسے رب نے نمازوں میں لازم کیا اور اذکار میں محبوب۔

تو اے اہلِ دل! جب تم ان کا ذکر کرو تو جان لو کہ تم صرف ذکر نہیں کر رہے ہو بلکہ ایک نورانی نسبت سے اپنے زبان و دل کو منور کر رہے ہو، یہ نسبت تمھیں رب سے جوڑتی ہے، یہ نسبت تمھیں نجات دلاتی ہے، یہ نسبت تمھیں انسانیت سے بلند کر کے عبدیت کی رفعت عطا کرتی ہے۔

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى •

کبھی تم نے کسی بشر کے بارے میں رب کو قسم کھاتے دیکھا؟ کبھی سنا کہ خود خالقِ عقل، کسی کے عقل پر گواہ بن جائے؟ یہی تو وہ لمحۂ نور ہے، جہاں انسان کی فہم عاجز، اور زبان خاموش ہو جاتی ہے، جب کلامِ ربانی اعلان کرتا ہے:

''مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى'' (النجم:2)

تمھارے صاحب (محمد ﷺ) نہ بہکے نہ بے راہ چلے۔

یہ کوئی عام تزکیہ نہیں، یہ حقیقتِ عقلِ محمدی ﷺ کی وہ الہامی سند ہے، جو عقل کی بلندیوں کو ماورا کر کے یقین کی وادیوں میں اتارتی ہے۔ عقل کو انسان نے تاجِ فضیلت سمجھا، اس کے ذریعے فلسفے تراشے، منطق کے محل تعمیر کیے، جس پر قومیں ناز کرتی رہیں، مگر

اس عقل کی معراج تو ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی فطری عقل ہے جو کسی مکتب، کسی معلم اور کسی نسخے کی مرہونِ منت نہیں۔ ان کی اس عقل عظیم کے آگے سقراط کی تعلیم، ارسطو کی منطق اور افلاطون کے خیالات، سب ڈگمگا گئے۔ ان کی عقل وحی کے چشمے سے سیراب ہوتی تھی اور فطرت کے آسمان سے اتر کر زمین پر مہتاب بنتی تھی۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ جس نے سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا، اس کی فراست، سیاست، تدبیر، معاملات، اور حکمتوں میں غور کیا، وہ یہی کہے گا کہ ایسی عقل نہ کسی نے پائی، نہ کبھی کوئی پائے گا۔

ایسی عقل، جو جذبات میں عدل کو فراموش نہ کرے، ایسی حکمت، جو دشمن کے دل میں بھی خیر کی راہ روشن کرے، ایسی بصیرت، جو آنے والے صدیوں کو روشنی عطا کرے وہ ہمارے آقا کی شمعِ عقل ہے جو وحی کے روغن سے جلتی، فطرت کی روشنی میں چمکتی، اور زمانے کو اندھیروں سے نکالتی ہے۔ جب طائف میں ظلم و ستم کے پتھر چلے، تو عقلِ محمدی نے صبر کی قمیص پہنی، جب منافقین نے نفاق کے خنجر چلائے تو حلم کی چادر اوڑھ لی، جب بدر و احد کے فیصلے ہوئے، تو تدبیرِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی آفاقیت ظاہر ہوئی، اور جب امت کو نظامِ عدل عطا کیا گیا، تو ان کی عقل نے قانون کی آخری شِق لکھ کر یہ بتا دیا کہ وہ نہ صرف ظاہری تدبیر کی علامت ہے، بلکہ باطنی حکمت، روحانی بصیرت، قلبی اور اخلاقی حکمت کا وہ جامع گلدستہ ہے، جس سے ہر صدی، ہر مکتب، ہر نظریہ خوشبو کشید کرتا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ارشادِ ربانی ہے:

"مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَ مَا غَوٰى" تمھارے صاحب نہ بھکے نہ بے راہ چلے۔

بہتوں نے اسے نفیِ ضلالت سمجھا مگر اصل میں یہ نفیِ ضلالت نہیں، بلکہ اثباتِ ہدایت ہے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عقل، نہ صرف صراطِ مستقیم پر ہے، بلکہ وہ خود صراطِ مستقیم کا مرکز و محور ہے۔

پس اے دنیا والو! اگر تم علم چاہتے ہو، تو ان کی بے مثال عقل سے روشنی حاصل کرو، اگر تم سیاست چاہتے ہو، تو ان کے تدبر سے سبق حاصل کرو، اگر تم حیات چاہتے ہو، تو ان کے شعور سے آشنا ہو جاؤ؛ کیوں کہ ان کی عقل، وہ پیمانہ ہے جس پر قیامت تک انسانوں کی عقلیں پرکھی جائیں گی۔

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ○ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی

جب کوئی لب گویا ہو، تو دل سوال کرتا ہے کہ یہ صدا کہاں سے آئی؟ یہ لفظوں کی ردا کس نے اوڑھی؟ یہ باتوں کی مہک کس بزم سے آئی؟ اور جب گویا ہونے والے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں تو سوال کا جواب بھی آسمان سے نازل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

"وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی، اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی" (النجم:3،4)

یعنی وہ خواہشِ نفس سے نہیں بولتے، یہ تو وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جب نطقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر جمیل ہو، تو جان لو کہ یہاں الفاظ نہیں بولتے، یہاں وحی کی روشنی بولتی ہے، یہاں رب کی مرضی بیان ہوتی ہے۔ یہ زبان وہ ہے جس پر جبرئیل امین ناز فرماتے ہیں، جس پر ربِ کریم کا کلام اترتا ہے، در حقیقت ان کی زبان نبوت کی چادر میں لپٹی ہوئی صداقت ہے۔ جب وہ بولتے ہیں، تو وہ کلام صرف دلوں کو ہی نہیں گرماتا بلکہ روحوں کو جلا بخشتا ہے، ذہنوں کو روشنی دیتا ہے اور معاشروں کو عدل وانصاف عطا کرتا ہے۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان تو وہ زبان ہے جس نے وحی کے موتی بکھیرے، امت کو ایمان کے الفاظ سکھائے، کفر کی تاریکی میں ہدایت کے چراغ روشن کیے، شریعت کی راہیں متعیّن کیں، انسانیت کو آسمانی لغت عطا فرمائی۔ یقین جانو صرف قرآن نہیں بلکہ حدیثیں بھی اسی سرچشمۂ وحی کا تسلسل ہیں۔ آپ کی ہر حدیث، ہر قول، ہر ارشاد "ھوٰی" (خواہش) سے پاک، اور رب کی وحی سے معمور ہے۔

کتنا عظیم ہوتا ہوگا وہ لمحہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی سائل کے سوال پر لب کھولتے ہوں گے اور جواب وحی بن کر اترتا ہوگا، کوئی فقیہ پوچھتا ہوگا تو فقہ اور کوئی عاشق پوچھتا ہوگا تو آیتِ محبت کا نزول ہوتا ہوگا اور جب کوئی دشمن طعنہ دیتا ہوگا تو رب اپنے محبوب کی طرف سے خود جواب دیتا ہوگا۔ یہی تو مقامِ نطقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے کہ نہ اس میں خطا ہے، نہ غرض، نہ جھوٹ، نہ لغو۔ یہ وہ کلام ہے جو زمین پر نازل ہوا، مگر آسمان کی خوشبو لیے ہوئے ہے۔ یہ نور ہے، جو دل کو جگاتا ہے، اور روح کو بلند کرتا ہے۔

تو اے اہلِ عقل! جب تم لفظوں کی صداقت تلاش کرو، جب تم کلام میں صدق، حکمت، موعظت، تقویٰ اور عشق تلاش کرو، تو میرے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کے لبوں کی جنبش کو سنو۔ کیوں کہ ان کے ہونٹوں سے نکلنے والی ہر بات، در حقیقت خالق کی طرف سے ہدایت کا جام ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

”جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کچھ کہتے، تو ہم جانتے کہ وہ وحی ہے۔“

اور آج بھی جب میرے جیسا کوئی نعت نگار لفظ چنتا ہے، جب کوئی عاشق سلام پڑھتا ہے، جب کوئی عالم دین حدیث بیان کرتا ہے، تو وہ نطقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے بحرِ ناز سے ہی قطرہ کشی کر رہا ہوتا ہے۔

وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ •

سوچو! کبھی کسی کے کردار پر آسمان نے قسم کھائی؟ کبھی کسی کی ذات کو خُلُقِ عظیم کا پیکر رب نے قرار دیا؟ کبھی کسی انسان کے اخلاق کی تصدیق براہِ راست خالقِ اخلاق نے کی؟ — ہاں، یہ صرف اُس ہستی کے حصے میں آیا، جس کی فطرت، گفتار، کردار، مزاج، زبان، لب، خامشی، صبر، حلم، عفو، جود، محبت، سب کچھ خالص خدا کے نور سے تراشا گیا۔

قرآن مجید میں ارشاد ربانی ہے:

"وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ "(القلم:4)

بے شک تم عظیم خلق کے بلند مرتبے پر فائز ہو۔

لفظِ "عظیم" جب اللہ تعالیٰ خود استعمال کرے، تو وہ عظمت کسی انسانی تصور کی حدود میں نہیں آتی۔ یہ کوئی شاعرانہ تعبیر نہیں، کوئی مبالغہ نہیں، یہ الٰہی تصدیق ہے، کہ محمد ﷺ کا ہر عمل، ہر سلوک، ہر رویّہ، خلقِ انسانی کی بلند ترین مثال ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

"كان خلقه القرآن."(مسند احمد، 148/41)

ان کا اخلاق ہی قرآن تھا۔ یعنی اگر تمھیں قرآن عملی صورت میں دیکھنا ہو تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو دیکھو۔

قاضی عیاض رحمہ اللہ نے کیا خوب فرمایا: "اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، صرف پسندیدہ خصلتیں نہیں، بلکہ وہ ہر وہ خوبی ہیں جنہیں عقلا سراہیں، شرع جنھیں واجب قرار دے، اور انسانیت جنھیں سلام کرے۔"(شفا شریف)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خلق عظیم نرم ایسا کہ پتھر بھی پگھل جائیں، حلم کی بات کی جائے تو سمندر سے زیادہ گہرا، سخاوت بے کراں، اور رحم تو ایسا کہ گویا خود رحمت متشکل ہو کر چل رہی ہو۔

مدینے کے گلیوں میں جو پاؤں پاؤں چلے، وہ صرف انسانوں کی راہنمائی کے لیے نہ آئے تھے، وہ اخلاق کے زندہ نمونوں کو زمین پر چلتا ہوا دکھانے کے لیے آئے تھے۔ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو یتیموں کو سینے سے لگا لیتے، غلاموں کے ساتھ فرشِ خاک پر بیٹھ جاتے، دشمنوں کے سینے پر بھی رحمت کا ہاتھ رکھ دیتے، اور دوست کو ایسا احترام دیتے کہ وہ خود کو خلیفۂ وقت سمجھے۔ ایسا خلق عظیم کہ دشمنوں نے بھی اقرار کیا کہ "ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کبھی جھوٹ بولتے، بدلہ لیتے، یا حد سے تجاوز کرتے نہ پایا۔"

آپ کا یہ خلق صرف عبادت میں ظاہر نہ ہوتا تھا، یہ خلق تو تجارت میں بھی تھا، بچوں کی دل جوئی میں بھی تھا، گھریلو معاملات میں بھی تھا، جنگ کی تدبیروں میں بھی تھا، اور امت کی تربیت میں بھی۔ یہ وہ خُلق تھا جس نے دلوں کو مسخر کیا، قبائل کو یکجا کیا، اور انسانیت کو ایک نیا معیار عطا فرمایا۔

اگر تمھیں خلقِ عظیم کا مشاہدہ کرنا ہو تو ان صفحات کو مت پڑھو؛ بلکہ مدینے کی گلیوں میں اپنے دل کو لے چلو، جہاں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خاموشیاں اخلاق کا اعلان اور لب کشائیاں وحی کا پیکر تھیں۔

تو اے اہلِ دل! اگر تم سیرت پڑھتے ہو، تو اخلاق پڑھو، اگر تم عشق کرتے ہو، تو اخلاق کو اپناؤ، کیوں کہ اخلاقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ شمع ہے جس سے امت کا بجھا ہوا چراغ پھر سے روشن ہو سکتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ

ہر زمانہ کسی مثال کا محتاج رہا ہے، کبھی فاتحین کی تلوار، کبھی فلاسفہ کے افکار، کبھی اولیا کے اذکار، کبھی مصلحین کا وقار، مگر جب رب نے خود ایک ہستی کو اسوہ (نمونہ) قرار دے دیا، تو اس بات کا اعلان فرما دیا کہ اب قیامت تک محمد ﷺ کی ذات ہی انسانیت کے لیے مکمل ترین معیار ہے۔

اسوہ، یعنی کامل نمونہ: نہ صرف عبادت کا، بلکہ محبت کا بھی، نہ صرف زہد کا، بلکہ قیادت کا بھی، نہ صرف خانقاہ کا، بلکہ بازار کا بھی، نہ صرف محراب کا، بلکہ میدانِ جنگ کا بھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ رب تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

"لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ" (الاحزاب:21)

یعنی تمھارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں بہترین نمونہ ہے۔

یہ عام مثال نہیں، یہ تمھارا نصیب ہے کہ تمھارے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معیار بنایا گیا، یعنی ان کی سیرت، ان کی طبیعت، ان کا کردار، ان کا سکوت و کلام، سب کچھ بہترین

نمونہ ہے، "سب سے کامل، سب سے نافع۔

نبی ﷺ کا اسوہ کیا ہے؟ نماز میں عاجزی ، روزہ میں صبر ، معاملات میں سچائی ، تجارت میں امانت ، محبت میں وفا ، جنگ میں حکمت ، امن میں شفقت ، اقتدار میں عدل ، گھریلو زندگی میں حلم ، دوستی میں وفاداری اور دشمنی میں ظرف۔

اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم وہ ہے جو یتیم کے سر پر ہاتھ رکھے اور بادشاہ کو تخت سے اتار کر تواضع سکھا دے ، جو بیوی کے ساتھ مسکرائے ، میدانِ جنگ میں للکارے ، جو بچوں کے ساتھ دوڑے اور جبریل کے ساتھ معراج پر جائے۔

یہی تو اسوہ ہے ، جو حکمت کا معیار ، رحمت کا مظہر اور مردِ کامل کی تجلی ہے۔ یہ وہ اسوہ ہے جو ہر دور کی قیادت کے لیے نمونہ ، ہر اصلاح کے لیے نقطۂ آغاز اور ہر روح کے لیے رہنمائی ہے۔

دیکھا جائے تو دنیا میں ہزاروں کردار نظر آئیں گے مگر وہ سب ایک دائرے میں قید ہوں گے ، کسی کے اندر صبر تو ہوگا مگر جلال نہ ہوگا ، کسی میں علم تو ہوگا مگر حلم نہ ہوگا ، کسی میں جلال تو ہوگا مگر جمال نہ ہوگا۔ مگر ایک ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ ان کا کردار تمام خوبیوں کا سنگم ، تمام صفات کا مظہر ، تمام انسانی ارتقا کا آخری زینہ ہے

تو اے اہلِ محبت ! اگر تم کو نجات درکار ہے ، اگر تم عزت و فلاح اور ایمان و عرفان چاہتے ہو تو اسوۂ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے جام سے اپنی پیاس بجھالو ، اسی میں نجات ہے ، اسی میں فلاح ہے ، اور یہی تمھاری زندگی کا سب سے بڑا حاصل ہے۔

وَمَا اَرْسَلْنَاكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ

رحمت ، ایک ایسا لفظ ہے جو خود میں نرمی ، محبت ، شفقت ، ہمدردی ، اور عطا کا رنگ رکھتا ہے۔ لیکن جب خالقِ رحمت خود کسی کو "رحمت" کہہ دے ، تو پھر وہ محض ایک صفت نہیں رہتی ، بلکہ وہ کائناتی صداقت بن جاتی ہے ، اور وہ ذات صرف انسانیت کے لیے نہیں ،

بلکہ عالمین کے لیے رحمت بن جاتی ہے۔

قرآن کی اس عظیم آیت: "وَ مَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ "(الانبیاء:107) میں ایک عالم گیر اعلان پوشیدہ ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف کسی خاص قوم، ملک، یا زمانے کے لیے نہیں، بلکہ تمام مخلوقات کے لیے، ہر دور، ہر نسل، ہر سانس کے لیے سراپا رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔

یہ رحمت کیا ہے؟ یہ وہ مہر ہے، جو پتھروں کو نرم کر دے، تیغوں کو نیام میں ڈال دے، دلوں کو جیت لے، اور دشمنی کو محبت میں ڈھال دے؛ کبھی بدر کی خاک پر قیدیوں کو آزاد کرتے ہوئے، کبھی احد کے زخموں کے باوجود دعا دیتے ہوئے، کبھی طائف کی سنگباری سہہ کر معافی بانٹتے ہوئے، کبھی مکہ کی فتح پر دشمنوں کو "اذھبوا فأنتم الطلقاء" کہہ کر سینے سے لگاتے ہوئے۔(السنن الکبریٰ للبیہقی،199/9)

یہ تمام مناظر چیخ چیخ کر گواہی دیتے ہیں کہ یہ "رحمت مجسم" ہیں۔ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم۔

اس آیت کا اعجاز یہ ہے کہ "رحمت" کو "رسالت" کی علت قرار دیا، یعنی نبوت بھی رحمت کی بنیاد پر ملی! بعثت بھی رحمت ہے، کلامِ الٰہی بھی رحمت ہے، سنتِ محمدی ﷺ بھی رحمت ہے، اور ہر لمحہ، ہر ادا، ہر خاموشی، ہر لب کشائی؛ بس رحمت کا ترجمہ اور ترجمانی ہی تو ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ "جو اس رحمت کو قبول کرے گا، وہ دنیا و آخرت میں فلاح پائے گا اور جو رد کرے گا، وہ اپنے نصیب سے محروم ہو جائے گا۔"

اور یہ "عالمین" صرف انسان نہیں، بلکہ جنات، حیوانات، نباتات، فرشتے، ہوائیں، پرندے، دریا، وقت، قافلے، اور زمین کے ذرّے سب اس "عالمین" میں شامل ہیں۔ مدینے کی گلیوں میں چلتی خوشبو، وعدے پر پلٹ کر آتی ہوئی ہرنی، اونٹنی کی آنکھوں سے ٹپکنے والا آنسو، چلتا ہوا درخت، پلٹتا ہوا سورج اور سینہ چاک کرتا چاند، سب آپ صلی اللہ علیہ

وسلم کی رحمت کے آئینے ہیں۔

آج اگر دنیا ظلم سے بھری ہوئی ہے، انسان کا دل نفرت سے سیاہ ہے، تو ہمیں صرف اس رحمت کی طرف پلٹنے کی ضرورت ہے کیوں کہ وہ "رحمت" محض لفظ نہیں، بلکہ زندگی کا آخری سہارا ہے۔

اور یہی وجہ ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "أنا رحمة مهداة" میں تو رحمت بھیجی ہوئی ہوں۔" تو گویا انھوں نے اپنی بعثت کی پوری کائناتی تعریف چند الفاظ میں سمیٹ دی۔

پس جان لو محمد ﷺ کا ہونا، رحمت کا اترنا ہے۔ ان پر درود بھیجنا، رحمت میں داخل ہونا ہے۔ ان کی سنت کو تھام لینا، رب کی رضا پالینا ہے۔ ان سے محبت رکھنا، خود رحمت بن جانے کی پہلی شرط ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ•

کیا تمیں یہ جان کر خوش گوار حیرت نہ ہوگی کہ جب آسمانوں کے فرشتے سجدہ گزار ہوں ،جب کہکشاؤں کی وسعت تسبیح ربانی کے بحر ناپیدا کنار میں غرق ہو اور خود رب العزت فرما رہا ہو:

"اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ" (الاحزاب:56)

یعنی اللہ رب العزت خود بھی اور اس کے تمام نورانی لشکر بھی ایک ہی طرف متوجہ ہیں، وہ طرف ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس۔

یہ کوئی عام ذکر نہیں، یہ رب کا ذکر ہے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، جو مخلوقات کے ایمان کا تاج، اور محبتوں کا سب سے مقدس عمل بن جاتا ہے۔

"يُصَلُّوْنَ" یہ فعل مضارع ہے، یعنی ہمیشہ جاری رہنے والا درود۔ یعنی درود بھیجنے میں نہ رب کبھی تھمتا ہے نہ فرشتے کبھی تھکتے ہیں، نہ آسمانی دربار میں لمحہ بھر کے لیے کبھی یہ ذکر رکتا ہے۔ اور پھر زمین والوں سے خطاب ہوتا ہے: "يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا" اے ایمان

والو! تم بھی شامل ہو جاؤ درود کے اس بہتے ہوئے نورانی دریا میں۔

جان لو یہ محض کوئی ترغیب نہیں، یہ تو امر ہے، فرمان ہے، محبت کا تقاضا ہے۔

درود صرف چند کلمات کا نام نہیں یہ رحمتوں کی برسات کا نام ہے، درود دلوں کی تطہیر ہے، گناہوں کا کفارہ ہے، اور قربِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذریعہ ہے۔ درود ایک ایسا ہدیہ ہے، جسے انسان رب کے دربار میں بھیجتا ہے اور جس کا عوض، رب تبارک و تعالیٰ دس رحمتوں کے ساتھ لوٹاتا ہے۔ اس کی دلیل خود قرآن مجید کی یہ آیتِ مبارکہ ہے:

"مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا." (الانعام:160)

یعنی جو ایک نیکی لائے تو اس کے لیے اس جیسی دس نیکیاں ہیں۔

ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی فرمایا:

"من صلّی عليّ مرة، صلّی الله علیه بها عشراً"

جو مجھ پر ایک بار درود بھیجے، اللہ اس پر دس رحمتیں نازل فرماتا ہے۔

کائنات میں کوئی ایسا نام نہیں جس پر رب خود بھی درود بھیجے، فرشتے بھی، اور مؤمنین بھی حکم کے پابند ہوں۔ یہ مقام محمود تو صرف ہمارے آقا احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے۔ جب ہم "اللهم صل علیٰ محمد..." کہتے ہیں تو صرف دعا نہیں کرتے، بلکہ اس آسمانی صدا میں شامل ہو جاتے ہیں اور فرشتے ہمارے لیے مغفرت کی دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ اور خود فرشتے درود بھیجنے والے کے لیے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں۔ تو اے عشقِ نبی کا دَم بھرنے والو! اگر تم چاہتے ہو کہ تمھارا نام آسمانوں پر گونجے، اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری دعائیں بلند ہوں، تو درود کے قافلے میں شامل ہو جاؤ، کہ یہی وہ ذکر ہے جس میں خدا، فرشتے، اور مؤمنین، سب شریک ہوتے ہیں۔

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ، ستمبر 2025ء۔۔۔ تحریر: جولائی 2025ء)

ہر روز روزِ عید ہو ہر شب شبِ براءت

عالمِ اسلام میں شبِ براءت تقدیسی اہمیت کی حامل ہے، یہ مغفرت کی رات ہے، تقسیمِ نعمت کی رات ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے غفران واحسان کی رات ہے، عبادت وریاضت کی رات ہے، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے محبت اور اللہ تعالیٰ سے قربت کی رات ہے۔ سچ اور حق تو یہ ہے کہ یہ ماہِ عظمت رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پسندیدہ مہینوں میں سے ایک ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس ماہِ مبارک میں کثرت سے روزے رکھا کرتے تھے۔اس مہینے کی چودھویں اور پندرہویں کی درمیانی شب کو شبِ براءت منائی جاتی ہے جس میں مسلمان کثیر تعداد میں قبرستانوں کا رخ کرتے ہیں، اور اس دنیا سے گزر جانے والے اپنے پیاروں کی مغفرت اور بخشش کے لیے خصوصی دعائیں کرتے ہیں۔ بلا شبہ یہ ایک نیک عمل ہے۔ حدیث شریف میں ذکر ہے کہ اس رات حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس جنت البقیع تشریف لے گئے اور وہاں دعائیں فرمائیں، یہ حدیث ابن ماجہ میں موجود ہے؛ لیکن غیر مقلدین، ضعیف کہ کر اس کا انکار کر دیتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ضعیف حدیث بھی حدیث رسول ہی ہوتی ہے اور فضائل کا ثبوت اس سے ہوسکتا ہے، اس کے حدیث ہونے کا سرے سے انکار کرنا یا اس سے ثابت شدہ فضیلت کا انکار کرنا قطعی نامناسب ہے۔ پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب ضعیف حدیث متعدّد طرق سے ثابت ہو تو اس کا ضعف بھی ختم ہو جاتا ہے۔

ابن ماجہ کی روایت کے علاوہ اور بھی متعدّد احادیث سے شب براءت کی فضیلت ثابت ہے بلکہ مستند تفسیر کے مطابق اس کی فضیلت تو قرآن مجید کی آیات طیبات سے بھی

صاف ظاہر ہے۔

اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے قول میں ہے: فِيهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيمٍ. کہ اس میں ہر حکم والا معاملہ جدا کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں: ”نصف شعبان کی شب میں سال کا معاملہ طے کیا جاتا ہے، زندہ لوگوں کا فیصلہ کیا جاتا ہے، حاجیوں کا نام لکھا جاتا ہے، اور اس میں کسی کے عدد میں اضافہ نہیں ہوتا اور نہ ہی کمی کی جاتی ہے۔“ یہ روایت ابن جریر، ابن منذر، اور ابن ابی حاتم کی ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں:

”یہ روایت نقل کرنے کے بعد اکثر علما کا اجماع ہے کہ یہ معاملہ شبِ قدر سے متعلق ہے، اور اس کا آغاز نصف شعبان کی رات سے ہوتا ہے۔“

بیہقی کی روایت میں ہے:

” عن أبي بكر الصديق عن النبي صلى الله عليه وسلم قال ينزل الله تعالى إلى السماء الدنيا ليلة النصف من شعبان فيغفر كل مسيء إلا رجل مشرك أو في قلبه شحناء. رواه البيهقي.“(شعب الایمان للبیہقی ج: 3، ص: 380، حدیث نمبر: 3827، دار الکتب العلمیۃ بیروت)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات کو آسمانِ دنیا کی طرف اپنی رحمت نازل فرماتا ہے اور ہر خطا کار کی خطا بخش دیتا ہے، سوائے مشرک کے، یا اس شخص کے جس کے دل میں کینہ و عداوت ہو۔

ابن ابی شعبہ، ترمذی، ابنِ ماجہ اور بیہقی میں ہے:

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ :فَقَدْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَخَرَجْتُ أَطْلُبُهُ، فَإِذَا هُوَ بِالْبَقِيعِ رَافِعٌ رَأْسَهُ إِلَى السَّمَاءِ .فَقَالَ : يَا عَائِشَةُ أَكُنْتِ تَخَافِينَ أَنْ يَحِيفَ اللهُ عَلَيْكِ وَرَسُولُهُ؟ «قَالَتْ، قَدْ قُلْتُ :وَمَا بِي ذَلِكَ، وَلَكِنِّي ظَنَنْتُ أَنَّكَ أَتَيْتَ بَعْضَ نِسَائِكَ، فَقَالَ : إِنَّ اللهَ تَعَالَى يَنْزِلُ لَيْلَةَ النِّصْفِ مِنْ شَعْبَانَ إِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَيَغْفِرُ لِأَكْثَرَ مِنْ عَدَدِ شَعَرِ غَنَمِ كَلْبٍ. (سنن ابن ماجہ، ج:1، ص:444، حدیث نمبر:1389، مکتبہ شاملہ)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، فرماتی ہیں: میں نے ایک رات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں پایا، تو میں تلاش کرتی ہوئی بقیع کی طرف پہنچی، دیکھا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف اپنا سر مبارک بلند کیے ہوئے ہیں۔ حضور نے مجھے دیکھا تو فرمایا: اے عائشہ! کیا تجھے خوف تھا کہ اللہ اور اس کا رسول تم پر زیادتی کریں گے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: نہیں، بلکہ مجھے خیال ہوا کہ شاید آپ کسی دوسری زوجہ کے پاس تشریف لے گئے ہوں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات کو آسمان دنیا کی طرف اپنی رحمتیں نازل فرماتا ہے اور ہر گنہگار کو بخش دیتا ہے، سوائے مشرک کے، یا اس کے جس کے دل میں بغض و کینہ ہو۔ پھر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: اللہ رب العزت نصف شعبان کی رات کو آسمان دنیا کی طرف اپنی رحمتوں کا نزول فرماتا ہے اور قبیلہ بنی کلب کی بکریوں کے بالوں سے زیادہ تعداد میں لوگوں کی بخشش فرماتا ہے۔

ان کے علاوہ اور بھی طرق سے یہ مضمون حدیثوں میں وارد ہوا ہے، بعض میں اور تفصیل بھی مذکور ہے، حضرات محدثین اور فقہا کا یہ فیصلہ ہے کہ ایک روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہو لیکن اس کی تائید بہت سی احادیث سے ہوجائے تو اس کی کمزوری دور ہوجاتی ہے، لہٰذا جس رات کی فضیلت میں دس صحابۂ کرام سے روایات مروی ہوں اس کو بے بنیاد اور بے اصل کہنا بالکل غلط ہے۔

دیگر معتمدین کے نزدیک شب براءت کی کیا اہمیت ہے آئیے ذرا ایک نگاہ اس پر بھی ڈال لیں:

امام شافعی علیہ الرحمۃ والرضوان فرماتے ہیں:

> ”پانچ راتیں ایسی ہیں جن میں دعائیں قبول ہوتی ہیں: (1) جمعہ کی رات۔ (2) عید الفطر کی رات (3) عید الاضحیٰ کی رات (4) ماہِ رجب کی پہلی رات (5) نصف شعبان کی رات۔

حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”سال کی چار راتیں ایسی ہیں جنھیں نظر انداز نہ کیا کریں، کیوں کہ ان راتوں میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر رحمتوں کا نزول فرماتا ہے: * رجب کی پہلی رات، * شعبان کی پندرہویں رات * عید الفطر کی رات * عید الاضحیٰ کی رات۔

آپ رحمۃ اللہ علیہ بذاتِ خود بھی شبِ براءت میں عبادتِ الٰہی میں مصروف رہا کرتے تھے۔ (تفسیر روح البیان، پ25، الدخان، تحت الآیۃ:3،، ج:2، ص:802)

ہمارے بیش تر بزرگانِ دین یہ رات عبادتِ الٰہی میں بسر کیا کرتے تھے حضرت خالد بن مَعدان، حضرت لقمان بن عامر اور دیگر بزرگانِ دین رحمہم اللہ المبین شبِ براءت میں عمدہ لباس زیب تن کرتے، خوشبو اور سُرمہ لگاتے اور رات کے وقت مسجد میں (جمع ہو

کر) عبادت کیا کرتے تھے۔ (ماذا فی شعبان، ص75)

تیسری صدی ہجری کے بزرگ ابو عبد اللہ محمد بن اسحاق فاکہی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں: جب شبِ براءت آتی تو اہلِ مکّہ کا آج تک یہ طریقۂ کار چلا آرہا ہے کہ مسجدِ حرام شریف میں آجاتے اور نماز ادا کرتے، طواف کرتے اور ساری رات عبادت اور تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتے، ان میں بعض لوگ 100 رکعت (نفل نماز) اس طرح ادا کرتے کہ ہر رکعت میں سورۂ فاتحہ کے بعد دس مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھتے۔ زم زم شریف پیتے، اس سے غسل کرتے اور اسے اپنے مریضوں کے لیے محفوظ کر لیتے اور اس رات میں ان اعمال کے ذریعے خوب برکتیں سمیٹتے۔ (اخبار مکہ، جز: 3، ج2، 84 ملخصًا)

سوائے چند نامراد وہابی لوگوں کے دنیا بھر کے مسلمان بڑی دھوم دھام سے شبِ براءت مناتے ہیں۔ عام عرب اسے لیلۃ البراءت کہتے ہیں، انڈونیشیا اور ملیشیا میں بھی یہ رات انتہائی عقیدت و احترام سے منائی جاتی ہے۔ ترکی میں اسے براءتِ قندیلی کہہ کر اس رات کا بھرپور ادب و احترام کیا جاتا ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے بارے میں تو ہمیں اور آپ کو بخوبی معلوم ہے کہ یہاں کس قدر جوش و خروش سے اس رات کی عبادات کا اہتمام کیا جاتا ہے۔

آج ہماری ذاتی، قومی، اور عالمی مشکلات کے پیش نظر، یہ بہت اہم ہے کہ ہم اپنی ذات اور ارد گرد کی دنیا پر غور کریں۔ چاہے اس رات کو الگ سے کوئی اہمیت دی جائے یا نہ دی جائے، حقیقت یہ ہے کہ ہر دن، ہر مہینہ، اور ہر لمحہ اپنی جگہ بابرکت ہے۔ ہمیں ان برکتوں کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے اور ہر موقع کو مثبت اور خیر کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ روزہ رکھنا بہر حال ایک مثبت عمل ہے، یہ جسمانی، روحانی اور معاشرتی طور پر بھی فائدے مند ہے۔ دلوں سے نفرت، کینہ، اور بغض و حسد کے نکالنے کی کوشش کرنا بھی ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے، یہ عمل دل کو پر سکون کرنے اور معذرت خواہی میں مددگار ہو سکتا ہے۔ صدقہ و

خیرات کی اہمیت سے انکار تو کوئی اندھا بھی نہیں کر سکتا۔ اس رات صدقہ و خیرات کا بھی اہتمام کیا جانا چاہیے، اس طرح ہم اسلامی معاشرے میں توازن قائم کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اپنے اسلامی بھائیوں کے دکھ درد میں شریک ہو سکتے ہیں۔

ہمارے دیار میں عموماً چودہ شعبان کو دن میں ہر خوش عقیدہ اہل سنت و جماعت کے یہاں حلوے بنائے جاتے ہیں، اسی طرح دنیا بھر میں جہاں جہاں اہل سنت و جماعت ہیں، اپنی اپنی تہذیب کے اعتبار سے شیرینیاں بناتے ہیں، فاتحہ کرتے ہیں، کھاتے ہیں، اہلِ خانہ کو کھلاتے ہیں اور رشتہ داروں اور احباب کے درمیان نہایت محبت سے تقسیم کرتے ہیں، آنے والی رات میں حسبِ توفیق عبادت کا اہتمام کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے حضور روتے گڑگڑاتے ہیں، اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہیں، نیک اعمال کی توفیق طلب کرتے ہیں، مغفرت کے لیے آنسو بہاتے ہیں، آنے والے دن میں روزے کا اہتمام کرتے ہیں۔ جہاں تک ہماری عقل کام کر رہی ہے، ان تمام اعمال میں کوئی بھی ایسا عمل نہیں ہے جسے کسی بھی طرح ناجائز کہا جائے۔ جو لوگ ان اعمال سے روکتے ہیں، یا انھیں بدعت کہتے ہیں انھیں غور کرنے کی اور اپنے ناپختہ شعور کو میزان حقیقت پر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سب کو ہدایت نصیب فرمائے۔ تاکہ مخالفین بھی شیرینیوں کے ساتھ محبتیں بٹوریں اور محبتیں بانٹیں، نہ صرف اپنوں میں بلکہ ساری دنیا میں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں ہر روز و شب اپنی رحمتوں اور برکتوں سے فیض یاب فرمائے۔ ہمیں معاف کرنے اور معافی مانگنے والا بنائے، اور ہماری حیات کچھ ایسی بنا دے کہ: ”ہر روز روزِ عید ہو، ہر شب شب براءت“۔ آمین یارب العالمین۔

(ماہ نامہ اشرفیہ فروری 2025 میں شائع)

(تحریر: 20 جنوری 2025)

موسمِ بہاراں کا نقطۂ آغاز

دنیا بھر کے مسلمان رمضان المبارک کی تیاریاں کر رہے ہیں، امسال رمضان المبارک کی یہ 1445 ویں بہار ہے۔ روزے کی فرضیت کا حکم تحویلِ قبلہ کے واقعہ سے کم و بیش دس پندرہ روز بعد نازل ہوا، آیتِ صیام شعبان کے مہینے میں نازل ہوئی جس میں رمضان المبارک کو ماہِ صیام قرار دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ
00183

(البقرہ183)

ترجمہ: اے ایمان والوتم پر روزے فرض کیے گئے جیسے اگلوں پر فرض ہوئے تھے کہ کہیں تمھیں پرہیزگاری ملے۔

نیز ارشاد فرمایا:

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ(البقرۃ185)

ترجمہ: رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اترا لوگوں کے لیے ہدایت اور رہنمائی اور فیصلہ کی روشن باتیں تو تم

میں جو کوئی یہ مہینہ پائے ضرور اس کے روزے رکھے۔

مشرکین مکہ کی ستم رانیوں کے سبب بہ اذن الٰہی مسلمانوں نے مکہ کو خیرباد کہا اور مدینہ آباد فرمایا۔ ہمارے آقا و مولا سید کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بہ حکم الٰہی سرزمینِ مدینہ کو رونق بخشی۔ یہ واقعہ تاریخ اسلام میں اتنی بڑی تبدیلی کا نقطۂ آغاز تھا کہ بعد میں اسے اسلامی تقویم کا نقطۂ آغاز قرار دیا گیا۔ ہجرت کے ڈیڑھ سال 10 شعبان المعظم سنہ 2 ہجری /624ء میں جب رمضان کے روزے فرض کیے گئے تو پہلا رمضان شریف مارچ کے مہینے میں آیا۔ مارچ مدینہ والوں کے لیے بہار کا موسم تھا۔ اس مہینے میں جزیرہ نما عرب خصوصًا مدینہ کا درجۂ حرارت نسبتًا معتدل ہوتا ہے، جب کہ گرمیوں میں شدید گرمی صحرا اور شہری علاقوں دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

رمضان کے روزے جب فرض کیے گئے اس سے پہلے ایسا نہیں تھا کہ روزے نہیں رکھے جاتے تھے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ اسلام کی آمد سے قبل بھی مکہ اور مدینہ میں لوگ مخصوص تاریخوں پر روزہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ کئی لوگ عاشورہ کے دن روزہ رکھتے تھے جب کہ کچھ ہر قمری ماہ کی 13، 14 اور 15 تاریخ کو بھی روزے رکھتے تھے۔ اسلام کی آمد کے بعد صحابۂ کرام بھی عاشورا کا روزہ اور دیگر روزے انتہائی ذوق و شوق سے رکھتے تھے، البتہ یہ ضرور ہے کہ مکمل ایک مہینہ رمضان المبارک کے روزے رکھنا ان اولین مسلمانوں کے لیے ایک غیر معمولی اور منفرد تجربہ تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے ایسے شواہد موجود ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ پہلے سال مسلمان رمضان کے روزے رکھنے کے عادی ہونے میں کچھ مشکلات کا سامنا کر رہے تھے لیکن باوجود اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رمضان سے متعلق تعلیمات کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے میں انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ وہ تاریخ کا پہلا رمضان تھا، نفسیاتی اور جسمانی آزمائشوں کا پہلا انفرادی سال لیکن صحابۂ کرام نے مستقل

مزاجی سے پورا رمضان گذارا۔

رمضان کے روزوں کی فرضیت سے کچھ ہی عرصہ قبل، تحویل قبلہ کی آیت بھی نازل ہوئی اور بیت اللہ ہمارا قبلہ قرار پایا۔

یہ بڑی تبدیلیاں تھیں اور ان تمام تبدیلیوں کا آغاز اس وقت ہوا جب نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام نے مدینہ میں ایک مضبوط بنیاد قائم کرلی تھی۔ سمتِ قبلہ کی تبدیلی اور ایک مکمل مہینے کے مسلسل روزے رکھنے سے مسلمانوں کو گہری سطح پر یہ احساس ہوا کہ وہ دیگر توحیدی مذاہب، یعنی عیسائیوں اور یہودیوں سے علاحدہ ایک دینی امت ہیں، مذکورہ تمام واقعات نے ان کے اندر اپنی مذہبی شناخت کے بارے میں ایک مضبوط شعور پیدا کیا۔

یہاں یہ بات واضح کردینا ضروری ہے کہ رمضان کے روزوں کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ یہ سابقہ امتوں پر بھی فرض تھے، یہودیوں نے رمضان مہینے سے ہٹا کر یومِ عاشورا کو منتقل کر دیا اور ایک دن تک محدود کر دیا اور عیسائیوں نے اپنی مرضی سے تیس دن کے روزوں میں اس کے آگے پیچھے متعدّد وجوہات سے اسے پچاس دنوں کا کر دیا۔ یعنی سابقہ دونوں امتوں نے احکامِ خداوندی کے خلاف اپنی عبادتوں کا ضابطہ مقرر کیا۔

ہم ذکر کر رہے تھے مسلمانوں کے پہلے رمضان کا، یاد رہے کہ پہلے رمضان کے ساتھ ایک انتہائی اہم تاریخی واقعہ بھی تاریخ میں مذکور ہے، یعنی اسی پہلے رمضان میں مسلمانوں کو پہلی بڑی جنگ، غزوۂ بدر، کا سامنا کرنا پڑا، قلیل تعداد کے باوجود صحابۂ کرام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں کفار و مشرکین سے جہاد کیا اور نصرتِ الٰہی سے کامیاب و کامران ہوئے۔ یہ فتح اس لحاظ سے بھی تاریخی حیثیت رکھتی ہے کہ اس نے دینِ اسلام کی تاریخی بقا کو یقینی بنایا اور بعد میں اسلام پوری دنیا میں پھیل گیا۔

سنہ 2 ہجری میں جب فرضیتِ رمضان کا حکم نازل ہوا تو قرآن مجید نے (جو ہمیشہ ایمان والوں کے لیے ایک متوازن راستہ پیش کرتا ہے تاکہ ان کی زندگی کو آسان اور منصفانہ

بنایا جاسکے) افراد کے لیے روزے میں رعایت بھی رکھی، سورۃ البقرہ کی آیت 184 میں فرمایا:

اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ
عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَ عَلَى الَّذِيْنَ
يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا
فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ 00184

ترجمہ: گنتی کے دن ہیں تو تم میں جو کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو اتنے روزے اور دنوں میں اور جنھیں اس کی طاقت نہ ہو وہ بدلہ دیں ایک مسکین کا کھانا پھر جو اپنی طرف سے نیکی زیادہ کرے تو وہ اس کے لیے بہتر ہے اور روزہ رکھنا تمھارے لیے زیادہ بھلا ہے اگر تم جانو۔

روزہ ہر فرد پر بلا استثنا فرض تو کیا گیا لیکن ساتھ میں یہ رعایت دے دی گئی کہ جو بیمار ہیں، یا سفر میں ہیں یا اپنے بدن میں اتنی قوت نہیں پاتے کہ روزہ رکھ سکیں تو وہ اپنی اس شرعی حاجت کے پیش نظر روزہ ترک کر سکتے ہیں البتہ انھیں روزوں کا فدیہ دینا ہو گا۔

تفسیر صراط الجنان میں ہے کہ حیض و نفاس والی عورت کو تو روزہ رکھنے کی اجازت ہی نہیں وہ تو بعد میں قضا کرے گی۔ اس کے علاوہ بھی چند افراد ہیں جنھیں روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے مذکورہ آیت میں بطورِ خاص بیمار اور مسافر کو رخصت دی گئی ہے لیکن یہ یاد رہے کہ سفر سے مراد تین دن کی مسافت یعنی ساڑھے ستاون میل یعنی بانوے کلومیٹر ہے، اگر اس سے کم فاصلے کا سفر ہے تو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہرگز نہیں۔ اسی طرح مریض کو بھی رخصت ہے جب کہ اسے روزہ رکھنے سے مرض کی زیادتی یا ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو، بعد میں ممنوع ایام کے علاوہ اور دنوں میں روزہ رکھ لے۔

خزائن العرفان میں اس کی تفصیل یوں ہے کہ:

(1)... جو فی الحال بیمار نہ ہو لیکن مسلمان ماہر طبیب یہ کہے کہ وہ روزے رکھنے سے بیمار ہو جائے گا وہ بھی روزہ چھوڑ سکتا ہے۔

(2)... حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت کو اگر روزہ رکھنے سے اپنی یا بچے کی جان کا یا اس کے بیمار ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس کو بھی روزہ ترک کرنا جائز ہے۔

(3)... جس مسافر نے طلوعِ فجر سے قبل سفر شروع کیا اس کو تو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے لیکن جس نے طلوعِ فجر کے بعد سفر کیا اس کو اُس دن کا روزہ چھوڑنے کی اجازت نہیں۔

شیخ فانی یعنی وہ بوڑھا جس کی عمر ایسی ہو گئی کہ اب روز بروز کمزور ہی ہوتا جائے گا، جب وہ روزہ رکھنے سے عاجز ہو یعنی نہ اب رکھ سکتا ہے اور نہ آئندہ ہی اس میں اتنی طاقت آنے کی امید ہو کہ روزہ رکھ سکے، اس کے لیے جائز ہے کہ روزہ نہ رکھے اور ہر روزے کے بدلے فدیے کے طور پر نصف صاع گندم یا اس کا آٹا یا اس کی قیمت دے دے۔ اور اگر فدیہ جَو سے دینا ہو تو گندم سے دُگنا دینا ہو گا۔ یہ بھی یاد رہے کہ اگر فدیہ دینے کے بعد روزہ رکھنے کی قوت آگئی تو روزہ رکھنا لازم ہو جائے گا۔

فدیہ کی مقدار تو مخصوص ہے البتہ اگر کوئی زیادہ دینا چاہے تو بخوشی دے سکتا ہے۔ جتنا زیادہ دے گا اتنا ہی ثواب بڑھتا جائے گا۔ جیسے بعض صحابۂ کرام نے نماز کے خشوع و خضوع میں فرق پڑنے پر پورا باغ صدقہ کر دیا۔ یہاں یہ مسئلہ بھی یاد رہے کہ مسافر و مریض کو روزہ نہ رکھنے کی اگرچہ اجازت ہے لیکن زیادہ بہتر و افضل روزہ رکھنا ہی ہے، جیسا کہ آیت کے آخر میں فرمایا: وَ اَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ یعنی تمھارا روزہ رکھنا تمھارے لیے بہتر ہے۔

روزے کی دشواریوں کے باوجود، جو ایک مسلمان کی جسمانی برداشت کے ساتھ ساتھ اس کی نفسیاتی قوت کا بھی امتحان لیتی ہیں، رمضان بے شمار برکتیں اور اللہ کی مغفرت

لے کر آتا ہے، جیسا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ احساس بالکل ایسے ہے جیسے کوئی شخص ایک طویل میراتھن مکمل کرنے کے بعد زبردست راحت محسوس کرتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ کی زیرِ تربیت رہ کر صحابۂ کرام نے رمضان کو اپنی روحانی زندگی کا مرکزی دور سمجھا، اس لیے ان کی تمام انسانی سرگرمیاں رمضان کے آداب کے مطابق منظم ہوگئیں۔ آج بھی ترکی میں لوگ پرانے رمضان سے اپنی شدید محبت کا اظہار کرتے ہیں، تو یہ عام طور پر ماقبل جدید دور کی طرف اشارہ ہوتا ہے، جب کام کے اوقات بھی رمضان کے آداب کے مطابق ترتیب دیے جاتے تھے۔

اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق، روزہ صرف کھانے پینے سے رکنے کا نام نہیں، بلکہ اپنے گناہوں اور برے اعمال سے پاکیزگی حاصل کرنے کی کوشش ہے، یہ ایک ایسی ڈھال ہے جو مسلمانوں کو برائی سے محفوظ رکھتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ زیادہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا، اور برے الفاظ سے بچنا، روزہ دار کی بنیادی خصوصیات میں شامل ہیں۔ ایک مقام پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اللہ کو اس شخص کے بھوکے اور پیاسے رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، جو برے الفاظ اور برے اعمال کو ترک نہیں کرتا۔“

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی ہی روحانی تربیت کے سبب صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس ماہِ مبارک کی عبادات میں اضافہ فرما دیا کرتے تھے تاکہ زیادہ سے زیادہ برکتیں حاصل کر سکیں۔

رمضان کے آخری عشرے میں، نبی کریم ﷺ عبادت میں مشغول ہونے کے لیے مسجد میں اعتکاف کرنا پسند فرماتے تھے۔ اعتکاف کا مطلب ہے کہ انسان دوسروں سے الگ ہو کر اپنی تمام تر توجہ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر مرکوز کرے اور دنیاوی معاملات سے دور ہو جائے تاکہ وہ اپنی زندگی کے مقصد اور سمت کو بہتر طور پر سمجھ سکے۔

عبادت اور روزہ کا مطلب یہ نہیں کہ تمام کام اور روزمرہ کی سرگرمیاں ترک کر دی

جائیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم رمضان میں اپنے روزمرہ کے معمولات کو ترک نہیں کرتے تھے، اگر روزے کی حالت میں کوئی کام کرنا ہوتا تو کرتے، آپ نے کبھی روزے کی بنیاد پر آج کے کام کو کل پر نہیں ٹالا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غزوۂ بدر کے دوران بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بحالتِ روزہ مجاہدین صحابہ کرام کی رہنمائی کمانڈر کی حیثیت سے فرمائی۔

یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ 10 جنوری 630ء کو جب فتح مکہ ہوئی تو وہ دن تھا بیس رمضان المبارک سنہ 8 ہجری کا، اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام روزے سے تھے۔ یقیناً رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہمیں اس بات کا درس دیتی ہے روزہ کسی بھی جائز کام کو مانع نہیں، اور روزے کی حالت میں رہتے ہوئے رزقِ حلال کی جستجو کرنا، ذاتی اور سماجی نوعیت کے کام کرنا یہاں تک کہ جہاد کرنا خود ہمارے آقا و مولا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ آج ہمارا حال یہ ہے کہ روزے کی حالت میں ہمارے نوجوانوں کی بڑی تعداد روزے کے بہانے سے اہم اور ضروری کاموں کو بھی التوا کے خانے میں ڈال دیتی ہے، ضرورت ہے ہمیں اپنے آقا کی سنت پر چلنے کی۔

ساڑھے چودہ سو برس میں حالات میں زمین آسمان کا فرق نمودار ہو چکا ہے، آج کے مسلمانوں اور پہلے مسلمانوں کے درمیان صرف اخلاقیات ہی نہیں، بلکہ ان کے روزہ، سحری اور افطار کے معمولات میں بھی کافی فرق آچکا ہے۔ ہمارے اور صحابہ کرام کے درمیان رمضان کے کھانے کے حوالے سے واضح فرق موجود ہے۔ آج انواع و اقسام کے کھانے ہمارے دسترخوان پر چنے ہوتے ہیں لیکن تاریخ شاہد ہے کہ پہلے مسلمانوں کے پاس اس قسم اور مقدار کے کھانے نہیں ہوا کرتے تھے۔ وہ بھی سحری کھاتے تھے لیکن کیسی؟ ان کی سحری ایسی ہوتی تھی جس کا تصور آج کے کئی مسلم گھروں کے لیے تقریباً ناممکن ہے، ان کی سحری میں محض چند کھجوریں اور تھوڑا پانی ہوا کرتا تھا اور بس۔ افطار بھی بہت سادہ، عیش و آرام اور فضول خرچی سے دور۔ اگر انہیں ایک قسم کا کھانا میسر آتا تو وہ اسی پر خوش رہتے اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا

کرتے، آج کل تو نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے پھر بھی ہم ناشکرے بنے پھرتے ہیں۔ ان میں اکثر لوگ کھجور کو پیس کر آٹے یا پانی کے ساتھ ملا کر اپنا کھانا بناتے، یا بھنے ہوئے آٹے کو زیتون کے تیل کے ساتھ ملا کر کھانا تیار کرتے تھے۔

624ء میں مدینہ میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی پہنچ مذکورہ کھانوں تک بھی نہیں تھی۔ چناں چہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متمول مسلمانوں کو یہ ترغیب دی کہ وہ اپنے افطار میں دیگر مسلمانوں کو بھی شریک کریں اور ایسے لوگوں کو ترجیح دیں جن کے پاس مناسب افطار کا انتظام نہ ہو۔ اس طرح رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے افطار کے دسترخوان پر دوستوں، رشتہ داروں اور غریبوں کو مدعو کرنے کی مضبوط روایت کی بنیاد رکھی۔ خاص طور پر اصحابِ صفہ کہ جن کا نہ کوئی گھر بار تھا، نہ کوئی خاندان، انھوں نے محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں سکونت اختیار فرمائی تھی اور علمِ دین حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگیوں کو وقف کر چکے تھے، حضور نے لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ اصحابِ صفہ کو بھی اپنے یہاں افطار میں شریک کیا کریں۔ خود ہمارے آقا بھی ضرورت مند مسلمانوں کو اپنے درِ دولت پر مدعو فرمایا کرتے اور اپنے دسترخوان سے انھیں رحمتوں کے نوالے عطا کیا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو سیرتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ مارچ 2025ء)

(تحریر: 8/ فروری 2025ء)

یومِ اطفال اور اسلام میں بچوں کے حقوق

اسلام میں ہر دن بچوں کا دن ہے

ہندوستانی منظر نامے پر 14 نومبر ایک ایسا دن ہے جسے ہر سال یوم اطفال کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ اصل میں یہ دن ہندوستان کے پہلے وزیرِاعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی یادگار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ پنڈت نہرو بچوں سے بہت محبت رکھتے تھے اور انھیں ملک کا مستقبل کہا کرتے تھے۔ ابتدائی طور پر ہندوستان میں یومِ اطفال 1950 کی دہائی میں 20 نومبر کو منایا جاتا تھا، جو اقوامِ متحدہ کے اعلان کردہ "Children's Day" کی تاریخ تھی۔ لیکن 1964ء میں پنڈت نہرو کے انتقال کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ان کی یاد میں یہ دن 14 نومبر کو منایا جائے۔ تب سے اب تک اسی تاریخ میں یہ اہم دن منایا جاتا ہے۔ اس دن اسکولوں میں قہقہے گونجتے ہیں، رنگ برنگے ربن، تحفے اور تقریریں بچوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ آج کا دن صرف انھی کے نام ہے۔ لیکن سوال یہ ہے: کیا محبت اور شفقت کی یہ چھاؤں صرف ایک دن کے لیے مخصوص ہے؟ ہاں! ہندوستان میں تو بس ایک ہی دن کے لیے مخصوص ہے، آنے والے پندرہ نومبر کو ساری دنیا پھر اپنے روز مرہ کے کاموں میں مشغول ہو جائے گی۔ لیکن اگر یہی سوال دینِ اسلام سے کیا جائے تو جواب آئے گا یہ یومِ اطفال کوئی عارضی جشن نہیں ہے بلکہ اسلام میں تو ہر دن بچوں کا دن ہے۔

اسلام میں بچوں کے حقوق:

دیکھا جائے تو اسلامی قانون نے بچوں کو خاص توجہ کا مرکز بنایا ہے، ان کے لیے ایسے حقوق قائم کیے ہیں جو انھیں باوقار زندگی کی ضمانت دیتے ہیں۔ ہم ذیل کی سطور میں انھی

حقوق پر۔

بچپن کی نازک نوعیت کی وجہ سے، تمام الہامی مذاہب، ترقی یافتہ انسانی تہذیبوں، اور ملکوں مثبت قوانین نے بچوں کی نشو و نما کے لیے موزوں ماحول فراہم کرنے پر توجہ مرکوز کی ہے۔ جو قومیں اور لوگ اپنے بچوں کی دیکھ بھال کرنے، ان کی مادی، نفسیاتی اور معاشرتی ضروریات کو پورا کرنے اور اخلاقی بنیادوں پر ان کی زندگی استوار کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں، ان کی نئی نسلوں کے دل و دماغ صلاحیتوں کے خزانوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا بھر میں انسانی حقوق کے تحفظ اور انسانیت کے احترام میں غیر معمولی دلچسپی دیکھنے میں آئی ہے۔ مختلف قانون سازیوں اور بین الاقوامی معاہدوں سے واضح ہوتا ہے کہ جو ممالک انسانی حقوق کا احترام کرنے کے پابند ہوتے ہیں وہاں ترقی کا بگل ضرور بجتا ہے۔ لیکن یہ قابلِ توجہ امر ہے کہ آج دنیا جس چیز کو "انسانیت" اور "انسانی حقوق" سے تعبیر کرتی ہے اس کی بنیاد تو ڈیڑھ ہزار سال پہلے ہی مکہ اور مدینہ میں ہمارے پیارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھ دی تھی۔ ہمارے آقا نے نہ صرف عمومی انسانی حقوق کا منشور دنیا کے سامنے پیش فرمایا بلکہ خاص طور سے بچوں کے حقوق اور ضمانتوں کے جو روشن مینار تعمیر فرمائے ان کا اُجالا ساری دنیا میں بحسن و خوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ آپ نے مختلف اسلامی دفعات کے ذریعہ انسانوں کو مخاطب کرتے ہوئے انھیں ان حقوق کی ادائیگی کا پابند بنایا بلکہ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کے لیے دنیا اور آخرت کے خسارے کا ڈر بھی سنایا۔

اسلامی قانون میں بچے کے حقوق بے شمار اور کثیر ہیں۔ ان کی حفاظت کے لیے، اسلام نے خاص طور پر ماؤں کو کچھ ذمہ داریاں عطا کیں، جنھیں وہ دوسروں کے مقابلے میں پورا کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہیں۔ اسلام نے باپ کو بھی بعض اہم امور کا ذمہ دار بنایا کیوں کہ وہ انھیں پورا کرنے کے زیادہ اہل ہیں، اس کے علاوہ سرپرستوں اور حکمرانوں کے ذمہ بھی کچھ کام لگائے تاکہ ایک مہذب معاشرہ تشکیل پا سکے۔ اسلامی ریاست کو پر ذمہ دار بنایا گیا

کہ وہ ان لوگوں کی مدد کرے جن کے پاس کوئی کمانے والا نہیں ہے۔ اس درست اور متوازن تقسیم میں، اسلامی قانون نے بچے کے بہترین مفادات پر توجہ مرکوز کی، انھیں مستقبل کا انسان اور آنے والے کل کا خزانہ سمجھا۔

اسلامی قانون نے بچوں کو مادی اور اخلاقی حقوق کا پابند کیا جو ان کی پیدائش سے پہلے اور ان کی پرورش کے ساتھ ہوتے ہیں۔ ان حقوق کا مقصد ان کے جسم اور صحت کو محفوظ رکھنا، ان کے دماغ کی نشو و نما، ان کے ضمیر کو زندہ کرنا اور ان کے اخلاق کو بہتر بنانا ہے یہاں تک کہ وہ بلوغت کو پہنچ جائیں اور ایمان اور اعمال صالحہ کے مذہبی فریضے کی ذمہ داری اٹھائیں، اس طرح وہ کائنات کی ترقی اور اپنی قوم کی بھلائی میں حصہ ڈالیں۔

بچوں کے لیے والدین کے فرائض کو اسلامی اخلاق کے ساتھ ان کی پرورش کرنے کے لیے متعیّن کیا گیا، معلم پر فرض کیا گیا کہ وہ بچے کی ذہنی پرورش کرے۔ صالح اولاد کے حصول کے لیے سب سے پہلے نکاح کی شرط عائد کی گئی، پھر نکاح کے لیے جو امور قابلِ توجہ ہیں ان کی نشان دہی فرمائی گئی، چناں چہ ارشادِ ربانی ہے:

وَلَا تَنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكٰتِ حَتّٰى يُؤۡمِنَّ ‌ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤۡمِنَةٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكَةٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ‌ ۚ وَلَا تُنۡكِحُوا الۡمُشۡرِكِيۡنَ حَتّٰى يُؤۡمِنُوۡا ‌ؕ وَلَعَبۡدٌ مُّؤۡمِنٌ خَيۡرٌ مِّنۡ مُّشۡرِكٍ وَّلَوۡ اَعۡجَبَكُمۡ ‌ؕ (البقرہ:221)

یعنی "اور مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں، اور یقیناً ایک مومنہ لونڈی مشرکہ عورت سے بہتر ہے، خواہ وہ تمھیں (ظاہری حسن ومال وغیرہ کے اعتبار سے) پسند ہی کیوں نہ آئے۔ اور مشرک مردوں سے (اپنی عورتوں کا) نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے

آئیں، اور یقیناً ایک مؤمن غلام مشرک مرد سے بہتر ہے، خواہ وہ تمھیں (اپنی شان و دولت وغیرہ سے) پسند ہی کیوں نہ آئے۔"

رسول اکرم اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ تُنْكَحُ النِّسَاءُ لِأَرْبَعٍ: لِمَالِهَا، وَلِحَسَبِهَا، وَلِجَمَالِهَا، وَلِدِينِهَا، فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّينِ، تَرِبَتْ يَدَاكَ. (ابن ماجہ: ح1858)

یعنی عورتوں سے چار چیزوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے: (کسی سے) اس کے مال کی وجہ سے، (کسی سے) اس کے حسب و نسب کی وجہ سے، (کسی سے) اس کے حسن و جمال کی وجہ سے، (کسی سے) اس کی دینداری (اور نیکی) کی وجہ سے۔ تو دین دار عورت (کے حصول میں) کامیاب ہو جا۔

جس طرح اسلام صالح بیوی کے انتخاب کو بہت اہمیت دیتا ہے، اسی طرح صالح مرد کو ترجیح دینے کی ضرورت پر بھی زور دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"عَنْ أَبِي حَاتِمٍ الْمُزَنِيِّ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا جَاءَكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَأَنْكِحُوهُ إِلَّا تَفْعَلُوا تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ وَإِنْ كَانَ فِيهِ قَالَ إِذَا جَاءَكُمْ مَنْ تَرْضَوْنَ دِينَهُ وَخُلُقَهُ فَأَنْكِحُوهُ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ".

(جامع الترمذی:1985)

ابوحاتم مزنی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمھارے پاس جب کوئی ایسا شخص (نکاح کا پیغام لے کر) آئے، جس کی دین داری اور اخلاق سے تم مطمئن ہو تو اس سے نکاح کر دو۔ اگر ایسا نہیں کروگے تو زمین میں فتنہ اور فساد برپا ہوگا۔ لوگوں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اگر اس میں کچھ ہو؟ آپ نے تین بار یہی فرمایا کہ جب تمھارے پاس کوئی ایسا شخص آئے جس کی دین داری اور اخلاق سے تم مطمئن ہو تو اس سے نکاح کر دو۔

آج کی دنیا میں بین الاقوامی دستاویزات اور معاہدے بچے کو اس کی پیدائش کے دن سے حقوق کا ایک مجموعہ دینے کے خواہاں ہیں جب کہ ہماری اسلامی شریعت بچے کی ولادت سے پہلے ہی اس کے حقوق کی باتیں کرتی ہے بچہ جب اپنی ماں کے شکم میں ہوتا ہے تو اس کے جینے کے حق کی توثیق کرتی ہے اور حاملہ ماں کی دیکھ بھال کی خواہاں ہوتی ہے۔

حق کہتے کسے ہیں؟

حق وہ ہے جو شریعت میں انسان کے لیے یا اللہ تعالیٰ کے لیے (دوسروں پر) قائم ہے، یعنی یہ وہ سب کچھ ہے جس پر شریعت نے انسان کو اختیار دیا ہے۔ اور تمام حقوق کا ماخذ الوہی قانون ہے یا جو اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو حقوق وہ ہیں جن میں تمام انسانوں کی بھلائی ان کے عمومی فریم ورک کے اندر اور حقیقی معنوں میں پائی جاتی ہے۔ بچوں کے چند مخصوص حقوق درج ذیل ہیں:

(1) جان کا حق:

اسلامی قانون کی بنیاد انسانی جان کی حفاظت اور اس کے تحفظ کی ذمہ داری ہے اور کسی بھی عمل یا ذریعہ سے اس کے خلاف جارحیت کی ممانعت ہے جب تک کہ کوئی جائز وجہ نہ ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ایک جان کے قتل کو پوری انسانیت کے قتل کے مترادف

قرار دیا ہے اور ایک جان کی نجات کو پوری انسانیت کی جان بچانے کے مترادف۔ اسلام نے ہر اس عمل کو حرام قرار دیا ہے جو زندگی کے حق سے منحرف ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشہور خطبہ میں فرمایا: ”تمھارا خون، تمھارا مال اور تمھاری عزتیں ایک دوسرے کے لیے حرمت والے ہیں“۔

جان کا حق انسانی وجود کا سب سے قریبی تعلق سمجھا جاتا ہے اور یہ اس کے لیے ایک فطری حق ہے اور خالق کی نعمتوں میں سے ہے، اس کی شان ہے، لیکن تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ بعض تہذیبیں انسان کو اس حق سے محروم کر دیتی تھیں۔ قدیم زمانے میں لوگ اس حق کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور غربت یا شرمندگی کے خوف سے بچوں کی جان لے لیتے تھے۔ چناں چہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”اپنی اولاد کو غربت کے خوف سے قتل نہ کرو، ہم
تمھیں اور ان کو رزق دیتے ہیں۔“ (الانعام:151)

(2) نسب کا حق:

جب اسلامی قانون نے بچے کو زندہ رہنے کے حق کی ضمانت دی تو اس نے اسے اپنے باپ سے نسب اور وابستگی کے حق کی ضمانت بھی دی ہے تاکہ وہ جہالت کا شکار نہ ہو اور اس طرح کفالت اور وراثت جیسے دیگر حقوق سے محروم نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

”انھیں ان کے والد کے ناموں سے پکارو، یہ خدا
کے نزدیک زیادہ درست ہے“۔ (الاحزاب:5)

اسلام نے نسب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے یا کسی بچے کو اس کے والد کے علاوہ کسی اور سے منسوب کرنے کی کوشش کرنے سے بھی منع کیا اور اس کے لیے سخت سزا مقرر کی۔ اولاد کا نسب قائم کرنا نہ صرف اس کا حق ہے بلکہ ماں اور باپ کا بھی حق ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا حق بھی ہے۔ یہ باپ کا حق ہے کیوں کہ یہ اس کا حق ہے کہ وہ اپنے بچے کو ضائع ہونے سے بچاتا

ہے، اور اس لیے کہ اس کے نسب کو قائم کرنے میں دیگر حقوق شامل ہیں، جیسے کہ جب وہ جوان ہے تو اس کی سرپرستی کا حق، جب وہ اپنے بیٹے کی ضرورت ہو تو اس کی کفالت کا حق، اور اگر وہ اس سے پہلے فوت ہو جائے تو اس کی جائیداد سے وراثت کا حق۔ یہ ماں کا بھی حق ہے، کیوں کہ یہ اس کا حق ہے کہ وہ زنا کے الزام کے خلاف اپنا دفاع کرے اور اپنے بیٹے کو ضائع ہونے سے بچائے۔ نیز، ماں کے لیے نسب قائم کرنے میں حقوق شامل ہیں، جیسے کہ بچے کی اس سے وراثت اور اس کی طرف سے اس کی وراثت، اور اس کی نااہلی کی صورت میں اس کی حمایت کا حق اور اس کی کفالت کی صلاحیت۔

(3) دودھ پلانے کا حق:

ماہرین سماجیات اور ڈاکٹر اس بات پر متفق ہیں کہ ماں اپنے بچے کے سب سے زیادہ قریب ہوتی ہے اور اس کا دودھ اس کے لیے بہترین غذا ہے۔ بچوں سے متعلق بین الاقوامی تنظیموں نے پوری دنیا کی ماؤں سے دودھ پلانے کی طرف واپس آنے کا مطالبہ کیا ہے کیوں کہ اس سے بچے کی صحت، نشوونما اور نفسیات پر بہت زیادہ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسلامی قانون ماؤں کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو مکمل دو سال تک دودھ پلائیں ان لوگوں کے لیے جو دودھ پلانا مکمل کرنا چاہتی ہیں۔

(4) کفالت کا حق:

یہ حق اسلامی قانون میں بچوں کے والدین پر قائم کردہ حقوق میں سے ایک ہے۔ فقہا نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ ایک شخص پر اپنے بچوں کی کفالت کرنا واجب ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"جس کے پاس کثرت ہے وہ اپنی کثرت سے خرچ
کرے اور جس کا رزق تنگ ہو وہ اس میں سے خرچ کرے

جو اللہ نے اسے دیا ہے، اللہ تعالیٰ کسی نفس کو اس کی طاقت
کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں دیتا، اللہ سختی کے بعد آسانی پیدا
کرتا ہے۔"(الطلاق:7)

حدیث میں آیا ہے کہ انصار میں سے ایک شخص فوت ہوا، اپنے پیچھے چھوٹے بچے چھوڑ گیا۔ اس نے اپنی موت سے پہلے پاس میں جو مال تھا اسے خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے خرچ کر دیا، جس کی وجہ سے اس کے بچے محتاجی اور غربت کا شکار ہو گئے۔ جب یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے اپنی قوم سے فرمایا: تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ؟ انھوں نے کہا: ہم نے اسے دفن کر دیا۔ انھوں نے کہا: اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں مسلمانوں کے ساتھ دفن نہ کرنے دیتا۔ اس نے اپنے بیٹے کو لوگوں سے بھیک مانگنے کے لیے چھوڑ دیا۔

بچوں کے حقوق کے کنونشن کے آرٹیکل (27) میں بچے کو اپنی جائیداد سے حصہ فراہم کرنے کی ذمہ داری کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس آرٹیکل کا پہلا پیراگراف ہر بچے کی جسمانی، ذہنی، روحانی، اخلاقی اور سماجی ترقی کے لیے موزوں معیار زندگی کے حق کو تسلیم کرتا ہے۔ اسی مضمون کا دوسرا پیراگراف بنیادی ذمہ داری والدین پر ڈالتا ہے، یا ان میں سے ایک، یا بچے کے لیے ذمہ دار دوسرے افراد، اپنی مالی صلاحیتوں کی حدود کے اندر، بچے کے لیے ضروری حالات زندگی فراہم کریں ۔

یہ تسلیم شدہ امر ہے کہ باپ کو اپنے گھر والوں کے لیے سخاوت کرنے اور اپنی اولاد پر خرچ کرنے کا ثواب اور اجر ہے، لیکن اگر وہ کھانے پینے کی استطاعت رکھنے کے باوجود اپنے اہل وعیال اور بچوں پر خرچ کرنے سے باز رہے تو وہ یقیناً گناہ گار ہے۔

پھر اسلام کفالت کی مد میں یہ اضافہ کرتا ہے کہ اگر والدین اپنے بچوں کی کفالت کرنے سے قاصر ہیں تو ان کی کفالت اور تعلیم وتربیت کی ذمہ دار اسلامی ریاست ہے۔

(5)تعلیم کا حق:

اسلام نے حصولِ علم کی تاکید کی ہے اور اسے ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض قرار دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جس نے اپنے بچے کو وہ بات سکھانے میں کوتاہی کی جو اس کو فائدہ پہنچاتی تو اس نے اس پر بہت ظلم کیا ہے۔ آج ہم اپنے معاشرے میں اس بات کا مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ کتنے ایسے والدین ہیں جنھوں نے اپنے بچوں کو دنیا اور آخرت کی بھلائی سے محروم کر کے انھیں دنیا و آخرت دونوں میں تباہی سے دوچار کیا ہے؟ یہ سب والدین کی خدا کے حقوق سے غفلت، ان کی نظر اندازی، اور اللہ کی طرف سے ان پر مفید علم اور اعمال صالحہ کے واجب ہونے سے روگردانی کا نتیجہ ہے ۔

انسانی حقوق کی زیادہ تر دستاویزات میں بچے کے کم از کم تعلیم کے حق پر ضرور توجہ دی گئی ہے، اور اس حق کو بچے کے سات بنیادی حقوق میں سے ایک سمجھا گیا ہے۔ اقوام متحدہ کی دفعہ (89)1959 میں کہا گیا ہے کہ بچے کو تعلیم کا حق حاصل ہے، اور کم از کم ابتدائی مراحل میں تعلیم مفت اور لازمی ہوگی، تاکہ بچے کو اس کی ذمہ داری کا احساس ہو سکے اور وہ معاشرے کا ایک کارآمد رکن بن سکے۔

(6)بچوں کے ساتھ کھیلنا:

سماجی نفسیات کے مطالعے نے بچوں کے لیے کھیل کی اہمیت کو ثابت کیا ہے۔ کھیل بچوں کو ذمہ داریوں، پابندیوں، مایوسی، اور احکامات اور ممانعتوں سے بھری حقیقت سے آزاد ہونے کا ایک منفرد موقع فراہم کرتا ہے۔ یہ بچوں کو نیا علم حاصل کرنے کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ مزید، یہ انہیں تنازعات سے بچنے کی ترغیب دیتا ہے۔ کھیلنے کا حق ایسا ہے کہ اسلامی قانون نے سب سے پہلے بچوں کے لیے اس کو تسلیم کیا۔ شریعت واضح طور پر اس حق کو لازمی قرار دیتی ہے اور مسلمانوں سے بچوں کے کھیلنے کے حق کو تسلیم کرنے پر زور بھی دیتی

ہے۔علما نے اپنی کتابوں میں ”بچوں کی طرح کام کرنے اور ان کے ساتھ کھیلنے کی خواہش“ کے عنوان سے متعدّد نصوص کا حوالہ دیا ہے، جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ بچوں کے ساتھ کھیلنا اسلامی قانون میں مطلوب ہے۔

اسلام کے دیے گئے اس حق کو بچوں کے حقوق کے کنونشن نے تسلیم کیا۔ کنونشن کے آرٹیکل 31 میں کہا گیا ہے: ”مملکتیں بچے کے آرام اور تفریح، بچے کی عمر کے مطابق کھیل اور تفریحی سرگرمیوں میں مشغول ہونے اور ثقافتی زندگی اور فنون میں آزادانہ طور پر حصہ لینے کے حق کو تسلیم کرتی ہیں۔“

ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام، کسی بھی دوسرے مذہب سے پہلے، بچے کی زندگی کے اس پہلو پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ ہمارے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہی ایک حدیث ہی کافی ہے کہ، حضرت عائشہ نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں گڑیوں سے کھیلتی تھی اور میری سہیلیاں بھی تھیں جو میرے ساتھ کھیلتی تھیں۔

(7) بچوں کے ساتھ انصاف اور مساوی سلوک کا حق:

اسلام بچوں کے ساتھ یکساں سلوک کا طرف دار ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی اولاد کے درمیان عدل کرو۔“ حضور کی اس حدیث سے بیٹیوں پر بیٹوں کو ترجیح، چھوٹے بہن بھائیوں پر بڑوں کی ترجیح کی نفی ہوتی ہے۔اگر اسلامی معاشرے میں ایسے والدین پائے جاتے ہیں جو لڑکوں اور لڑکیوں کو امتیازی نظروں سے دیکھتے ہیں، تو اس کی وجہ وہ کرپٹ ماحول ہے جس میں ان کی پرورش کافرانہ رسوم و رواج کے ساتھ ہوتی ہے۔ اسلام، مکمل مساوات اور جامع انصاف کے اپنے مطالبے کے ساتھ اس قسم کی کسی بھی ترجیح و تخصیص کی بالکل بھی حمایت نہیں کرتا۔ مسلم شریف کی حدیث ہے، حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: میرے والد مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئے اور کہا: اے اللہ کے رسول، گواہ رہنا کہ میں نے نعمان کو فلاں مال دیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا: کیا تم نے اپنے تمام بیٹوں کو بھی وہی دیا ہے جیسا کہ تم نے نعمان کو دیا تھا؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنے بچوں کے ساتھ انصاف کرو۔

بچوں کے درمیان نابرابری اور تفریق ان کے درمیان نفرت اور بغض اور خاندانی رشتوں کو توڑنے کا باعث بنتی ہے۔ بچے دراصل وہ امانت ہیں جو خالق ارض و سماوات نے ہمارے سپرد کی ہے۔ ان کے حقوق کی حفاظت محض ایک سماجی تقاضا نہیں بلکہ ہماری دینی و اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ جب تک ہم اس امانت کا حق ادا نہیں کرتے، نہ ہماری عبادتیں مکمل ہوتی ہیں اور نہ ہی ہمارا معاشرہ حقیقی سکون کی دولت سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بچوں کے مسکراتے چہرے ہی ہماری تہذیب کی بقا اور مستقبل کی روشنی ہیں۔ اگر ہم نے ان کے حقوق ضائع کیے تو گویا ہم نے اپنی آنے والی نسلوں کو اندھیروں کے حوالے کر دیا۔ لہٰذا آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنی ترجیحات پر نظر ثانی کریں اور بچوں کے حق کو عبادت سمجھ کر ادا کریں، تاکہ کل کا معاشرہ ایمان، انصاف اور انسانیت کی خوشبو سے مہکتا ہوا دکھائی دے۔ (آمین)

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ نومبر 2025ء)
(تحریر ستمبر 2025ء)

اسلام کا نظامِ حِسبہ

گوستاف گریٹباوم کے باطل نظریے کی تردید

اسلامی شریعت اُن سابقہ آسمانی شریعتوں کی مانند نہیں جو اپنے زمانے کی حدود و قیود میں رہ کر منسوخ ہو چکیں، بلکہ اسلامی شریعت تو تمام انسانیت کے لیے ایک ایسا ابدی ضابطۂ حیات ہے جو انسان کی دنیا بھی سنوارتا ہے اور آخرت بھی۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج ہم اس صداقتِ جاوداں سے اپنے منہ موڑے ہوئے بیٹھے ہیں۔ ہماری فطرت کے آئینے پر شکوک و شبہات کی دبیز دھند جمی ہوئی ہے، ہمارے ذہن اُن نظریات کے اسیر ہو چکے ہیں جن کی اصل روشنی نہیں صرف دھواں ہے۔ ان نام نہاد ترقی یافتہ نظریات نے ہماری پوری قوم کو محرومی اور ذلت کا اسیر بنا رکھا ہے، لیکن مشاہدے میں یہ بات بھی آئی ہے کہ خود اُن نظریات کی بنیادیں اُن کے اپنے ہی دیار میں زلزلوں کا شکار ہیں، ان کی چمک دمک پھیکی پڑ چکی ہے، گویا وہ نظریاتِ باطل اپنے ہی ہاتھوں اپنی قبر کھود رہے ہیں۔

اسلام محض ایک دین نہیں بلکہ مکمل ضابطۂ حیات ہے، اس میں زندگی گزارنے کے رہنما قوانین کے علاوہ حکومت و ریاست کے لیے ایسے ضابطے موجود ہیں جو انسانی فطرت کے عروج و زوال کے ساتھ ہم آہنگ ہیں۔ انھی قوانین میں سے ایک قانونِ "حسبہ" ہے (یعنی نظامِ احتساب) یہ قانون معاشرے کو دھوکا دہی اور جعل سازی سے پاک خوش حال اور محفوظ زندگی فراہم کرتا ہے۔

لوگ کہیں گے کہ یہ تو ایک پرانا موضوع ہے، جس پر قدیم مصادر میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، پھر اس میں نیا کیا ہے؟

توحقیقت یہ ہے کہ حسبہ کے قدیم متون سے ماخوذ ہونے کا جو بھی دعویٰ کیا گیا ہے وہ سب کی سب غلط بنیادوں پر ہے۔ مشہور مستشرق (Orientalist) گوستاف گریٹباؔوم نے اپنی کتاب "الإسلام في العصر الوسيط" میں یہ دعویٰ کیا کہ نظامِ حسبہ "والی المدینة" نامی بازنطینی (Byzantine) کتاب سے ماخوذ ہے، یعنی یہ کوئی اسلامی قانون نہیں بلکہ دوسری قوموں سے حاصل شدہ نظام ہے، اسلامی نہیں بلکہ غیر قوموں سے نقل کیا گیا ہے۔ لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس نظام پر ایک مختصر نگاہ ڈالیں تاکہ حقیقت حال واضح ہوسکے اور مستشرقین کے جھوٹ کا پردہ فاش ہوسکے۔

حسبہ کا معنیٰ:

لفظ "حِسْبَة" (حسبہ) عربی زبان کے مادّہ "حَسَبَ – يَحْسِبُ – حِسْبَةً" سے ماخوذ ہے، جس کے بنیادی معنی ہیں: "گنتی کرنا، اندازہ لگانا، شمار کرنا، حساب لینا، اور نیکی کی نیت سے کسی کام کو انجام دینا"۔

حِسْبَة لغت میں اُس عمل کو کہا جاتا ہے جو انسان خالصتاً رضائے الٰہی کے لیے انجام دے، خواہ اس میں کوئی دنیاوی منفعت یا ذاتی فائدہ شامل نہ ہو۔ چنانچہ عربی میں کہا جاتا ہے:

فَعَلَهُ احتِسَابًا لِوَجْهِ الله.

یعنی: "اس نے یہ کام صرف اللہ کی رضا کے لیے کیا۔"

اسی سے لفظ "احتساب" بھی نکلا ہے، جس کا مطلب ہے "اللہ کی رضا کے حصول کے لیے عمل کرنا" یا "اللہ کی طرف سے اجر کی امید رکھنا"۔

فقہی و شرعی اصطلاح میں الحِسبة کا مفہوم اس سے وسیع ہے۔ علما کے نزدیک "حسبہ" اجتماعی نگرانی کا وہ نظام ہے جس کے ذریعے اسلامی ریاست میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نیکی کا حکم اور برائی سے روکنا) عملاً نافذ کیا جاتا ہے۔ یعنی:

الحِسْبَةُ هيَ وِلايةٌ على الأُمورِ العامّةِ

لإقامةِ المعروفِ إذا ظُهِرَ تركُهُ، وَلِمَنْعِ المنكرِ إذا ظَهَرَ فِعلُهُ .(المصدر: الماوردي، الأحكام السلطانية)

”حسبہ وہ انتظامی اختیار ہے جو عوامی معاملات کی اصلاح کے لیے قائم کیا جاتا ہے، تاکہ نیکی کو قائم کیا جائے جب وہ ترک ہونے لگے اور برائی کو روکا جائے جب وہ ظاہر ہو۔“

حسبہ کی اصل:

یہ خالص اسلامی نظام ہے جس کی بنیاد واضح قرآنی آیات پر ہے، جیساکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلۡتَكُنۡ مِنۡكُمۡ اُمَّةٌ يَدۡعُونَ اِلَى الۡخَيۡرِ وَيَاۡمُرُونَ بِالۡمَعۡرُوفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُونَ ○(آل عمران:104)

ترجمہ:” اور تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔“

مزید ارشاد فرمایا:

وَالۡمُؤۡمِنُونَ وَالۡمُؤۡمِنَاتُ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ يَاۡمُرُونَ بِالۡمَعۡرُوفِ وَيَنۡهَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ○(التوبۃ:71)

ترجمہ:”مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے رفیق و مددگار ہیں، وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔“

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال میں بھی اس نظام کا ثبوت موجود ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غلے کے ایک ڈھیر کے پاس سے گزرے، آپ نے اپنا ہاتھ اس میں ڈالا، تو نمی محسوس ہوئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: ''اے اناج والے! یہ کیا ہے؟ اس نے کہا: ''یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم، اسے بارش لگ گئی تھی۔ یہ سن کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تو اسے تم نے اوپر کیوں نہیں رکھا تاکہ لوگ دیکھ لیں۔'' اور فرمایا: ''جو دھوکے بازی سے کام لے وہ مجھ سے نہیں''۔ (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اپنے صحابہ کو بھی اس ذمہ داری میں شریک فرمایا۔ آپ نے سعید بن العاص کو مکہ کے بازار کا نگران مقرر فرمایا تاکہ معاشرتی زندگی اسلامی اصولوں کے مطابق چلے اور کوئی دھوکا یا بددیانتی نہ کرے۔

خلفائے راشدین بھی حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی اس سنت پر عمل پیرا رہے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ خود بازاروں کا معائنہ کرتے، ترازو اور پیمانوں کو دیکھتے اور گڑبڑ کرنے والوں کو متنبہ کرتے۔ روایت ہے کہ آپ نے ایک اونٹ والے کو مارا اور فرمایا: ''تو نے اپنے اونٹ پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ لادا ہے''۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بازار مدینہ کے لیے عبداللہ بن عتبہ کو محتسب مقرر کیا اور بعض بازاروں کی نگرانی کے لیے ایک انصاری خاتون الشفاء بنت عبداللہ کو بھی یہ ذمہ داری سونپی۔

فقہائے عظام کی شرط کے مطابق محتسب شریعت کا علم رکھنے والا، حق پر ثابت قدم اور مشکلات کے حل میں بصیرت رکھنے والا ہو، تاکہ وہ اپنے منصب کو درست طریقے سے انجام دے سکے۔ یہ نظام وقت کے ساتھ ساتھ ارتقا پذیر رہا، مگر ہمیشہ اپنے شرعی اصول سے وابستہ رہا۔

اموی اور عباسی خلفا نے بھی حسبہ کا نظام قائم رکھا۔ بعض اوقات یہ کام وہ خود بھی

انجام دیتے اور بعض اوقات قاضی یا پولیس کے ذریعے کرواتے۔ خلیفہ مہدی عباسی نے ایک خاص محکمہ قائم کیا جو زنادقہ (ملحدوں) کے خلاف کام کرتا تھا جو معاشرے کو بگاڑنے کی کوشش کرتے تھے۔

اس طرح حسبہ کا نظام بغداد، مصر، شام، مغرب اور اندلس تک پھیل گیا۔ فاطمی دور میں محتسب کے ماتحت ''نوّاب'' ہوتے تھے جو بازاروں میں گھومتے، کھانے پکانے، گوشت اور وزن تولنے کی نگرانی کرتے اور پانی فروشوں کو صفائی کا پابند بناتے۔

اندلس میں محتسب کو ''صاحب السوق'' کہا جاتا تھا اور وہ بازار کے تمام معاملات کی نگرانی کرتا۔ مؤرخ المقرّیؒ لکھتا ہے:

> ''یہ ذمہ داری اہل علم و فہم کے لیے مخصوص تھی، محتسب خود بازاروں میں گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا، اس کے ساتھ اعوان ہوتے اور ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ترازو ہوتا تاکہ روٹی وغیرہ کا وزن درست رہے۔''

مغرب میں یہ نظام طویل عرصے تک باقی رہا۔ المقری نے لکھا: ''میں نے خود تطوانؔ شہر میں محتسب کو دیکھا، جو بازار کے انتظام تک محدود تھا۔ بعد میں سرکاری محکموں نے یہ کام سنبھال لیا۔''

تمام اسلامی مصادر میں حسبہ کی تعریف ایک ہی مفہوم پر مبنی ہے۔ ابن خلدون اپنی ''مقدمہ'' میں لکھتے ہیں:

> "الحسبۃ ایک دینی منصب ہے، جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے تحت آتا ہے اور یہ منصب حاکمِ وقت پر فرض ہے کہ وہ کسی اہل شخص کو اس پر مقرر کرے۔ اس کے ذمہ لوگوں کو عام مفاد کی پابندی پر مجبور کرنا ہے، مثلاً راستوں

میں رکاوٹ ڈالنے سے روکنا، حد سے زیادہ وزن لادنے
سے منع کرنا، گرنے والی عمارتوں کو گرانا اور عوام کو ضرر سے
بچانا۔"

یہ ہے اسلام میں حسبہ کا خلاصہ ہے جو ہم نے ابھی پیش کیا۔اب دیکھتے ہیں کہ مستشرق گوستآف نے اپنی کتاب میں کیا کہا؟اس نے حسبہ اور بازنطینی کتاب "والی المدینہ" کے درمیان موازنہ کیا اور روایتی مستشرقانہ انداز میں حسبہ کی اسلامی اصالت کو مشکوک بنانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کا دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے، کیوں کہ "والی المدینہ" دسویں صدی عیسوی میں لکھی گئی، جب کہ حسبہ کا **نظام قرآن وسنت سے ماخوذ** ہے اور خلفائے راشدین کے زمانے میں نافذ تھا، یعنی اس کتاب کے لکھے جانے سے دو صدی پہلے ہی یہ نظام رائج تھا۔

مزید یہ کہ "والی المدینہ" میں شاہی طبقے، جوہریوں، اور ریشمی کپڑے بیچنے والوں کے متعلق قوانین ہیں، جب کہ حسبہ کا نظام صرف یہیں تک محدود نہیں بلکہ تمام طبقات سے متعلق ہے۔اسی طرح "والی المدینہ" میں غیر ملکیوں، یہودیوں اور غلاموں پر مخصوص پابندیوں کا بیان ہے، جب کہ حسبہ سب کو برابر سمجھتا ہے۔ یعنی اسلامی قانون سب کے لیے مساوی ہے۔

یہاں سے فرق بالکل واضح ہوجاتا ہے اور مستشرق گوستآف کا جھوٹ بے نقاب ہوجاتا ہے۔ البتہ یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ "والی المدینہ" میں بیان کردہ بعض قوانین اسلامی حسبہ سے ہی ماخوذ ہوں، کیوں کہ انجیل تو ریاستی امور میں بالکل بھی مداخلت نہیں کرتی، جیسا کہ اُس کا اصول ہے:

"جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو۔"

لہٰذا گمانِ غالب یہی ہے کہ بازنطینیوں نے اسلامی نظام سے استفادہ کیا ہوگا۔ اگرچہ یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ بعض قدیم اقوام جیسے یونانیوں (یونان) میں بھی بازاروں کی نگرانی کا

نظام تھا، لیکن اسلامی حسبہ اور اُن کے نظام میں فرق بہت واضح ہے، یعنی ہمارا نظامِ حسبہ الوہی قوانین کے تابع ہے جب کہ یونانی حسبہ انسانی قوانین کا پابند ہے۔

گستاؔف نے ایک حالیہ کتاب ”الحسبة المذهبية في بلاد المغرب العربي: نشأتها وتطورها “مصنفہ: موسی لقبال کی بارے میں بھی گفتگو کی اور اس کو مندرجہ ذیل جملہ نقل کیا:

”یہ نظام بعد کے ادوار میں بھی باقی رہا، یہاں تک
کہ جب مسلمان مشرق و مغرب کی اقوام تک پہنچے تو وہاں
موجود اس قسم کے نظام کو برقرار رکھا، کیوں کہ وہ مفید تھا،
اور پھر اس کو ترقی دے کر اسلامی شکل دی گئی۔“

اس جملے کو نقل کرنے کے بعد گوستاؔف نے لکھا:

”اس عبارت سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ مسلمانوں
نے حسبہ کو اپنی الٰہی تعلیمات سے نہیں، بلکہ غیر مسلم اقوام
سے اخذ کیا۔“

ہم گوستاؔف پر بدنیتی کا الزام نہیں لگاتے، کیوں کہ اس نے بعد میں لکھا ہے کہ ”نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی پہلے شخص تھے جنھوں نے حسبہ کا عملی نظام قائم کیا۔“

بہتر ہوتا کہ وہ یوں کہتا: ”مسلمانوں نے یونانی حسبہ کو اس لیے برقرار رکھا کیوں کہ انھوں نے پایا کہ یہ ان کے اپنے نظام سے ہم آہنگ ہے“ اس طرح اس کی عبارت شک و تاویل سے پاک رہتی۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ بعض اسلامی احکام بعض غیر اسلامی قوانین سے ظاہری مشابہت رکھتے ہوں، بشرطے کہ وہ ان سے ماخوذ نہ ہوں۔ یہ محض اس لیے ہے کہ بعض اصول فطری بدیہات پر مبنی ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ ہماری حسبہ ایک دینی فریضہ ہے جو

انسانی معاشرے کی حقیقی خوش بختی کا ضامن ہے، کیوں کہ اسلامی نظام ہی وہ نظام ہے جو انسانی زندگی کو منظم کرتا ہے اور ہر شعبے کے لیے رہنمائی فراہم کرتا ہے، نہ کہ زندگی اسلام پر اپنی مرضی مسلط کرتی ہے۔

مراجع و مصادر:

- ڈاکٹر عبد الہادی الشال، "الإسلام والمجتمع الفاضل" سلسلة البحوث الاسلامیه، صفحہ 241، ذوالحجہ 1392ھ۔
- الفیروزآبادی، القاموس، صفحہ 54–55۔
- صحیح مسلم، جلد 1، حدیث نمبر 102۔
- احمد سعید المجلیدی" التیسیر في أحكام التسعیر"، تحقیق: موسیٰ لقبال، صفحہ 42، مطبوعہ: الشرکۃ الوطنیۃ للنشر والتوزیع، الجزائر۔
- النفح (نفح الطیب)، جلد 1، صفحہ 218، تحقیق: ڈاکٹر احسان عباس، دار صادر، 1388ھ۔

(ماہ نامہ اشرفیہ نومبر 2025ء میں شائع)

(تحریر: اکتوبر 2025ء)

(یہ مضمون ابوالتمش اعظمی کے قلمی نام سے شائع ہوا)

بیداری کی خاموش دستک

ہم ایک ایسے دور میں جی رہے ہیں جہاں واقعات کی رفتار نے ہماری سوچ کو مفلوج کر دیا ہے، ایک حادثہ گزرتا نہیں کہ دوسرا سامنے آجاتا ہے، ہمارے دل و دماغ گردشِ زمانہ میں بے طرح الجھے ہوئے ہیں۔ سیاست، جنگ، معاش، میڈیا اور روزمرہ کی کشمکش نے ہمارے دل کو منتشر اور ذہن کو تھکا دیا ہے، مگر ہمیں اس الجھاؤ سے، اس کشمکش سے آزادی کی طرف نکلنا ضروری ہے، میں اس کی طرف ایک قدم بڑھانے کی ضرورت ہے جو یہ کہتا ہے کہ تم میری طرف ایک قدم قریب آؤ تو میں تمھاری طرف دس قدم قرب آؤں گا، ہمیں اس سے ذرا سی محبت کرنے کی دیر ہے پھر وہ ہمیں ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرے گا۔

اس وقت ہم لوگ ماہِ رجب کو الوداع کہہ کر ماہِ شعبان کے روحانی اور عرفانی ماحول میں داخ ہونے والے ہیں۔ اس مہینے کی اپنی ایک الگ روحانی شناخت ہے۔ یہ مہینہ مایوسی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں امید کی ایک روشن کرن کی طرح ہے، یہ مہینہ بہ بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ دروازہ ابھی بند نہیں ہوا، تم دستک دے کر تو دیکھو۔ ہماری یہ تحریر اسی دستک کی ایک ادنیٰ سی کوشش ہے، تاکہ غفلت کے شکار دل کو بیداری کی صبح امید افزا مل سکے۔

ماہِ رجب کے حوالے سے کہنے والے نے کہا۔

مَضَى رَجَبٌ وَمَا أَحْسَنْتَ فِيهِ ... وَهَذَا شَهْرُ شَعْبَانَ المُبَارَكْ
فَيَا مَنْ ضَيَّعَ الأَوْقَاتَ جَهْلاً ... بِحُرْمَتِهَا أَفِقْ وَاحْذَرْ بَوَارَكْ
فَسَوْفَ تُفَارِقُ اللَّذَّاتِ قَسْرًا ... وَيُخْلِي المَوْتُ كُرْهًا مِنْكَ دَارَكْ
تَدَارَكْ مَا اسْتَطَعْتَ مِنَ الخَطَايَا ... بِتَوْبَةِ مُخْلِص وَاجْعَلْ مَدَارَكْ

عَلَى طَلَبِ السَّلَامَةِ مِنْ جَحِيم فَخَيْرُ ذَوِي الجَرَائِم مَنْ تَدَارَكْ

(لطائف المعارف–امام ابن رجب الحنبلی)

- رجب گزر گیا اور تم نے اس میں کوئی بھلائی نہ کمائی، اور یہ ہے شعبان کا مبارک مہینہ۔
- اے وہ شخص جس نے وقتوں کی حرمت کو نہ پہچان کر انھیں ضائع کر دیا، ہوش میں آ اور اپنی ہلاکت سے ڈر۔
- یاد رکھ! لذتیں ایک دن زبردستی تجھ سے چھن جائیں گی، اور موت نہ چاہتے ہوئے بھی تجھے تیرے گھر سے جدا کر دے گی۔
- ابھی جو ممکن ہو، سچی توبہ کے ذریعے اپنے گناہوں کی تلافی کر لے۔
- دوزخ سے نجات کو اپنا مقصد بنا، کہ گناہ گاروں میں بھی سب سے بہتر وہی ہے جو سنبھل جائے۔

شاعر بندے کو جھنجھوڑتے ہوئے اسے وقت کی حرمت یاد دلاتا ہے، اور اس تلخ مگر سچی حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ لذتیں ہمیشہ ساتھ نہیں رہتیں، اور موت ایک دن زبردستی انسان کو اس کے سارے اپنوں اور سپنوں سے جدا کر دیتی ہے۔ ابھی زندگی موجود ہے، انسان اگر چاہے تو سنبھل سکتا ہے، گمراہوں کے جال سے نکل سکتا ہے، راہِ راست پر چل سکتا ہے، اور سچی توبہ کے ذریعے اپنی بربادی کو نجات میں بدل سکتا ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ اسلام فرد اور اجتماع کو ایک دوسرے سے الگ نہیں دیکھتا۔ دل کی اصلاح، زبان کی حفاظت، نگاہ کی پاکیزگی، دیانت، امانت؛ یہ سب اجتماعی نجات کی بنیادیں ہیں۔ امت کے عظیم مسائل پر بات کرنا ضروری ہے، مگر یہ بات اسی وقت بامعنی ہوتی ہے جب فرد کے اندر تقویٰ، خوفِ خدا اور اخلاقی استقامت موجود ہو۔ دل جب تقویٰ سے خالی ہو تو فساد کا گھر ہوتا ہے، اور سیاست جب شریعت کے اصولوں سے ہٹتی ہے

تو قوموں کو ذلت کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔ اسی طرح عبادت اگر سماجی شعور سے خالی ہو تو وہ محض ایک ذاتی عمل بن کر رہ جاتی ہے۔ اسلام ان سب کو جوڑ کر دیکھتا ہے، اور ماہِ شعبان اسی جامع فکر کی عملی تربیت کا مہینہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں ماہِ شعبان ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ فرماتی ہیں:

مَا رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِّ صلى الله عليه وسلم اسْتَكْمَلَ صِيَامَ شَهْرٍ قَطُّ إِلَّا رَمَضَانَ. وَمَا رَأَيْتُهُ فِي شهر أكثر منه صياما في شعبان. (الصحيح لمسلم ،باب صيام النبي صلى الله عليه وسلم في غير رمضان، واستحباب أن لا يخلى شهرا عن صوم،2/ 810)

میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو رمضان کے علاوہ کسی مہینے کے پورے روزے رکھتے نہیں دیکھا، اور شعبان کے علاوہ کسی مہینے میں اتنے زیادہ روزے رکھتے نہیں دیکھا۔

یہ روایت ہمیں بتاتی ہے کہ شعبان محض ایک تقویمی مہینہ نہیں بلکہ رمضان کی دہلیز ہے، جہاں ٹھہر کر بندہ اپنے نفس کو نظم و ضبط سکھاتا ہے، بھوک کے ذریعے دل کو نرم کرتا ہے، اور عبادت کے ذوق کو بیدار کرتا ہے، تاکہ رمضان اچانک بوجھ بن کر نہ آئے بلکہ ایک مانوس مہمان کی طرح آئے اور خوشی خوشی اس کا استقبال کیا جائے۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے سوال پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جواب دراصل پورے ماہ شعبان کی تفسیر ہے۔

"يَا رَسُولَ الله ، إِنَّكَ تَصُومُ حَتَّى لاَ تَكَادَ تُفْطِرُ ، وَتُفْطِرُ حَتَّى لاَ تَكَادَ أَنْ تَصُومَ إِلاَّ يَوْمَيْنِ

إِذَا دَخَلاَ فِي صِيَامِكَ وَإِلاَّ صُمْتَهُمَا ، قَالَ : أَيُّ يَوْمَيْنِ ؟ قُلْتُ : يَوْمَ الِاثْنَيْنِ وَيَوْمَ الْخَمِيسِ ، قَالَ : ذَانِكَ يَوْمَانِ تُعْرَضُ فِيهِمَا الأَعْمَالُ عَلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ ، وَأُحِبُّ أَنْ يُعْرَضَ عَمَلِي وَأَنَا صَائِمٌ." (سنن نسائی: 3/ 177)

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں دیکھتا ہوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی اتنے زیادہ روزے رکھتے ہیں کہ گویا افطار ہی نہیں کرتے، اور کبھی اتنا افطار فرماتے ہیں کہ گویا صرف دو دن ہی روزہ رکھتے ہیں۔ اس پر رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: وہ کون سے دو دن ہیں؟ حضرت اسامہ نے جواباً عرض کی: پیر اور جمعرات۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ وہ دو دن ہیں جن میں اعمال ربّ العالمین کے حضور پیش کیے جاتے ہیں، اور مجھے یہ پسند ہے کہ میرا عمل اس حال میں پیش ہو کہ میں روزے سے ہوں۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ مزید کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میں آپ کو کسی اور مہینے میں اتنے روزے رکھتے نہیں دیکھتا جتنے شعبان میں رکھتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" ذَاكَ شَهْرٌ يَغْفُلُ النَّاسُ عَنْهُ بَيْنَ رَجَبٍ وَرَمَضَانَ، وَهُوَ شَهْرٌ تُرْفَعُ فِيهِ الْأَعْمَالُ إِلَى رَبِّ الْعَالَمِينَ." (مسند احمد: 36/ 85)

یہ وہ مہینہ ہے جس سے لوگ غافل ہو جاتے ہیں، کیوں کہ یہ رجب اور رمضان کے درمیان واقع ہے، اور اسی مہینے اعمال رب العالمین کے حضور پیش کیے جاتے ہیں، اس لیے مجھے پسند ہے کہ میرا عمل اس حال میں پیش ہو کہ میں روزے سے ہوں۔

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کے نزدیک وہ عمل زیادہ محبوب ہے جو غفلت کے شور میں تنہائی سے اٹھے، جو نمائش سے پاک ہو، اور جو نفس پر گراں گزرنے کے باوجود اخلاص کے ساتھ انجام دیا جائے۔

اسی مضمون کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی بیان فرمایا۔ بخاری و مسلم کی روایت ہے کہ وہ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ کبھی اتنے روزے رکھتے کہ ہم کہتے اب افطار ہی نہیں کریں گے، اور کبھی اتنا افطار فرماتے کہ ہم کہتے اب روزہ رکھیں گے ہی نہیں۔ اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو رمضان کے سوا کبھی کسی مہینے کے پورے روزے رکھتے نہیں دیکھا، اور میں نے آپ ﷺ کو شعبان کے علاوہ کسی مہینے میں اتنے زیادہ روزے رکھتے نہیں دیکھا۔ بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ شعبان کے پورے روزے رکھتے تھے، اور مسلم کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ شعبان میں روزے رکھتے تھے، مگر تھوڑے دن چھوڑ بھی دیتے تھے۔

اسی حقیقت کو امام ابن رجب نے ان الفاظ میں بیان کیا کہ غفلت کے اوقات کو عبادت سے آباد کرنا اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ: فتنوں، انتشار اور افراتفری کے زمانے میں عبادت کرنا میری طرف ہجرت کرنے کے برابر ہے۔ امام نووی رحمہ فرماتے ہیں کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے وقت میں اکثر لوگ عبادت سے غافل ہو جاتے ہیں، اس لیے جو بندہ اس ہجوم میں اللہ کو یاد رکھتا ہے وہ خصوصی فضل کا مستحق ہوتا ہے۔

علما نے یہ بھی واضح کیا ہے کہ اعمال کے پیش کیے جانے کے اوقات مختلف ہیں۔ دن اور رات کے اعمال روزانہ، ہفتے کے اعمال پیر اور جمعرات کو، اور پورے سال کے اعمال ماہِ شعبان میں اللہ کے حضور پیش کیے جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ہماری سال بھر کی کارگزاریاں ماہِ شعبان میں اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کی جاتی ہیں تو ایسے میں ایمان اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان اس مہینے میں اپنے باطن کو سنوارے، توبہ کو تازہ کرے، اور اطاعت کی حالت میں اللہ

کے سامنے حاضر ہو۔

نصف شعبان کی رات کے حوالے سے بھی اصل توجہ رسموں اور ظاہری اہتمام پر نہیں بلکہ دل کی صفائی پر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ نصف شعبان کی رات اپنی مخلوق پر نظر فرماتا ہے اور سب کو بخش دیتا ہے، سوائے مشرک اور کینہ رکھنے والے کے۔

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ اس رات کی سب سے بڑی رکاوٹ دل کا میل ہے۔ حسد، بغض، کینہ اور عداوت وہ زنگ ہیں جو عبادت کے نور کو بھی بے اثر کر دیتے ہیں۔ اگر اس رات کچھ کرنا ہے تو دل کو صاف کرنا ہے، رشتوں کو جوڑنا ہے، معاف کرنا ہے، اور اللہ کے حضور ٹوٹ کر جھک جانا ہے۔

ماہِ شعبان دراصل ایک خاموش پیغام ہے کہ رمضان آنے والا ہے۔ یہ مہینہ ہمیں بتاتا ہے کہ جو شخص تیاری کے بغیر رمضان میں داخل ہوا، وہ اکثر رسموں میں الجھ کر روح سے محروم رہ گیا۔ اور جو شعبان میں سنبھل گیا، اس کے لیے رمضان رحمت، نور اور نجات بن جاتا ہے۔

ماہِ شعبان ہماری زندگی کے قیمتی اوقات میں شمار ہوتا ہے ہیں، یہ ایک ایسی مہلت ہے جو اگلے برس ہمیں ملے گی یا نہیں یہ نہیں کہا جاسکتا لہٰذا لازم ہے کہ ہم اسی کو غنیمت جانیں، روزے، قیامِ شب، تلاوتِ قرآن اور آپس کی اصلاح کے ذریعے اسے آباد کریں۔ اس مہینے کو اپنے ایمان کی مضبوطی کا ذریعہ بنائیں، اور اس بات پر غور کریں کہ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے مواقع کو کس طرح سمیٹا۔

امام مسلم روایت کرتے ہیں کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آج تم میں سے کون روزے سے ہے؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں۔ پھر فرمایا : آج تم میں سے کس نے جنازے کے ساتھ شرکت کی؟ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے عرض کی: میں۔ پھر فرمایا: آج تم میں سے کس نے کسی

مسکین کو کھانا کھلایا؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں۔ پھر فرمایا: آج تم میں سے کس نے کسی مریض کی عیادت کی؟ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: میں۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ سب خوبیاں جس شخص میں ایک دن جمع ہو جائیں، وہ ضرور جنت میں داخل ہو گا۔

ہمارے اسلافِ صالحین ماہِ شعبان کی بڑی قدر کیا کرتے تھے۔ وہ اسے قرآنِ کریم کی کثرتِ تلاوت سے آباد کرتے تھے۔ سلمہ بن کہیل کہتے ہیں کہ شعبان کو قرّاء کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ حبیب بن ابی ثابت فرماتے ہیں یہ قرآن پڑھنے والوں کا مہینہ ہے۔ جب ماہِ شعبان آتا تو عمرو بن قیس الملائی اپنی دکان بند کر دیتے اور پوری طرح قرآن کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔

آج لوگ خون بہانے، مال لوٹنے، ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے، فتنوں کی آگ بھڑکانے اور امت کو پارہ پارہ کرنے میں مشغول ہیں، تاکہ اس کی قوت ختم ہو جائے، اس کے نوجوان ضائع ہو جائیں اور اس کی بنیادیں ہلا دی جائیں، اور دشمن مضبوط ہو۔ ایسے حالات میں ہم پر لازم ہے کہ ہم اس عظیم اور بابرکت مہینے میں طاعت و عبادت کی طرف متوجہ ہو جائیں، روزوں، قیام، تلاوتِ قرآن اور حتی المقدور لوگوں کی اصلاح کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔

گذشتہ سطور سے معلوم ہوا کہ یہ وہ مہینہ ہے جس میں اعمال اللہ ربّ العالمین کے بارگاہ میں پیش کیے جاتے ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ ہم ایسے نیک اعمال کی طرف راغب ہوں جو قیامت کے دن خوشی و خرّمی کا باعث بنیں، جو چہروں کو روشن اور تابناک کریں اور ہمارے آقا و مولا جانِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشی و رضا حاصل کریں۔ افسوس ہے ان لوگوں پر جن کے اعمال اس مہینے اللہ کے حضور پیش کیے گئے اور وہ اعمال چہرے سیاہ کرنے والے نکلے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غمگین کیا۔

آج دنیا بھر میں گناہوں اور برائیوں کا غلبہ ہو چکا ہے، شر پسندوں کا شر ہر جگہ پھیل گیا ہے، لوگ گم راہی کی دلدل میں گردن تک دھنسے ہوئے ہیں! کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو ”

کل ”کی امید پر اپنے ”آج“کو لایعنی خرچ کیے جا رہے ہیں مگر افسوس کہ ان کو”کل “میسر ہی نہیں ہوتا، وہ آنے والے دنوں کا استقبال تو ضرور کرتے ہیں مگر افسوس دن پورا نہیں کر پاتے ۔یاد رکھیے ہماری ہر سانس ایک مہلت ہے، ایسی مہلت جو دوبارہ اس دنیا میں حاصل نہیں ہونے والی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ سب جان کر بھی ہم ماہِ شعبان کو طاعت و عبادت میں اور گناہوں کو چھوڑنے میں استعمال نہیں کر سکتے...؟ سوال ہے کہ کیا ہم موت سے پہلے زندگی کے موقع کو غنیمت جان سکتے ہیں؟ کیا ہم وقت کی نعمت کو پہچان کر اسے لہو و معصیت میں ضائع ہونے سے بچا سکتے ہیں؟ یہ کوئی جبر کا سودا نہیں ہے، دینے والا تو دینے پر آمادہ لینے والا چاہیے۔

دعا ہے، پروردگارِ عالم ہمیں موت کی سختیوں کے وقت ان لوگوں میں شامل نہ کرنا جو یہ کہیں:﴿رَبِّ ارْجِعُونِ ○ لَعَلِّي اَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ﴾اے میرے رب! مجھے واپس لوٹا دے، شاید میں وہ نیک عمل کر لوں جو میں چھوڑ آیا تھا۔

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ فروری 2026ء)

(تحریر: دسمبر 2025ء)

چُپ رہو

اس عالمِ شور و شر انگیز میں، جہاں آوازیں کانوں کے پردوں میں شگاف ڈالتی ہیں اور نامناسب خیالات کا سیلاب ذہنوں کو اپنی منہ زور موجوں کے ساتھ بہالے جاتا ہے، وہاں خاموشی ایک کھویا ہوا خزانہ بن چکی ہے، آج کی دنیا کو اسی خاموشی کی ضرورت ہے جس نے ماضی میں دلوں کو مسخر کر کے باطنی کمالات کے نئے نئے دروازے وا کیے۔ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہم جس خاموشی کا ذکر کر رہے ہیں وہ کوئی ناپید اکنار خلا نہیں بلکہ مثبت فکر کا حجرۂ خلوت ہے، جہاں بصیرت آنکھ کھولتی ہے اور روح سجدہ ریز ہوتی ہے۔

فرانسیسی مصنف ارنسٹ پشکاری کے قول کے مطابق "خاموشی عظیم آسمان کا وہ ٹکڑا ہے جو زمین پر نازل ہو گیا ہے"۔ یہ قول ایک صداقت کو جنم دیتا ہے، یہ قول واضح کرتا ہے کہ خاموشی معنی کی عدم موجودگی نہیں بلکہ معنی کی دہلیز ہے۔ جیسے دریا کی گہرائی سطح کے سکوت میں چھپی ہوتی ہے، ویسے ہی انسان کی عظمت اس کی خاموشیوں میں گفتگو کرتی ہے۔

دیکھا جائے تو آج کا انسان اظہاریوں کا اسیر ہو چکا ہے، اس کا ہر لمحہ تبصرہ، رائے زنی، اشتراک خیالات، اور احتجاجات میں گزرتا ہے، وہ مسلسل بولتا ہے مگر اس کا یہ مسلسل بولنا کہیں نہ کہیں سوچنے کی عادت کو کمزور کر رہا ہے۔

آئیے تھوڑی دیر کے لیے ہم سر آئزک نیوٹن کو یاد کریں، وہ نابغۂ روزگار جو اپنے گم سم مزاج کے سبب 'woolgatherer' یعنی "خیالوں میں گم انسان" کہلائے۔ مگر ان کا سکوت ذہن کی زمین میں کششِ ثقل کا بیج بو گیا۔ ان کی خاموشی، دراصل ایک عالم کی تجریدی دعا تھی، جس نے علم کی دنیا بدل دی۔

ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ مسلسل خاموشی انسان کے ذہن کو پرسکون کرتی ،

یادداشت کو تازہ کرتی، اور تخلیقی قوتوں کو جِلا بخشتی ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ خاموشی، ایک ایسی علاج ہے جو نہ صرف ذہن کو سنوارتا ہے بلکہ زندگی کو بامعنی بنادیتا ہے۔

خاموشی صرف فرد کی ذات تک محدود نہیں کیا جاسکتا، یہ معاشرتی تعلقات کی خفیہ سفیر بھی ہے۔ کتنے ہی جھگڑے ایک ناسمجھی میں بولے گئے جملے سے شروع ہوتے ہیں، اور کتنے ہی فسادات کو خاموشی کا ایک لمحہ کاٹ سکتا ہے۔ غصے میں کچھ نہ کہنے کو جو لوگ بزدلی سمجھتے ہیں میں ان سے کہنا چاہوں گا کہ غصے کی حالت میں کچھ نہ بولنا بزدلی ہرگز نہیں بلکہ دانائی، اور عقل وبصیرت کو وہ تاج ہے جو نفس پر قابو پانے والے کے سر پر رکھا جاتا ہے۔

کسی دانش ور نے کہا: ”میں جب کسی کو سنتا ہوں تو اپنے ذہن کو خالی کرلیتا ہوں، گویا میں سوچ بھی نہیں رہا ہوتا، بس ہمہ تن گوش ہوتا ہوں۔“ یہی وہ خاموشی ہے جو سماعتوں کو سجدہ ریز کرتی ہے۔ خاموشی انسان کے اس کی اصل کی طرف لے جانے کا واحد ذریعہ ہے، جہاں انسان عالمِ بے پردگی میں خود سے ملاقات کرتا ہے۔

مذہبی روایات میں خاموشی کو ایک روحانی سیڑھی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ صوفیوں کے حالات کا مشاہدہ کیجیے تو سمجھ میں آتا ہے کہ ”جب دنیا کا شور تھمتا ہے، تب حق کی آواز سنائی دیتی ہے“۔ تصوف کی دنیا میں خاموشی محض سکوت نہیں بلکہ ”ریاضت“ اور ”مجاہدے“ کا رکن عظیم ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں: ”اذا تم العقل نقص الکلام“ جب عقل مکمل ہوتی ہے تو کلام کم ہوجاتا ہے۔"

یہ قول بتاتا ہے کہ عقل اور سکوت کا گہرا تعلق ہے۔ اہلِ تصوف کہتے ہیں کہ جو خاموش ہے، وہ سن رہا ہے؛ جو سن رہا ہے، وہ سمجھ رہا ہے؛ اور جو سمجھ رہا ہے، وہ خود سے بلند ہو رہا ہے۔

ہمارے مشہور صوفی بزرگ حضرت شبلی رحمہ اللہ کو جب ان کے شیخ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ نے سلوک کی راہ پر تربیت دی، تو پہلے ہی سبق میں کہا کہ ”اے شبلی! زبان بند رکھ، تاکہ دل بولے۔“ شبلی کو سالہا سال خاموشی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا، یہاں تک کہ ان کے خاموش وجود سے معانی یوں ٹپکنے لگے جیسے ایک مدت گزرنے کے بعد شہد کی مکھیوں کا چھتہ ٹپکنے لگتا ہے۔ شبلی بولتے نہیں تھے، مگر ان کے چہرے سے عرفان کی روشنی چھن چھن کر ظاہر ہوتی تھی۔

حضرت مریم سلام اللہ علیہا کی مثال لیجیے کہ جب دردِزہ کے وقت اپنے دامن میں مسیحائی کا راز لیے، خامشی کا عہد باندھے اپنی قوم کے سوالات کا سامنا کر رہی تھیں، تو اللہ نے فرمایا:

”فَقُولِي إِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ أُكَلِّمَ الْيَوْمَ إِنسِيًّا“ (مریم)

”کہہ دینا: میں نے رحمٰن کے لیے خاموشی کا روزہ رکھا ہے، آج کسی انسان سے بات نہ کروں گی۔“

یہ صرف روزہ نہیں، بلکہ خاموشی کا روزہ ہے۔ یہاں "صوم" سے مراد کھانے پینے سے پرہیز نہیں بلکہ کلام سے اجتناب ہے، زبان کی بندش، تاکہ دل کی زبان کھل سکے۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ بعض اوقات خامشی، قول سے زیادہ گویا ہوتی ہے۔ انبیا کی سنت میں بھی سکوت ایک تربیت ہے، ایک پیغام ہے، ایک احتجاج ہے، اور ایک عبادت۔

صوفیاء کا قول ہے: ”جب زبان بند ہو، تب دل کھلتا ہے۔“

اس کائنات میں ہر شے کی ایک زبان ہے؛ ہوا کی سرسراہٹ، دریا کی گنگناہٹ، پھولوں کی خوشبو، آسمان کا نیلا پن —— سب ایک خاموش زبان بول رہے ہیں۔ لیکن انسان اس زبان کو تب ہی سمجھتا ہے جب وہ اپنی زبان کو خاموش کر دے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

”میں نے سکوت کو اپنا امام بنایا، تو معرفت میری پشت پر آن کھڑی ہوئی۔“

یہ ایک روحانی راز ہے کہ جب انسان بولنا چھوڑ دیتا ہے، تب کائنات اس سے بات کرتی ہے۔ ہر پتھر، ہر ذرہ، ہر لمحہ، ایک علم بن جاتا ہے۔ یہی خامشی، انسان کو معرفتِ الٰہی کی دہلیز تک لے جاتی ہے۔

یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ خاموشی صرف ظاہری نہیں، بلکہ باطنی بھی ہوتی ہے۔ ظاہری سکوت سے کہیں زیادہ اہم باطنی خاموشی ہے اور باطنی خاموشی ہے خیالات کا سکوت، نفس کا سکوت، تمناؤں کا سکوت۔

امام غزالی رحمہ نے باطنی خاموشی پر گفتگو کرتے ہوئے احیاء العلوم میں فرمایا:

”سکوت کا مطلب یہ نہیں کہ زبان بند ہو، بلکہ یہ ہے کہ دل، دنیا کی فضول باتوں سے خاموش ہو جائے۔“

یہی مجاہدہ ہے، یہی عرفان کا پہلا قدم ہے، جب انسان کے اندر کی ہنگامہ خیزی رک جائے، تب ذکرِ حقیقی شروع ہوتا ہے۔

تصوف میں ایک درجہ ہے جسے ذکرِ خفی کہا جاتا ہے، وہ ذکر جو صرف دل کرتا ہے، جس میں زبان کو کوئی دخل نہیں۔ یہ خاموشی کی اعلیٰ ترین صورت ہے، اسی کو سماعِ قلب کہتے ہیں۔ حضرت رابعہ بصری اکثر خاموش رہا کرتی تھیں، مگر ان کی خاموشی میں وہ تاثیر تھی کہ سننے والا رونے لگتا تھا۔

حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کہتے ہیں:

”خامشی کے بغیر دل میں کوئی نور داخل نہیں ہوتا۔“

اور یہی نور ہے جو دل کو مقام بقا کی طرف لے جاتا ہے۔

خاموشی صرف روحانیت کی معراج نہیں، بلکہ معاشرت کا توازن بھی ہے۔ کتنے ہی رشتے ایک جملے سے ٹوٹتے ہیں، اور کتنی ہی دشمنیاں ایک لمحۂ خاموشی سے ٹل سکتی ہیں۔ خاموشی دراصل وہ آئینہ ہے جس میں انسان اپنے الفاظ کی شکل دیکھ سکتا ہے، کہ وہ کیسا لگے گا، کیسا

چبھے گا، کتنے سینے چاک کرے گا اور کتنے دامن سیے گا۔ صوفیا نے فرمایا کہ:

"جب غصے میں ہو، تو خاموشی اختیار کرو، کیوں کہ غصے کا وہ لمہ زبان کا نہیں، روح کا امتحان ہوتا ہے۔"

مگر آج کی دنیا میں خاموشی کوئی آسان کام نہیں۔ نوٹیفکیشن کے شور اور چوبیس گھنٹے کی خبروں میں گھرا انسان شاید یہ بھول چکا ہے کہ خاموشی بھی گفتگو کی ایک شکل ہے؛ وہ جو روح سے روح تک پہنچتی ہے۔

خامشی دراصل اندرونی اعتماد کی علامت ہے، جو شخص اپنے خیالات میں پختہ ہوتا ہے، وہ ہر لحہ زبان کھولنے کا محتاج نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ خامشی میں بھی ایسی قوت ہے جو ماحول کا مزاج بدل سکتی ہے، جو تعلقات میں احترام کی فضا پیدا کر سکتی ہے، اور دلوں میں سوچنے کی کھڑکیاں کھول سکتی ہے۔

بے سبب تم لب نہ کھولو چپ رہو
فالتو ہرگز نہ بولو، چپ رہو

28/ جون 2025ء شنبہ

بھول جانا بھی ایک نعمت ہے

کبھی کبھی بھول جانا بھی یاد رکھنے سے بہتر ہوتا ہے

یادداشت کو عموماً ذہانت، وفاداری، اور حساسیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ہم بچپن کی باتوں کو، تلخیوں کو، صدمات کو اپنی یادوں کی تجوری میں بحفاظت تمام یوں رکھتے ہیں جیسے کوئی خزانہ ہو، حالانکہ اکثر یہ خزانہ زہر بھرا پیالہ بن جاتا ہے۔ مگر کیا کبھی ہم نے سوچا ہے کہ بھول جانا بھی تو ایک نعمت ہے؟ جی ہاں، بھول جانا محض کمزوری نہیں، بلکہ دانائی ہے، ایک فن ہے، غم و آلام سے رہائی اور رنج و درد سے نجات ہے۔

زندگی کا کارواں یونہی رواں دواں رہتا ہے، مگر ہم ماضی کے کانٹوں میں اپنے قدم الجھا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ پرانی رنجشیں، بوسیدہ گلے شکوے اور زخم خوردہ یادیں ہمیں قدم قدم پر روک لیتی ہیں۔ ایسی صورت میں بھول جانا، دل کا بوجھ ہلکا کرنے جیسا ہے۔ جیسے کسی پیاسے کو ریگستان میں پانی کا چشمہ مل جائے، ویسے ہی بھولنا انسان کو ذہنی سکون عطا کرتا ہے۔

ذرا سوچیے، نیلسن منڈیلا جیسے شخص کو، جنھوں نے اپنی زندگی کے ستائیس برس قید و بند کی صعوبتوں میں گزارے، جب رہائی ملی تو ان کے پاس انتقام کا پورا حق تھا۔ مگر انھوں نے معافی کو چنا، تلخی کو نہیں، اور کہا:

> ”جب میں اُس دروازے سے باہر نکلا جو مجھے آزادی کی طرف لے جا رہا تھا، تو میں نے یہ طے کیا کہ اگر میں نفرت اور کینہ دل میں رکھوں تو میں اب بھی قید میں ہی ہوں۔“

نیلسن منڈیلا کا یہ قول قرآن مجید کے اُس پیغام کی عکاسی کرتا ہے جہاں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

”اور وہ لوگ جو غصہ پی جاتے ہیں، اور لوگوں کو
معاف کر دیتے ہیں، اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا
ہے۔“(آل عمران:134)

غور و فکر کا مقام ہے..... کیا یہ بھولنا کمزوری ہے؟ نہیں، بلکہ یہ تو ایک ایسی طاقت ہے جو قوموں کی تقدیر بدل دیتی ہے۔

ہر شخص کی زندگی کے دامن میں کوئی نہ کوئی دکھ، کوئی صدمہ، کوئی زخم ضرور ہوتا ہے۔ کبھی دوست کی بے وفائی، کبھی رشتہ دار کی زیادتی، کبھی زمانے کی بے رخی، مگر کیا ہر بات کو سینے سے لگائے رکھنا عقل مندی ہے؟ کیا ہم دل کے دریچے کھول سکتے ہیں جب تلخیوں کی زنجیریں ہمیں جکڑے رکھیں؟

یاد رکھیے، بھولنا فراموشی نہیں، بلکہ درگزر کا فن ہے۔ جیسے دریا اپنے دامن میں گرنے والی گندگی کو بہالے جاتا ہے، ویسے ہی درگزر ہمیں نفرت کی میل سے پاک کر دیتا ہے۔ جو دل اس نعمت سے خالی ہے، وہ قبرستان بن جاتا ہے، جہاں صرف قبریں ہوتی ہیں، زندگی نہیں۔

یونانی فلسفی ایپیکورَس نے کہا تھا کہ:

”دل کا سکون ان باتوں کو بھلا دینے سے آتا ہے جو
دل کو مضطرب کرتی ہیں“۔

وہ اسے ”اتاراکسیا“ کہتے تھے، یعنی سکون کی وہ کیفیت جو ذہنی شور سے آزاد ہو۔ یہ فلسفہ ہمیں سکھاتا ہے کہ ہر بات کو دل پر لینا ضروری نہیں۔ کچھ باتیں وقت کے ساتھ دھندلی ہو جائیں تو بہتر ہوتا ہے، کیوں کہ ہر تلخی کو یاد رکھنا ایسے ہے جیسے جلتا ہوا انگارا مٹھی میں دبائے رکھنا۔

ہماری روحانی روایات بھی یہی سبق دیتی ہیں۔ اسلام میں معافی کو افضل عمل کہا گیا ہے۔ یاد کیجیے حضرت یوسف کی حیات کے بارے میں، ان کے بھائیوں نے انھیں کنویں میں ڈالا، غلام بنایا، اور جدائی کا داغ دیا مگر جب اقتدار آیا، تو انھوں نے نہ انتقام لیا، نہ طعن کیا، بلکہ فرمایا:

"آج تم پر کوئی ملامت نہیں، اللہ تمہیں معاف کرے۔" (یوسف:92)

یہ جملہ صرف معافی نہیں، بلکہ ماضی کی تلخیوں کو دفن کرنے کا اعلان تھا۔

جب مکہ فتح ہوا تو جو دشمن جو رسول اللہ ﷺ کو مکہ سے نکالنے والے تھے، سرنگوں کھڑے تھے، آپ ﷺ نے عام معافی کا اعلان کیا اور فرمایا: جاؤ تم سب آزاد ہو۔ اگر حضور چاہتے تو انتقام کی پوری تاریخ رقم ہو سکتی تھی، مگر آپ نے بھلا دیا، معاف کیا، اور انسانیت کو درسِ رحمت عطا کیا۔

حضرت علی فرماتے ہیں:

"دل آئینہ ہے، اور کینہ اس پر زنگ کی مانند ہے۔"

بھولنے سے دل کا آئینہ صاف ہوتا ہے۔ جو دل معاف نہیں کرتا، وہ بدگمانی اور غصے کی دھند میں گم ہو جاتا ہے۔

حضرت رابعہ بصری فرمایا کرتی تھیں:

"جس نے دل میں کسی کی برائی بسائی، وہ خدا کو دل
سے کیسے پکارے گا؟"

عیسائیت میں "turn the other cheek" یعنی دوسرا گال بھی پیش کرنے کا درس دیا گیا ہے۔ ہندو دھرم میں "کرم کا بندھن" توڑنے کے لیے معاف کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ ہر مذہب، ہر صوفی، ہر حکیم یہی کہتا ہے کہ یادیں بھی کبھی کبھی بوجھ بن جاتی ہیں۔

یاد رکھیے، بھولنا ماضی سے راہِ فرار نہیں، بلکہ حال کی طرف واپسی ہے۔ وہ حال جہاں ہم کھل کر سانس لے سکتے ہیں، بغیر کسی بوجھ کے۔ جو شخص بھولنا سیکھ جاتا ہے، وہ کائنات کے

بہاؤ میں شامل ہو جاتا ہے۔ وہ زندگی کو ہنر سے جیتا ہے، انا سے نہیں۔

تو اگلی بار جب کوئی پرانا دکھ دل کے دریچوں پر دستک دے، تو لمحہ بھر ٹھہر کر خود سے سوال کیجئے: ”کیا یہ یاد میری زندگی کو بہتر کر رہی ہے؟ یا یہ صرف ایک زنجیر ہے؟“ اگر جواب زنجیر ہے، تو اسے توڑ دیجیے، بھول جایئے۔ کیوں کہ بھولنا، جب حکمت کے ساتھ ہو تو نعمت بن جاتا ہے۔

زندگی ایک قافلہ ہے، نہ کہ ماضی کا قبرستان۔ جو لوگ ہر زخم کا حساب رکھتے ہیں، وہ دل میں زندگی کے لیے جگہ نہیں چھوڑتے۔ بھول جانا، دراصل دل کو خدا کے قریب کرنا ہے۔ اور خدا انھی دلوں کو اپنا گھر بناتا ہے جو معاف کرنا جانتے ہیں۔

تو آیئے! ہم بھی اُس راہ پر چلیں جہاں بھولنا بزدلی نہیں، بلکہ بصیرت ہے، جہاں معافی کمزوری نہیں، بلکہ کرامت ہے۔ جہاں دل نفرت سے خالی اور رحمت سے لبریز ہوتا ہے۔

آیئے! ہم بھی دل کے کونے کونے کو جھاڑ کر ان بیکار یادوں کا غبار ہٹا دیں۔ پرانی تلخیوں کا بوجھ اتاریں اور دل کے آنگن میں نئی روشنی آنے دیں۔ کیوں کہ اصل آزادی وہی ہے جہاں ہم ماضی کے قیدی نہ ہوں، بلکہ حال کے مسافر ہوں۔

کیونکہ بھولنا... دراصل جینے کا ہنر ہے۔

24/ مئی 2025ء

اسلامی تعلیم کا مشترکہ مقصد

تعلیم ایک مسلسل ارتقا پذیر عمل ہے، کیونکہ ہماری معاشرتوں کی فوری ضروریات بدلتی ہوئی عالمی صورت حال اور ٹیکنالوجی میں ترقی کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ مذہب پر مبنی تدریس اور تعلیم، بشمول اسلامی اسکولنگ، بھی اس تبدیلی سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ دنیا بھر میں اسلامی اسکول تعلیم و تدریس کے اپنے اپنے طریقے، تعریفیں اور اہداف رکھتے ہیں، جن میں ترجیحات کی بنیاد پر تنوع پایا جاتا ہے؛ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔

نویں صدی سے لے کر چودھویں صدی تک، شمالی افریقہ سے وسطی ایشیا تک کے علاقوں میں ابن سحنون، الجاحظ، اخوان الصفا، الفارابي، ابن سینا، القابسی، مسکویہ، الغزالی، الزرنوجی، ابن خلدون اور ابن جماعہ جیسے نامور علما نے اسلامی تناظر میں تعلیم کے نفاذ پر مختلف رسائل اور تصانیف لکھیں۔ ان کے نزدیک:

> "اسلام کو مذہبی عقائد اور علم الٰہیات کا ایک شعبہ نہیں سمجھا گیا، بلکہ ایک ایسے خیالات، اصولوں، اور اخلاقیات کے مجموعے کے طور پر دیکھا گیا جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔"(1)

اس زمانے اور اس سے پہلے کے ادوار میں انسانی تجربے کی کثیر الجہتی کو جغرافیائی تنوع کے ساتھ تسلیم کیا گیا تھا، اور اسلامی تعلیم جامد کی بجائے ایک متحرک عمل بن چکا تھا۔

ابتدائی اسلامی علما نے اپنی تعلیمی نظریات کی تشکیل میں قرآن اور حدیث سے استفادہ کیا۔ ان کا دھیان بنیادی طور پر استاد کے رویے، دین کی تعلیم و تعلم کے آداب، دیگر علوم کی

اہمیت، اور علم کے حصول و ترسیل کے اصولوں پر مرکوز تھا۔ ان سب کا مشترکہ مقصد یہ سمجھنا تھا کہ ایک مسلمان کس طرح علم حاصل کرے کہ وہ اسلام کے اصولوں سے انحراف نہ کرے۔ (2)

یہ جاننا مشکل ہے کہ ان کے خیالات کسی مربوط "اسلامی تعلیمی نظریے" کی نمائندگی کرتے تھے یا نہیں، کیوں کہ ان کے درمیان نہ صرف طویل زمانی فاصلہ تھا بلکہ ان کا تعلق مختلف جغرافیائی علاقوں سے بھی تھا۔ ہر عالم نے اپنے معاشرے کی ضروریات اور اہمیت کے مطابق ایک ایسا نصاب یا نظام ترتیب دیا جو اس وقت کے حالات کے مطابق مناسب سمجھا گیا۔

اگرچہ وہ آج کے دور میں تدریس کے پیشہ ورانہ اصولوں کے مطابق تربیت یافتہ نہیں تھے، لیکن جیسا کہ کُک بیان کرتے ہیں:

> "ان کے مرتب کردہ اصولوں نے اسلامی تعلیم
> کے مستقبل کو تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔"

ان کے نقطۂ نظر کی بنیاد یہ تھی کہ خدا اور علم کے درمیان ایک گہرا تعلق ہے۔ لہٰذا، تعلیم کا مقصد انسان کو خدا کی طرف لے جانا اور اسلام پر ایمان کو مضبوط کرنا ہونا چاہیے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلم معاشرے کے افراد کو اسلامی سوچ اور طرزِ زندگی سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے تاکہ وہ معاشرہ ترقی کر سکے۔

تاہم، جدید دور کے آغاز کے ساتھ ہی یہ خدشات ان عوامل کے زیر اثر آ گئے جن کا تعلق وقت کی بدلتی ہوئی ضروریات سے ہم آہنگ ہونے کی بے چینی سے تھا۔ کئی مسلم اکثریتی ممالک پر نوآبادیاتی تسلط، جدیدیت کو مغربی رنگ میں دیکھنا، سائنس کے مضامین کو سیکولر حیثیت دینا (حالاں کہ یہ مضامین پہلے ہی، یعنی اس نام نہاد جدید دور سے بہت پہلے پڑھائے جا رہے تھے)، اشتراکی تحریکوں کا پھیلاؤ، عوامی اسکولنگ کا تعارف، اور نئی تکنیکی ترقیات نے مسلم دنیا میں تعلیم کے لیے نئی جہتیں اور ترجیحات متعارف کرائیں۔ اس کے نتیجے میں، مذہب پر مبنی تعلیمی طریقوں میں تبدیلیاں آئیں۔ تعلیم کے مقاصد اب اس بات پر مرکوز ہو

گئے ہیں کہ اسلامی معاشروں کو ایک روایتی طرز سے ایک جدید نمونے کی طرف منتقل کیا جائے جہاں ""تنقیدی اور سائنسی سوچ"" کو اہمیت دی جاتی ہے۔ (3)

اس نئے طرزِ عمل کے اپنے نتائج برآمد ہوئے۔ جیسا کہ رحمان (1998) نے استدلال کیا:

> ""جدیدیت کی کوششوں کا نتیجہ صرف جدیدیت کے ایک تضاد کی صورت میں نکلا ہے، جہاں مستقبل پر توجہ مرکوز ہونے کے بجائے اسلامی فلسفے کی ماضی سے تعمیرِ نو پر مرکوز رہی۔ "" (4)

تاہم اب تعلیم اور نصابِ تعلیم صرف کتاب، مکتب یا مدارس تک محدود ہے۔

آج مسلم دنیا میں قرآنی مدارس، ہفتہ واری اسکول، گھریلو تدریس (ہوم اسکولنگ)، ایسے اسکول مضامین جو صرف مذہب کی تعلیم کے لیے مخصوص ہیں، نجی اسکول، عوامی پیشہ ورانہ اسکول، اور اعلیٰ تعلیمی ادارے جیسے مختلف تعلیمی نظام موجود ہیں۔ ان میں سے کچھ نظام مذہبی مضامین پر زور دیتے ہیں، جب کہ کچھ نے سائنسی مضامین کو سیکولر حیثیت کے ساتھ شامل کیا ہے۔ کچھ دیگر نے ایسے طریقے اپنانے کی کوشش کی ہے جو قرونِ وسطیٰ کے زمانے سے ملتا جلتا ہے، جہاں مختلف شعبہ جات میں تعلیم سخت اسلامی نقطۂ نظر کے مطابق دی جاتی ہے۔

ان تمام اقسام کی تعلیم اور نصابِ تعلیم کے لیے اسلامی نصوص اور تعلیمات ایک منفرد بنیاد فراہم کرتی ہیں، جو مسلم امت کی تعلیمی ضروریات کی وضاحت کرتی ہیں۔ (5)

مجموعی طور پر، اسلامی طرزِ تعلیم و تدریس ایک پیچیدہ عمل ہے جو اعلیٰ تعلیمی سطحوں کے اداروں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ کمیونٹیز، وسیع تر معاشروں، ادوار، قومی اقدار، جدیدیت کی کوششوں، عالمی رجحانات، اور تکنیکی ترقیات کی ضروریات کا جواب دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر معاشرہ اپنی ساخت، تاریخ اور دنیا کے دیگر حصوں کے ساتھ تعلقات میں منفرد ہوتا ہے۔

ایسے تعلیمی طریقے جو امریکہ میں مؤثر ہو سکتے ہیں، جرمنی، برطانیہ، ترکی، نائیجیریا، انڈونیشیا وغیرہ کے سیاق وسباق میں نافذ کرنے کے لیے کئی تبدیلیوں اور اصلاحات سے گزرنا ہوگا۔ چار دہائیوں پہلے جو طریقے کارآمد تھے، ان کی آج دوبارہ تشکیل کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود، اس قسم کی تعلیم کو عام طور پر ریاست، کمیونٹی یا افراد کی جانب سے ضروری سمجھا جاتا ہے تاکہ مسلم شناخت کی تشکیل کے لیے ایک پلیٹ فارم فراہم کیا جاسکے۔

اسلامی تعلیم کا مشترکہ مقصد ایک مضبوط اسلامی شناخت اور اردگرد کی دنیا کو سمجھنے کا شعور پیدا کرنا ہے، اگرچہ اس کے طریقے اس کمیونٹی کے لحاظ سے مختلف ہوں گے جہاں اساتذہ کام کر رہے ہیں۔ چنانچہ، بنیادی طور پر مشترکہ مقاصد (مثلاً ایمان اور اسلامی شناخت کو مضبوط کرنا) ہونے کے باوجود، عملی طور پر اسلامی تعلیم ایک کمیونٹی، علاقے اور قوم سے دوسرے میں مختلف ہوتی ہے۔ جب اس کی تشخیص اور جائزہ لیا جائے، اور متعلقہ معاشروں کو منصفانہ طور پر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس بات کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔

ماخذ:

1. Al-Sharaf, A. (2013). Developing Scientific Thinking Methods and Applications in Islamic Education. Education, 133(3), 272–282.
2. Cook, B. J. (2010). Introduction. In B. J. Cook (Ed.), Classical Islamic foundations of educational thought (pp. ix-xxxiv). USA: Brigham Young University Press.
3. Rahman, F. (1998). Islam and modernity. In Kurzman, C. (Ed.) Liberal Islam: A sourcebook (304-318). New York: Oxford University Press.
4. Rohman, M. Q. (2017). Modernization of Islamic education according to Abdullah Nashih Ulwan. Advances in Social Science, Education and Humanities Research, 125, 163-167.
5. Shah, S. (2014). Islamic education and the UK Muslims: Options and expectations in a context of multi-locationality. Studies in Philosophy & Education, 33(3), 233-249.

(ماہنامہ اشرفیہ جنوری 2025ء میں شائع۔ تحریر: 5/ جنوری 2025ء)

بھارت کا عصری نظامِ تعلیم - چند معروضات

ہندوستانی تہذیب صدیوں سے علم و حکمت، فن و فلسفہ، اور اخلاقی اصولوں کی علمبردار رہی ہے۔ مگر موجودہ دور میں تعلیم کا جو ڈھانچہ ہمارے سامنے ہے، وہ ایک فکری المیہ کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ تعلیم جو فرد کی شخصیت کو نکھارتی ہے، جو انسانی شعور کو بیدار کرتی ہے، وہ اب محض امتحانات، مارکس، اور ملازمتوں کے گرد جنونی انداز میں رقص کرنے والا ایک لایعنی نظام بن چکی ہے۔

ہندوستان کا قدیم تعلیمی نظام گروکل، آشرم، اور مدارس کی صورت میں تھا، اس نظام میں تعلیم کا مقصد صرف ملازمت حاصل کرنا یا روزگار میں کامیاب ہونا نہیں تھا، بلکہ اس کا مقصد سماج کے اجتماعی شعور کو بیدار کرنا اور انفرادی روحانی، عقلی، اور اخلاقی تربیت تھا۔ قدیم بھارت کے نالندہ اور ٹیکسلا جیسے تعلیمی ادارے ساری دنیا میں مشہور و معروف تھا جہاں اس دور کی ایسی تعلیم کا اہتمام و انصرام تھا جس کی بدولت بڑے بڑے مفکرین پیدا ہوئے، حصولِ تعلیم کے لیے ان اداروں میں دنیا بھر سے طلبہ آتے اور خود اپنی شخصیت کو نکھار کر دنیا کو نکھارنے کا کام کیا کرتے، مشہور یونانی سفیر میگا ستھنیز نے اپنی مشہور زمانہ کتاب انڈیکا (Indica) ٹیکسلا کو علم اور فلسفے کا مرکز بتایا ہے، فاہیان ہیوانگ سانگ نے بھی ٹیکسلا کو عظیم تعلیمی مرکز قرار دیا تھا۔ ہیوانگ سانگ نے نالندہ میں کئی سال تعلیم حاصل کی تھی، اس نے وہاں کی علمی فضا کا تفصیلی تذکرہ اپنی کتاب میں کیا ہے۔ اس نے لکھا کہ یہاں بیک وقت دس ہزار طلبہ تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اور دو ہزار سے زادہ اساتذہ مذہبیات، منطق، گرامر، طب، فلکیات اور فلسفہ کی تعلیم دینے کے لیے موجود رہتے تھے۔

تدریس و تعلیم کا جو طور طریقہ ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے رائج تھا، یا وہ طریقۂ تعلیم جسے لے کر مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تھے، وہ سب کچھ برطانوی نوآبادیاتی دور میں انگریزوں نے بدل کر رکھ دیا، حتیٰ کہ تعلیم کا بنیادی مقصد کا مدار تعمیر ذات و کائنات سے بدل کر تحصیل ملازمت کر دیا۔ 1835ء میں لارڈ میکالے نے اپنی مشہور "Minute on Indian Education" میں واضح کہا کہ ہم ایک ایسی کلاس تیار کریں گے جو ”رنگ میں ہندوستانی، مگر دماغی طور پر انگریز“ ہو۔ لارڈ میکالے نے جو نظامِ تعلیم ہندوستان میں متعارف کرایا وہ صرف کلرک، اکاؤنٹنٹ، اور سرکاری ملازم پیدا کرنے کا ذریعہ بن گیا۔ 1947ء میں ہندوستان انگریزوں کے پنجۂ استبداد سے بظاہر آزاد ہو گیا مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ اس نام نہاد آزادی کے 77 سال بعد بھی ہم اور آپ انگریزوں کے فکری غلام بنے ہوئے ہیں اور اسی نظامِ تعلیم کے ارد گرد چکر کاٹ رہے ہیں جو لارڈ میکالے نے پیش کیا تھا۔

تعلیم یا غلامی کی تربیت؟

صابر بھاٹیا، Hotmail کے بانی اور سلی کون ویلے کے ایک کامیاب موجد کے طور پر جانے جاتے ہیں، انھوں نے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں ہندوستان کے موجودہ تعلیمی نظام پر شدید تنقید کی ہے، انھوں نے کہا:

> "We are creating an army of useless kids who follow instructions instead of thinking for themselves."
>
> **”ہم ایک ایسی نسل تراش رہے ہیں جو سوچ کی آزادی سے محروم ہے، محض حکم بجا لانے والی کٹھ پتلیاں، جن کی فکری نمو زنجیروں میں جکڑی جا چکی ہے۔“**

صابر بھاٹیا کا کہنا بالکل درست ہے۔ آج کے تعلیمی نظام پر نگاہ ڈالیں تو یہ افسوسناک حقیقت ہمارے سامنے آکھڑی ہوتی ہے کہ ہم مدارس، اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں علم

نہیں، فرماں برداری سکھا رہے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تعلیم کا بنیادی مقصد اب شعور، تحقیق یا سوال پروری نہیں رہا، بلکہ ایک ایسی نسل تیار کرنا بن چکا ہے جو صرف "ہاں" میں جواب دینا جانتی ہو، اور "کیوں" کی جرأت سے عاری ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ بچپن میں جو ہاتھ قلم تھامتا ہے، پہلے ہی ایک نپا تُلا ایسا نصاب اس پر تھوپ دیا جاتا ہے جس میں تخلیق کی کوئی گنجائش نہیں، صرف یادداشت کو پرکھنے کا معیار ہوتا ہے۔ سوال کرنے والا بچہ "بدتمیز" کہلاتا ہے، اور اصولوں سے ہٹ کر سوچنے والا "ناکام" اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہنوں میں خوف، شک اور تعمیل حکم کی بیڑیاں پڑ جاتی ہیں۔ کامیاب وہی کہلاتا ہے جو نمبروں کی دوڑ میں دوسروں سے آگے نکلنے کے لیے اپنی فطری تجسس کو قربان کر دیتا ہے۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے لائق ہے کہ "جو قومیں صرف فرماں بردار ذہن پیدا کرتی ہیں، وہ ہمیشہ فیصلہ کرنے والوں کی غلام بن جاتی ہیں"۔

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو یہ تلخ حقیقت سامنے آتی ہے کہ "جنگیں صرف ہتھیاروں سے نہیں، نظریات سے جیتی جاتی ہیں"۔ لیکن افسوس کہ ہمارے نصاب میں نہ تو تنقیدی سوچ کی گنجائش ہے، نہ ہی تخلیقی اظہار کی قدر۔ ہمارے یہاں تو بچے نظموں کے رٹّے لگاتے ہیں، مگر اپنے خیالات کو نظم کرنے کا ہنر نہیں سیکھتے۔ انہیں تاریخ رٹائی جاتی ہے، مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ تاریخ سے کیا سیکھنا ہے اور تاریخ کیسے بنانی ہے، سائنس کے اصول پڑھائے جاتے ہیں، مگر تحقیق کا جذبہ دبا دیا جاتا ہے اور ایسے ماحول میں پرورش پانے والا نوجوان صرف ملازمت کی تلاش میں در در خوار ہوتا ہے، وہ نہیں جانتا کہ قیادت کسے کہتے ہیں، وہ صرف اپنے حالات بدلنا چاہتا ہے، دنیا کے حالات سے اسے کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

صابر بھاٹیا مزید کہتے ہیں:

"You're never asked to write a paper. You're asked to memorise 13 chapters and regurgitate them. That is

not education."

"تم سے کبھی یہ نہیں کہا جاتا کہ تم اپنی فکر کو بروئے کار لا کر کوئی مضمون لکھو؛ تم سے صرف یہ کہا جاتا ہے کہ 13 ابواب رٹو اور انہیں لفظ بہ لفظ اُگل دو، یہ تعلیم نہیں ہے۔

ہمارے تعلیمی نظام کی عملی خامیاں:

NCERT کے 2023 کے ایک تجزیے کے مطابق، CBSE اور دیگر بورڈز کے نصاب میں 70 فیصد سوالات ایسے ہوتے ہیں جو حافظہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ صرف 15 فیصد سوالات تجزیاتی یا تنقیدی سوچ کو جانچنے والے ہوتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ، علم کو سمجھنے کے بجائے یاد کرتے ہیں، اور انجام کار امتحان گاہ سے باہر نکل کر سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ جب ایک طالب علم اسکول سے لے کر کالج تک صرف "سوال نمبر فلاں فلاں" کا جواب رٹ رہا ہو، تو وہ تحقیق یا مضمون نویسی جیسے کاموں میں مہارت کیسے حاصل کر سکے گا؟ ایک معروف تعلیمی ماہر ڈاکٹر انور جلال کے مطابق:

"ہندوستان میں تحقیق کو علم کا ذریعہ نہیں بلکہ وقت کا ضیاع سمجھا جاتا ہے۔"

ایک اور سروے کے مطابق، ہندوستانی اسکولوں میں 82 فیصد سے زائد والدین اور اساتذہ یہ سمجھتے ہیں کہ آرٹس کی تعلیم "وقت کا ضیاع" ہے۔

صابر بھاٹیا نے اپنے انٹرویو میں امریکی نظام تعلیم کی مثال پیش کی جہاں بچوں کو کم عمری سے ہی اپنی کہانیاں اور تصورات پیش کرنے کی آزادی دی جاتی ہے، خواہ وہ اسپیلنگ غلط ہی کیوں نہ لکھیں۔ امریکہ کے مشہور ماہر تعلیم "جان ڈیوی" نے کہا تھا:

"Education is not preparation for life; education is life itself."

یعنی "تعلیم زندگی کے لیے محض تیاری نہیں، بلکہ خود زندگی ہے۔"

جان ڈیوی خوب اچھی طرح سمجھتے تھے کہ بچے صرف کتابوں سے نہیں، بلکہ تجربات

سے سیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے اسکولوں میں پروجیکٹ بیسڈ لرننگ، ڈیبیٹ، گروپ ڈسکشن، اور سائنسی تجربات پر زور دیا جاتا ہے۔

WHO کی رپورٹ کے مطابق، ہندوستان میں 15 سے 24 سال کی عمر کے نوجوانوں میں ڈپریشن اور امتحانی دباؤ کی شرح جنوبی ایشیا میں سب سے زیادہ ہے۔ ہر سال تقریباً 10000 سے زائد طلبہ خودکشی کرتے ہیں—یہ اس حقیقت کا ایک خوف ناک اشارہ ہے کہ ہمارا نظام انسان کو تربیت نہیں دیتا، بلکہ توڑ دیتا ہے۔

ایک رپورٹ (Aspiring Minds, 2022) کے مطابق:

"Only 20% of Indian engineering graduates are employable in the knowledge economy."

"صرف 20 فیصد ہندوستانی انجینئرنگ کے گریجویٹس ہی علم کی معیشت میں قابلِ استعمال ہیں۔"

یہ بیان نہ صرف بھارتی تعلیمی نظام کی کمزوریوں کو اجاگر کرتا ہے بلکہ اس بات کا بھی غماز ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے طلبہ کو صرف ڈگریاں تو فراہم کرتے ہیں، لیکن ان کی حقیقی مہارت اور جدید معیشت کے تقاضوں کے مطابق ان کی تربیت نہیں کرتے۔ یعنی اس رپورٹ کے مطابق تعلیم یافتہ نوجوان بھی ملازمت کے قابل نہیں، کیونکہ ان میں عملی مہارت، تنقیدی سوچ، اور حل تلاش کرنے کی صلاحیت کا فقدان ہے۔

ہم کہنا چاہیں گے کہ تعلیم ایک جامع، ہمہ جہت اور مسلسل عمل ہے جس کے ذریعے انسان اپنی انفرادی و اجتماعی شناخت، اخلاقی اقدار، سائنسی شعور، جمالیاتی ذوق، اور سماجی ذمہ داریوں سے آشنا ہوتا ہے۔ تعلیم محض نصابی مواد کا حصول نہیں بلکہ ایک فکری، اخلاقی اور تمدنی تربیت کا نام ہے۔ تعلیم انسان کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتی ہے، اس کے اندر یہ شعور پیدا کرتی ہے کہ وہ اپنے معاشرے کا جائزہ لے، مسائل کو سمجھے، اور ان کے حل کے لیے

غور و فکر کرے۔ تعلیم سوال اٹھانے، سوچنے، تجزیہ کرنے، اور مکالمہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے، جو معاشرتی تشکیلِ نو کا اولین زینہ ہے۔

فرائیری (Paulo Freire) جیسے مفکرین کے مطابق تعلیم کا مقصد صرف علم دینا نہیں بلکہ "تنقیدی شعور" پیدا کرنا ہے تاکہ فرد نظام کی ناانصافیوں کو پہچان سکے اور ان کے خلاف آواز بلند کرے۔ تعلیم کے ذریعے معاشرتی ہم آہنگی، رواداری، انصاف، مساوات، انسانی حقوق، اور ذمہ داری جیسے اقدار پروان چڑھتے ہیں۔ جب تعلیم ان اقدار کو نصاب اور تربیت کا حصہ بناتی ہے تو ایک ایسے معاشرے کی تشکیل ممکن ہوتی ہے جو انسان دوست اور پرامن ہو۔ ایک انصاف پسند اور جامع تعلیمی نظام طبقاتی فرق کو کم کر سکتا ہے۔ وہ بچوں کو ان کے سماجی و معاشی پس منظر سے بلند ہو کر آگے بڑھنے کے مساوی مواقع فراہم کرتا ہے، جس سے معاشرے میں ترقی کی راہیں کھلتی ہیں۔ تعلیم فرد کو صرف اپنی ذات یا قوم تک محدود نہیں رکھتی بلکہ اسے عالمگیر انسانیت کا حصہ بننے کا درس دیتی ہے۔ وہ فرد کو قومی شناخت کے ساتھ ساتھ عالمی برادری کا باشعور شہری بھی بناتی ہے۔

ہمارا ہندوستانی نظامِ تعلیم آج بھی نوآبادیاتی دور کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکا ہے، وہ تنقید، تخلیق، تحقیق، اور تجزیے کی صلاحیت پیدا کرنے کے بجائے رٹّا سسٹم کو فروغ دیتا ہے۔ ہندی، انگریزی اور دیگر نظاموں کی تقسیم نے ایک ایسا غیر منصفانہ طبقاتی نظام جنم دیا ہے جس میں ایک ہی قوم کے مختلف طبقے تیار ہو رہے ہیں، جو ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہیں۔ اور رہے تعلیمی تو وہ تعلیم و تعلم کے مراکز کے بجائے منافع بخش کارپوریشنز بن چکے ہیں۔ نجی اسکولز، کوچنگ سینٹرز اور ٹیسٹنگ سروسز تعلیم کو ایک مارکیٹ کی طرح چلا رہے ہیں۔

چند اصلاحی تجاویز:

ہندوستانی نظامِ تعلیم بہتر کرنے کے لیے ہم چند تجاویز پیش کرتے ہیں:

- ہر جماعت میں مضمون نویسی، مختصر کہانیاں، مکالمہ نویسی، اور مشاہداتی رپورٹ

لازمی کی جائے۔

- آرٹس کو اختیاری نہیں بلکہ لازمی مضمون بنایا جائے۔
- نصاب تعلیم میں اخلاقی تربیت، انسانی حقوق، ماحولیاتی شعور، اور شہری ذمہ داری جیسے موضوعات کو شامل کیا جائے۔
- ہر درجے کے نصاب میں سوال کرنے، سوچنے اور مکالمہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔
- نصاب کو مقامی، عملی، اور تنقیدی شعور پر مبنی بنایا جائے۔
- اوپن بُک امتحانات، پروجیکٹ بیسڈ اسسمنٹ، اور گروپ پریزنٹیشنز متعارف کروائے جائیں۔
- نمبر کی بنیاد پر درجہ بندی کے بجائے سیکھنے کے عمل پر فوکس ہو۔
- اساتذہ کو تخلیقی تدریس، بچوں کی نفسیات، اور جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کیا جائے۔
- اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرامز کو لازمی، مسلسل اور جدید خطوط پر استوار کیا جائے۔
- استاد کو محض تدریسی عملہ نہیں بلکہ ایک سماجی مصلح، فکری رہنما اور اخلاقی نمونہ بنایا جائے۔
- اسکولوں اور کالجوں میں ایسے ماحول ترتیب دیا جائے جس میں "غلطی" کو سیکھنے کا مرحلہ سمجھا جائے۔
- تعلیم میں قومی زبان کو مرکزی حیثیت دی جائے۔
- مقامی ثقافت، اور ادبی سرمائے کو نصاب کا حصہ بنایا جائے تاکہ بچے اپنی جڑوں سے جڑے رہیں۔
- سرکاری اداروں کو مضبوط بنا کر نجی اداروں کے غیر متناسب اثر کو کم کیا جائے۔
- دیہی علاقوں میں معیاری اسکول اور تربیت یافتہ اساتذہ تعینات کیے جائیں۔
- غریب طبقے کے لیے وظائف، اسکالرشپس اور مفت تعلیمی سہولیات فراہم کی جائیں۔

- آن لائن تعلیم، ڈیجیٹل کلاس روم، اور سمارٹ لرننگ جیسے ذرائع کو عام کیا جائے۔
- سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اور ریاضی (STEM) کی تعلیم پر خاص توجہ دی جائے۔
- مذہبی تعلیم کو اخلاقی تربیت سے ہم آہنگ کیا جائے۔
- شدت پسندی، نفرت اور تعصب کے بیانیے کو تعلیم کے ذریعے رد کیا جائے۔

اس سلسلے میں بین الاقوامی تجربات سے بھی سبق حاصل کیا جا سکتا ہے: **فن لینڈ** کا تعلیمی ماڈل اس بات کا ثبوت ہے کہ جب تعلیم میں برابری، مقصدیت اور تربیت کو اولیت دی جائے تو پورا معاشرہ بدل سکتا ہے۔ **جاپان** میں تعلیم کی بنیاد اخلاقی اقدار، قومی ذمہ داری اور سادگی پر ہے، جس نے اسے ترقی کی بلند چوٹیوں تک پہنچایا۔ **سنگاپور** نے بھی تعلیمی اصلاحات کے ذریعے محض چند دہائیوں میں ایک پسماندہ سماج کو عالمی معیشت میں بدل دیا۔ ہم بھی ان ماڈلز سے سیکھ کر اپنی تعلیمی پالیسیوں میں جدت، انقلابی فکر، اور ثقافتی ہم آہنگی لا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ تعلیم صرف ایک ذاتی یا انفرادی ضرورت نہیں، بلکہ یہ اجتماعی فلاح، تمدنی ارتقا، اور تہذیبی احیا کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ ایک پرامن، انصاف پر مبنی، مساوات پسند، اور ترقی یافتہ اکائی میں ڈھل جائے، تو ہمیں اپنی تعلیمی پالیسیوں، نصاب، تدریس، ادارہ جاتی ڈھانچے، اور سماجی نظریات کا از سرِ نو جائزہ لینا ہو گا۔ تعلیم کو ایک انقلابی ذریعہ بنانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اگر ہم نے تعلیم کو صرف نوکری کے حصول کا ذریعہ بنایا تو ہم چند افراد کو فائدہ دے سکیں گے، لیکن اگر اسے سماجی شعور، اخلاقی تربیت اور فکری آزادی کا سرچشمہ بنایا تو ہم پوری قوم کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔

7/ مئی 2025ء

اسلامی معاشی اصول-کساد بازاری کا حل

گلوبل صدقہ ڈاٹ کام کی انگریزی تحریر کا اردو ترجمہ

حال فی الحال میں عالمی معیشت کو متعدّد کساد بازاریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے، جس کی وجہ سے دنیا کو بڑے پیمانے پر مالی عدم استحکام اور مشکلات کا سامنا ہے۔ ایسے میں اسلامی معاشی اصول ان بحرانوں سے نمٹنے کے لیے ایک الوہی اور جامع نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ قرآن اور سنت پر مبنی یہ اصول اخلاقی طریقوں، سماجی بہبود، اور پائیدار ترقی پر زور دیتے ہیں۔ اس مضمون میں اس بات کی تحقیق کی گئی ہے کہ کس طرح اسلامی معاشی اصول معاشی کساد بازاری کا دیرپا حل فراہم کر سکتے ہیں۔

اسلامی اقتصادی اصولوں کی بنیادیں:

اسلامی معاشی نظام ایک الوہی معاشی نظام ہے جو قرآن، حدیث اور سنت کے ساتھ ساتھ اجماع سے ماخوذ ہے۔ یہ ذرائع تمام معاشی سرگرمیوں کے لیے ایک جامع فریم ورک فراہم کرتے ہیں اور اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ وہ اخلاقی اور پائیدار طریقوں سے ہم آہنگ ہوں۔

معاشیات میں حلال اور حرام کا کردار:

اسلامی اقتصادی نظام میں تمام معاشی سرگرمیاں حلال اور حرام کے دائرہ کار میں چلائی جاتی ہے۔ یہ عمل اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ کوئی بھی ایسا کام جو سماجی اور اقتصادی کاروبار کے خلاف مسائل پیدا کر سکتا ہو ممنوع ہے۔ لوگوں یا خاندانوں کو نقصان پہنچانے والے کسی بھی پروڈکٹ یا کاروبار سے اجتناب پر سب سے زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔

بطور امانت دولت کا تصور:

اسلام معاشی مسائل کو اس بات پر زور دے کر حل کرتا ہے کہ بہر حال بالادستی خدا کی ہے۔ جب لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی حاصل کرتے ہیں وہ ان کے پاس محض ایک امانت ہے، تو وہ حلال ذرائع سے مال تلاش کرتے ہیں اور اس کو مالکِ مطلق کے حکم کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ قرآن کریم ہمیں بارہا اس اصول کی یاد دہانی کراتا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ اسلامی معاشی نظام دنیا اور آخرت میں انسانیت کی بھلائی کے لیے قائم کیا گیا ہے، جس میں معاشی قوانین اللہ کی طرف سے انسانیت کی آزمائش کے لیے ترتیب دیے گئے ہیں۔

معاشی کساد بازاری کی وجوہات:

کساد بازاری معیشت میں ایک عام انحطاط ہے، جس کی خصوصیت اعلیٰ سطح کی بے روزگاری، عدم تحفظ، افراط زر، اور کم جی ڈی پی ہے۔ اگرچہ زیادہ تر ماہرین اقتصادیات اس بات پر متفق ہیں کہ دنیا کو گریٹ ڈپریشن کے بعد بدترین معاشی بحران کا سامنا ہے، لیکن اس کے اسباب کے بارے میں بہت کم اتفاق ہے۔ بعض ماہرین معاشیات کہتے ہیں کہ مالی عوامل کساد بازاری کا سبب بنتے ہیں اور بعض کا کہنا ہے کہ یہ ایک نظامی مسئلہ ہے، جو مارکیٹ کے اندرونی عمل کا نتیجہ ہے۔

عالمی اقتصادی عوامل:

عالمی اقتصادی عوامل کساد بازاری پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سود کی اعلیٰ شرح، سرمایہ کاری کے لیے دستیاب سرمایے کی مقدار کو کم کرتی ہے۔ مطلوبہ سرمایہ کار اپنی مصنوعات کے لیے مناسب منڈی کی دستیابی پر غور کرتے ہیں اور ان بلند شرحوں سے خوفزدہ ہوتے ہیں مزید برآں، عالمی تجارتی عدم توازن اور جغرافیائی سیاسی تناؤ بھی معاشی

بد حالی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مقامی معاشی بدانتظامی:

رہنماؤں اور کاروباری ایگزیکٹوز کی غلط معاشی پالیسیاں بھی معاشی بحران کا باعث بن سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر، کوئی ملک غلط سود اور مالیاتی پالیسیوں یا غیر متوازن سیاسی سرمایہ کاری کی وجہ سے بحران کا شکار ہو سکتا ہے۔

قرض پر مبنی معیشتوں کے اثرات:

قرض پر مبنی معیشتیں خاص طور پر کساد بازاری کا شکار ہیں۔ قرض کی بلند سطح مالی عدم استحکام کا باعث بن سکتی ہے، خاص طور پر جب معاشی ترقی کی رفتار کم ہو جاتی ہے۔ معاشی سرگرمیوں کو ایندھن دینے کے لیے قرض پر انحصار ایک نازک معاشی ماحول پیدا کر سکتا ہے، جہاں کوئی بھی خلل ایک اہم مندی کا باعث بن سکتا ہے۔

اس مشکل کا کافی کچھ حل مقامی اور بین الاقوامی شہرت کے تجربہ کار ماہرین اقتصادیات نے تجویز کیا ہے۔ تاہم، ان میں سے بہت سے حل مصنوعی نظریات پر مبنی ہیں، وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ مسئلہ صرف اسی صورت میں حل ہو سکتا ہے جب ہم بنیاد پر واپس جائیں۔ اور بنیاد قرآن و سنت کے سوا کچھ نہیں۔

اقتصادی بحران کے خلاف اسلامی احتیاطی تدابیر:

اسلامی معاشی اصول سود کی ممانعت اور دیگر نقصان دہ کاروباری طریقوں پر زور دیتے ہیں۔ اس کی جڑ اس یقین میں پوشیدہ ہے کہ اس طرح کے عمل معاشی عدم استحکام اور سماجی ناانصافی کا باعث بن سکتے ہیں۔ اسلامی معاشی نظام کا مقصد ان نقصان دہ سرگرمیوں سے گریز کرتے ہوئے، ایک زیادہ مستحکم اور منصفانہ معیشت بنانا ہے۔

اسلامی مالیات اخلاقیات، شفافیت، حقیقی اقتصادی تعلقات، اور کاروباری خطرات

کے اشتراک کو فروغ دیتا ہے۔ اسلام میں صرف حلال صنعتوں میں ہی سرمایہ کاری کی اجازت ہے، اس کی بھی متعدّد شرائط ہیں جو کافی تفصیل طلب ہیں۔ یہاں اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ معاشی سرگرمیاں معاشرے کو نقصان نہ پہنچائیں۔ اور یہی وہ اخلاقی نقطۂ نظر ہے جو خطرات کو کم کر کے پائیدار اقتصادی ترقی کو فروغ دینے میں مدد کرتا ہے۔

اسلامی معاشی اصول و قواعد کمیونٹی کی فلاح و بہبود اور مدد پر بہت زیادہ زور دیتے ہیں۔ زکوٰۃ (خیرات) اور سماجی بہبود کی دوسری شکلیں اسلامی نظام کے لازمی حصے ہیں، جو دولت کی دوبارہ تقسیم کو یقینی بناتے ہیں تاکہ غریبوں اور مفلوک الحال حاجت مندوں کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ یہ ایک ایسا امدادی معاشی نظام ہے جو افراد کی اقتصادی بدحالی کے خلاف بفر کا کام کرتا ہے۔ اسلامی معاشی نظام میں، افراد، خاندان، کمیونٹیز اور حکومتیں اس طرح کے مسائل سے نمٹنے کے لیے کیے جانے والے مختلف اقدامات کی وجہ سے معاشی مسائل کا کم سامنا کرتی ہیں۔

اقتصادی کساد بازاری کا اسلامی حل:

شریعت پر مبنی بینکنگ سود (ربا) کو ختم کرتی ہے اور رسک شیئرنگ کو فروغ دیتی ہے، جو مندی کے دوران معیشتوں کو مستحکم کر سکتی ہے۔ زیادہ تر اسلامی بینک منافع اور نقصان کے اشتراک کے اصولوں پر کام کرتے ہیں۔ یہ نظام اخلاقی سرمایہ کاری کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ اسلامی معاشیات پائیدار اور ماحول دوست منصوبوں میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ سبز سرمایہ کاری نہ صرف ماحول کی حفاظت کرتی ہے بلکہ روزگار کے مواقع بھی پیدا کرتی ہے اور معاشی ترقی کو تحریک دیتی ہے۔ قلیل مدتی فوائد کے بجائے طویل مدتی فوائد پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے، اسلامی مالیات پائیدار ترقی کی حمایت کرتی ہے۔

دولت کی دوبارہ تقسیم اسلامی معاشیات کا ایک بنیادی اصول ہے، جو زکوٰۃ اور صدقہ کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ طرز عمل اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ دولت کمیونٹی کے اندر

گردش کرتے ہوئے غربت اور معاشی تفاوت کو کم کرتی ہے۔ زکات کے طویل مدنی سماجی اثرات انتہائی گہرے ہیں، کیونکہ یہ ذمہ داری اور کمیونٹی کی فلاح و بہبود کے احساس کو فروغ دیتا ہے۔

اسلامی معاشیات میں زکات کا نظام دولت کی تقسیم، اسلامی بینکاری، اور بحران کے جواب میں انسان دوستی پر زور دیتا ہے۔

اسلام کی معاشی کامیابی-تاریخی مثال:

عمر بن عبدالعزیز کے دور خلافت میں اسلامی معاشی اصولوں کے نفاذ سے ایک قابل ذکر دور کا آغاز ہوا جب کوئی بھی شخص مستحقِ زکات نہیں رہا بلکہ سب صاحبِ نصاب ہو گئے تھے یہ ایسی تاریخی مثال ہے جو کمیونٹیز کو با اختیار بنانے میں دولت کی دوبارہ تقسیم اور کمیونٹی ویلفیئر کی تاثیر کو اجاگر کرتی ہے ۔

مسلم ممالک میں جدید نفاذ:

اس وقت کئی مسلم اکثریتی ممالک کامیابی کے مختلف درجات کے ساتھ اسلامی معاشی اصولوں کو اپنا چکے ہیں، مثال کے طور پر، ملائیشیا اسلامی مالیات کا عالمی مرکز بن گیا ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ شریعت کے مطابق بینکنگ کس طرح روایتی مالیاتی نظاموں کے ساتھ ساتھ جاری رہ سکتی ہے۔ اسی طرح، انڈونیشیا اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک نے اسلامی مالیات کو اپنی قومی معیشتوں میں ضم کرنے میں اہم پیش رفت کی ہے۔

ایک تقابلی تجزیہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلامی مالیاتی نظام اکثر معاشی بدحالی کے دوران زیادہ لچک دکھاتے ہیں۔ اسلامی مالیات مساوات اور رسک شیئرنگ پر زور دیتی ہے، جس سے مالیاتی بحرانوں کے اثرات کو کم کیا جاسکتا ہے۔ یہ نقطۂ نظر نہ صرف مالی استحکام کو فروغ دیتا ہے بلکہ اخلاقی سرمایہ کاری اور مالی شمولیت کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

اسلامی مالیاتی اداروں کا کردار:

اسلامی بینک ان اصولوں پر کام کرتے ہیں جو سود سے بچتے ہیں اور رسک شیئرنگ پر زور دیتے ہیں۔ وہ مختلف مالیاتی مصنوعات پیش کرتے ہیں جیسے **مرابحہ** (لاگت سے زیادہ فنانسنگ)، مشارکہ (مشترکہ کاروبار)، اور اجارہ (لیزنگ)۔ یہ مصنوعات اخلاقی اور سماجی طور پر ذمہ دارانہ سرمایہ کاری کو فروغ دینے کے لیے ڈیزائن کی گئی ہیں۔

اسلامی مائیکرو فنانس کا مقصد پسماندہ افراد کو مالی خدمات فراہم کرنا، مالی شمولیت اور کمیونٹی کو فروغ دینا ہے۔ یہ بغیر سود کے چھوٹے قرضے فراہم کرنے پر توجہ مرکوز کرتا ہے، جو غربت کو کم کرنے اور کاروبار کو فروغ دینے میں مدد کر سکتا ہے۔

چیلنجز اور مواقع:

دیکھا جائے تو اسلامی مالیاتی اداروں کو کئی چیلنجز کا سامنا ہے، تاہم، اخلاقی اور پائیدار مالیاتی مصنوعات کی بڑھتی ہوئی مانگ توسیع اور اختراع کے لیے اہم مواقع پیش کرتی ہے۔

اسلامک فنانس عالمی مالیاتی صنعت کے تیزی سے ترقی کرنے والے شعبوں میں سے ایک ہے۔کچھ ممالک میں، یہ منظم طور پر اہم ہو گیا ہے اور بہت سے دوسرے ممالک میں، یہ اتنا بڑا ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

مستقبل کے امکانات:

اسلامی معاشیات، معاشیات اور انسانی معاشرے کے مسائل کے حل لیے ایک نئے نقطہ نظر کی نمائندگی کرتی ہے، کیوں کہ یہ ایک الگ عالمی نظریہ اور انسان، معاشرے اور تاریخ کے ایک وژن پر مبنی ہے۔ایک معروف پاکستانی نژاد مسلم اسکالر کا کہنا ہے کہ موجودہ معاشی بحران کے حل کے طور پر اسلامی معاشیات جمود کو برقرار رکھنے کا نہیں بلکہ معیشت اور معاشرے کی تبدیلی کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسلامی معاشی اصولوں کو عالمی سطح پر اپنانے سے دنیا

بھر میں زیادہ پائیدار اور اخلاقی مالیاتی نظام قائم ہو سکتے ہیں۔

جدید معیشتوں کے ساتھ انضمام:

توانائی کے منصوبوں میں سرمایہ کاری کر کے، اسلامی معاشیات پائیداری کو فروغ دے سکتی ہے اور عالمی کساد بازاری سے پیدا ہونے والے چیلنجوں سے بھی نمٹ سکتی ہے۔ معیشت میں اسلامی معاشی اصولوں کا انضمام مثبت ماحولیاتی اور اقتصادی نتائج کے لیے نمایاں صلاحیت رکھتا ہے۔ اسلامی بینکوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ شریعت کے مطابق پوزیشن سے شریعت پر مبنی پوزیشن پر منتقل ہو جائیں، ایسی حکمت عملی جو انھیں قرض پر مبنی معیشت سے ایک قابل عمل متبادل کی طرف جانے کے قابل بنائے گی۔

سچ اور حق تو یہ ہے کہ اسلامی معاشی اصول اقتصادی کساد بازاری کے بار بار آنے والے مسئلے کا ایک جامع اور متوازن حل پیش کرتے ہیں۔ قرآن، حدیث اور سنت کے اصول و ضوابط اخلاقی طرز عمل، سماجی انصاف، اور نقصان دہ اقتصادی سرگرمیوں کی ممانعت پر زور دیتے ہیں۔ اگر ہم دولت کو خدا کی امانت سمجھ کر اس کے حلال حصول اور تقسیم کو یقینی بنا لیں تو بے شک ایک بہترین معاشی نظام اور متوازن لچک دار معیشت کو فروغ مل سکتا ہے۔ ہمارے اسلاف اور علما کی بصیرت اور اسلامی تاریخ کی عملی مثالیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ ان اصولوں پر عمل کرنے سے معاشی بحرانوں کو مؤثر طریقے سے کم کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے اسلامی معاشی اصولوں کو اپنانا ہی پائیدار اقتصادی استحکام اور خوشحالی کے حصول کے لیے ایک قابل عمل راستہ ہو سکتا ہے۔

(ماہ نامہ اشرفیہ اپریل 2025ء میں شائع)

(تاریخ ترجمہ 2/ مارچ 2025ء)

تاریک براعظم میں صبح نو کی امید

سینوں میں شگاف ڈالتی ہوئی افریقہ کی دھوپ میں 14 مارچ 1988 کو ایک ٹھنڈے بادل نے جنم لیا تھا، جس کا نام ابراہیم تراورے تھا، موسی نسل کے اس بادل کا ٹھکانہ "کیرا" نامی گاؤں تھا، اس کے باپ کا نام مانٹوبا میٹکین (Mantuba Matekane) اور ماں کا ہوہول (Hoohol) ہے۔ سنیت کے رنگ میں رنگا ہوا وہ بادل صرف برسنے کے لیے پیدا نہیں ہوا ، بلکہ سب کچھ جلا کر بھسم کر دینے والی دھوپ کے خلاف جہاد کرنے کے لیے پیدا ہوا۔ اس نے اپنے اندر ان ظلمت فروشوں کے خلاف برسنے کی جرأت و ہمت پالی جو روشنی کے تاجر بنے بیٹھے تھے۔ صدیوں سے اپنے بیٹوں کی قربانی کا کفارہ ادا کرنے والی برکینا فاسو کی خشک مٹی آخر کار ایک ایسا بیٹا پا گئی جو تقدیر کے لہو میں قلم ڈبو کر تاریخ کی پیشانی پر اپنا نام لکھنے والا تھا۔

وہ ایک غیر معروف گاؤں "کیرا" گاؤں میں پیدا ہوا، وہ یوں نمودار ہوا گویا تقدیر خاموشی سے اپنے سب سے بڑے پتھر کو صیقل کر رہی ہو۔ اس کا بچپن شور و شر کا آمیزہ نہیں بلکہ اس سکوت کا پیامبر تھا جو طوفان سے پہلے کی ہوا میں بسا ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں وہی وحشت تھی جو جنگلی شیر کے بچوں میں ہوتی ہے ، بظاہر خاموش، مگر بیدار، ہوشیار اور خبردار۔ جب دوسرے بچے خاک سے کھیلتے تھے، وہ اپنی خاک میں سوالوں کے بیج بویا کرتا تھا، وہ اکثر خود سے پوچھتا تھا کہ "کیا میری زمین صرف خاموش رہنے کے لیے ہے؟"

اسی طرح کے سوالات خود سے پوچھتے ہوئے اس نے تعلیمی مراحل طے کیے ، یونیورسٹی آف اوگاڈوگو (University of Ouagadougou) سے جیولوجی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد 2009ء میں برکینا فاسو کی فوج میں شامل ہوا اور 2020ء میں

کپتان کے عہدے پر ترقی پائی، لیکن وہ صرف اپنے افسروں کے اشاروں پر کٹھ پتلیوں کی طرح ناچنے والا ایک عام سا فوجی نہیں تھا وہ تو ہر حکم کو انصاف کے ترازو پر تولنے والا سپاہی تھا۔

بغاوت:

2022 میں، برکینا فاسو کی فضائیں میں جب دھویں سے بھر گئیں اور اقتدار کی سانسیں پھولنے لگیں، تو ابراہیم تراورے نے آئین کے خواب میں جلتا ہوا قلم لے کر ایک نئ تحریر لکھی۔ وہ ایک فوجی تھا، مگر اس کی تلوار پر الفاظ کی دھار تھی، اور اس کی بندوق سے انقلاب کے نعرے گونجتے تھے۔ اس نے حکومت گرادی، ہاں حکومت گرادی مگر صرف ایک حکومت نہیں گرائی، بلکہ خوف و دہشت کے بت کو چکنا چور کر دیا، جب اس نے ایسا کیا تو وہ صرف ایک کمانڈر نہیں تھا، بلکہ ضمیر کی جانب سے بھیجا گیا ایک انقلابی پیغامبر تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بندوق تھی، مگر نگاہ میں قرآن کے پہلی "اقرا" کی روشنی۔

اس نے حکومت اختیار کی، مگر کیسی حکومت؟ سچ کہوں تو تراورے کا طرزِ حکومت کوئی عیاش بادشاہوں کا خواب نہیں، وہ ریت میں اگنے والا وہ درخت ہے جسے صرف قوم کی پیاس سیراب کرتی ہے، اس نے مغربی طاقتوں کے کھوکھلے غبارے پھاڑ کر استقلال کی نئ فضا بنائی۔ اس نے قوم کو بتایا کہ آزادی ایسی شے نہیں جو کسی طاقتوروں کے ترازو پر تولی جائے، بلکہ یہ وہ شعور ہے جو خود اپنے سینے میں سلگتا ہے۔ اس نے فرانس کی مداخلت کو" نوآبادیاتی پرچھائیوں کا دوبارہ ظہور". کہا، اور اس کے خلاف افریقی شناخت کی ایک نئ قبا تیار کی۔ وہ قائد ہے، مگر اس کی پیشانی پر تاج نہیں، بلکہ سجدوں کا نشان ہے، اس کی تقریر، جیسے صحرا میں اذان کی صدا؛ اور اس کی خاموشی، جیسے جیسے کسی طوفان کا پیش خیمہ۔

سب سے کم عمر صدر:

ابراہیم تراورے دنیا کے سب سے کم عمر صدور میں سے ہے، مگر اس کی سوچ میں کہنہ روحوں کی سی گہرائی ہے۔ اس نے بتایا کہ قیادت عمر سے نہیں، قربانی اور بینائی سے پیدا

ہوتی ہے۔ وہ نوجوان ہے، مگر اس کا سینہ تاریخ کے شہیدوں کے لہو سے روشن ہے۔ اس نے صرف اقتدار نہیں سنبھالا بلکہ استعماری ذہنیت کو آئینہ دکھایا۔ اس کے سوال فقط الفاظ نہیں تھے، بلکہ پہاڑوں کے سینے چیرنے والے آواز تھے۔ اس نے اپنی قوم سے کہا:

"اگر تم خود کو غلام سمجھو گے، تو تمھاری زنجیریں سونے کی ہوں یا فولاد کی، تم کبھی آزاد نہیں ہو سکتے۔"

خطاب:

اس نے انگریزی اور فرانسیسی میڈیا کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

میں تمھیں دیکھ رہا ہوں، تمھارا ہر جھوٹ میری نگاہوں میں ہے، تمھاری ہر مکارانہ چال، ہر توڑ مروڑ کر سنائی گئی بات، میں محفوظ کر رہا ہوں۔ میں، ابراہیم ترا اورے آج تمھارے چہرے سے نقاب اتار رہا ہوں، ہاں، تم نے ٹھیک سنا! میں، جسے تم ایک جوان فوجی آمر کہتے ہو، جس پر تم "انتہا پسند، خطرناک، مغرب مخالف" ہونے کے الزامات دھرتے ہو—آج میں خود کو پیش کر رہا ہوں، بغیر تمھارے کیمرے کی کَٹ کے، بغیر تمھارے ایڈیٹر کی قینچی کے، بغیر تمھارے چالاک مکالمے کے پردے میں چھپے ہوئے۔

اب وہ دنیا نہیں رہی جہاں صرف تمھاری آواز گونجتی تھی، اب بغیر تمھارے فلٹر کے، بغیر تمھاری سازشوں کے غلاف میں لپٹے، بغیر تمھارے گندے عدسے کے ذریعے مسخ شدہ، کروڑوں لوگ سن رہے ہیں۔ میں صرف چونتیس برس کا ہوں، لیکن میری عمر کا ہر لمحہ تمھارے جھوٹ کے سائے میں گزرا ہے۔

بچپن میں جب میں نے ٹی وی پر افریقہ کو دیکھا تو وہی پرانی تصویریں، مکھیوں سے بھرے چہرے، خشک زمین، گولیاں، لاشیں، چیخیں، خون۔ یہی تھا تمھارا افریقہ—تم نے کہا: یہی حقیقت ہے، یہی فطرت ہے، یہی تقدیر ہے، اور ہم نے مان لیا، ہمیں اپنی مٹی سے شرم آنے لگی، اپنے لوگوں سے، اپنی شناخت سے شرم آنے لگی۔ مگر پھر میں جوان ہوا، میں

نے مطالعہ کیا، سوال کیے، تحقیق کی اور تب مجھے معلوم ہوا کہ جو افریقہ تم نے ہمیں دکھایا وہ صرف ایک فلم تھی جھوٹ اور سازش پر مبنی فلم، ایک ایسی کہانی جسے تم نے لکھا، فلمایا اور دنیا کو دکھایا۔

تم نے افریقہ کو کیسا پیش کیا؟ ایک ایسا قحط زدہ خطہ، جہاں زندگی کی رمق نہیں، جہاں انسان، انسان نہیں، جانور سے بھی کمتر، جہاں صرف بدحالی، دہشت، اور پسماندگی ہے۔ تمھاری اسکرین پر ہر لمحہ وہی داستان، غربت، فساد، بیماری، دہشت، بدنظمی۔ گویا ہمارے مقدر میں روشنی کا کوئی چراغ نہیں۔ کامیابی، ترقی، عزت، خودداری، یہ سارے الفاظ تمھارے لغت میں ہمارے لیے مفقود تھے۔

تو میں پوچھتا ہوں نیویارک ٹائمز، واشنگٹن پوسٹ، گارڈین، لی موند سے کہ کب تم نے افریقی کامیابیوں کو سرخی بنایا؟ کب تم نے روانڈا کی ٹیکنالوجی کی معجزاتی پیش رفت دنیا کو دکھائی؟ کب ایتھوپیا کے دوبارہ آباد کاری منصوبے کی ستائش کی؟ کب بوٹسوانا کی جمہوری استقامت پر فخر کیا؟ کب کینیا کی کاروباری ذہانت اور جدت کی داستان بیان کی؟ کبھی نہیں !!! کیونکہ وہ سب تمھاری کہانی میں فٹ نہیں بیٹھتا، کیوں کہ تمھارے اسکرپٹ میں افریقہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر ہم محروم نہ ہوں، تو تمھارا "نجات دہندہ" بننے کا ڈرامہ کیسے چلے گا؟ اگر ہم پیچھے نہ ہوں، تو تم اپنے برتری کے سراب کو کس پر تھوپو گے؟ کیا تمھارے کسی رپورٹر نے کبھی یہ سوال کیا: کہ دنیا کی سب سے امیر زمین پر رہنے والے لوگ غریب کیوں ہیں؟

لو، اب میں تمھیں اصل حقیقت بتاتا ہوں، اعداد و شمار کے ساتھ، ناموں کے ساتھ، تاریخ کے ساتھ۔

دنیا کا 70 فیصد کوبالٹ افریقہ کے پاس ہے، جس کے بغیر تمھارے فون، لیپ ٹاپ، اور الیکٹرک گاڑیاں ایک قدم نہ چلیں، یہ کوبالٹ کانگو سے آتا ہے، مگر کانگو کے بچے موبائل نہیں خرید سکتے۔ 90 فیصد پلاٹینم، جنوبی افریقہ میں پایا جاتا ہے اور وہاں کے نوجوان بے روزگاری کی

دلدل میں دفن ہیں۔ دنیا کا 30 فیصد سونا مالی، برکینا فاسو، گھانا، تنزانیہ کی نہروں میں پانی کی طرح بہتا ہے مگر عوام فاقے کرتے ہیں۔ 65 فیصد ہیرا بوٹسوانا، انگولا، کانگو، سیرالیون میں پایا جاتا ہے، دنیا کے سب سے قیمتی ہیروں کی کانیں ہماری ہیں، مگر مزدور کی اجرت صرف ایک ڈالر؟؟؟ 35 فیصد یورینیم نائیجر، نامیبیا، جنوبی افریقہ میں ہیں، پیرس ہمارے یورینیم سے جگمگاتا ہے، مگر ہمارے گاؤں اندھیرے میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اور تم ہم سے پوچھتے ہو کہ افریقہ غریب کیوں ہے؟ سوال تو یہ ہونا چاہیے تھا: کہ اتنی دولت کے باوجود افریقہ کو غریب کیسے رکھا گیا؟ جواب ہے۔ نوآبادیات کبھی ختم ہی نہیں ہوئی، بس اس نے لباس بدلا ہے۔ پہلے تم ہماری زمین پر قبضہ کرتے تھے، اب تم معاہدے کرتے ہو۔ پہلے تم کوڑوں سے حکم چلاتے تھے، اب قرض دے کر غلامی کراتے ہو۔ پہلے تم بندوق سے چھینتے تھے، اب کمپنی بنا کر ہتھیاتے ہو۔

اب تم سنو میرے الفاظ، میرے شواہد:

Glencore سوئٹزرلینڈ کی کمپنی کانگو سے کوبالٹ نکالتی ہے، 2022 میں منافع: 256 ارب ڈالر اور کانگو کو ٹیکس دیا صرف 500 ملین یعنی 0.2٪۔ Rio Tinto برطانوی آسٹریلین کمپنی گنی سے 20 ملین ٹن سالانہ باکسائٹ نکالتی ہے اور مقامی لوگوں کو ملتا ہے صرف آلودگی اور کینسر۔— Total Energies فرانسیسی کمپنی — انگولا، نائجیریا، کانگو سے نکالتی ہے، منافع 36 ارب ڈالر، مگر اس نے افریقہ میں زنگ آلود پائپ، بیماریوں اور کچرے کے ڈھیر لگا رکھے ہیں۔ تم ہمارے یہاں سے ہیرا، پلاٹینم، لوہا سب کچھ لے گئے اور چھوڑ گئے 60 لاکھ بے روزگار۔ یہ تو صرف نمونہ ہے اصل چہرہ وہ ہے جو تم چھپاتے ہو: خفیہ سودے، جعلی کھاتے، ٹیکس چوری، ہر سال 88 ارب ڈالر غیر قانونی طریقے سے افریقہ سے باہر لے جاتے ہو اور لکھتے ہو کہ ہم کو 45 ارب کی امداد دی جاتی ہے، یہ نہیں کہتا کہ افریقہ مدد لینے والا نہیں، دینے والا ہے! تم پھولے پیٹ والے بچوں پر کیمرہ زوم کرتے ہو مگر تم یہ نہیں دکھاتے کہ ہر دن ہماری زمین سونا، ہیرا، تیل، یورینیم ٹنوں کے حساب سے نکلتے ہیں۔

تمھارا نظام تو یہ ہے:

- رشوت دو، سیاست دان خرید لو، ان کے بچے اپنی یونیورسٹیوں میں داخل کراؤ۔
- سودے کرو، 99 سالہ معاہدے، ٹیکس فری رعایتیں، کوئی ماحولیاتی یا مزدور قانون نہیں۔
- انفراسٹرکچر پہ قبضہ، بندرگاہ سے کان تک ریلوے بچھاؤ، مگر گاؤں جانے کا راستہ نہیں۔
- سکیورٹی دو — پرائیویٹ گارڈز، ہتھیار دو اور مخالفین کو "دہشت گرد" قرار دو۔
- میڈیا پر پابندیاں لگاؤ — مقامی صحافیوں کو خریدو، عالمی میڈیا کو صرف انتشار دکھاؤ۔
- تمھارا یہ نظام ایک صدی سے جاری ہے، اور تم اسے دیکھنا نہیں چاہتے، کیونکہ تم خود اس کے ستون ہو۔

ابراہیم تراورے کا یہ خطاب ایسا آئینہ ہے جس میں مغروب کے مکروہ چہرے کا نظارہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت ابراہیم تراورے کی زندگی ایک طرح کی کربلائی جستجو ہے، وہ حق کے خیمے میں تنہا کھڑا ہے، اور وقت کی یزیدی طاقتیں اس کے گرد حلقہ بنائے بیٹھی ہیں۔ مگر اس کی زبان پر ایک ہی صدا ہے: "لا ظلم بعد الیوم" — آج کے بعد کوئی ظلم (غلامی) نہیں۔

وہ فقط صدر نہیں، بلکہ روحِ افریقہ کا ترجمان بن چکا ہے۔ اس کی ہستی، استعمار کے لیے زنجیر کی جھنکار ہے، اور مظلوم کے لیے امید کی اذان۔ وہ صرف ایک انسان نہیں، بلکہ افریقی شعور کی جاگتی ہوئی آنکھ ہے، وہ ان گنت غلام قوموں کے لیے چراغِ رہ ہے، اس کا سفر ابھی مکمل نہیں، مگر اس کی سمت درست ہے۔

مغرب کی سازشیں:

ابراہیم تراورے وہ کرگس ہے جس کے اردگرد کرگس حصار بنا رہے ہیں۔ اس مردِ مجاہد کو کئی خطرات بھی درپیش ہیں۔ سب سے پہلا خطرہ اُن سفید پوش سفیروں سے ہے، جو امن اور ترقی کے کاغذی طومار ہاتھ میں لیے آتے ہیں، مگر ان کی آستینوں میں سانپ چھپے ہوتے ہیں۔ یہ سفیر دراصل قدیم سلطنتوں کے جاسوس ہیں، جو مالیاتی امداد، مشاورتی معاہدے، اور تعلیمی اصلاحات

کے نام پر ایک نئی غلامی کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں۔ان کے قلم کی سیاہی میں زہر گھلا ہوتا ہے۔

فرانس اور اس کے پرانے نوآبادیاتی ہم نوا، عسکری سازشوں کے ماہر ہیں۔ابراہیم کے لیے سب سے بڑا خطرہ ان خفیہ آپریشنز سے ہے جو "امن قائم رکھنے" کے بہانے کیے جاتے ہیں۔اِن کے ہاں بندوق پہلے آتی ہے، بات چیت بعد میں۔ممکن ہے وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ کے پردے میں اندرونی بغاوت کو ہوا دیں، یا کسی کرائے کے ٹٹو کو اڑنگا لگانے کے لیے راستے میں چھوڑ دیں۔

عالمی مالیاتی ادارے، جو سرمایہ کے تاج محل میں بستے ہیں، ابراہیم کے لیے ریشم میں لپٹی زنجیروں کا جال بچھانے میں مصروف ہیں۔ قرضوں، پابندیوں، تجارتی معاہدوں، اور کرنسی کی غیر مرئی رسّیوں کے ذریعے اُس کے گرد معاشی حصار کھینچ رہے ہیں۔ ابراہیم تراورے کے لیے یہ سب سے خطرناک ہے، اگر وہ ان کی شرائط کو رد کرے تو اسے عالمی اقتصادی تنہائی کا سامنا ہو سکتا ہے۔

تراورے کے اردگرد وہ ساتھی بھی ہیں جو اس کے ساتھ بظاہر کھڑے ہیں، مگر دل میں نوآبادیاتی دنیا کے خواب سجائے ہوئے ہیں۔ ان میں سیاسی، عسکری اور مذہبی ہر قسم کے لوگ ہیں۔ میر جعفر تو ہر قوم میں ہوتے ہیں نہ!!! برکینا فاسو میں بھی ہیں۔

مغربی میڈیا وہ میدان ہے جہاں الفاظ خنجر بن جاتے ہیں۔ تراورے کے خلاف جھوٹی خبریں، سازشوں کی تھیوریاں، اور تشہیری طوفان اٹھائے جا رہے ہیں، جن کا مقصد عوام کے دل میں اس کے خلاف شک پیدا کرنا ہے۔وہ دن دور نہیں جب اسے بھی صدام حسین اور معمر قذافی کی طرح آمریت پسند، انقلابی خطرہ، یا بین الاقوامی امن کا دشمن قرار دیا جائے گا، مغرب کے پاس سب سے خطرناک یہی تو ذہنی اور نظریاتی قتل کی تلوار ہے۔

تراورے نے حالیہ دنوں میں روسی صدر سے ملاقات کی ہے ،امریکہ، بظاہر نیوٹرل کھلاڑی ہے مگر جلد ہی تراورے کے آزادی پسند بیانیے کو روسی اثر یا چینی مکاری کا نام دے کر

اسے جیو اسٹریٹیجک خطرہ قرار دے گا اور امریکہ کی خفیہ ایجنسیاں اسے خاموش کرنے کے لیے "جمہوریت کی بحالی" جیسے نعروں کے پیچھے اپنی مداخلت کو جائز ٹھہرائیں گی، یعنی وہی کھیل ایک بار پھر سے کھیلا جائے گا جو افغانستان، عراق اور لیبیا میں کھیلا جا چکا ہے۔

لائحۂ عمل:

ابراہیم تراورے کو چاہیے کہ وہ ایک نیا انقلابی منشور ترتیب دے، جو صرف بندوق کے بل پر نہیں، بلکہ شعور، خودداری اور افریقی وقار پر مبنی ہو۔ وہ منشور جو جنگلوں میں گونجے، اور شہروں کے بوسیدہ ایوانوں کو ہلا کر رکھ دے۔

دیہاتوں اور قصبوں میں ایسی عوامی کونسلیں قائم کرے، جہاں فیصلے توپ کے سائے میں نہیں، بلکہ کسانوں، مزدوروں، نوجوانوں اور عورتوں کے ہاتھوں میں ہوں، وہ اس قدیم افریقی جمہوریت کو زندہ کرے جو بزرگوں کی دانش پر یقین رکھتی ہے۔

ایسے اسکول قائم کرے جہاں دفاع کے مضامین پڑھائے جائیں اور ایسی چھاونیاں قائم کرے جہاں شعور کا درس دیا جائے۔ بندوقیں صرف ہاتھوں میں نہ ہوں بلکہ عقلوں میں بھی ہوں تاکہ جنگ محض ردِّعمل نہ ہو، بلکہ ایک بیدار ارادہ بنے۔

تراورے کو چاہیے کہ بین الاقوامی اداروں سے تعلقات صرف برابری کی بنیاد پر رکھے۔ جو امداد عزت چھینے، اسے ٹھکرا دے اور جو قرض قوم کی گردن پر غلامی کی زنجیر باندھے، اسے جلا دے۔

اتحاد قائم کرے، مالی، نائیجر، گنی، صومالیہ اور کانگو کو ایک افریقی وحدت کی لڑی میں پروئے۔ اس کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر قدم کو ایک کہانی بنائے، تاکہ نسلیں یاد رکھیں کہ ایک دن افریقہ کے قلب میں ایک شخص اٹھا تھا، جس نے تخت کو خیمہ، اور فرمان کو قسم بنا دیا تھا، اس کے اندر نہ سیاست کی دغابازی تھی، نہ سفارت کی مصلحت۔

3/ جون 2025ء

مستقبل میں دنیا کی مسلم آبادی

(شمائلہ زماں کی انگریزی تحریر کا اردو ترجمہ)

مذہب ہر ایک کی زندگی میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دنیا بھر کے لوگ اپنے اپنے رسوم و روایات کے مطابق مختلف مذاہب کی پیروی کرتے ہیں۔ ہندوستان، اپنے بھرپور تنوع کے ساتھ، اس کی ایک بہترین مثال ہے، جہاں مختلف عقائد کے لوگ اپنی اپنی سماجی قومی، لسانی اور مذہبی انفرادیت کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ ہندوستان میں مذہب ناقابل یقین حد تک متنوع ہے، یہاں کے بڑے اور قابل ذکر مذاہب میں ہندو مت، اسلام، عیسائیت، بدھ مت، جین مت، زرتشتی اور سکھ مت شامل ہیں۔

کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ 2050 تک ہندوستان میں کس مذہب کے پیروکار سب سے زیادہ ہوں گے؟ پیو ریسرچ سینٹر کی طرف سے شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق، امید ہے کہ ہندوستان 2050 تک انڈونیشیا کو پیچھے چھوڑ کر سب سے زیادہ مسلم آبادی والا ملک بن جائے گا، مسلمانوں کی تعداد 311 ملین تک پہنچ جائے گی۔

دی فیوچر آف ورلڈ ریلیجنز: پاپولیشن گروتھ پروجیکشنز، 2010-2050 کے عنوان سے رپورٹ میں یہ بھی پیش گوئی کی گئی ہے کہ پاکستان 273 ملین کے ساتھ دوسری سب سے بڑی مسلم آبادی پر مشتمل ہو گا۔ انڈونیشیا، جس میں اس وقت سب سے زیادہ مسلم آبادی ہے، 2050 تک 257 ملین مسلمانوں کے ساتھ تیسرے نمبر پر آنے کا امکان ہے۔

مزید برآں، رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہندو دنیا کا تیسرا سب سے بڑا مذہبی گروہ بن جائے گا۔ اس کے علاوہ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 2050 تک ہندوستان میں 31 کروڑ

مسلمان ہوں گے جو کہ عالمی مسلم آبادی کا 11 فیصد بنتے ہیں۔ رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں ہندوؤں کی سب سے زیادہ آبادی برقرار رہے گی، جو بڑھ کر 1.03 بلین ہو جائے گی۔ فی الحال، انڈونیشیا کو سب سے زیادہ مسلم آبادی کا اعزاز حاصل ہے۔

تحقیق میں کہا گیا ہے کہ دنیا بھر میں مسلمانوں کی تعداد آئندہ دہائیوں میں تیزی سے بڑھنے کا امکان ہے، جو 2010 میں تقریباً 1.6 بلین سے بڑھ کر 2050 میں تقریباً 2.8 بلین ہو جائے گی۔

ہندوستان میں 2050 میں دنیا کی سب سے زیادہ مسلم آبادی (311 ملین) ہونے کا امکان ہے، جب کہ پاکستان میں دوسرے نمبر پر سب سے زیادہ مسلمان (273 ملین) ہونے کی توقع ہے۔ انڈونیشیا-2010 میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد والا ملک ہے لیکن 2050 تک 257 ملین مسلمانوں کے ساتھ اس کے تیسرے نمبر پر آنے کی توقع ہے۔ وسط صدی میں تقریباً 231 ملین مسلمانوں کے ساتھ نائیجیریا کے چوتھے نمبر پر آنے کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

پیو ریسرچ سینٹر کی ایک تحقیق کے مطابق مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کی بڑی وجہ اعلیٰ شرح پیدائش جیسے عوامل کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کی اوسط عمر 22 سال ہے جب کہ ہندوؤں کی عمر 26 سال اور عیسائیوں کی 28 سال ہے۔ ہندوستان میں مسلمان خواتین کے اوسطاً 3.2 بچے ہیں، جب کہ ہندو خواتین کے 2.5 بچے ہیں، اور عیسائی خواتین کے اوسطاً 2.3 بچے ہیں۔ یہ عوامل مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

بیان میں مزید کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی شرح پیدائش (3.2) مسلمانوں کی عالمی شرح (3.1) کے برابر ہے۔ جزوی طور پر چوں کہ انڈونیشیا جیسی بڑی آبادی والے ملک میں مسلمانوں کے بچے کم ہیں (2.0)، امید ہے کہ ہندوستان انڈونیشیا کو پیچھے چھوڑ کر 2050 تک دنیا کی سب سے بڑی مسلم آبادی والا ملک بن جائے گا۔

ہندوستان میں مسلم آبادی کی شرح، افزائش کی بلندی کی وجہ سے تیزی سے بڑھنے کی امید ہے۔ 2010 میں، مسلمان ہندوستان کی کل آبادی کا 14.4 فی صد تھے، اور 2050 تک، یہ تعداد بڑھ کر 18.4 فیصد ہونے کا امکان ہے۔ یہ بھی متوقع ہے کہ ہندوستان کی ہندو آبادی پاکستان، انڈونیشیا، نائیجیریا اور بنگلہ دیش سمیت سب سے بڑے مسلم اکثریتی ممالک کی مسلم آبادیوں کو پیچھے چھوڑ دے گی۔ دریں اثنا، ہندوستان کی عیسائی آبادی، جو اس وقت کل آبادی کا 2.5 فیصد ہے، 2050 تک کم ہوکر 2.3 فیصد رہنے کی توقع ہے۔

توقع ہے کہ 2050 تک عراق اور افغانستان 10 سب سے بڑی مسلم آبادی والے ممالک کی فہرست میں شامل ہو جائیں گے۔ دنیا کے دس میں سے چھ سے زیادہ مسلمان (62٪) 2050 میں سب سے زیادہ مسلمانوں کے ساتھ 10 ممالک میں رہنے کا تخمینہ لگایا گیا ہے، جو دنیا کے مسلمانوں کے حصہ سے تھوڑا کم ہے جو کہ دنیا کے سب سے اوپر 10 ممالک میں رہتے تھے۔ 2010 (66٪)۔

ایک اور رپورٹ میں پیو ریسرچ سینٹر نے اس بات پر روشنی ڈالی کہ مسلمان دنیا بھر میں سب سے تیزی سے ترقی کرنے والا مذہبی گروہ ہیں۔ توقع ہے کہ مسلمانوں کی آبادی عالمی آبادی سے زیادہ تیزی سے بڑھے گی۔ جب کہ اسلام اس وقت عیسائیت کے بعد دوسرا سب سے بڑا مذہب ہے، یہ سب سے تیزی سے پھیلنے والا بڑا مذہب بھی ہے۔ اگر موجودہ آبادی کے رجحانات جاری رہے تو اس صدی کے آخر تک مسلمانوں کی آبادی عیسائی آبادی سے بڑھ جانے کا امکان ہے۔ 2010 میں، دنیا بھر میں 1.6 بلین مسلمان تھے، جو دنیا کی آبادی کا تقریبًا 23 فیصد بنتے ہیں۔

اگلی چند دہائیوں میں عالمی آبادی میں 35 فیصد اضافے کا امکان ہے، جب کہ مسلمانوں کی آبادی میں 73 فیصد اضافہ متوقع ہے، جو 2050 تک 2.8 بلین تک پہنچ جائے گی۔ دنیا بھر میں مسلمانوں کی اکثریت ایشیا پیسیفک خطے میں رہتی ہے۔ انڈونیشیا، بھارت،

پاکستان، بنگلہ دیش، ایران اور ترکی میں بڑی کمیونٹی سمیت عالمی مسلم آبادی کا تقریباً 72 فیصد ہے۔ جب کہ انڈونیشیا میں اس وقت مسلمانوں کی سب سے زیادہ آبادی ہے، توقع ہے کہ بھارت 2050 تک اس سے آگے نکل جائے گا، ایک اندازے کے مطابق 310 ملین مسلمانوں کے ساتھ، سرفہرست مقام حاصل کرلے گا۔

دنیا بھر میں ہندوؤں کی تعداد 2010 میں 1 بلین سے قدرے بڑھ کر 2050 میں تقریباً 1.4 بلین تک پہنچنے کا امکان ہے۔ اس کے نتیجے میں، ہندو اگلی چار دہائیوں میں دنیا کی آبادی کے ایک حصے کے طور پر کافی مستحکم رہیں گے، 2010 اور 2050 دونوں میں تقریباً 15 فیصد۔

2050 تک، ریاست ہائے متحدہ امریکہ 4.8 ملین ہندوؤں کے ساتھ دنیا کی پانچویں بڑی ہندو آبادی ہوگی۔ اس کے علاوہ، کینیڈا، 2050 میں 10 لاکھ ہندوؤں کے ساتھ، 10 سب سے بڑی ہندو آبادی والے ممالک کی فہرست میں شامل ہونے کی پیش گوئی کی گئی ہے۔

آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

(ترجمہ: 12 فروری 2025۔ ماہ نامہ اشرفیہ مارچ 2025ء میں شائع)

عصر حاضر کا ہندوستان

اقتصادی اور سماجی شراکت داری کا فقدان

ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف تشدد ایک ایسا مسئلہ ہے جس کی جڑیں تاریخی کشیدگی اور سیاسی نظریات سے جڑی ہوئی ہیں۔ یہ تشدد مختلف شکلوں پر محیط ہے، بشمول فرقہ وارانہ فسادات، ٹارگٹڈ حملے وغیرہ۔ اس میں غیر حل شدہ علاقائی تنازعات کے ساتھ 1947 میں برٹش انڈیا کی تقسیم کے تاریخی عوامل بھی کارفرما ہیں، بی جے پی اور اس جیسے مذہبی منافرت کو ہوا دینے والے سیاسی گروہوں کے ذریعے پروپیگنڈہ کی جانے والی ہندو قوم پرستی نے ہندوستان میں مذہبی تقسیم کو بڑھاوا دیا اور اپنی نفرت انگیز پالیسیوں اور بیان بازیوں سے مسلمانوں کو مزید پس ماندہ کرکے ہندو اکثریتی ایجنڈے کو فروغ دیا ہے۔ مسلمانوں کے خلاف تشدد سے نمٹنے میں قانون نافذ کرنے والے اداروں اور انصاف کے نظام کی ناکامی سماجی عدم تحفظ کو مزید ہوا دیتی ہے، نتیجتاً ہندوستان میں آئے دن مسلمانوں کو معاشی اور سماجی مشکلات، جانی و مالی نقصانات اور املاک کی تباہی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اعداد و شمار کے مطابق ہندوستان کی 14 فیصد آبادی پر مشتمل مسلمان تقریباً 200 ملین افراد کے ساتھ سب سے بڑی مذہبی اقلیت ہیں۔ واشنگٹن میں قائم ایک تحقیقی ادارے کے مطابق اتنی بڑی تعداد ہونے کے باوجود 2023 کی دوسری ششماہی میں مسلم مخالف نفرت انگیز تقاریر میں 62 فیصد اضافہ ہوا، اور مسلمانوں کے خلاف اوسطاً روزانہ تقریباً ایک واقعہ رونما ہوا۔ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ 2009 اور 2019 کے درمیان مذہبی منافرت پر مبنی جرائم کا 90 فیصد ارتکاب 2014 میں بی جے پی کے اقتدار میں آنے کے بعد ہوا، 2014 سے

2018 کے دوران نفرت انگیز تقاریر میں تقریباً 500 فیصد اضافہ ہوا۔ بی جے پی کی زیر قیادت ریاستوں میں 80 فیصد نفرت انگیز تقاریر کے اجتماعات میں مسلمانوں کو بطور خاص نشانہ بنایا گیا، کبھی لباس، کبھی حجاب، کبھی اذان، کبھی نماز کبھی قربانی غرض متعدّد حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کے خلاف نفرت کو بڑھاوا دیا گیا، انجام کار فرقہ وارانہ تشدد میں سیکڑوں جانیں گئیں، علاوہ ازیں گورکشا کے نام پر بھی بی جے پی کی زیر اقتدار ریاستوں میں، سیکڑوں جانیں گئیں۔ 2023 میں نوح کی جھڑپوں میں 7 مسلمان شہید ہوئے اور 70 سے زائد زخمی ہوئے۔ حالیہ واقعات میں سنبھل کا واقعہ قابلِ ذکر ہے جس میں 7 ہلاکتیں ہوئیں اور 70 سے زیادہ لوگ زخمی ہوئے۔

اتر پردیش کے سنبھل ضلع میں پتھراؤ اور گاڑیوں کو نذر آتش کرنے کا واقعہ اتوار (24 نومبر 2024) کی صبح پیش آیا۔ اس دوران چار افراد کی موت ہو گئی۔ یہ سب کچھ اس وقت ہوا جب ایک ٹیم دوسری بار شاہی جامع مسجد کے سروے کے لیے عدالتی حکم کے بعد چندوسی پہنچی تھی۔ منگل (19 نومبر 2024) کو ایک مقامی عدالت نے سروے کا حکم دیا تھا۔ یہ حکم ایک درخواست کی سماعت کے فوراً بعد دیا گیا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ 1526 میں مسجد بنانے کے لیے ایک مندر کو توڑ دیا گیا تھا۔ سنبھل کے چندوسی میں سول جج (سینئر ڈویژن) آدتیہ سنگھ کی عدالت نے یہ حکم جاری کیا۔ درخواست منگل کی دوپہر کو دائر کی گئی اور چند گھنٹوں کے اندر جج نے ایک ایڈوکیٹ کمشنر مقرر کیا اور اسے مسجد میں ابتدائی سروے کرنے کی ہدایت کی۔ یہ سروے صرف منگل کو کیا گیا۔ عدالت نے یہ بھی ہدایت کی کہ سروے کی رپورٹ 29 نومبر تک اس کے سامنے پیش کی جائے۔

سنبھل کی یہ شاہی جامع مسجد ایک محفوظ یادگار ہے۔ جسے 22 دسمبر 1920 کو قدیم یادگاروں کے تحفظ کے ایکٹ 1904 کے سیکشن 3 ذیلی دفعہ (3) کے تحت درج کیا گیا تھا۔ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا کی ویب سائٹ پر اسے ”قومی اہمیت“ کی یادگار قرار دیا گیا

ہے اور اسے آگرہ سرکل کے مرادآباد ڈویژن کی ویب سائٹ پر مرکزی طور پر محفوظ یادگاروں کی فہرست میں شامل کیا گیا ہے۔

کل آٹھ عرضی گزاروں نے سنبھل کورٹ میں مقدمہ دائر کیا ان میں سے ایک ہری شنکر جین (گیانواپی مسجد - کاشی وشواناتھ تنازعہ کے وکیل)، ایڈوکیٹ پارتھا یادو، سنبھل میں کلکی دیوی مندر کے مہنت رشی راج گری وغیرہ شامل ہیں، دیگر درخواست گزاروں میں وید پال سنگھ، راکیش کمار، جیت پال یادو ہیں۔ عرضی میں دعویٰ کیا گیا کہ سنبھل شہر کے وسط میں، بھگوان کلکی کے لیے وقف ایک صدیوں پرانا شری ہری مندر ہے، جسے جامع مسجد کمیٹی زبردستی اور غیر قانونی طور پر استعمال کر رہی ہے۔ درخواست میں کہا گیا کہ سنبھل ایک تاریخی شہر ہے اور اس کا ذکر ہندو کتابوں میں ملتا ہے جس کے مطابق یہ ایک مقدس مقام ہے، جہاں بھگوان وشنو کے اوتار کالکی مستقبل میں پہنچیں گے۔ درخواست میں مزید کہا گیا کہ بابر نے 1526 عیسوی میں ہندوستان پر حملہ کیا اور اسلام کی طاقت کو ظاہر کرنے کے لیے بہت سے ہندو مندروں کو تباہ کر دیا تاکہ ہندو یہ محسوس کریں کہ وہ اسلامی حکمرانوں کے ماتحت ہیں چنانچہ مسلمانوں نے مندر کی عمارت پر قبضہ کر لیا اور اسے مسجد کے طور پر استعمال کیا۔

جامع مسجد سروے کا جواب دیتے ہوئے، سنبھل سے سماج وادی پارٹی کے رکن پارلیمنٹ ضیاء الرحمن برق نے کہا کہ باہر کے لوگوں نے عدالت میں اس طرح کی درخواست دائر کر کے ضلع کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ سپریم کورٹ پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ 1991 کے عبادت ایکٹ کے مطابق 1947 میں موجود تمام مذہبی مقامات اپنی صورت پر برقرار رہیں گے۔ سنبھل میں واقع جامع مسجد ایک تاریخی مقام ہے جہاں مسلمان صدیوں سے نمازیں ادا کر رہے ہیں۔ اگر ہمیں مقامی عدالت سے تسلی بخش حکم نہیں ملتا ہے تو ہمیں ہائی کورٹ میں اپیل کرنے کا حق حاصل ہے۔

جیسا کہ ہم جانتے ہیں سیاسی طور پر اسلام ہندوستان میں 712ء میں داخل ہوا اور

سولہویں صدی میں مغلیہ سلطنت کے دوران مضبوطی سے قائم ہوا۔ ہندوستان کی مسلم آبادی کی اکثریت مقامی لوگوں سے تعلق رکھتی ہے، خاص طور پر نچلی ذات کے لوگ جنھوں نے ذات پات اور چھوا چھوت کے نظام سے بچنے کے لیے اسلام قبول کیا۔ فی الحال، ہندوستان اپنے مذہبی، نسلی، اور لسانی تنوع کی وجہ سے دنیا بھر نمایاں حیثیت کا حامل ہے اور ایک قابل ذکر مسلم آبادی (14 فیصد) کی نمائندگی کرتا ہے۔ ہندوستان کی مسلم کمیونٹیز بھی کثیر جہتی ہیں، جن میں ذات، نسل، زبان کے علاوہ سیاسی اور اقتصادی اثر و رسوخ کی سطحوں میں بھی فرق موجود ہے۔ کشمیر کے علاوہ، مسلمان پورے ہندوستان میں اقلیت میں ہیں اور دوسری ریاستوں میں وہ مخصوص علاقوں میں مرکوز ہیں، یہ ارتکاز سب سے زیادہ اتر پردیش، بہار، مغربی بنگال اور کیرالہ میں نظر آتا ہے۔ شمالی ہندوستان میں، اردو بنیادی طور پر مسلم کمیونٹیز کی زبان سمجھی جاتی ہے۔

اب آئیے مذہبی تشدد کی طرف چلتے ہیں اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذہبی تشدد آخر کیا چیز ہے۔

مذہب اور تشدد دونوں ہی ایسی اصطلاحات ہیں جو بہت زیادہ متنازعہ ہیں۔ تشدد کی اصطلاح میں متعدّد کارروائیوں کا احاطہ کیا جاسکتا ہے، بشمول جسمانی طاقت جس کا مقصد کسی کو تکلیف دینا یا مارنا، ذاتی آزادیوں کا نفاذ، اور جارحانہ زبانی اظہار شامل ہیں۔ اسی طرح اصطلاحِ مذہب سماجی تجرید کے طور پر عناصر کی ایک رینج کو گھیرے ہوئے ہے جس میں عام طور پر دیگر چیزوں کے ساتھ بیانیہ، عقائد، مقدس مقامات اور اعمال شامل ہیں۔ مذہبی عقائد اور رویے کے درمیان تعلق کی وضاحت کرنا مشکل ہے، کیوں کہ تحقیق بتاتی ہے کہ مذہبی نظریات اتنے ہی بکھرے ہوئے اور سیاق و سباق پر منحصر ہیں۔ مثال کے طور پر، ہندوستان میں ہندو اعمال و عقائد خاص طور پر امریکہ کے مقابلے میں مختلف ہیں۔ واضح رہے کہ تشدد اکثر نظریاتی عوامل کی وجہ سے ہوتا ہے، اور مذہب مختلف سماجی اور سیاسی اثرات میں سے ایک

ہے، جس کے درمیان تعلق ایک مشکل سماجی اور فلسفیانہ کام ہے۔

اب ہم ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف تشدد کو جسمانی طاقت کی کارروائیوں کے لحاظ سے بیان کریں گے جو نقصان پہنچانے کا سبب بنتے ہیں یا جن کا مقصد جارحیت سے ممتاز ہوتا ہے، ایک عام قسم کا معاندانہ رویہ جو جسمانی، زبانی، یا غیر فعال نوعیت کا ہو سکتا ہے۔

ہندوستان میں مذہبی تشدد میں رویے اور واقعات کا لامتناہی عمل دخل ہے، لیکن خاص طور پر فرقہ وارانہ فسادات، مسماری، ہجومی تشدد اور لنچنگ کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔ منظم فرقہ وارانہ تشدد کے علاوہ مذہبی اقلیتوں پر ٹارگٹڈ اور منصوبہ بند حملے ہوئے ہیں۔ ان حملوں میں 1992 کا بابری مسجد کی شہادت کا واقعہ بھی شامل ہے۔ یہ ہندوستان کی تاریخ کا وہ سیاہ ترین دور تھا جب ایک مسجد کو ہندو انتہا پسندوں نے تباہ کر دیا تھا، اس کے بعد ہندوستان بھر میں فسادات کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے کثیر جانی نقصان کا سامنا کرنا پڑا اور فرقہ وارانہ پولرائزیشن کا عمل شروع ہوا۔

ہندوستان میں مذہبی شناخت کی بنیاد پر افراد پر بے ساختہ حملے بھی عام ہیں۔ ہجومی تشدد اور لنچنگ کے واقعات خاص طور پر گائے کے ذبیحہ یا بین المذاہب تعلقات کی افواہوں سے ہوا کرتے ہیں۔ ہیومن رائٹس واچ کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا کہ کس طرح حکمران بی جے پی کے ارکان گائے کے گوشت کے استعمال اور مویشیوں کی تجارت میں ملوث افراد کے خلاف تشدد کو بھڑکانے کے لیے فرقہ وارانہ بیان بازی کا استعمال کرتے ہیں۔ گائے ہندو روایت میں مقدس ہے، اس لیے گائے کے تحفظ کے مطالبات ابتدا میں ہندو ووٹ حاصل کرنے کے لیے ایک حربے کے طور پر کام کرتے تھے، لیکن اس کے بعد یہ ہجوم کے لیے پر تشدد حملہ کرنے اور اقلیتی گروہوں کے ارکان کو قتل کرنے کے لائسنس میں تبدیل ہو گئے۔ ان حملوں نے مذہبی اقلیتی برادریوں میں خوف اور عدم تحفظ کا ایک وسیع احساس پیدا کیا۔ گائے کا گوشت کھانے کے الزام میں 2015 میں ہندو دیہاتیوں کے ذریعہ محمد اخلاق کا قتل اور 2017 میں پہلو خان کا

مویشیوں کی نقل وحمل کے دوران قتل اس رجحان کی واضح مثالیں ہیں۔

بین المذاہب تعلقات بھی ہجومی تشدد کی وجہ بنے ہیں، خاص طور پر ان لوگوں کے لیے جن پر "لو جہاد" کا الزام ہے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی موتیں اور گرفتاریاں ہوئیں۔ اکثر ہندو انتہا پسند "لو جہاد" کے بارے میں بے بنیاد پرچار کرتے ہیں، مسلمانوں پر ہندو خواتین کو منظم طریقے سے اسلام قبول کرنے، فرقہ وارانہ کشیدگی اور تشدد میں حصہ ڈالنے کا جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔واضح رہے کہ تبدیلی مذہب مخالف قانون کے تحت درج کیے گئے 17 مقدمات میں سے، 14 کا تعلق 2020 میں تبدیلی مذہب مخالف قوانین کے قیام کے بعد پہلے سال کے اندر ہندو خواتین اور مسلمان مردوں کے درمیان تعلقات سے تھا۔

بین الاقوامی مذہبی آزادی پر امریکی کمیشن (یو ایس سی آئی آر) نے رپورٹ کیا کہ ہندوستان میں مذہبی تشدد سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والی اقلیتوں میں عیسائی، مسلمان اور سکھ شامل ہیں۔ یو ایس سی آئی آر نے اپنی 2023 کی رپورٹ میں ہندوستان کو مذہبی اقلیتوں پر ظلم وستم کرنے والے ملک کے طور پر خاص تشویش (CPCs) کے طور پر نامزد کرنے کی بھی سفارش کی تھی۔ 2018 کی ایک رپورٹ میں، USCIRF نے ہندو انتہا پسند گروہوں پر الزام لگایا کہ وہ غیر ہندوؤں کے خلاف تشدد، دھمکیاں اور ہراساں کر کے ہندوستان کو بھگوا بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف تشدد کی گہری تاریخی جڑیں ہیں، اور اس کی ابتدا 12 ویں صدی کے اواخر سے کی جا سکتی ہے، اس دوران ہندوؤں نے ہندوستان کی اسلامی فتح اور مسلم مغل آقاؤں کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا۔ بعد میں ان اختلافات کو انگریزوں نے بڑھا وا دیا، کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی برطانوی حکمت عملی نے اپنے سامراجی کنٹرول کو برقرار رکھنے کے لیے مذہبی تقسیم کو بڑھا وا دیا۔

جس وقت برطانیہ نے برصغیر پاک و ہند سے انخلا کا عمل شروع کیا، اس دوران انڈین

نیشنل کانگریس نے آزادی کی وکالت کی اور آل انڈیا مسلم لیگ نے مسلمانوں کے لیے ایک الگ ملک کا مطالبہ کیا۔ ایک جج نے ہندو اکثریت والے ہندوستان اور مسلم اکثریتی پاکستان کی سرحدوں کا فیصلہ کیا۔ جلد بازی میں ہونے والی تقسیم نے بڑے پیمانے پر تشدد اور نقل مکانی کو جنم دیا۔ مورخین کا اندازہ ہے کہ بٹوارے اور نقل مکانی کے چلتے اس میں 2 سے 20 لاکھ تک لوگ مارے گئے ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر ہونے والے مظالم کے نتیجے میں فرقہ وارانہ تشدد ایک المناک اور ہنگامہ خیز علیحدگی کی صورت میں نکلا جس نے آپسی دشمنی کو مزید ہوا دی، تاہم، یہ واضح نہیں ہے کہ تقسیم کے دوران شدید فرقہ وارانہ تشدد کی وجہ کیا تھی۔

1947 کی تقسیم اور اس کے بعد ہونے والے تنازعات کے بعد سے، پاکستان اور بھارت کے درمیان گہرے عدم اعتماد کی جڑیں آج تک پیوست ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ خود تقسیم کا مقصد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جغرافیائی تقسیم پیدا کرنا تھا۔

مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تنازعات کی ایک طویل تاریخ ہے جسے مختصر میں سمیٹا نہیں جا سکتا، ہندوستان کی اسلامی فتح، تقسیم پر تشدد، اور اس کے نتیجے میں علاقائی تنازعات، یہ سبھی عوامل ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جاری تشدد میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، سب سے اہم کردار اس میں ہندو قوم پرستی والے نظریے کا ہے۔

ہندو قوم پرستی کو سب سے پہلے 1920 کی دہائی میں ساورکر نے اپنی کتاب میں بیان کیا تھا؟ یہ نظریہ ہندو قوم پرستوں کے درمیان امتیاز اور برتری کا احساس پیدا کرکے مذہبی تشدد کا سبب بنتا ہے۔

یہ بات تو بالکل واضح ہے کہ ایک اسلامی جمہوریہ کے طور پر پاکستان کی تشکیل سے ہندوستانی مسلمانوں کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ جب کہ تقسیم نے ہندوستان میں مسلمانوں کا فیصد (اس وقت) 25 سے کم کر کے 10 فیصد کر دیا، اس کے نتیجے میں ہندو قوم پرستوں نے مسلمانوں کو ملک دشمن اور غدار کے طور پر پیش کیا۔ ان کا خیال ہے کہ

ہندوستانی مسلمان، خاص طور پر تقسیم کے بعد سے، پاکستان کے ساتھ منسلک ہیں اور ممکنہ طور پر بنیاد پرست ہیں۔

بھارت میں مسلمانوں کے خلاف بڑھتے ہوئے تشدد کی ایک اور بڑی وجہ ہندو قوم پرست جماعتوں کا پھیلاؤ ہے۔ وزیر اعظم نریندر مودی اور بھارتیہ جنتا پارٹی کے دور حکومت میں مسلم مخالف جذبات میں کافی اضافہ ہوا، پی جے پی نے 2014 میں اقتدار میں آنے کے بعد ہندو قوم پرست ایجنڈے کو اپنایا، اس نے بھارت کو ایک ہندو ریاست بنانے کی پالیسیوں کی حمایت بھی کی۔ 2019 میں دوبارہ حکومت میں آنے کے بعد بی جے پی نے متعدّد متنازعہ پالیسیاں نافذ کیں جن میں مسلمانوں کے حقوق کو نظر انداز اور پامال کیا مثلاً شہریت ترمیمی ایکٹ، جو قریبی ممالک کے غیر مسلم تارکین وطن کے لیے فوری شہریت کی اجازت دیتا ہے، جب کہ مسلمانوں کے لیے اس میں ایسی کوئی شق شامل نہیں ہے۔

بھارت میں مسلمانوں کے خلاف تشدد سے نمٹنے میں قانون نافذ کرنے والے اداروں اور انصاف کے نظام کی ناکامی بھی جگ ظاہر ہے۔ اکثر قانون نافذ کرنے والے ادارے ان مسلم کمیونٹیز کو مناسب تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہتے ہیں، بھارت میں قائم ایک غیر سرکاری تنظیم کامن کاز کی طرف سے جاری کردہ 2019 کی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ سروے کیے گئے 50 فیصد پولیس افسران نے مسلمانوں کے خلاف تعصب کا مظاہرہ کیا، جس کی وجہ سے اس کمیونٹی کو نشانہ بنانے والے جرائم میں مداخلت کے امکانات کم ہو گئے۔ بہت سے معاملات میں، مسلمانوں کے خلاف تشدد کے مرتکب افراد کو سیاسی اثر و رسوخ، بدعنوانی، یا نظام انصاف میں تعصب کی وجہ سے بھی سزا نہیں ملتی۔ حالیہ واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ عدالتیں اور حکومتی ادارے مسلمانوں کے خلاف حملوں میں ہندوؤں کو ملوث کرنے والے مقدمات کو کالعدم قرار دے رہے ہیں۔ ان مقدمات میں بی جے پی کی ایک سینئر رکن مایا کوڈنانی کو بری کرنا اور 2002 کے گجرات فسادات کے کیس میں ان کے شریک

ملزمان کو بری کرنا بھی شامل ہے، جہاں 97 لوگ مارے گئے تھے۔

پچھلی دو دہائیوں میں فرقہ وارانہ تشدد کی ان مثالوں میں 2002 کے گجرات فسادات بھی شامل ہیں، جس کے دوران گجرات میں ہندو ہجوم نے عصمت دری، لوٹ مار اور تشدد کی ایک ایسی کشمکش پیدا کی جو دو ماہ سے زائد عرصے تک جاری رہی۔ خواتین کی عصمتوں کو پامال کیا گیا، بچوں کو آگ لگا دی گئی اور باپوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا گیا۔ تقریبًا ایک ہزار لوگ مارے گئے جن میں زیادہ تر مسلمان تھے۔ مسلمانوں کے تقریبًا 20000 گھر اور کاروبار اور 360 عبادت گاہیں تباہ ہوئیں اور تقریبًا 150000 لوگ بے گھر ہوئے۔ فرقہ وارانہ تشدد کی ایک اور اہم مثال 2013 میں مظفر نگر فسادات تھے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جھڑپوں کے ایک سلسلے پر مشتمل تھا جس کے نتیجے میں 60 سے زائد افراد ہلاک ہوئے۔

مئی 2015 اور دسمبر 2018 کے درمیان ہندوستان کی 12 ریاستوں میں کم از کم 44 افراد، جن میں سے 36 مسلمان تھے، مارے گئے۔ اسی عرصہ میں، 20 ریاستوں میں 100 سے زیادہ مختلف واقعات میں تقریبًا 280 افراد زخمی ہوئے۔ 2020 کی نئی دہلی جھڑپوں میں، شہریت ترمیمی قانون کے خلاف مظاہروں کے دوران مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تشدد پھوٹ پڑا، جس کے نتیجے میں تقریبًا 50 افراد ہلاک ہوئے، جن میں سے 38 مسلمان تھے۔ تشدد کے تازہ ترین واقعات کے لحاظ سے، اگست 2023 میں، ہریانہ کے نوح علاقے میں تشدد میں سات افراد ہلاک اور 70 سے زیادہ زخمی ہوئے۔ مزید بر آں، 8 فروری 2024 کو ہلدوانی تشدد کے واقعے میں کم از کم چھ افراد ہلاک ہوئے جن میں پانچ مسلمان بھی شامل تھے۔ ہجومی تشدد اور پولیس فائرنگ میں شامل جھڑپوں میں دو درجن سے زیادہ شہری اور 100 سے زیادہ پولیس اہلکار زخمی ہوئے۔

اس وقت ہندوستان میں مسلم کمیونٹیز میں عدم تحفظ، خوف، کمزوری اور بد اعتمادی وسیع ترین احساس گھر کیے ہوئے ہے۔ عدم تحفظ کی یہ فضا مسلم عوامی زندگی کے بہت سے

پہلوؤں کو محیط ہے۔ایک سروے سے پتا چلا ہے کہ ہندوستان کے 79 فیصد مسلمان نہ صرف مزید تشدد بلکہ مسلسل حکومتی ظلم وستم سے بھی ڈرتے ہیں۔

دیکھا جائے تو آج ہندوستان میں اقتصادی شراکت کی پابندی کے علاوہ، سماجی شرکت کا فقدان بھی ہے۔ایسے میں ہمیں اپنے وجود کی بقا کے لیے سیاسی پلیٹ فارم پر من حیث القوم اپنی موجودگی درج کرانے کی سخت ضرورت ہے، ورنہ وہ دن دور نہیں جب ہندوستان بھی مسلمانوں کے لیے اگلا اسپین ثابت ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ قوم مسلم کو انتشار کی مسموم ہواؤں سے محفوظ رکھے، اور وہ قومی وملی شعور عطا فرمائے جو ہمارے اسلاف کو عطا فرمایا تھا۔آمین یارب العالمین۔

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ 2025ء)

(تحریر:28فروری 2025ء)

وقف قانون ـــــ جمہوریت کی روح پر حملہ

"اگر کوئی حکومت مسلمانوں کو اس حد تک مجبور کرے کہ وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں، تو ایسی حکومت پاگل ہوگی۔" (ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر)

وقف اسلامی معاشرے میں ایک مقدس اور اہم ادارہ ہے، جو بنیادی طور پر مساجد، مدارس، یتیم خانے، لائبریریاں، اور دیگر فلاحی اداروں کے قیام و نگہداشت کے لیے وقف شدہ جائیدادوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہندوستان میں صدیوں سے مسلم حکمرانوں، علما، اور عوام نے دینی، تعلیمی اور فلاحی مقاصد کے لیے زمینیں اور جائیدادیں وقف کی ہیں، جو آج بھی مسلم برادری کے لیے روحانی و معاشرتی اہمیت رکھتی ہیں۔ حکومت کی متعصب نگاہیں کافی عرصہ سے اوقاف کی جائیدادؤں پر لگی ہوئی تھیں، اور آخر کار وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔

موجودہ حکومت کی جانب سے منظور شدہ وقف ترمیمی بل 2024 ایک ایسا متنازعہ قانون ہے، جس کا مقصد مسلمانوں کے وقف املاک کے انتظامات پر اثر انداز ہونا ہے۔ یہ بل ایسے وقت منظور کیا گیا ہے جب ہندوستان اپنے آئین کی 75 ویں سالگرہ منا رہا ہے، جس میں جمہوری اقدار اور تمام شہریوں کے حقوق کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس بل کی منظوری کے بعد، یہ مسلمانوں کے خلاف حکومت کی جانب سے ایک اور جابرانہ اقدام کے طور پر سامنے آیا ہے، جو ایک طویل عرصے سے ان کے معاشی اور سماجی حقوق پر حملے کا حصہ بن چکا ہے۔

وقف ترمیمی بل کی شق 43 (1) C میں یہ کہا گیا ہے کہ کلکٹر (نامزد افسر) کے عہدے سے اوپر کا افسر یہ فیصلہ کرے گا کہ کسی جائیداد کو وقف جائیداد قرار دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ اس شق کی بنا پر، مسلمانوں کے وقف املاک پر حکومتی کنٹرول مزید مستحکم ہو جائے گا،

اور اگر کسی وقت حکومت یا حکومتی افسران مسلمانوں کے وقف املاک کو غیر وقف قرار دے دیں، توان املاک پر قبضہ کرنے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔ اس شق کے تحت، مسلمانوں کو اپنے وقف املاک کے قانونی حقوق کے تحفظ کے لیے ایک طویل قانونی جنگ لڑنی ہوگی، جس کا نتیجہ اکثریتی فرقہ کی سیاست کے تابع ہو سکتا ہے۔

وقف کے حوالے سے حکومت کے متنازعہ اقدامات کا آغاز کئی سال پہلے بی جے پی کی حکومت والی ریاستوں میں زمینوں اور جائیدادوں کو قبضے میں لینے کی صورت میں ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں متعدّد مساجد اور دینی اداروں کو بلڈوز کیا گیا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ہمارے حقوق کو مسلسل پامال کیا جا رہا ہے۔ وقف ترمیمی بل، جس میں نامزد افسر کی جانب سے جائیدادوں کے وقف ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، دراصل یہ ہمارے لیے ایک سنگین چیلنج ہے۔

حکومت کا یہ دعویٰ کہ وقف ترمیمی بل مسلمانوں کے فائدے کے لیے ہے، محض ایک دھوکا ہے، تعجب کی کی بات ہے کہ یہ دعویٰ وہ حکومت کر رہی ہے جس میں ایک بھی مسلم رکن پارلیمنٹ نہیں ہے۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ یہ بل مسلمانوں کو اپنے مذہبی اداروں اور املاک پر اختیار سے محروم کرنے کی ایک کوشش ہے۔ جب حکومت اپنے سرکاری افسران کے ذریعے یہ فیصلہ کرنے کی طاقت رکھتی ہے کہ کون سی جائیداد وقف اور کون سی نہیں تو اصل میں یہ مسلمانوں کی آزادی اور خود مختاری پر براہ راست حملہ ہے۔

یہ بل نہ صرف مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے، بلکہ ہندوستان کے آئین کی روح کی بھی خلاف ورزی کرتا ہے، جو تمام شہریوں کو مساوی حقوق فراہم کرتا ہے۔ مسلمان، جنھیں وقف شدہ جائیدادوں کے کنٹرول کا حق حاصل ہے، اس بل کے ذریعے اپنے حقوق کو بچانے کی خاطر طویل قانونی جنگ میں الجھ سکتے ہیں۔

اس بل کے تحت یہ بھی کہا گیا ہے کہ وقف کے لیے اراضی وقف کرنے والے عطیہ

دہندگان کے قبول اسلام کی مدت کم از کم پانچ سال لازمی ہے، یہ شق بھی اسلامی قانونِ وقف کی صریح خلاف ورزی ہے۔ اسلام میں عطیہ دینے کے لیے کسی خاص مدت یا وقت کا تعین نہیں کیا گیا، اس طرح کی پابندی مسلمانوں کی مذہبی آزادی کی خلاف ورزی ہے۔

یہ ایک خطرناک صورت حال ہے جس میں حکومت کی جانب سے مسلسل ہمارے کے حقوق پر حملے کیے جا رہے ہیں، اور اس سے پورے ہندوستان کے آئین اور جمہوریت کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مودی حکومت کے یہ اقدامات مسلمانوں کے خلاف نہیں بلکہ پورے ملک کے جمہوری ڈھانچے کے خلاف ہیں، جہاں تمام مذاہب کو برابر کا حق حاصل ہونا چاہیے۔

یقیناً اس بل کے خلاف قانونی راستے موجود ہیں، مگر یہ ایک طویل اور پیچیدہ عمل ہو گا، جس میں مسلمانوں کو انصاف حاصل کرنے میں بہت وقت اور محنت درکار ہوگی۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس بل کے ذریعے حکومت نے مسلمانوں کے حقوق کو کمزور کرنے کی ایک اور کوشش کی ہے۔

ہندوستان کی جمہوری تاریخ میں وقف ترمیمی بل 2024 ایک ایسا موڑ ہے جہاں آئینی مساوات اور اقلیتوں کے مذہبی و سماجی حقوق کو کھلے عام پسِ پشت ڈالا گیا ہے اور اس قانون کے ذریعہ ہمارے عزت و قار، مذہبی آزادی اور ہماری املاک کے تحفظ پر کاری ضرب لگائی گئی ہے۔ اس بل میں جو شق سب سے زیادہ واضح امتیازی سلوک کی نشان دہی کرتی ہے، وہ ہے **"مرکزی وقف کونسل میں غیر مسلموں کی شمولیت"**۔ ایک طرف ہندو مندروں کی انتظامیہ کے بورڈ صرف ہندوؤں پر مشتمل ہوتے ہیں، جہاں ان کے مذہبی جذبات اور خود اختیاری کا مکمل احترام کیا جاتا ہے، وہیں دوسری جانب مسلمانوں کے وقف ادارے، جو خالصتاً اسلامی دینی، فلاحی اور تعلیمی مقاصد کے لیے قائم کیے جاتے ہیں، ان میں غیر مسلموں کو زبردستی شامل کرنا، یا ایسے ادارے جو خالص مسلمانوں کے حقوق کے لیے قائم کیے گئے ہیں ان میں غیر

مسلم افسران کی تقرری مسلمانوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت کے مترادف ہے۔ یہ وہی امتیازی سوچ ہے جو نوآبادیاتی دور میں انگریزوں نے ہندوستانیوں پر مسلط کی تھی، جب ایک طبقہ قانون کے اوپر تھا اور دوسرا ہمیشہ جواب دہ۔ آج، مودی حکومت کے ان اقدامات نے اسی نوآبادیاتی ذہنیت کو نئی شکل دے کر اقلیتوں کے خلاف ریاستی پالیسی کا حصہ بنادیا ہے۔

وقف ترمیمی بل 2024 کی سب سے سنگین خامیوں میں سے ایک **"وقف بہ صارف"** (یعنی وہ جائیدادیں جو طویل عرصے سے عوامی مذہبی یا فلاحی مقصد کے لیے استعمال ہوتی رہی ہوں) کے اصول کو نظر انداز کرنا ہے۔ یہ اصول صدیوں پر محیط اسلامی فقہ اور سپریم کورٹ کے فیصلوں کا تسلیم شدہ حصہ رہا ہے، جیسا کہ **"بابری مسجد-رام جنم بھومی"** مقدمے میں عدالت نے خود تسلیم کیا کہ "واضح دستاویزی اعلان کے بغیر بھی وقف کی حیثیت ممکن ہے"۔ اس کے باوجود، حکومت نے اس اصول کو قانون سے نکال کر فقہی روایت اور سپریم کورٹ کے بیانیہ، دونوں کی صریح خلاف ورزی کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وقف کو محض ایک جائیداد کا مسئلہ بنا کر دیکھا جا رہا ہے، نہ کہ ایک روحانی، سماجی اور تاریخی ادارہ، جس کی جڑیں ملت اسلامیہ کے اجتماعی شعور میں پیوست ہیں۔

1995ء کے وقف ایکٹ میں وقف کی ایک جامع تعریف دی گئی تھی، جو کسی بھی شخص کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم اجازت دیتی تھی کہ وہ کسی جائیداد کو اسلامی اصولوں کے تحت وقف کر سکتا ہے۔ یہ تعریف ہندوستانی معاشرے کی کثیر الثقافتی نوعیت کے عین مطابق تھی۔ لیکن وقف ترمیمی بل 2024 میں اس تعریف کو محدود کر کے صرف اُن افراد تک محدود کر دیا گیا ہے جو گزشتہ پانچ سال سے "عملی طور پر مسلمان" ہوں۔ یہ بات نہ صرف فقہی اصولوں کے خلاف ہے بلکہ **"آئین ہند"** کی کھلی توہین بھی ہے۔ قانون سازی میں ایسی پابندی، گویا یہ طے کرنا کہ کون کب سے مسلمان ہے، ریاست کے دائرہ اختیار سے بہت آگے کی چیز ہے۔ دستور ساز اسمبلی میں ڈاکٹر بی آر امبیڈکر کا 2 دسمبر 1948 کا وہ تاریخی خطاب آج مزید

معنویت اختیار کر چکا ہے، جس میں انھوں نے کہا تھا:

"اگر کوئی حکومت مسلمانوں کو اس حد تک مجبور کرے کہ وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں، تو ایسی حکومت پاگل ہوگی۔"

افسوس کہ موجودہ حکومت انہی سرحدوں کو عبور کرنے کی راہ پر گامزن دکھائی دیتی ہے، جہاں اقلیتوں کے جائز تحفظات کو "مخالفت برائے مخالفت" قرار دیا جاتا ہے، اور آئین کے تحت حاصل بنیادی حقوق کو ایک "رعایت" سمجھا جاتا ہے، نہ کہ غیر مشروط حق۔

یہ صرف مسلمانوں کا مسئلہ نہیں؛ یہ قانون ہندوستان کے **آئینی ڈھانچے، سیکولر اقدار اور قانون کی بالادستی** پر سوالیہ نشان ہے۔ اگر آج ایک اقلیت کی مذہبی آزادی اور املاک پر یوں قانون سازی کی جاسکتی ہے، تو کل کسی اور طبقے کی باری بھی آسکتی ہے۔

لگے کی آگ تو آئیں گے گھر کئی زد میں
یہاں پہ صرف ہمارا مکان تھوڑی ہے

یہ بل محض ایک قانونی دستاویز نہیں، بلکہ ایک فکری جنگ کا حصہ ہے، وہ جنگ جس میں یہ طے ہونا باقی ہے کہ ہندوستان واقعی ایک جمہوری، سیکولر اور مساوی حقوق پر مبنی ریاست ہے، یا اکثریتی غلبے پر مبنی ایک "نئی ریاست" کی تجربہ گاہ۔ لہٰذا، ضروری ہے کہ ہم اس قانون کو محض ایک اقلیتی مسئلہ نہ سمجھیں بلکہ اسے ہندوستانی جمہوریت کی روح پر حملہ تصور کریں۔ اگر ہم اب بھی خاموش رہے تو یہ جرم ہوگا..... بہت بڑا جرم۔

قابلِ ذکر ہے کہ متعدّد مسلم تنظیموں نے اس قانون کے خلاف سپریم کورٹ میں عرضیاں داخل کی ہیں، ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قانون کے خلاف عدالتی چارہ جوئی موثر ہوگی؟ یہ ایک اہم اور نازک سوال ہے، اور اس کا جواب کئی قانونی، آئینی، اور عملی پہلوؤں پر منحصر ہے۔

- اگر بل میں شامل ترامیم آئینِ ہند کے بنیادی حقوق، خاص طور پر **مذہبی آزادی (آرٹیکل 25 اور 26)** یا **اقلیتوں کے حقوق (آرٹیکل 29 و 30)** سے متصادم پائی جائیں، تو سپریم کورٹ یا ہائی کورٹ میں ان کے خلاف رِٹ دائر کی جاسکتی ہے۔
- ہندوستان کا آئینی ڈھانچہ **سیکولر** ہے۔ اگر کوئی قانون کسی خاص مذہب کو نشانہ بناتا ہو یا ریاست کو مذہبی امور میں ضرورت سے زیادہ مداخلت کی اجازت دیتا ہو، تو عدالتیں اس پر نظرِ ثانی کر سکتی ہیں۔
- قانونی بے ضابطگیاں اور تفریق جیسے غیر مسلموں کو وقف بورڈ میں شامل کرنا، وغیرہ۔ ان باتوں کو آئینی مساوات (آرٹیکل 14) کے خلاف قرار دیا جاسکتا ہے۔

ماضی میں سپریم کورٹ نے مذہبی معاملات میں ریاست کی مداخلت کے خلاف کئی فیصلے دیے ہیں، بشرطے کہ وہ بنیادی حقوق کو متاثر کرتی ہوں۔ تاہم، عدالتیں ہمیشہ پارلیمنٹ کے قانون سازی کے اختیارات کو بھی تسلیم کرتی ہیں، اور اگر کوئی قانون آئینی دائرے میں ہے تو اسے برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ یہ تو واضح ہے کہ قانون سازی پارلیمنٹ کا اختیار ہے، اور عدالت تبھی مداخلت کرتی ہے جب واضح آئینی خلاف ورزی ہو۔ لہٰذا عدالت کو قائل کرنے کے لیے مضبوط شواہد اور مفصل قانونی دلائل درکار ہوں گے، خاص طور پر جب حکومت دعویٰ کرے کہ قانون "انتظامی بہتری" کے لیے بنایا گیا ہے، نہ کہ مذہبی مداخلت کے لیے، ایسے میں مسلم تنظیموں اور ان اداروں کو جنھوں نے اس کے خلاف رٹ دائر کی ہے، کافی احتیاط کے ساتھ قدم آگے بڑھانے کی ضرورت ہے۔

موجودہ وقف قانون کی شقوں کو دیکھا جائے تو یہ صاف ہے کہ اس سلسلے میں عدالتی چارہ جوئی یقینی طور پر ممکن ہے اور اگر مؤثر طور پر پیش کی جائے ممکنہ طور پر کار آمد بھی ہے، **لیکن** اس کی کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ آئینی و قانونی ماہرین کتنا مضبوط مقدمہ تیار کرتے ہیں، اور عدالت اس قانون کو کس زاویے سے دیکھتی ہے — **انتظامی اصلاحات کے**

طور پر یا مذہبی آزادی میں مداخلت کے طور پر، اس سلسلے میں ماضی کے عدالتی فیصلوں کی مثال بھی دی جاسکتی ہے:

S. A. R. Muttah v. Union of India (1994) Citation: AIR 1995 SC 1215

اس کیس میں سپریم کورٹ نے واضح کیا کہ ریاست کو مذہبی اداروں کے انتظام میں صرف اسی وقت مداخلت کی اجازت ہے جب وہ عوامی نظم، صحت یا اخلاقیات کے دائرے میں ہو۔ مذہبی اداروں کی خود مختاری کو آئین کے آرٹیکل (b)26 کے تحت تحفظ حاصل ہے اور اس کے تحت ہر مذہبی گروہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مذہبی معاملات کو خود منظم کرے۔

Azeez Basha v. Union of India (1968) Citation: AIR 1968 SC 662

یہ مقدمہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق تھا۔ عدالت نے اقلیتوں کے حقِ انتظام کو تسلیم کیا، لیکن ادارے کے قیام کے پس منظر پر گفتگو کی اور اپنے فیصلے میں یہ واضح کیا کہ اقلیتوں کو اپنے تعلیمی و مذہبی ادارے قائم کرنے اور ان کا نظم چلانے کی آزادی حاصل ہے۔

Ratilal Panachand Gandhi v. State of Bombay (1954) Citation: AIR 1954 SC 388

اس کیس میں سپریم کورٹ نے واضح لفظوں میں کہا کہ مذہب صرف عبادات تک محدود نہیں بلکہ اس میں مذہبی اداروں کا قیام، ان کی مالیات اور ان کے طریقۂ کار بھی شامل ہیں۔ ریاست ان معاملات میں اس وقت تک مداخلت نہیں کر سکتی جب تک وہ عوامی نظم یا صحت کے خلاف نہ ہوں۔ سپریم کورٹ نے کہا کہ آرٹیکل 25 اور 26 مذہبی آزادی اور ادارہ جاتی خود مختاری کا مکمل تحفظ کرتا ہے۔

Indian Young Lawyers Association v. State of Kerala

(2018) *(Sabarimala Case)*

Citation: (2019) 11 SCC 1

2019ء میں سپریم کورٹ نے نے مساوات اور مذہبی آزادی کے درمیان توازن کی بات کی اور کہا کہ ہر فرد کو آئینی طور پر مذہبی اداروں میں داخلے اور شرکت کا حق حاصل ہے بشرطے کہ وہ بنیادی انسانی حقوق کے خلاف نہ ہو۔

Md. Ismail Faruqui v. Union of India (1994) Citation:

(1994) 6 SCC 360

سپریم کورٹ کا یہ فیصلہ بابری مسجد کیس کے تناظر میں تھا۔ عدالت نے کہا کہ مذہبی املاک ریاست کی تحویل میں آسکتی ہیں بشرطے کہ وہ عوامی مفاد میں ہو۔ مگر کسی کو بھی مذہبی جذبات اور شناخت کو مجروح کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دی جاسکتی۔

ان تمام فیصلوں سے حاصل ہونے والا قانونی مؤقف یہ ہے کہ وقف جیسے مذہبی ادارے کو ریاست کی جانب سے قانون سازی یا انتظامی مداخلت سے مکمل تحفظ حاصل ہے، جب تک کہ وہ آئینی حدبندیوں کے اندر ہو۔ علاوہ ازیں مذہبی آزادی اور اقلیتوں کے حقوق پر مبنی آئینی دفعات (Articles 25, 26, 29, 30) کو بنیاد بنا کر نئے وقف قانون Unified Waqf Management Empowerment, Efficiency and Development کی بعض شقوں کو عدالت میں چیلنج کیا جاسکتا ہے۔ یہ ایک طویل لڑائی ہو سکتی ہے، جس قدر ہو سکے مثبت طریقے سے ہمیں اس لڑائی میں حصہ لینا ہو گا اور اپنے آئینی حقوق کی حفاظت کے لیے قربانیاں پیش کرنی ہوں گی۔

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ جون 2025ء۔ تحریر: 30 اپریل 2025ء)

تل ابیب کے چہرے پر ایران کا طمانچہ

ہم جنگ اور اسرائیل دونوں کو ایک ساتھ ختم کریں گے — روزنامہ کیہان

تہران کے صاف شفاف فضا میں اچانک دھویں کے بادل منڈلانے لگے اور آسمان کے ستارے لرز اٹھے رات کی چادر پر جب آسمان کے ستارے خوف سے کانپنے لگے، دنیا نے دیکھا کہ جنگ کی دیوی نے ایک بار پھر مشرقِ وسطیٰ کی گود میں اپنے جلتے ہوئے پر پھیلا دیے ہیں۔ اسرائیلی طیاروں نے جب ایران کی زمین کو چیرتے ہوئے شعلوں کی لکیریں کھینچیں، تو لگا گویا تیل کے کنویں نہیں، تہذیبوں کے زخم چر کنے لگے ہوں۔ تہران کی جنوبی فصیل پر واقع آئل ریفائنری پر جو آگ برسائی گئی، وہ صرف ایندھن نہیں جلا رہی تھی بلکہ امیدوں کی روشنی کو بھی خاکستر کر رہی تھی۔ لگ رہا تھا جیسے زمین کے سینے پر کوئی پرانا عذاب واپس آ گیا ہو، وہی عذاب جو قوموں کو تقسیم کرتا ہے، شہروں کو مٹی میں بدل دیتا ہے، اور خوابوں کو راکھ کر دیتا ہے۔

ایران کے وزیر خارجہ عباس عراقچی نے جب میڈیا سے بات کی، تو ان کے لہجے میں سفارتی لہجے کی بجائے ایک گھائل قوم کی دھڑکن چیخ رہی تھی، ان کا کہنا تھا کہ یہ آگ اسرائیل نے تنہا نہیں لگائی، اس کے پس پردہ واشنگٹن کے سفید ستونوں سے اڑتی ہوئی کالی روشنی بھی شامل ہے، اور اسی روشنی نے ستم کے ان شعلوں کو راہ دکھائی ہے۔ یہ شعلے اسرائیل نے نہیں، امریکی نظامِ ستم نے برسائے ہیں، ہم نے ثبوت فراہم کیے ہیں کہ امریکی اڈے، ان کے ہتھیار، ان کی مرضی اور ان کے صدر کی زبان نے یہ سب کچھ ممکن بنایا۔ ہمارے پاس ثبوت ہیں، ناقابلِ تردید اور ٹھوس... امریکہ نے نہ صرف یہ جانا بلکہ سرِعام مانا کہ وہ اس سازش کا حصہ ہے۔ صدر ٹرمپ کے الفاظ ہمارے زخموں پر نمک نہیں، بلکہ ایک گواہی ہیں، جو تاریخ کے

ایوان میں ہمیشہ گونجتی رہے گی۔

عراقچی کا کہنا ہے کہ امریکہ نے پیغامات کے ذریعے معذرت کی کہ وہ ان حملوں میں شامل نہیں، مگر نشانات تو کچھ اور ہی گواہی دے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ: ”اگر امریکہ واقعی اس جنگ کا حصہ نہیں، تو وہ نیوکلیر تنصیبات پر حملے کی مذمت کرے۔“

یہ حملے ایسے وقت میں ہوئے جب عمان میں امریکہ اور ایران کے درمیان نیوکلیر معاہدے کی چھٹی نشست ہونے والی تھی۔ عراقچی نے دعویٰ کیا کہ ”اسرائیل نے ایک بار پھر سفارت کے چراغ کو بجھانے کی کوشش کی ہے، وہی چراغ جس کی لو پر دنیا کی امیدیں رقص کرتی تھیں۔“ یہ سب کچھ ایک ایسے لمحے میں رونما ہوا، جب ایران، شام اور لبنان کی فضائیں پہلے ہی جنگ کے بادلوں سے بوجھل تھیں۔ اور اب تہران، اصفہان، بوشہر، شاہرہان، ہر جگہ آگ برسائی گئی، تیل کے کنویں، گیس کے ذخائر، اور بجلی کے نظام.... ہر وہ شریان جس سے ایران کا بدن متحرک تھا، اسے نشانہ بنایا گیا۔ ایران کے فوجی کمانڈروں، پاسدارانِ انقلاب، نیوکلیر سائنسدانوں، اور درس گاہوں کے اساتذہ کو موت کی نیند سلا کر اسرائیل نے تہران کی زمین پر صرف لاشیں نہیں گرائیں، بلکہ فکر، دانش اور علم کے پودوں کو ان کی جڑوں سے اکھاڑنے کی کوشش کی۔

اس آپریشن کا نام اسرائیل نے ”آپریشن رائزنگ لاین“ رکھا۔ آپریشن رائزنگ لاین بھی ایسا ہی ایک خاموش مگر چمکتا ہوا شعلہ تھا، جس نے بظاہر ایران کے جوہری مراکز پر حملہ کیا، مگر حقیقتاً پوری مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی، عسکری اور تہذیبی زمین کو ہلا دیا۔ آپریشن رائزنگ لاین دراصل مستقبل کی جنگ کا پہلا بڑا مظہر تھا۔ اس میں نہ صرف جدید ٹیکنالوجی استعمال کی گئی، بلکہ اخلاقیات، سفارت، اور قانون کی تمام حدیں بھی عبور کی گئیں۔ اسرائیل نے بغیر اعلانِ جنگ، ایران کے نیوکلیر مراکز پر حملہ کیا۔ دعویٰ کیا گیا کہ یہ حملہ ایران کی جوہری صلاحیت کو روکنے کے لیے ضروری تھا۔ مگر سوال یہ ہے کہ اگر ہر طاقت ور ملک اپنے خوف کی بنیاد پر دوسروں کی خود مختاری روندنے لگے، تو عالمی نظام کا کیا بنے گا؟ یہ وہ لمحہ تھا جب پیشگی دفاع

(preemptive strike) کے نام پر پیشگی فتح حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اور دنیا، جو انسانی حقوق، عالمی ضوابط اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر کی دعوے دار ہے، محض تماشائی بن کر رہ گئی۔

اسرائیل کا یہ رائزنگ لاین تاریخی بھی ہے اور علامتی بھی، تاریخ میں اس کی جڑیں رضا شاہ پہلوی کے ایرانی پرچم سے جاکر ملتی ہیں، اور علامتی طور پر دیکھا جائے تو یہ ''رائزنگ لاین'' وہ جدید طاقت ہے جو سائنس، میڈیا اور پروپیگنڈا کو ہتھیار بناتی ہے۔ یہ جدید سیاست کے جنگل کا شیر ہے جس کے پنجے ''ڈرون'' ہیں، آنکھیں ''مصنوعی ذہانت''، اور دماغ ''ڈیپ اسٹیٹ'' یہ شیر صرف جسم نہیں چیرتا، ریاستوں کی خودی، اقوام کی خود مختاری، اور تاریخ کی حرمت کو بھی زخمی کرتا ہے۔

اس شیر نے نہ صرف جوہری تنصیبات، آئل ریفائنریز اور اہل علم و دانش کو تباہ و برباد کیا بلکہ اس نے ایران کے اندر خفیہ موسادی سرگرمیوں، سائبر تخریب کاری، اور داخلی کمزوریوں کو بھی ہوا دی۔ شاہ ہران کے آئل ڈپو میں لگنے والی آگ صرف ایندھن کو نہیں، بلکہ تہران کے باشندوں کے خوابوں کو بھی جلا گئی، آسمان پر اڑتے پرندے، جو کبھی محبت کے قاصد تھے، اب موت کے پیغامبر بن چکے ہیں۔

جنرلز کی ہلاکت، تنصیبات کی تباہی، اور قومی شعور کی چوٹ، یہ سب کچھ بتاتا ہے کہ جنگ اب صرف ہتھیاروں کی جنگ نہیں رہی، بلکہ نظاموں، اداروں، اور قوموں کے اعصاب پر قبضے کی جنگ ہے۔ مگر دنیا نے دیکھا کہ ایران خاموش نہیں بیٹھا۔ جواب میں ایران نے اپنے آتشیں پرندوں کو تل ابیب اور حیفہ کی جانب بہ زبانِ ساحر یہ کہتے ہوئے روانہ کیا۔

ہم امن چاہتے ہیں مگر ظلم کے خلاف
گر جنگ لازمی ہے تو پھر جنگ ہی سہی
یہ زر کی جنگ ہے نہ زمینوں کی جنگ ہے
یہ جنگ ہے بقا کے اصولوں کے واسطے

جو خون ہم نے نذر دیا ہے زمین کو
وہ خون ہے گلاب کے پھولوں کے واسطے
آئے گی صبح امن، لہو رنگ ہی سہی

بے شک ہمارے ہاتھوں میں شعلہ نہیں، دعا ہے، آنکھوں میں نفرت نہیں، روشنی کی پیاس ہے مگر اگر اندھیرے اس قدر گہرے ہو جائیں کہ چراغوں کو نگلنے لگیں، اگر ظلم سانپ بن کر حریت کے گلابوں کو ڈسنے لگے، تو پھر ہمیں اپنے زخموں کو ہتھیار بنانا آتا ہے۔ ہم امن کے دیوانے ہیں، لیکن اگر امن کو گلا گھونٹ کر قید کیا جائے، اگر انصاف کو زنجیروں میں جکڑا جائے، اگر سکوت کو بزدلی بنا دیا جائے، تو پھر ہماری خاموشی بغاوت بن جاتی ہے، اور ہماری خاموش آہیں، میدانِ کارزار کی گھن گرج میں ڈھل جاتی ہیں۔ جو خون ہم نے زمین کو دیا ہے، وہ فقط لہو نہیں، وہ عشق کی مہریں ہیں، جو مٹی کی پیشانی پر ثبت ہوئی ہیں۔ وہ خون لال گلاب کی آبیاری ہے، وہ صبح کی اذان ہے، جو رات کے سینے کو چیر کر نکلتی ہے، ہمیں معلوم ہے کہ صبحِ امن آئے گی، شاید وہ چادر لہو سے تر ہو، شاید اس کی ہوا میں سسکیاں ہوں، لیکن وہ صبح آئے گی۔ کیوں کہ سیاہ راہ کا سخت پتھر چاہے کتنا ہی سخت ہو، اذانِ فجر کی شیشہ نما ضرب اسے چکنا چور کر ہی دیتی ہے۔

ایران کی ضرب سے جب اسرائیل کی کمر ٹوٹنے لگی تو جس طرح رات کے اندھیرے میں گیدڑوں کا ہجوم ایک آواز میں چیختا ہے، اسی طرح اُس کے ہم نوا چیخنے چلانے لگے کہ یہ صرف بدلہ نہیں بلکہ تیسری عالمی جنگ کی تمہید ہے، امریکہ بہادر نے بھی اپنی چودھراہٹ دکھانے کی کوشش کی لیکن ایرانی رہ نماؤں کے بیانات نے ثابت کر دیا کہ وہ کسی سے نہیں ڈرتے۔

ایرانی حملے کے بعد ایران کے مقامی اخبارات نے اپنی پیشانیوں پر صرف خبریں نہیں، بلکہ ملی غیرت کے زخموں کو کندہ کیا۔ روزنامہ "کیہان" نے لکھا: "ہم جنگ اور اسرائیل دونوں کو ایک ساتھ ختم کریں گے۔" ایک اور اخبار نے اسے قومی جنگ سے تعبیر کیا، اخبار "سازندگی" نے سرخی جمائی "تل ابیب کے چہرے پر ایران کا طمانچہ۔"

حالیہ واقعات میں، ایران نے اپنے جوابی آپریشن "وعدۂ صادق "کے تحت، جس کے نام ہی میں صداقت اور وعدہ کی گونج سنائی دیتی ہے، پانچ سو سے زائد بیلسٹک میزائل اور ڈرونز کی بارش کر دی۔ یہ بارش پانی کی نہیں، آگ کی تھی، تل ابیب، حیفہ اور ریشون لیزون جیسے شہروں پر ایسی گھنگھور گھٹائیں چھاگئیں جن کے نیچے صرف دھواں، تباہی اور عبرت کے نقش ثبت ہوئے۔ ایران کی فضاؤں نے دشمن کے F-35 جنگی جہازوں کو قبول نہ کیا اور انھیں خاک میں ملایا، جیسے شہیدوں کا انتقام فضاؤں میں سرگوشی کرتا ہو۔

انقلابی گارڈز نے اپنے بیان میں اس جوابی طوفان کی تفصیل کچھ یوں بیان کی جیسے کوئی زخمی شیر دھاڑتا ہو: ”ہم نے ان کے ایندھن کے مراکز، توانائی کی فراہمی کے سرچشموں، اور جنگی جہازوں کی سانسوں کو نشانہ بنایا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر اسرائیلی ہاتھ باز نہ آئے، تو ایرانی ردِ عمل کی گونج اور زیادہ گہری اور تباہ کن ہوگی۔“

ایران کا یہ حملہ صرف فوجی کاروائی نہیں ہے، بلکہ ایک نظریاتی پیغام بھی ہے۔ ایک ملک جس پر جارحیت کی گئی، اس نے جواب دیا، اور ساتھ ہی بین الاقوامی ضمیر کو جھنجھوڑا۔ ایران نے اسرائیلی حملے کو نہ صرف اپنی سرزمین کی خودمختاری پر حملہ قرار دیا بلکہ اسے عالمی قوانین کی صریح خلاف ورزی بھی گردانا۔

ایرانی صدر پزشکین نے ان لمحوں میں جو لب کشائی کی، وہ محض سفارتی جملے نہ تھے بلکہ وہ صدیوں پر محیط ایرانی عزتِ نفس اور مزاحمت کی آواز تھی۔ انھوں نے دو ٹوک کہا کہ امریکہ کی وہ پرانی چال، جس میں دباؤ اور دھونس کے ذریعے ایران کو زیر کیا جاتا رہا، اب ناکام ہو چکی ہے۔ اسرائیل کے ان حملوں کی حمایت کو امریکہ کی بدنیتی کا ثبوت قرار دیتے ہوئے انھوں نے کہا: ”وہ ہمیں مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ ہم جھک جائیں، مگر وہ نہیں جانتے کہ ہم سر کٹوا سکتے ہیں، جھکا نہیں کرتے۔“ ایسے حالات میں قطر کے امیر شیخ تمیم کی جانب سے ایرانی عوام کے ساتھ اظہارِ ہمدردی اور یکجہتی نے خلیج کی ہواؤں میں ایک نئی ہم آہنگی پیدا کی۔ اس پر صدر

نے شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ پیغام دیا کہ ایران تنہا نہیں، اور جو دل ظلم کے خلاف دھڑکتے ہیں، وہ ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

یہ داستان صرف میزائلوں اور جہازوں کی نہیں، عزت و حمیت، وعدہ و وفا، اور ایک قوم کی بیدار غیرت کی کہانی ہے۔ ایران کی فضائیں اب بھی خاموش نہیں، اور اگر کوئی آسمان سے بارود برسائے گا، تو زمین سے حوصلے اگیں گے، ایسے حوصلے جنھیں نہ گولی مار سکتی ہے، نہ سازش روند سکتی ہے۔ ایرانی اتھارٹی نے اسرائیل کے منہ پر طمانچہ مار کر اسلامیانِ عالم کے جلتے سلگتے سینوں کو جو ٹھنڈک پہنچائی ہے، ہم دعا کرتے ہیں کہ تادیر وہ ٹھنڈک برقرار رہے۔ آمین۔

رسالہ پریس جانے کو تیار تھا، ایسے میں خبر آئی کہ ایران پر حملہ کرنے کی پندرہ روزہ مہلت کے باوجود دو ہی دن میں اپنی بات سے پھرتے ہوئے ڈونالڈ ٹرمپ کے حکم پر امریکی جنگی جہازوں نے ایران کے تین شہروں میں واقع ایٹمی تنصیبات پر بنکر بسٹر بموں سے حملہ کر دیا۔ امریکی صدر نے دعویٰ کیا کہ ایران کی ایٹمی تنصیبا کو ملیامیٹ کر دیا گیا ہے، اس کے یہ دعوے اس وقت بڑبول ثابت ہوئے جب ایران نے عالمی میڈیا کو بتایا کہ حملہ ضرور ہوا مگر اس کی ایٹمی تنصیبات کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ ایران اپنا ایٹمی مواد پہلے ہی دوسرے خفیہ مقامات پر منتقل کر چکا ہے۔ ایران نے امریکہ کو اس کے عبرت ناک انجام کی دھمکی دی ہے۔ اس حملے کے بعد دوسری بڑی طاقتوں کے جنگ میں ملوث ہونے کے آثار بھی نظر آنے لگے ہیں۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ دنیا تیزی سے تیسری عالمی جنگ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ تیسری عالمی جنگ ہو کر رہے گی اور 2027ء کے ختم ہوتے ہوتے اسرائیل کا وجود بھی دنیا کے نقشے سے غائب ہو چکا ہوگا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ اگست 2025ء)

(تحریر: جون 2025ء)

...بِن پانی سب سُون

پانی کا بحران — ایک بڑے تغیر کی ابتدائی داستان

زمین نام کا یہ نیلا سبز کرہ، ہر آن ماورائی رقص میں مصروف ہے، اس کا محور، جو تقریبًا 23.5 ڈگری پر جھکا ہوا ہے، مسلسل اپنے دائرے میں مگن ہے۔ اس کا ہر چکر، دن رات کی قوس قزح کو ترتیب دیتا ہے، ہر جھکاؤ موسموں کی موسیقی کو جنم دیتا ہے، اس کا یہ رقص نظامِ کائنات کے ساتھ ایک لطیف ہم آہنگی کے دائرے میں مدتِ مدید سے قائم ہے۔ یہ جھکاؤ موسموں کی ترتیب، دنوں کی مدت، اور زندگی کی گردش کا محافظ ہے۔ مگر سوچیے تو ذرا کہ اگر اس کی سمت یا شدت بدل جائے تو کیا ہوگا؟ اگر یہ رقاصہ اپنی چال میں لغزش کھالے تو کیا ہوگا؟

اب تک تو ایسا نہیں ہوا مگر لگتا ہے اب اس کی ہم آہنگی کی لے بگڑنے والی ہے، اب زمین کا محور کچھ اس طرح تھر تھرا رہا ہے، جیسے کوئی تھکی ہوئی رقاصہ، جس کی پازیب کی جھنکار مدھم پڑ گئی ہو۔ ایسا ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ایک نئی تحقیق میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان میں زمینی پانی کی ضرورت سے زیادہ پانی نکالنے کے سبب کرۂ ارض کا توازن بگڑ رہا ہے اور ممکنہ طور پر زمین اپنے محور سے منتقل ہو رہی ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اگر اس کا مناسب سد باب نہ کیا گیا تو یہ دن اور رات کے چکر میں خلل ڈال سکتا ہے اور دنیا بھر میں خوراک اور پانی کی شدید قلت جیسے متعدّد بحرانوں کا باعث بن سکتا ہے۔ ناسا کی ایک تحقیق سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ 1993 اور 2010 کے درمیان، بھارت، بنگلہ دیش، پاکستان اور چین میں تقریبًا 54 کھرب لیٹر زمینی پانی کے بڑے پیمانے پر اخراج نے زمین کے محور کو 78 سینٹی میٹر مشرق کی طرف منتقل کیا۔ زمین کے محور پر یہ زخم اُس پانی نے لگایا ہے جس کو انسان نے زمین کے

شکم سے بے دردی کے ساتھ کھینچ کر باہر نکال لیا اور ضائع کر دیا۔

پانی، ایک عظیم نعمت ہے جو زمین کے سینے سے پھوٹتی ہے، آسمان سے برستی ہے، اور زندگی کے ہر رنگ کو سیراب کرتی ہے۔ یہ محض ایک مادّی عنصر نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کا وہ آئینہ ہے جس میں رحمت، حکمت اور عظمت کے رنگ جھلکتے ہیں۔ یہ وہ گوہرِ نایاب ہے جو زندگی کا سرچشمہ ہے، زمین کے سینے میں موتیوں کی مانند چمکتا ہے اور آسمان سے رحمت بن کر برستا ہے۔ یہ وہ نعمتِ خداوندی ہے جو ہر جاندار کے وجود کو سیراب کرتی ہے، مگر افسوس کہ آج اسی پانی کی قدر و قیمت کو انسان نے اپنی بے پروائی سے گہنا دیا ہے۔ وہ پانی جو کبھی زندگی کا استعارہ تھا، آج موت کا پیغام بن چکا ہے۔ بھارت، جو کبھی دریاؤں، ندیوں اور جھیلوں کی نغمہ سرا دھرتی کہلاتا تھا، آج ایک تشنہ لب قافلہ کی صورت نظر آرہا ہے جو اپنی پیاس بجھانے کے لیے اپنی ہی زمین سے خراج مانگ رہا ہے۔ زیرِ زمین پانی کے خزانے جس تیزی سے نکالے جا رہے ہیں، وہ زمین کے توازن کو دھیرے دھیرے ڈگمگانے پر مجبور کر رہے ہیں۔ اور یہ معمولی تبدیلی، جو ہر سال صرف 10 سینٹی میٹر کروٹ بدلتی ہے، اپنے اندر انسانی تاریخ اور زمینی جغرافیے کا دھارا موڑ دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

بھارت میں ہر سال 250 سے 260 مکعب کلومیٹر پانی، زمین کے سینے سے نچوڑا جا رہا ہے۔ یہ وہ مقدار ہے جو امریکہ اور چین کے مجموعی استعمال سے بھی زیادہ ہے۔ گو کہ چین اور امریکہ بھی پانی کے ان خزینوں کے خریدار ہیں، مگر ان کی پیاس ہندوستان کی بے تابی کا سامنا نہیں کر سکتی۔ سعودی عرب اور ایران کی زمینیں بھی اس تشنگی کی دوڑ میں شامل ہیں، مگر ان کے طلب و رسد کی میزان اب بھی ہمارے قدموں کے نشان سے چھوٹی ہے۔ بھارت میں اس بے رحمانہ استحصال کی بنیادی وجہ وہ زرعی نظام ہے، جسے ہم ترقی کا تاج پہنا کر فطرت کی لاش پر جشن مناتے رہے ہیں۔ چاول، گنا، اور گندم جیسی فصلیں جنھیں زندگی کی علامت کہا جاتا تھا، اب زمین کا شکم چیر کر اپنا وجود برقرار رکھنے کی جدوجہد کر رہی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ

صرف پانی کے بحران کی کہانی نہیں، یہ وقت، زمین، اور کائنات کی گہرائیوں میں پنہاں ایک بڑے تغیر کی ابتدائی داستان ہے۔

پنجاب، ہریانہ، راجستھان، اترپردیش، اور تمل ناڈو — یہ وہ ریاستیں ہیں جہاں کی زمین کبھی نہ ختم ہونے والی تشنگی اور تباہی کی علامت بن چکی ہے، یہاں کا کسان، جو کبھی بارش کے ایک بوند پر سجدہ ریز ہوتا تھا، اب موٹر اور بورویل کی گرج میں فطرت کی سرگوشیاں سننے سے قاصر ہو چکا ہے اور دہلی، بنگلور، چنئی جیسے شہر جو کبھی تمدن کے سنگھاسن پر براجمان تھے اب پانی کی بوند بوند کو ترسنے لگے ہیں۔

جب انسان نے زمین سے اس کا وزن چھین لیا تو زمین بھی توازن کھونے لگی۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا؛ تحقیقی اداروں کے مطابق 1993 سے 2010 تک، برصغیر سے 54 کھرب لیٹر پانی نکالے جانے کے سبب زمین کا قطب شمالی 78 سینٹی میٹر مشرق کی جانب سرک گیا۔ یہ کوئی معمولی چیز نہیں، یہ گویا زمین کی سانسوں کے بھٹک جانے کا عمل ہے، اگر یہ عمل اسی رفتار سے جاری رہا، تو زمین کے محور کی تبدیلی، شب و روز کے چکر میں بھی خلل ڈال سکتی ہے۔ تصور کیجیے جب دن بے ترتیب ہو جائیں، راتیں بے معنی ہو جائیں، اور وقت کا پہیہ بے رخ ہو جائے تو اس انسان کا کیا ہوگا؟؟؟

یاد رکھیے! محور کی یہ تبدیلی مانسون کی آمد کو مزید بے وقت بنا دے گی، قطبین پر سورج کی شعاعوں کا دائرۂ کار بڑھائے گی، برف کی چادروں کو پگھلائے گی، پھر کہیں قحط ہوگا، کہیں طوفان، کہیں خشک سالی ہوگی تو کہیں بے موسم بارشیں اور انسان کی زندگی تہ و بالا ہو کر رہ جائے گی۔ قطبی برف کا پگھلنا صرف شمال کی سنسان زمینوں کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ سمندری سطح کو بڑھا کر، ممبئی اور کولکاتا جیسے شہروں کو نگلنے کی دھمکی بھی ہے۔ بنگلہ دیش کے ساحلی علاقے، جو پہلے ہی قدرتی آفات کی زد میں ہیں، سمندر کی آغوش میں سما سکتے ہیں۔ گلف اسٹریم جیسے بحری دھارے کمزور پڑ سکتے ہیں، اور یورپ کی سردیاں غیر معمولی شدت اختیار کر سکتی ہیں۔

محور کی تبدیلی دن اور رات کی مدت کو بھی بدل سکتی ہے۔ قطب شمالی اور جنوبی پر مہینوں کی تاریکی یا روشنی کا راج ہو سکتا ہے۔ یہ تبدیلی فصلوں کے موسموں کو بگاڑ دے گی، اور گندم، چاول جیسی بنیادی اجناس کی پیداوار کم ہو سکتی ہے۔

زمین کو صرف ایک ٹھوس کرّہ نہ سمجھیے، اسے ایک زندہ جسم سمجھیے، اس زندہ جسم کے سینے میں جو آگ ہے، وہ تب تک پُرامن رہتی ہے جب تک ہم اس کے توازن کو نہ چھیڑیں۔ مگر جب محوری جھکاؤ زمین کے اندرونی دباؤ کو چھیڑتا ہے، تو وہی زمین زلزلوں اور آتش فشاں کے ذریعے احتجاج کرتی ہے۔ بحرالکاہل کے "رِنگ آف فائر" میں سرگرمیاں تیز ہوتی ہیں، اور طوفانوں کی شدت میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ محض پانی کا بحران نہیں یہ انسان کی عاقبت نااندیشیوں کے خلاف فطرت کا انتقام ہے، ایک ایسا انتقام جو خاموشی سے سب کچھ بدل رہا ہے۔ زمین کی تہ میں خالی جگہوں کے سبب "land subsidence" یعنی زمینی نشست کے آثار دہلی، کولکتہ اور ممبئی جیسے شہروں میں ظاہر ہو چکے ہیں۔ یہ شہر اب زمین میں دھنستے جا رہے ہیں، جیسے فطرت انھیں سزا کے طور پر، یا شاید پناہ کے طور پر واپس اپنی آغوش میں لے جانا چاہتی ہو۔ ندیوں کا بہاؤ کم ہوتا جا رہا ہے۔ یمنا، گوداوری اور کرشنا کی آنکھیں خشک ہو چکی ہیں۔ کیوں کہ جب زمین کے نیچے پانی نہ ہو، تو اوپر کی روانی بھی تھمنے لگتی ہے۔ یہ وہی دریا ہیں جو کبھی تہذیبوں کی نرسری کہلاتے تھے، اور آج اپنی زمین کے سینے سے بچھڑ کر سسک رہے ہیں۔ یہ صرف ایک ماحولیاتی مسئلہ نہیں، بلکہ ہماری اجتماعی بقا کا سوال ہے۔ اگر ہم نے اس پیاس کی گہرائی کو نہ سمجھا، تو کل یہ زمین ہمیں اپنے سینے میں جگہ دینے سے بھی گریزاں ہو جائے گی۔

وہ خوف ناک مسائل جو کسی اژدہے کی طرح انسان کے وجود کو نگلنے کے لیے مسلسل آگے بڑھ رہے ہیں، ان کا حل کیا ہے؟ آج کی دنیا کو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ جہاں تک ہم سمجھتے ہیں؛ ان مسائل کا حل اسلام کے درسِ اعتدال میں پوشیدہ

ہے۔ اسلامی تعلیمات پر اگر خلوص نیت سے عمل کیا جائے تو یقیناً مکمل طور پر ان مسائل کو حل کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید نے پانی کو حیات کا سر چشمہ قرار دیا اور اس کی قدر و منزلت کو بارہا بیان کیا ہے۔ آج، جب ساری دنیا پانی کے بحران سے دو چار ہے اور اس بحران کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نت نئے مسائل انسان کے لیے ہر لمحہ ایک نئی امتحان گاہ ترتیب دے رہے ہیں، ایسے پر آشوب عہد میں قرآن و حدیث کی روشنی میں اس نعمت کی اہمیت اور اسے بچانے کی ضرورت کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا از حد ضروری ہے۔

بے شک پانی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اور ہم نے ہر جاندار چیز کو پانی سے بنایا، کیا پھر بھی وہ ایمان نہیں لاتے؟"

(الانبیاء:30)

غور تو کیجیے! اس آیت مقدسہ میں پانی کی عظمت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے جیسے وہ کائنات کی روح ہو۔ پانی نہ ہو تو زمین بنجر، دل ساکت، اور زندگی خاموش ہو جائے۔ یہ اللہ کی رحمت کا وہ گوہر ہے جو صحراؤں کو گلزار بناتا اور خشک دلوں کو ایمان کے نور سے منور کرتا ہے۔

دیکھیے! ہمارے آقا رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی پانی کو نہ صرف زندگی کا ذریعہ قرار دیا بلکہ اسے پاکیزگی اور طہارت کا سب سے بڑا وسیلہ بھی بتایا۔ ارشاد ہے:

"پانی پاک ہے، اسے کوئی چیز ناپاک نہیں کرتی، سوائے اس کے کہ اس کا رنگ، بو یا ذائقہ بدل جائے۔" (سنن ابی داؤد، کتاب الطہارۃ، حدیث نمبر66)

یہ حدیث پانی کی فطری پاکیزگی کی گواہی دیتی ہے، جیسے کوئی روشن آئینہ جو اپنی شفافیت سے ہر پل اپنی پاکی کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن جب ہم اس کو ضائع کرتے ہیں یا اسے آلودہ کرتے ہیں، تو گویا ہم اس رحمتِ الٰہی کی توہین کرتے ہیں جو ہمیں عطا کی گئی۔

سورۃ الشوریٰ آیت:28 میں ارشاد باری ہے:

"وہی ہے جو نا امیدی کے بعد بارش نازل کرتا ہے اور اپنی رحمت پھیلاتا ہے۔"

یقیناً بارش کی ہر بوند آسمان سے اترتا ہوا ایک نامۂ رحمت ہے۔ یہ بوندیں زمین کے سینے کو چیرتی ہیں، اسے سیراب کرتی ہیں اور اس سے سبزے، پھل پھول اور زندگی کے رنگ اگاتی ہیں۔ لیکن آج ہم اس نعمت کی قدر کھو رہے ہیں۔ ہمارے دریا سوکھ رہے ہیں، ہمارے تالاب گندلے ہو رہے ہیں، اور ہماری زمین پانی کے لیے ترس رہی ہے۔ یہ گویا ہمارے ہاتھوں اپنی ہی زندگی کا گلا گھونٹنے کے مترادف ہے۔ آج جو ہم پانی کے بحران کی لپیٹ میں ہے، دریا خشک ہو رہے ہیں، زیرِ زمین پانی کی سطح گر رہی ہے، اور آلودگی نے صاف پانی کو نایاب بنا دیا ہے، تو یہ بحران محض مادی نہیں، بلکہ روحانی بھی ہے۔ جب ہم پانی کو ضائع کرتے ہیں، تو گویا ہم اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی ناشکری کرتے ہیں جسے قرآن نے حیات کا سرچشمہ قرار دیا۔

سورہ واقعہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"بھلا بتاؤ، جو پانی تم پیتے ہو، کیا تم نے اسے بادل سے اتارا یا ہم نے اتارا؟"

(آیت:68،69)

یہ آیات ہمیں پانی کی قدر کرنے اور اس کے تحفظ کی دعوت دیتی ہیں۔ پانی کو ضائع کرنا گویا اس رحمت کو ٹھکرانا ہے جو اللہ نے ہمیں عطا کی۔ قرآن نے ہمیں اعتدال کا سبق دیا ہے، یہ اعتدال ہر جگہ ہر مقام پر اور ہر حال میں ضروری ہے۔ سورۃ الاعراف میں ارشاد ہے:

"کھاؤ اور پیو، مگر اسراف نہ کرو، بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

(آیت:31)

یاد رکھیے پانی کا بے جا استعمال بھی اسراف ہے، اور اسراف اللہ کو سخت ناپسند۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اعتدال اور میانہ روی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ آپ نے پانی کے استعمال میں بھی اسی اعتدال کی تلقین فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک صحابی کو وضو کرتے ہوئے زیادہ پانی استعمال کرنے سے منع فرمایا اور

ارشاد فرمایا:

"اسراف نہ کرو، چاہے تم بہتے دریا کے کنارے ہی وضو کر رہے ہو۔"

(سنن ابن ماجہ، کتاب الطہارۃ، حدیث نمبر 425)

یہ الفاظ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ پانی، چاہے وہ دریا کی روانی ہو یا کنویں کی گہرائی، ہر حال میں اسے احتیاط سے استعمال کرنا ہماری دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ یہ گویا ایک امانت ہے جو ہمیں سونپی گئی، اور اس امانت میں خیانت ہمارے ایمان کی کمزوری کا مظہر ہے۔ ہمیں اپنے گھروں، کھیتوں اور شہروں میں پانی کے استعمال میں احتیاط کرنی چاہیے، دریاؤں اور جھیلوں کو آلودگی سے بچانا، بارش کے پانی کو محفوظ کرنا، اور پانی کے تحفظ کے لیے اجتماعی کوششیں کرنا ہمارا دینی اور اخلاقی فریضہ ہے۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پانی کی حفاظت اور اس کی منصفانہ تقسیم پر بھی زور دیا۔ ایک موقع پر فرمایا:

"مسلمانوں کے درمیان تین چیزیں مشترک ہیں: پانی، چراگاہ اور آگ۔"

(سنن ابی داؤد، کتاب الاجارہ، حدیث نمبر 3477)

یعنی پانی کوئی نجی ملکیت نہیں بلکہ ایک اجتماعی نعمت ہے، جو ہر جان دار کا حق ہے۔ جب ہم پانی کو ضائع کرتے ہیں یا اسے آلودہ کرتے ہیں، تو ہم نہ صرف اپنی نسلوں کے حق کو غصب کرتے ہیں بلکہ اس رحمتِ الٰہی کو بھی داغ دار کرتے ہیں جو سب کے لیے عطا کی گئی ہے۔

پانی کو بچانا صرف ایک مادی عمل نہیں، بلکہ یہ ایک روحانی اور اخلاقی فریضہ ہے۔ جب ہم پانی کو بچاتے ہیں، تو گویا ہم اپنے ایمان کو جلا دیتے ہیں۔ جب ہم اسے آلودگی سے محفوظ رکھتے ہیں، تو گویا ہم اپنے دلوں کو پاکیزہ بناتے ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث ہمیں یہ درس دیتی ہیں کہ پانی کی حفاظت ہمارا دینی فریضہ ہے، اور اس فریضے کی ادائیگی ہی ہمارے معاشرے کو سرسبز و شاداب بنا سکتی ہے۔

بے شک پانی ہی تو زمین کو جنت زار بناتا ہے، پانی ہی تو ہر سانس، ہر نبض، اور ہر لمحے کے ساتھ ہماری زندگی کو رواں رکھتا ہے۔ آئیے، ہم عہد کریں کہ اس گوہرِ نایاب کی قدر کریں گے، اسے ضائع ہونے سے بچائیں گے اور اس کی پاکیزگی کو برقرار رکھیں گے، تاکہ ہماری آنے والی نسلیں بھی اس رحمتِ الٰہی سے فیض یاب ہوسکیں۔

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ جولائی 2025ء۔ تحریر 22 مئی 2025ء)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی داستان حیات

نبوت کے آسمان پر جگمگاتے ہوئے ستاروں میں ایک ستارہ آج بھی اپنی پوری تابناکیوں کے ساتھ انسان کی نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے ، اس ستارے کا نام ہے حضرت ”اسماعیل“ علیہ السلام۔ اسماعیل اس مقدس ہستی کا نام ہے جن کی زندگی ایثار، قربانی، توکل، اطاعت، محبت اور نبوت کے رنگوں سے سجی ہوئی ہے اور تمام عالمِ انسانیت کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ان کی ولادت سے لے کر قربانی کے عظیم امتحان اور کعبہ کی تعمیر تک، ہر لمحہ ایک ایسا سبق ہے جو دلوں کو ایمان کے نور سے منور کرتا ہے۔

ولادتِ اسماعیل-ایک دعا کا ثمر:

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں اولاد کی حسرت موجزن تھی، انھوں نے ربِ کائنات سے التجا کی:

”اے میرے رب! مجھے صالح اولاد عطا فرما۔“(الصافات:100)

یہ دعا ایسی تھی جیسے کوئی تشنہ لب صحرا میں میٹھے پانی کی فریاد کر رہا ہو۔ حضرت سارہ، جو ابراہیم علیہ السلام کی رفیقِ حیات تھیں، نے اپنی باندی حضرت ہاجرہ کو اپنے شوہر کے نکاح میں دینے کی تجویز پیش کی، تاکہ اللہ انھیں اولاد کے نور سے منور کرے، حضرت ابراہیم نے ان کی اس تجویز کو پسند فرمایا اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے حضرت ہاجرہ سے نکاح فرمایا۔ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ حضرت ہاجرہ کی آغوش میں ایک رشکِ ماہ تاب نمودار ہوا جس کا نام اسماعیل رکھا گیا۔ یہ وہ لمحہ تھا جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر 86 برس تھی۔ اللہ کریم کی اس عطا نے انھیں سرشار کر دیا اور ان کے لبوں سے بے اختیار حمد و ثنا کے کلمات جاری ہوئے۔

صحرا میں تنہائی-توکل کا امتحان:

ایک دن، جب صبح کا سورج اپنی تیز و تند شعاعوں سے زمین کا سینہ چھلنی کر رہا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجر اور ننھے اسماعیل کو ایک طویل سفر کے لیے تیار کیا۔ وہ چلتے رہے، شام ڈھلی، پھر صبح ہوئی، پھر شام ڈھلی، کئی روز چلتے رہے، پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں کو عبور کیا، اور آخر کار ایک ایسی وادی میں پہنچے جہاں آدم نہ آدم زاد، دور دور تک زرد ریت کا سمندر موجیں مار رہا تھا، ننگی چٹانیں تھیں جنھیں سخت دھوپ نے سنولا دیا تھا، ہریالی اور پانی کا نام و نشان تک نہ تھا، یہ وادی مکہ تھی، جو اس وقت ایک بنجر خطہ تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور بیٹے کو وہاں چھوڑا، کچھ پانی اور کھانے کا تھوڑا سامان ان کے حوالے کیا اور واپسی کا ارادہ فرمایا: حضرت ابراہیم کی واپسی کا ارادہ سن کر ہاجرہ مضطرب ہوگئیں، انھوں نے ایک نگاہ اپنے معصوم بیٹے کی طرف ڈالی، اور سوال کیا:

”آپ ہمیں اس بے آب و گیاہ وادی میں تنہا چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں؟“

ابراہیم علیہ السلام خاموش رہے، کیوں کہ ان کا دل اللہ کے حکم کی ڈور سے بندھا ہوا تھا۔

آخر کار حضرت ہاجر نے سوال کیا: ”کیا یہ اللہ کا حکم ہے؟“

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے آہستہ سے سر ہلا کر ہامی بھری۔ یہ جان کر حضرت ہاجرہ نے ایمان افروز لہجے میں کہا:

”جب اللہ ہمارے ساتھ ہے، تو ہم کبھی گم نہیں ہو سکتے۔“

یہ الفاظ ایمان کی وہ چٹان تھے، جنھوں نے مکہ کے سلگتے ریگستان میں مضبوطی سے قدم گاڑ دیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے وادی سے نکلتے ہوئے کعبہ کی جانب رخ کیا اور دعا مانگی:

”اے ہمارے رب! میں نے اپنی اولاد کو تیری پاک گھر کے پاس ایک ایسی وادی میں بسایا جہاں کوئی کاشت نہیں، تاکہ وہ تیری عبادت کریں۔ پس تو لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر اور انھیں رزق عطا فرما۔“ (ابراہیم: 37-38)

یہ صرف دعا نہیں تھی بلکہ بنجر زمین میں ایمان کے ساتھ بویا گیا وہ بیج تھا جس کی سرسبزی و شادابی اللہ تعالیٰ کی رضا کے سپرد کر دی گئی تھی۔

صفا و مروہ کے درمیان جدوجہد-ایمان کی دوڑ:

مکہ کی اس بنجر وادی میں، جہاں زندگی کا نام و نشان نہ تھا، حضرت ہاجرہ اور ننھے اسماعیل علیہ السلام تنہا رہ گئے۔ ان کے پاس جو تھوڑا سا پانی تھا، وہ جلد ہی ختم ہو گیا۔ پیاس نے ماں بیٹے دونوں کو بے قرار کر دیا۔ ننھا اسماعیل تڑپ رہا تھا، اور ہاجرہ کا دل اپنے لختِ جگر کی تکلیف دیکھ کر پگھل رہا تھا۔ وہ اس منظر کو مزید برداشت نہ کر سکیں اور پانی کی تلاش میں امید کا دامن تھامے ہوئے صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئیں۔ نگاہ اٹھائی، وادی میں چاروں طرف غور سے دیکھا، شاید کوئی راہگیر نظر آ جائے، مگر وہاں سوائے خاموشی کے کچھ نہ تھا۔ وہ صفا سے اتریں اور کچھ چلتے، کچھ دوڑتے ہوئے مروہ تک پہنچیں، مگر وہاں بھی کوئی نشانِ حیات نظر نہ آیا۔ اس طرح وہ سات بار صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتی رہیں، پانی کی تلاش میں ان کی یہ دوڑ صرف جسم کی نہیں، بلکہ روح کی بھی تھی اور ان کی روح تو ایمان و توکل سے لبریز تھی۔

رحمتِ الٰہی کا چشمہ:

جب حضرت ہاجرہ ساتویں بار مروہ پر پہنچیں، تو انھوں نے ایک آواز سنی، کان لگائے، آواز پھر آئی۔ انھوں نے پکارا:

"اے تم جو بھی ہو! تم نے مجھے اپنی آواز سنائی، کیا تمھارے پاس کوئی مدد ہے؟"

اور پھر اچانک ایک عظیم الشان معجزہ رونما ہوا، زمزم کے مقام پر ایک فرشتہ نمودار ہوا، جس نے اپنے پر زمین پر مارے اور وہاں سے اللہ کی حمد و ثنا گنگناتا ہوا پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ حضرت ہاجرہ نے یہ دیکھا تو فوراً اپنے ہاتھوں سے اس کے گرد ایک حوض سا بنایا اور اپنے مشکیزے میں پانی بھرنا شروع کیا۔ پانی اس قدر بہتا تھا کہ وہ اسے روک نہ پاتی تھیں۔ رسول

اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ اسماعیل کی ماں پر رحم کرے! اگر وہ زمزم کو بہنے دیتیں، تو زمزم زمین پر بہتا ہوا دریا بن جاتا۔"

یہ زمزم کا پانی آج بھی لاکھوں حاجیوں کی پیاس بجھاتا ہے، اور حضرت ہاجر کے صبر و ایمان کی گواہی دیتا ہے۔

حضرت ہاجرہ کی عظیم جدوجہد آج حج کے رکن "سعی" کی صورت میں زندہ ہے، حضرت ہاجرہ کی بے قرار دوڑ اللہ تعالی کو اس قدر پسند آئی کہ اسے حج کا رکن بنا دیا۔

مکہ میں آباد کاری کی ایک نئی صبح:

زمزم کے معجزے کے بعد، حضرت ہاجر نے پانی پیا اور اپنے بیٹے کو پلایا۔ فرشتے نے ان سے کہا: "تمھیں تنہائی کا خوف نہ ہو، کیوں کہ یہ اللہ کا گھر ہے، جسے یہ لڑکا اور اس کا باپ تعمیر کریں گے۔ اللہ اپنے بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا۔"

اس وقت کعبہ ایک بلند ٹیلے کی طرح تھا، جس کے دائیں بائیں سیلابی ریلے بہتے تھے۔ حضرت ہاجرہ اور اسماعیل اسی وادی میں رہنے لگے۔ ایک دن قبیلہ جرہم کے کچھ لوگ، اس راستے سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے ایک پرندہ دیکھا جو پانی کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ انھوں نے کہا: "یہ پرندہ پانی کے گرد ہی پرواز کرتا ہے، حالاں کہ ہمیں معلوم ہے کہ اس وادی میں پانی نہیں۔"

انھوں نے اپنے چند آدمیوں کو بھیجا، جنھوں نے زمزم کے چشمے کو دریافت کیا اور واپس جا کر اپنے کارواں کو اطلاع دی۔ جب وہ سب زمزم کے پاس پہنچے، تو وہاں حضرت ہاجرہ اپنے بیٹے کے ساتھ موجود تھیں۔ جرہم کے لوگوں نے پوچھا:

"کیا ہم تمھارے ساتھ یہاں رہ سکتے ہیں؟"

حضرت ہاجر نے جواب دیا: "ہاں، مگر تمھیں اس پانی پر کوئی حق نہیں ہو گا۔"

وہ اس شرط پر راضی ہو گئے۔ حضرت ہاجرہ کو بھی ان لوگوں کا ساتھ بھا گیا، کیوں کہ وہ

تنہائی کے مقابلے میں رفاقت کو ترجیح دیتی تھیں۔ جرہم کے لوگوں نے اپنے خاندانوں کو بھی بلا لیا، اور وہ وہاں مستقل طور پر آباد ہو گئے۔ حضرت اسماعیل بھی کچھ بڑے ہو گئے، انھوں نے جرہم کے لوگوں سے عربی سیکھی اور ایسی سیکھی کہ سکھانے والے دانتوں تلے انگلیاں دبانے پر مجبور ہو گئے۔

قربانی کا امتحان، ایمان کی معراج:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اللہ کے احکام کی مکمل اطاعت کا ایک روشن باب ہے۔ ایک دن، جب وہ اپنے خیمے کے باہر بیٹھے اپنے پیارے بیٹے اسماعیل اور اللہ کی رحمتوں کے بارے میں غور کر رہے تھے، ان کے دل میں اللہ کی نعمتوں کا شکر اور اس کی عظمت کا خوف موجزن تھا۔ ایسے میں ایک آنسو ان کی آنکھ سے ٹپکا، جو اسماعیل سے ان کی محبت کی گواہی دے رہا تھا۔ غنودگی طاری ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک خواب دکھایا اور اپنی سب سے پیاری چیز قربان کرنے کا حکم دیا۔ متواتر کئی بار جب یہ خواب دیکھا تو سمجھ گئے کہ اللہ مجھ سے اسماعیل کی قربانی چاہتا ہے، انھوں نے اپنے بیٹے سے کہا:

”اے میرے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں، تو بتا تیری کیا رائے ہے؟“

حضرت اسماعیل تو اطاعت و فرماں برداری اور صبر و استقامت کا حسین پیکر تھے، والد کریم کی بات سن کر فوراً جواب دیا: ”جو آپ کو حکم دیا گیا ہے، اسے بجا لائیں۔ ان شاء اللہ آپ مجھے صابرین میں سے پائیں گے۔“

حضرت ابراہیم اسماعیل کو عرفات کے پہاڑ پر لے گئے، چھری اور رسی لی۔ اسماعیل نے کہا کہ ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیں تاکہ وہ جدوجہد نہ کریں، اور اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیں تاکہ وہ اپنے بیٹے کی تکلیف نہ دیکھ سکیں۔ ابراہیم نے اپنی آنکھوں پر پٹی باندھی اور اللہ کے حکم کے مطابق چھری چلائی، جب انھوں نے پٹی ہٹائی، تو دیکھا کہ سامنے ایک ذبح شدہ دُنبہ پڑا ہے اور اسماعیل بالکل صحیح سلامت ان کے پاس کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے انھیں لگا

کہ ان سے کوئی غلطی ہوگئی، مگر پھر غیب سے آواز آئی کہ انھوں نے خواب کی تعمیل کر دی ہے۔ اللہ نے ان کی قربانی کو ایک عظیم ذبیحہ (دُنبہ) سے بدل دیا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

”اے ابراہیم! تم نے خواب کی تعمیل کر دی۔ بیشک ہم نیکوکاروں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ یہ ایک کھلا امتحان تھا۔“ (الصافات:104-106)

اللہ نے ابراہیم اور اسماعیل کی اس اطاعت کو آنے والی نسلوں کے لیے ایک عظیم یادگار بنا دیا، اور فرمایا: ”ابراہیم پر سلام ہو! بیشک وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔“

(الصافات:109-111)

یہ قربانی آج عیدالاضحیٰ کی صورت میں ہر سال منائی جاتی ہے، جو ہمیں ایمان، اطاعت اور قربانی کا درس دیتی ہے۔

اسماعیل کی ازواج اور حکمت کا امتحان:

جب حضرت اسماعیل علیہ السلام جوان ہوئے تو جرہم نے ان کا نکاح اپنے قبیلے کی ایک خاتون سے کر دیا۔ حضرت ہاجر کے انتقال کے بعد، حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اور اس کے خاندان سے ملنے مکہ تشریف لائے، مگر اسماعیل علیہ السلام گھر پر نہ تھے۔ انھوں نے اسماعیل کی بیوی سے ان کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اسماعیل روزی کی تلاش میں گئے ہیں۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے ان کے حالات کے بارے میں دریافت کیا، تو اس نے شکایت کرتے ہوئے کہا: ”ہم تنگی اور افلاس میں زندگی گزار رہے ہیں۔“ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ”جب تمھارا شوہر آئے، تو اسے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ وہ اپنے گھر کی دہلیز بدل دے۔“

جب اسماعیل علیہ السلام واپس آئے، تو انھوں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ کیا کوئی آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک بزرگ تشریف لائے تھے، جنھوں نے ان کے حالات کے بارے میں پوچھا اور دہلیز بدلنے کا پیغام دیا۔ اسماعیل علیہ السلام سمجھ گئے کہ یہ ان کے والد تھے اور ان کا اشارہ بیوی کو طلاق دینے کی طرف تھا۔ چناں چہ انھوں نے اسے طلاق دے دی اور

قبیلۂ جرہم کی ایک دوسری خاتون سے نکاح کر لیا۔

کچھ عرصے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام دوبارہ تشریف لائے۔ اس بار بھی اسماعیل گھر پر نہ تھے۔ انھوں نے ان کی نئی بیوی سے حالات دریافت کیے۔ اس نے خوشی سے بتایا: ''ہم خوش حال ہیں اور اللہ نے ہمیں وافر رزق دیا ہے۔'' ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا کہ وہ کیا کھاتے پیتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ گوشت کھاتے ہیں اور پانی پیتے ہیں۔

ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: ''اے اللہ! ان کے گوشت اور پانی میں برکت عطا فرما۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس وقت ان کے پاس اناج نہ تھا، ورنہ ابراہیم علیہ السلام اس میں بھی برکت کی دعا کرتے۔

ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل کی بیوی سے کہا:

''جب تمھارا شوہر آئے، تو اسے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ وہ اپنی دہلیز کو مضبوط رکھے۔''

جب اسماعیل علیہ السلام واپس آئے، تو انھوں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ کیا کوئی آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک بزرگ تشریف لائے، جنھوں نے ان کے حالات کے بارے میں پوچھا اور دہلیز مضبوط رکھنے کا پیغام دیا۔ اسماعیل علیہ السلام نے کہا:

''وہ میرے والد تھے، اور تم ہی وہ دہلیز ہو۔ انھوں نے مجھے تمھیں ساتھ رکھنے کا حکم دیا ہے۔''

یہ واقعہ حکمت اور بصیرت کا ایک ایسا سبق ہے، جو ہمیں سکھاتا ہے کہ گھر کی بنیاد شکر اور صبر پر استوار ہوتی ہے۔

کعبہ کی تعمیر:

کعبہ کی تعمیر ایک ایسی عظیم الشان داستان ہے جس کی عظمت و شان کو وقت کی گرد کبھی دھندلا نہیں سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ کعبہ کئی بار منہدم ہوا اور تعمیر کیا گیا، مگر اس کی روحانی عظمت اور تقدس ہمیشہ برقرار رہا۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے اس مقدس گھر کی

تعمیر میں ایسی محنت اور لگن سے کام کیا کہ ہزاروں انسانوں کی کاوشیں بھی اس کا مقابلہ نہ کر سکیں۔
جب اللہ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا کہ وہ مکہ کی وادی میں ایک گھر تعمیر کریں، تو انھوں نے اپنے بیٹے اسماعیل سے مدد مانگی۔ اسماعیل نے فوراً حامی بھری: "میں آپ کی مدد کروں گا۔"

چناں چہ باپ اور بیٹے نے مل کر ایک بلند ٹیلے پر کعبہ کی بنیادیں اٹھائیں۔ اسماعیل علیہ السلام پتھر لاتے اور ابراہیم علیہ السلام دیواریں بناتے۔ جب دیواریں بلند ہوئیں، تو اسماعیل علیہ السلام ایک پتھر (مقامِ ابراہیم) لائے، جس پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے اور تعمیر جاری رکھی۔ اس دوران دونوں باپ بیٹے پتھر دیتے اور لیتے ہوئے دعا مانگتے رہے:

"اے ہمارے رب! ہماری اس خدمت کو قبول فرما، بے شک تو سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔" (البقرہ:127)

اللہ نے کعبہ کی تعمیر کے وقت کا ذکر قرآن میں نہیں کیا، کیوں کہ اس سے زیادہ اہم اس گھر کو بنانے والوں کی روحوں کی پاکیزگی اور ان کی دعاؤں کی عظمت ہے۔ وہ دعائیں آج بھی کعبہ کے تقدس کا حصہ ہیں، جو ہر حاجی کے دل میں گونجتی ہیں۔

حجرِ اسود، جنت کا تحفہ:

حجرِ اسود، وہ مبارک پتھر جو کعبہ کی جنوب مشرقی دیوار میں جڑا ہے، اپنی عظمت اور تقدس میں بے مثال ہے۔ اس کے بارے میں مختلف روایات ہیں، مگر سب اس کی حرمت اور عزت پر متفق ہیں۔ سب سے معتبر روایت کے مطابق، جب حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہ السلام کعبہ کی تعمیر مکمل کر رہے تھے، تو دیوار میں ایک پتھر کی کمی رہ گئی۔ ابراہیم نے اسماعیل سے کہا کہ وہ ایک مناسب پتھر تلاش کریں۔ اسماعیل پتھر کی تلاش میں نکلے، مگر جب وہ واپس لوٹے تو دیکھا کہ وہ جگہ ایک پتھر سے پر ہو چکی تھی۔ انھوں نے اپنے والد سے پوچھا کہ یہ پتھر کہاں سے آیا۔ ابراہیم نے بتایا کہ یہ پتھر فرشتہ جبرائیل علیہ السلام لے کر آئے ہیں۔
یہ حجرِ اسود جنت سے نازل ہوا تھا، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے

منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''حجرِ اسود جنت سے نازل ہوا، وہ دودھ سے زیادہ سفید تھا، پھر اسے بنی آدم کے گناہوں نے سیاہ کر دیا۔'' (ترمذی:877)

یہ پتھر، جو کبھی جنت کی سفیدی کا مظہر تھا، انسانوں کے گناہوں کی سیاہی سے اسود ہو گیا، مگر اس کی روحانی پاکیزگی اور تقدس آج بھی برقرار ہے۔ حجرِ اسود نہ صرف کعبہ کی زینت ہے، بلکہ وہ نشانی ہے جو مومنوں کو جنت کی یاد دلاتی ہے اور ان کے دلوں کو توحید کے نور سے منور کرتی ہے۔

اسماعیل علیہ السلام کی نبوت:

اللہ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو نبوت کے عظیم منصب سے نوازا۔ انھیں یمن کے قبیلہ عمالیقہ کی ہدایت کا فریضہ سونپا گیا۔ بعض روایات کے مطابق، انھوں نے پچاس سال تک اس قوم کو اللہ کا پیغام پہنچایا۔ کچھ لوگوں ان پر ایمان لائے، کچھ شرک اور کفر پر ڈٹے رہے۔ قرآن پاک میں اللہ نے ان کی نبوت کی تعریف یوں بیان کی:

''اور کتاب (قرآن) میں اسماعیل کا ذکر کرو۔ بیشک وہ وعدے کا سچا تھا، اور وہ رسول اور نبی تھا۔ وہ اپنے گھر والوں اور اپنی قوم کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا، اور اس کا رب اس سے راضی تھا۔'' (مریم:54-55)

اسماعیل علیہ السلام نے ہدایت کا یہ اصول اپنایا کہ پہلے خود دین پر عمل کیا، پھر اپنے گھر والوں کو اس کی تلقین کی، اور آخر میں اپنی قوم کو اللہ کا پیغام پہنچایا۔ ان کی زندگی اطاعت اور ہدایت کا ایک روشن نمونہ تھی۔

وصال:

بعض روایات کے مطابق، حضرت اسماعیل علیہ السلام کا وصال 130 یا 137 سال کی عمر میں ہوا۔ ان کے بارہ بیٹوں نے ان کی نسل کو آگے بڑھایا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی وفات تک

مکہ میں رہے اور انھیں ان کی والدہ حضرت ہاجر کے قریب، مسجد الحرام میں حجرِ اسود کے نزدیک دفن کیا گیا، واللہ اعلم۔ ان کا وصال ہو گیا، مگر ان کی میراث آج بھی کعبہ، زمزم، اور صفا و مروہ کی صورت میں زندہ ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زندگی ہر مومن کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کا توکل، ان کے والد حضرت ابراہیم کی اطاعت، اور ان کی اپنی قربانی اور نبوت کا جذبہ، یہ سب وہ جواہرات ہیں جو تاریخ کے اوراق میں انتہائی نفاست کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہ صرف آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جدِ امجد ہیں، بلکہ ان کی زندگی ایک ایسی کتاب ہے جس کا ہر صفحہ ایمان، صبر، محبت، حکمت، تقدس اور ہدایت کی لازوال داستان بیان کرتا ہے۔ آج جب ہم کعبۃ اللہ کو دیکھتے ہیں، تو وہ ہمیں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عظیم قربانی، حضرت ہاجر کی جدوجہد، اور حضرت ابراہیم کی دعاؤں کی یاد دلاتا ہے۔ زمزم کا چشمہ، صفا و مروہ کی سعی، حجرِ اسود کا تقدس، اور کعبہ کی پاک دیواریں ان کے عظیم ایمان کی گواہی دیتی ہیں۔ کعبہ، جو کئی بار منہدم ہوا اور دوبارہ تعمیر ہوا، آج بھی اپنی روحانی عظمت کے ساتھ قائم ہے، گویا یہ بتاتا ہے کہ ایمان کی بنیادیں کبھی کمزور نہیں پڑتیں۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی داستان حیات ہمیں درس دیتی ہے کہ جب دل اللہ کے سپرد ہو، تو صحرا گلزار بن جاتا ہے، تنہائی رحمتوں کا مسکن بن جاتی ہے، اور ایک بنجر وادی دنیا کا روحانی مرکز بن جاتی ہے۔ یہ داستان ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کی راہ میں کی گئی محنت کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔

(ماہنامہ اشرفیہ جولائی 2025ء میں شائع۔ تحریر: 26/ مئی 2025ء)

(نوٹ: یہ مضمون میرے قلمی نام "ابوالتمش اعظمی" کے تحت شائع ہوا)

تری شان سب سے جدا غوث اعظم

وہ 471 ہجری کی ایک کرامت خیز صبح تھی، جب گیلان کی وادیوں سے ولایت کا آفتاب طلوع ہوا۔ ہواؤں میں ایثار کی خوشبو گھلی، اور ایک ایسا نخلِ نور نمودار ہوا جس کے سائے نے بغداد سے لے کر ہند و خراسان تک دلوں کو فرحت انگیز سایہ بخشا۔ یہ وہی لمحہ تھا جب عبدالقادر کا نام تقدیر کے قلم سے لکھی جانے والی روحانی تاریخ میں ثبت ہوا۔ گیلان یا جیلان کی نسبت سے آپ کو جیلی یا جیلانی کہا گیا، اگرچہ بعض مؤرخین نے بغداد کو بھی مقامِ ولادت قرار دیا ہے، مگر گیلان کی مٹی ہی ہے جس میں آپ کا پہلا نور بکھرا۔

آپ نہ صرف فقہِ حنبلی کے امام تھے، بلکہ مشک بار گلشن حدیث کے رکھوالے، اور سلوک کے پیچیدہ راستوں کے سالک تھے، آپ کے قدموں کے نشان آج بھی قلوبِ عاشقاں کی راہنمائی کرتے ہیں۔

آپ کے والد کے نام میں اختلاف ہے۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ آپ کے والد کا نام عبداللہ تھا اور ''ابوصالح'' کے لقب سے یاد کیے جاتے تھے، بعض دیگر کے نزدیک آپ کے والد موسیٰ بن عبداللہ تھے، جو ''جنگی دوست'' کے خطاب سے پہچانے جاتے تھے۔ مگر دونوں صورتوں میں سچائی یہ ہے کہ وہ صدق و صفا، طہارت و کرامت کے پیکر تھے، اور ان کی روحانی میراث، حضرت شیخ کے قلب میں نور بن کر چمکی۔

نسب کے حوالے سے بھی کئی داستانیں سنائی دیتی ہیں۔ کچھ روایات آپ کو ساداتِ حسنی میں شمار کرتی ہیں، ان کا شجرہ نسب امام حسن بن علی رضی اللہ عنہ تک جا پہنچتا ہے۔ ایرانی محققین بشمول یافعی، صفدی، اور ابنِ عماد نے بھی اس نسبت کو بڑے وثوق سے نقل کیا ہے،

مگر کچھ دیگر اہلِ تحقیق کا کہنا ہے کہ یہ دعویٰ بعد میں آپ کے ایک پوتے، نصر بن ابو بکر نے بغیر کسی معتبر سند کے کیا۔ مگر شیخ کی اپنی آواز، جو قصیدۂ غوثیہ کے دریچوں سے آرہی ہے، اس اعلیٰ نسب کی گواہی دیتی ہے۔ اپنے اشعار میں آپ نے خود کو ساداتِ حسنی قرار دیا، اور بہت سے علمائے انساب نے بھی اس دعوے پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت کی۔

آپ کی والدہ محترمہ فاطمہ بنت ابو عبداللہ تھیں، جنہیں ام الخیر کہا جاتا تھا، وہ زہد کا مجسمہ، عبادت کی پیکر، اور روحانی کشف و کرامات کی امین تھیں۔ ان کا تعلق بھی ان اولیا سے تھا جن کے سجدے زمین کو مقدّس بناتے، اور جن کی خاموشی میں عرفانی صدائیں گونجتی تھیں۔ آپ کی ایک پھوپھی بھی تھیں "ام محمد عائشہ" شب زندہ دار خاتون تھیں اور خلوتوں میں مالکِ حقیقی سے سرگوشیاں کیا کرتی تھیں، ان کی روحانی شان ایسی تھی کہ وقت کے اولیا بھی ان سے کسبِ فیض کیا کرتے تھے۔

سچ تو یہ ہے کہ یہ خاندان نہ صرف علم و معرفت کا مرکز تھا، بلکہ وہ سرچشمہ تھا جہاں سے طریقت کی ندیاں پھوٹیں، اور سلوک کا دریا رواں دواں ہوئے۔

شیخ عبد القادر جیلانی کی ابتدائی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات تو تاریخی دُھند میں چھپی ہوئی ہیں، اور جو کچھ ملتا ہے وہ یا تو غلو سے معمور ہے یا پھر افسانوی رنگ میں رنگا ہوا۔ کچھ روایات میں آپ کی نوجوانی کے وہ سخت ایام بیان کیے گئے ہیں جب آپ عراق پہنچ کر کھنڈرات میں بسر کرتے، اور فاقہ اور پیاس کی ہم نشینی میں گزر کرتے۔ مگر ان اقوال میں حقیقت سے زیادہ سلوک کی علامتی سختی بولتی ہے۔

ہاں، یہ بات واضح ہے کہ آپ نے اٹھارہ برس کی عمر میں بغداد کا رُخ کیا، وہ شہر جو اس دور میں علم و عرفان کا قبلہ تھا۔ وہاں آپ نے نحو، لغت، تفسیر، حدیث، فقہ اور اصول کے گلشنوں میں قدم رکھا۔ اور پھر، علم کی جس راہ پر چلے، اس میں فقر و فاقہ آپ کے ہم سفر بنے، مگر ہمت نہ تھکی، دل نہ ٹوٹا۔ اپنے شب و روز کو علم کی شمع پر پروانہ وار نثار کیا۔

بغداد میں آپ نے یحییٰ بن علی تبریزی سے علومِ ادبیہ، اور ابو سعد مبارک بن علی مخرمی حنبلی سے علم فقہ حاصل کیا۔ انھی مخرمی سے آپ کو خرقۂ طریقت بھی حاصل ہوا، یہ وہ خرقہ تھا جو بعد میں طریقۂ قادریہ کی زنجیر کا پہلا حلقہ بنا۔ اس کے علاوہ آپ نے محفوظ بن احمد کلوذانی، ابوالوفا علی بن عقیل، اور دیگر جلیل القدر علما و مشائخ سے بھی علمِ فقہ حاصل کیا۔ علمِ حدیث کی خوشبو آپ نے احمد بن مظفر تمار، محمد بن حسن باقلانی، جعفر بن احمد سراج، ابوطالب بن یوسف سمیت دیگر محدثین سے کشید کی۔

علم و عرفان کی راہوں پر حضرت عبدالقادر جیلانی کا سفر صرف کتابوں، مدرسوں اور درس گاہوں تک محدود نہ تھا۔ جیسا کہ بتایا گیا، آپ نے نہ صرف ابو سعد مخرمی جیسے جلیل القدر شیخ سے خرقۂ طریقت حاصل کیا، بلکہ دیگر مشائخِ سلوک سے بھی روحانی خوشبو حاصل کی، جن میں حمّاد بن مسلم دبّاس کا ذکر خاص طور پر کیا جاتا ہے۔ دباس وہ بزرگ تھے جن کی صحبت میں حضرت عبدالقادر نے کچھ وقت گزارا، اور وہیں سے طریقت کی کئی راہیں آپ کے قلب پر منکشف ہوئیں۔

شیخ ابو سعد مخرمی، جن کی وفات 513 ہجری میں ہوئی، انھوں نے بغداد کے مشرقی حصے میں واقع "باب الازج" کے مقام پر ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ یہ مدرسہ انھوں نے شیخ عبدالقادر کے سپرد کر دیا، اور پھر تاریخ نے وہ منظر دیکھا جب 521 ہجری میں پہلی مرتبہ آپ نے اسی مدرسہ میں وعظ کی مجلس آراستہ کی۔ یہ صرف مجلس موعظہ نہ تھی بلکہ روح کی پرواز تھی، دلوں کی کھڑکیوں سے اترتی ہوئی روشنی تھی جس کی طرف سیکڑوں نہیں، ہزاروں نہیں، ستر ہزار افراد تک کھنچے چلے آئے، گو یہ عدد مبالغہ ہو، مگر محفلِ وعظ میں خلقِ خدا کی کثرت تو اس سے ثابت ہو ہی جاتی ہے، حقیقتاً آج بھی بغداد کی فضا گواہ ہے کہ ایک مردِ خدا نے دلوں کو بیدار کر دیا
۔

وعظ کی محفلوں میں خلقت کے ہجوم سے جب مدرسے کی حدود تنگ پڑ گئیں تو اس

عظیم مجاہدِ وقت نے شہر کی حدود سے نکل کر سورِ بغداد کے نزدیک وعظ کے اجتماعات منعقد کیے۔ پھر کچھ صاحبِ ثروت مریدوں نے مالی اعانت فراہم کی، اور 528 ہجری میں مدرسے کی توسیع عمل میں آئی۔ اب وہی جگہ، جو ایک چھوٹا سا دینی مرکز تھی، فتوے، تدریس، وعظ اور خطاب کا بحرِ ناپیداکنار بن گئی۔

کہا جاتا ہے کہ آپ کے کلام کا دلوں پر ایسا اثر ہوتا کہ لوگ روتے روتے گناہوں سے تائب ہوتے، اور غیر مسلموں کی کثیر تعداد؛ بعض روایات کے مطابق پانچ پانچ سو سے زائد اہلِ کتاب؛ آپ کی مجلسوں میں کلمۂ حق ادا کر کے اسلام میں داخل ہو جاتے۔ شیخ عبد القادر صرف واعظ نہ تھے، بلکہ آئینہ تھے، جس میں ہر سننے والا اپنا باطن دیکھ لیتا، اور اسے پاک کرنے کی تڑپ لے کر اٹھتا۔ یہ حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے کہ آپ کی مجالس صرف عوامی موعظہ تک محدود نہ تھیں؛ بڑے بڑے علما و فقہا بھی آپ کی نشست میں شریک ہوتے، اور آپ کے لبوں سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے علم کا رزق بنتا۔ یوں آپ کی محفل علم کا سمندر، سلوک کا مدرسہ، اور ہدایت کا آسمان بن گئی۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ عبد القادر جیلانی نے جب بغداد کی گلیوں میں وعظ و تلقین کے دریا بہائے اور ذکرِ خدا سے شہر کی فضا معطر کی، تو اس کے کچھ دنوں بعد یک لخت خلوت گزین ہو گئے۔ بعض روایات کے مطابق، یہ گوشہ نشینی محض طبیعت کی خلوت پسندی نہ تھی بلکہ ایک مجذوبانہ رجعت تھی — بیابانوں کی خاک، کھنڈرات کی خاموشی، اور باطن کی آگ میں تپنے کی ایک شعوری واپسی۔ اسی دورِ خلوت میں آپ نے شیخ حماد دباس کی صحبت اختیار کی اور وہ اسرارِ طریقت جو محض علم سے نہیں بلکہ سوزِ دل سے حاصل ہوتے ہیں، آپ نے انھی کے فیوضِ قدم سے حاصل فرمائے اور پھر، 521 ہجری میں، آپ ایک بار پھر خلوت سے جلوت کی طرف لوٹے، مگر اس بار آپ کا کلام فقط "عالم کا بیان" نہ تھا، بلکہ "ولی کا الہام" بن چکا تھا۔

حضرت عبد القادر جیلانی اپنے وقت کے جلیل القدر حنبلی فقیہ، محدث اور شیخ الاسلام

تھے۔ آپ کا فتوائی دائرہ صرف فقہِ حنبلی تک محدود نہ تھا، بلکہ آپ نے فقہِ شافعی میں بھی فتاوے دیے۔ بغداد کے علما، فقہا، متکلّمین اور عوام الناس سبھی آپ کے حلقۂ درس و فیض میں شریک ہوتے، لوگ آپ سے اصول، تفسیر، حدیث، کلام اور فقہ سیکھتے، اور علم و نور کا ایک مشترک منبع آپ کی زبانِ گویا سے جاری رہتا۔

آپ سے علم حاصل کرنے والوں کی فہرست مختصر نہیں: ابوسعد سمعانی، عمر بن علی قرشی، موفق الدین ابن قدامہ، عبداللطیف قبیطی، محمد بن مبارک قلانسی، یحیٰ بن سعداللہ تکریتی، اور خود آپ کے فرزند عبدالرزاق اور موسیٰ، جنھوں نے اپنے والد کے علم و عرفان کے چراغ کو آگے بڑھایا۔ یہاں تک کہ تاج النساء بنت فضائل بن علی تکریتی جیسی عالمہ خاتون بھی آپ کی مجالسِ حدیث کی مستفیدہ شمار کی گئیں۔

آپ کا دائرۂ تربیت صرف ظاہر کی حدوں تک مقید نہ تھا، وہ سالکانِ راہِ سلوک کے لیے مشعلِ راہ بھی تھے، مرشدِ کامل بھی، اور مربیِ قلوب بھی۔ بہت سے مرید آپ سے خرقہ پا کر خلفا کی صف میں داخل ہوئے اور آپ کی طریقت کو زمانوں میں پھیلایا۔ ان میں شہاب الدین عمر سہروردی اور احمد بن ابوبکر (ابن شبلی زاہد) کے نام درخشاں ستاروں کی مانند ہیں۔

آپ کی طریقت کی بنیاد شریعت کی سخت پاسداری، ذکرِ دائمی، نفیِ نفس، فناء فی اللہ، توحید، تفویض، توبہ، زہد، تفقہ، محبتِ الٰہی، ایثار، دنیا سے قلب کا انقطاع، ریا اور کبر و نفاق جیسے باطنی امراض سے اجتناب پر استوار تھی۔ آپ کے مکتب کی روح سادگی، صداقت اور خدا پر کامل اعتماد تھی۔ طریقۂ قادریہ میں نجات کا راستہ نہ مجازی تصورات سے گزرتا ہے اور نہ خرقِ عادت کے مظاہرے سے، بلکہ یہ ایک مسلسل تزکیۂ نفس، محبتِ ربّ اور اطاعتِ رسول کا نام ہے۔

البتہ یہ بھی سچ ہے کہ آپ کی طرف بعض ایسی شطحیات اور طامات منسوب کی گئیں جنھیں بعض ناقدین نے تنقید کا نشانہ بنایا۔ کچھ نے ان اقوال کو مبالغہ قرار دیا، کچھ نے انھیں عشق کی بے خودی کا مظہر کہا، اور کچھ نے انھیں تصوف پر خلطِ واقعیت کے سائے۔ مگر اہلِ دل

جانتے ہیں کہ جہاں عشق بولتا ہے، وہاں عقل تھوڑی دیر خاموش ہو جاتی ہے۔

شیخ عبد القادر کا تربیتی اسلوب نہایت معتدل تھا۔ اپنے مریدوں کو سماع سے مطلق منع نہیں فرمایا، مگر اس کے لیے ایسے شروط مقرر کیے کہ ذکرِ الٰہی کی مجالس میں کوئی شائبۂ غفلت نہ در آئے۔ آپ کے نزدیک سماع کی روح، قلب میں رب کی یاد کا تلاطم تھی، نہ کہ جسم کی لذت یا وجد کی بے ضابطگی۔ آپ آلاتِ موسیقی کو سماع میں شامل کرنے کو قطعی طور پر غلط سمجھتے تھے اور مجلس میں مشایخ کی حرمت کو لازم قرار دیتے تھے۔ یوں شیخ عبد القادر جیلانی نے ظاہر و باطن، شریعت و طریقت، علم و عمل، اور ذکر و فکر کو ایک ایسے حسین امتزاج میں ڈھالا، جس نے قادری سلسلے کو دوام بخشا۔

شیخ عبد القادر جیلانی نے 561ھ میں وصال فرمایا، اور آپ کو آپ کے اپنے قائم کردہ مدرسے ہی میں سپردِ خاک کیا گیا۔ یہ مدرسہ نہ صرف آپ کی حیات میں علم و ہدایت کا مرکز تھا، بلکہ آپ کی وفات کے بعد بھی علم و روحانیت کا چراغ بن کر روشن رہا۔ آپ کے فرزندان و احفاد نے اسی مدرسے میں تدریسی فرائض سرانجام دیے، اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں سے کئی افراد کو بھی وہیں دفن کیا گیا۔ انھیں مزارات کے مجموعے کو "الحضرۃ القادریۃ" یا "الحضرۃ الکیلانیۃ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جو بغداد کی روحانی تاریخ کا زریں باب ہے۔

شیخ کے وصال کے بعد، مدرسے کے ساتھ متّصل ایک مسجد کی بنیاد بھی رکھی گئی۔ یہ مسجد تاریخ کے کئی نشیب و فراز سے گزری، حتیٰ کہ ہلاکو خان کے حملے (656ھ) میں یہ ویران ہو گئی۔ بعد ازاں، خلافتِ عثمانیہ کے جلیل القدر سلطان سلیمان قانونی (حکومت: 1520–1566ء) کے حکم سے 941ھ میں اس کی از سرِ نو تعمیر کی گئی۔ اس کے بعد سلطان مراد چہارم (حکومت: 1623–1640ء) اور دیگر عثمانی حکام نے مسجد و مدرسہ کی وسعت اور تزئین و آرائش پر خصوصی توجہ دی۔ میناروں، صحنوں، حجرات اور دیگر تعمیرات کا اضافہ اسی دور میں ہوا۔ ان میں مصلیٰ تابستانی، رواق شرقی، منارۂ کبیر، منارۂ صغیر (منارۂ سید سلمان

نقیب)، اور برجِ ساعت قابل ذکر ہیں۔

حضرت عبدالقادر جیلانی کو روحانیات کے افق پر نہایت بلند مقام حاصل ہے۔ متعدّد مآخذ میں انھیں "قطبُ الاولیاء، قدوۃ العارفین، امام الفریقین" اور "قطب الوجود" جیسے القاب سے یاد کیا گیا ہے۔ صوفیانہ روایات میں انھیں کشف و کرامات کا حامل، اور اہلِ دل کا مرشدِ کامل مانا جاتا ہے۔ ابن عربی، یافعی، ذہبی، اور دیگر بلند پایہ مؤرخین نے ان کے روحانی مقام کی گواہی دی ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی نے نہ صرف اپنے وعظ و ارشاد اور روحانی فیوض کے ذریعے اسلامی دنیا کو منور فرمایا، بلکہ کئی گراں قدر تصانیف بھی اپنے پیچھے چھوڑیں، جو صدیوں سے طالبانِ حق کے لیے رہنما چراغ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

آپ کی معروف تصانیف میں سرِفہرست:

▫ "الغنية لطالبي طريق الحق" ہے، جو راہِ حقیقت کے جویاؤں کے لیے قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ کتاب پہلی بار 1288ھ میں قاہرہ اور مکّہ میں زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔

اسی طرح آپ کے وعظ و نصائح پر مشتمل:

▫ "الفتح الرباني و الفيض الرحماني" ہے، جسے "ستین مجالس" بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی پہلی اشاعت 1318ھ میں قاہرہ میں ہوئی۔

دیگر کتب میں "سر الأسرار و مظهر الأنوار فيما يحتاج إليه الأبرار" اور "آداب السلوك والتوصل إلى منازل الملوك" شامل ہیں، جن میں دوسری کتاب 1281ھ میں استنبول سے شائع ہوئی۔

▫ "الفيوضات الربانية في المآثر و الأوراد القادرية" مطبوعہ مصر۔

▫ "فتوح الغيب" مطبوعہ قاہرہ و استنبول 1357ھ۔

▫ "ملفوظات قادریہ"

▪ "يواقيت الحكم"

▪ "بشائر الخيرات" (درودِ نبوی کے صیغوں پر مشتمل، مطبوعہ بولاق 1292ھ واسکندریہ 1304ھ)

یہ کتب بھی قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ —

▪ "جلاء الخاطر فی الباطن والظاهر" بھی آپ کے عرفانی مکاشفات کا مجموعہ ہے۔

بعض مآخذ میں آپ سے منسوب دیگر تصانیف کا بھی ذکر ملتا ہے، جیسے:

- "معراج لطیف المعانی"
- "مراتب الوجود"
- "تحفۃ المتقین وسبیل العارفین"
- "جواہر الرحمن"
- "الکبریت الأحمر"
- "مثنوی فتوح الحرمین"
- "ہادی السلوک"۔

اگرچہ ان میں بعض کی نسبت حضرت شیخ سے قطعی ثابت نہیں۔

ابنِ کثیر جیسے محققین اس امر کے قائل ہیں کہ شیخ عبدالقادر کی تصانیف علم و حکمت سے لبریز ضرور ہیں، مگر ان میں بعض ضعیف یا موضوع احادیث کا احتمال بھی پایا جاتا ہے۔

تحریری آثار کے علاوہ، شیخ کے عارفانہ اقوال اور ملفوظات بھی معروف ہیں۔ یافعی نے اپنی تصانیف "نشر المحاسن" اور "خلاصۃ المفاخر" میں ان میں سے بہت سے اقوال کو محفوظ کیا ہے۔

شیخ عبدالقادر جیلانی اہلِ سخن بھی تھے۔ فارسی اشعار میں وہ "محی" تخلص کرتے تھے، اور ان کے اشعار "دیوانِ غوثِ اعظم" یا "دیوانِ محیی گیلانی" کے نام سے معروف ہیں۔

مؤرخین کے مطابق آپ کی 49 اولادیں تھیں، 27 صاحب زادے اور 22 صاحب زادیاں۔ ان میں سے چند معروف نام درج ذیل ہیں:

• محمد ابوالفضل • عبداللہ • عبدالرزاق • عبدالعزیز • عبدالوھاب • موسیٰ • اور عیسیٰ۔

آپ کی نسل اور ذریہ پر مبسوط کتب بھی تحریر کی گئیں، جن میں:

• "ضم الأزهار إلى تحفة الأبرار" از: محمد سعدی ازہری جیلانی۔ اور

• "شمس المفاخر في ذكر ذرية سلطان الأولياء" از: محمد بن محمد نجشی حلبی، قابل ذکر ہیں۔

شیخ عبد القادر جیلانی کے روحانی مرتبے اور کرامات پر سیکڑوں کتب تحریر کی گئیں، جن میں سے چند مشہور یہ ہیں:

•مناقب الشيخ عبدالقادر الجيلاني •الأشراف على نسب الأقطاب الأربعة •اسنى المفاخر •بهجة الأسرار و معدن الأنوار •قلائد الجواهر •الجنى الداني فى مناقب الجيلاني •الروض الزاهر •خلاصة المفاخر •نشر المحاسن الغاليه •نزهة الخاطر الفاتر • قصيدة الباز الاشهب •گلدستۂ کرامات، وغیرہ.

یہ تمام آثار اور مناقب، حضرت غوث الاعظم کی ہمہ گیر شخصیت، ان کی علمی رفعت، روحانی جاذبیت، اور امتِ مسلمہ میں ان کے گہرے اثرات کا شاہکار مظہر ہیں۔ اللہ جل شانہ ہمیں اور آپ کو حضور غوث اعظم رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیمات و تحریرات سے مستفیض ہونے کی توفیق عطا فرمائے اعور فیوضاتِ غوثیہ سے مالامال فرمائے۔ آمین

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ اکتوبر 2025ء)۔

(تحریر: اگست 2025ء)

ایمان کامل کی عملی تصویر

جلالۃ العلم حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان

اسلام کی روح ''ایثار'' اور ''خدمتِ خلق'' سے عبارت ہے۔ قرآنِ کریم میں مومنین کی جن صفات کو بلند مرتبہ عطا کیا گیا ہے، اُن میں ایک نمایاں صفت یہ بھی ہے:

وَيُؤْثِرُونَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ. (الحشر:9)

یعنی وہ اپنی حاجت کے باوجود دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ جل شانہ نے مومنین کی جو یہ صفت بیان فرمائی اصل میں یہ ایمان کی پختگی اور انسانیت کی معراج ہے۔ ہمارے آقا و مولا نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

والذي نفسُ مُحَمَّدٍ بيدِهِ لا يُؤْمِنُ أحدُكُم حتى يُحِبَّ لِأَخِيهِ ما يُحِبُّ لنفسِهِ من الخيرِ. (النسائی:5017)

''قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں محمد (ﷺ) کی جان ہے! تم میں سے کوئی شخص (اس وقت تک کامل) مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لیے وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے، یعنی ہر بھلائی۔''

یہ حدیثِ مبارک در اصل صرف اخلاقی تعلیم تک محدود نہیں بلکہ ایک ایسا روحانی پیمانہ ہے جس سے کسی کے ایمان کا درجہ پرکھا جا سکتا ہے۔ اس پیمانے پر اگر ہم ماضی قریب کے ہندوستانی علما چند برگزیدہ ہستیوں کو پرکھیں تو یقیناً ان میں جلالۃ العلم حضور حافظ ملے

علامہ عبد العزیز محدث مراد آبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کا نامِ نامی ابھر کر سامنے آتا ہے۔ بلا شبہہ حافظ ملت علیہ الرحمہ نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی حدیث کے عملی سانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔

حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی ذات علم، حلم، زہد اور سخاوت کا حسین امتزاج تھی۔ آپ کی زندگی کا مطالعہ اس حقیقت کو آشکار کرتا ہے کہ آپ کا ہر عمل، ہر فیصلہ اور ہر جذبہ "میں" سے زیادہ "ہم" کے احساس سے معمور تھا۔ آپ نے اپنی ذات کو امت کے لیے وقف کر دیا تھا۔

دنیاوی مال و دولت سے بے نیاز رہتے ہوئے بھی آپ کے دروازے پر ہمیشہ ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا۔ نہ کوئی محروم لوٹتا، نہ کسی کو واپس جانے کا دکھ دیا جاتا۔ اپنے آرام، اپنی آسائش، حتیٰ کہ اپنے لباس اور خوراک تک میں آپ نے دوسروں کو مقدم رکھا۔ یہ وہ صفت ہے جو صرف واعظانہ تعلیم سے نہیں بلکہ دل کے ایمان سے پیدا ہوتی ہے۔

حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کا طرزِ حیات اس بات کی عملی تفسیر تھا کہ "مومن وہ ہے جو اپنے بھائی کے لیے وہی چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے"۔ آپ کی طبیعت میں دوسروں کو خوش دیکھنے کا ایک فطری ذوق موجود تھا۔ اگر کسی عالمِ دین، طالبِ علم یا دین کے لیے کام کرنے والے کسی رضا کار کو مالی تنگی کا سامنا ہوتا تو آپ حتی المقدور تعاون پیش فرماتے۔ آپ کی حیات کا مطالعہ کرنے سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ آپ اپنے لیے خرچ کرنے سے زیادہ دوسروں پر خرچ کرنے میں روحانی لذت و مسرت محسوس کرتے تھے۔ جب کبھی کسی محتاج کی خبر ملتی تو آپ کی آنکھوں میں خوشی کی ایک خاص چمک پیدا ہوتی۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ:

"خوشی وہ نہیں جو ہم اپنی ذات کے لیے حاصل کریں، بلکہ وہ ہے جو کسی دوسرے کے چہرے پر مسکراہٹ بن کر ظاہر ہو۔"

حافظِ ملت علیہ الرحمہ کے وصال کے بعد جب اُن کے ذاتی کمرے سے ایک پرانی

ڈاک کی گٹھری ملی، تو اس نے آپ کے خاموش ایثار کی وہ داستانیں بیان کیں جس کا ذکر تک انھوں نے کبھی کسی سے نہیں کیا تھا۔ اُن خطوط میں ملک بھر کے علما، مدرسین، طلبہ اور خدامِ دین کے شکریے نامے شامل تھے، جن میں انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ حافظِ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان نے اُن کی مالی و اخلاقی مدد فرمائی۔ یہ گٹھری ایک ایسا آئینہ تھی جس میں حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کے باطنی حسن کی جھلک نظر آتی تھی۔ انھوں نے سخاوت و فیاضی کو کبھی نمائش کا ذریعہ نہیں بنایا، بلکہ بسا اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ جن کے لیے خرچ کیا، ان پر بھی ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ کسی کے احسان کے زیرِ سایہ ہیں۔ یہی خلوص، یہی بے غرضی آپ کے اخلاق کا بنیادی ستون تھا۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

خيرُ الناسِ أنفعُهم للناسِ. (المعجم الاوسط:5787)

یعنی سب سے بہتر انسان وہ ہے جو لوگوں کے لیے سب سے زیادہ نفع بخش ہو۔

حافظِ ملت علیہ الرحمہ نے اسی نبوی تعلیم کو اپنے دائرۂ عمل کا محور بنایا۔

یقیناً آپ کی پوری زندگی خلوص و للّٰہیت سے مرقع تھی۔ دارالعلوم اشرفیہ کی بنیاد ہو یا طلبہ کے قیام و طعام کا انتظام، فقرا و مساکین کی خبرگیری ہو یا مساجد و مدارس کی تعمیر، ہر شعبے میں آپ نے اپنے وسائل اور اثر و رسوخ کو دین کی خدمت کے لیے استعمال کیا۔

آپ کے بیش تر تلامذہ کا بیان ہے کہ بارہا مدرسے کے اخراجات کے لیے مختص رقم ختم ہو جاتی مگر آپ تعلیم و تعلم پر اثر نہ آنے دیتے اور اکثر اوقات اپنا ذاتی اثاثہ بیچ کر نظامِ تعلیم کو جاری رکھتے۔ کبھی آپ نے کسی ذاتی مفاد کے لیے کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کیا، البتہ جب دوسروں کی ضرورت سامنے آئی تو آپ نے اپنی قلیل جمع پونجی بھی خوشی سے لٹا دی۔

تصوف کے زاویے سے دیکھا جائے تو ایثار دراصل "نفس کے فنا ہونے" کی علامت ہے۔ جب انسان اپنی خواہشات سے اوپر اٹھ جاتا ہے اور دوسروں کے لیے جیتا ہے، تو وہ

دراصل ''محبتِ الٰہی'' کے حقیقی مفہوم کو پالیتا ہے۔ حافظِ ملت علیہ الرحمہ اسی ''فنافی الاخلاق'' کے مقام پر فائز تھے۔ ان کے دل میں مخلوقِ خدا کے لیے درد و محبت کا دریا موجزن تھا، خدمتِ خلق کو قربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے فرمایا تھا:

''اگر تم چاہتے ہو کہ تمھاری دعا قبول ہو تو کسی کی حاجت پوری کر دو۔''

حافظِ ملت علیہ الرحمہ سخاوت کے ساتھ ساتھ سادگی بھی بے مثال تھے۔ آپ کے کپڑے عام کپڑے تھے، خوراک عام لوگوں جیسی، مگر دل میں شاہانہ سخاوت تھی۔ آپ کے خدام نے بیان کیا کہ اکثر آپ اپنی چادر کسی غریب طالبِ علم یا مسافر کو دے دیتے اور خود پرانی اوڑھ لیتے۔ کبھی کسی نعمت کو اپنی ملکیت نہیں سمجھا۔ فرمایا کرتے تھے:

''یہ سب کچھ اللہ کا ہے، ہم تو صرف اس کے امین ہیں۔''

یہ طرزِ فکر دراصل اسلامی معاشرت کا وہ گمشدہ جوہر ہے جو سماجی عدل و محبت کی بنیاد بنتا ہے۔ حافظِ ملت علیہ الرحمہ نے اس جوہر کو اپنی زندگی میں زندہ رکھا۔ ان کا یہ جذبہ صرف فردی عمل نہیں تھا بلکہ ایک سماجی تحریک کی بنیاد بھی تھا۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور مریدوں کو یہی گوہر نایاب دیا کہ ''خدمتِ دین'' کا مطلب صرف تدریس نہیں، بلکہ عوام و خواص کی فلاح کا ہر ممکن ذریعہ اختیار کرنا ہے۔

--*--*--*--

دنیا کے تعلیمی اور روحانی نظاموں میں استاد اور شاگرد کے تعلق کی نوعیت ہمیشہ بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ مگر جب ہم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی سیرت کے آئینے میں اس تعلق کو دیکھتے ہیں تو وہ عام معلم اور متعلم کے رشتے سے بہت آگے بڑھ کر ایک پدرانہ اور روحانی نظامِ تربیت کی صورت نظر آتے ہے۔ اس بات میں کوئی شک و شبہہ نہیں کہ اسلامی تعلیم کا جوہر صرف علم کا حصول نہیں بلکہ انسان کی مکمل تربیت ہے۔ قرآنِ مجید نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کو بیان کرتے ہوئے فرمایا:

وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيْهِمْ ؕ

(البقرۃ:129)

ترجمہ:"انہیں تیری کتاب اور پختہ علم سکھائے اور انھیں خوب ستھرا فرمادے"

اسی قرآنی معیار کو اگر کسی نے برصغیر کے علمی ماحول میں حقیقی رنگ دیا تو وہ حافظِ ملت علیہ الرحمہ تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم صرف ذہن کی غذا نہیں بلکہ روح کی طہارت کا ذریعہ بھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ملت کا نظامِ تدریس روایتی حلقے سے آگے بڑھ کر "تربیتِ انسانیت" کا ایک جامع ادارہ بن گیا۔

رئیس القلم حضرت علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ نے جو تبصرہ کیا ہے، وہ حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی شخصیت کا نہایت گہرا تجزیہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ عام طور پر استاد و شاگرد کا رشتہ حلقۂ درس تک محدود ہوتا ہے، مگر حافظِ ملت علیہ الرحمہ کے یہاں یہ دائرہ پورے انسانی وجود کو محیط تھا۔ شاگرد ان کے پاس محض کتابیں پڑھنے نہیں آتا تھا، بلکہ اپنی پوری زندگی کی سمت متعیّن کرنے آتا تھا۔

حافظِ ملت علیہ الرحمہ کا طرزِ تعلیم اس بات کا مظہر تھا کہ وہ علم کو زندگی کے عمل سے جوڑتے تھے:

- اگر شاگرد درس میں ہوتا تو آپ اُس کے علمی شعور کی آبیاری کرتے،
- اگر وہ مجلس میں بیٹھتا تو اخلاق و آداب کی تربیت دیتے،
- اگر بیمار ہوتا تو روحانی علاج کرتے،
- اگر تنگ دست ہوتا تو مالی مدد کرتے،
- اگر فارغ التحصیل ہوتا تو روزگار دلانے تک ساتھ دیتے،
- اور شادی بیاہ، گھریلو مسائل یا معاشرتی الجھنوں میں بھی ایک مشفق اور مہربان باپ

کی طرح مشورہ اور معاونت فرماتے۔

حافظِ ملت علیہ الرحمہ کا یہ امتیاز ہے کہ آپ کے درس گاہ سے نکلنے والے طلبہ نہ صرف علم میں ممتاز ہوتے تھے بلکہ اخلاق، تہذیب، اور خدمتِ خلق کے عملی نمونے بھی تھے۔ اکثر اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کرتے "علم بغیر عمل کے بے روح ہے، اور عمل بغیر اخلاق کے بے اثر"، یہی وجہ تھی کہ شاگردوں کو محض عبارت خوانی نہیں سکھاتے تھے بلکہ ان کے دلوں میں دینی حمیت، اخلاقی غیرت، اور انسانی محبت کے چراغ روشن کرتے تھے۔ ان کے طرزِ تربیت کے چند پہلو جو علامہ ارشد القادری کی تحریروں سے ابھر اور نکھر کر سامنے آتے ہیں، درج ذیل ہیں:

▫ حافظِ ملت علیہ الرحمہ کتاب پڑھاتے وقت طلبہ کے مزاج، فہم اور روحانی کیفیت پر بھی نگاہ رکھتے۔ وہ فرماتے تھے:

"کتاب کو پڑھانا آسان ہے، مگر دلوں کو پڑھنا استاد کا اصل کمال ہے۔"

▫ اگر کوئی شاگرد درس سے باہر غیر ذمہ دارانہ طرزِ عمل اختیار کرتا تو آپ خاموشی سے اصلاح فرماتے، نصیحت میں سختی نہیں بلکہ محبت کا لہجہ اختیار کرتے تاکہ شاگرد ندامت کے بجائے شعورِ اصلاح سے بہرہ مند ہو۔

▫ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ روحانی و جسمانی علاج کے بھی ماہر تھے، طلبہ اگر بیمار ہوتے تو آپ خود تیمارداری فرماتے۔ بعض اوقات قرآن کی آیات سے تعویذ لکھ کر دیتے، اور فرماتے: "قرآن دوا بھی ہے، دعا بھی۔"

▫ آپ کے پاس کوئی طالبِ علم مالی تنگی میں آتا تو آپ اپنا ذاتی خرچ روک کر اُس کی مدد کرتے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے کئی غریب طلبہ کو عالمِ دین بنایا، اور ان کے ذریعے ملک بھر میں علم کے چراغ روشن ہوئے۔

▫ ان کی نگاہ شاگرد پر اُس وقت بھی رہتی جب وہ فارغ التحصیل ہو کر کسی مدرسے یا

علاقے میں خدمت پر مامور ہوتا۔اگر کسی کو تدریسی یا معاشی دشواری پیش آتی تو حافظِ ملت علیہ الرحمہ فوراً اُس کی خبرگیری کرتے، مشورہ دیتے، اور عملی مدد فراہم کرتے۔

اصل میں حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی تربیت محض ادارہ جاتی نہیں بلکہ روحانی تزکیہ پر مبنی تھی، ان کا ماننا تھا کہ علم کے دروازے کھولنے سے پہلے دل کے دروازے کھولنا ضروری ہیں، اسی لیے وہ شاگردوں کے ساتھ تزکیۂ نفس، مراقبہ، ذکر، اور خدمت خلق کو بھی تربیت کا حصہ بناتے تھے۔

علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ کے بقول، حافظِ ملت علیہ الرحمہ کا طرزِ تربیت ایسا تھا کہ پوری درس گاہ اُن کے قلب و نظر کے دائرے میں سمائی ہوئی تھی، ہر شاگرد کو محض کسی درخت کی شاخ نہیں بلکہ ایک مکمل باغ سمجھتے تھے جس کی نشوونما اُن کی ذمہ داری تھی، اسی وصف نے انھیں اپنے معاصرین میں ممتاز بنایا۔ دوسرے اساتذہ تو صرف درس تک محدود رہتے تھے، لیکن حافظ ملت علیہ الرحمہ زندگیاں بناتے تھے، اسی لیے ان کی درس گاہ سے نکلنے والا ہر شاگرد ایک جیتی جاگتی درسی کتاب اور خدمتِ دین کا علم بردار بن کر نکلا۔

آج جب تعلیم کا مقصد صرف حصولِ معاش تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی سیرت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ

”اصل تعلیم وہ ہے جو انسان کو انسان بنائے“۔

آپ کا تربیتی فلسفہ جدید دنیا کے لیے ایک مثالی ماڈل ہے جس میں؛علم، اخلاق، روحانیت، اور سماجی ذمہ داری کا حسین امتزاج موجود ہے۔ اگر موجودہ مدارس اور جامعات حافظِ ملت علیہ الرحمہ کے اس ماڈل کو اپنائیں تو یقیناً نئی نسل میں نہ صرف علم کا ذوق بیدار ہو گا بلکہ اخلاق و خدمت کا جذبہ بھی پروان چڑھے گا۔

–٭–٭–٭–

اللہ کے مقرب بندوں کی زندگی اس حقیقت کی عملی تفسیر ہوتی ہے کہ ایمان صرف

لفظوں کا نہیں بلکہ اعمال اور استقامت کا نام ہے۔ یہ استقامت اُس وقت سب سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے جب انسان سہولیات سے محروم، بیماری میں مبتلا، یا آرام کے مواقع سے دور ہو، یہی وہ مواقع ہوتے ہیں جب ایمان کی اصل چمک ظاہر ہوتی ہے، اور یہی چمک ہمیں حافظِ ملت علامہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کی حیاتِ طیبہ میں بدرجۂ اتم نظر آتی ہے۔

حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی پوری زندگی دینِ متین کی خدمت، علمِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی اشاعت، اور سنیت کی آبیاری کے لیے وقف تھی۔ آپ کے اوقات درس و تدریس، تصنیف و تالیف، تبلیغ و اصلاح، اور تربیت و تنظیم کے کاموں میں گزرتے۔ مسلسل محنت، قلیل آرام، اور غیر معمولی مشغولیت آخر کار آپ کے جسمِ نازنین کو بیماری کی طرف لے گئی، لیکن کمال تو یہ ہے کہ کوئی بیماری آپ کے عزم و ارادہ کو مضمحل نہ کر سکی۔ ڈاکٹروں نے سختی سے آرام کا حکم دیا، مگر آپ کے لیے آرام کا مفہوم کچھ اور تھا، فرماتے تھے:

"آرام مجھے اس وقت ملتا ہے جب دل کو اطمینان ہو کہ کوئی طالبِ علم بغیر سبق کے واپس نہیں گیا، اور کوئی دینی ضرورت بغیر جواب کے نہیں رہی۔"

یہ جذبۂ خدمتِ دینِ متین آپ کے وجود کا سرمایہ اور آپ کی بیماری میں بھی قوت کا سرچشمہ تھا۔

جب بیماری نے شدت اختیار کی تو وہ لمحے اطاعت اور محبتِ الٰہی کے امتحان تھے۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے نہ شکایت کی، نہ غم کا اظہار، بلکہ ہر تکلیف پر اللہ جل شانہ کا شکر ادا کیا۔ تلامذہ بیان کرتے ہیں کہ:

"جب بھی ہم تیمارداری کے لیے حاضر ہوتے تو
آپ کے چہرے پر تبسم ہوتا اور زبان پر الحمدللہ۔"

بیماری کی شدت میں اہلِ خاندان نے التجا کی کہ: "حضور! اس رمضان میں روزے چھوڑ دیجیے، بیماری بڑھ جائے گی، کمزوری لاحق ہو چکی ہے۔" مگر آپ نے فرمایا:

”زندگی اور صحت دونوں اللہ کی عطا ہیں۔

جب تک ہوش ہے، میں اس فرض کو ترک نہیں کروں گا۔“

اس طرح آپ نے رمضان المبارک کے پورے مہینے میں ایک دن کا بھی روزہ قضا نہ کیا۔ بلکہ کمال تو یہ کہ اسی حالت میں تراویح میں قرآنِ کریم کا ختم بھی فرمایا ۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک عبادت صرف جسمانی عمل نہیں بلکہ روحانی عہد ہے، جو بیماری یا آرام سے مشروط نہیں بلکہ ایمان سے وابستہ ہے۔

حافظِ ملت علیہ الرحمہ کا معمول تھا کہ بیماری کے باوجود بھی نماز باجماعت کے لیے اہتمام کرتے، اگر کبھی ضعف کی شدت سے مسجد تک نہ جاسکتے تو مکان پر باجماعت نماز قائم فرماتے۔ فرائض کی ادائیگی میں اُن کی احتیاط اس قدر تھی کہ اگر کسی عمل کے ترک کا اندیشہ ہوتا تو آپ قلبی اضطراب محسوس کرتے۔ان کی عبادت میں محض رسم نہیں بلکہ عشق و شعور تھا۔ جب کوئی شاگرد یہ کہتا کہ ”حضور! کچھ دیر آرام فرما لیجیے۔“ تو آپ فرماتے: ”عبدالعزیز کا آرام عبادت میں ہے، غفلت میں نہیں۔“

یہی کیفیت در اصل عشقِ عبادت ، اس کیفیت میں بندہ جسمانی راحت کے مقابلے میں روحانی راحت کو ترجیح دیتا ہے۔ اور یہی وہ درجہ ہے جسے عرفانِ الٰہی کی منازل میں ”عبادت فی المحبۃ“ کہا جاتا ہے، یعنی وہ عبادت جو محض محبت کے جذبے سے ادا کی جائے، نہ کہ عادت یا مجبوری سے۔

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ اکثر فرمایا کرتے:

”جو بندہ بیماری میں عبادت کرتا ہے،

وہ صحت میں بھی اللہ کی رحمت کے سائے میں ہوتا ہے۔“

آپ کی اس استقامت نے شاگردوں اور معتقدین پر گہرا اثر چھوڑا، وہ دیکھتے تھے کہ ایک بزرگ، جس کے جسم میں ضعف ہے، پھر بھی عبادت، تدریس اور خدمتِ دین سے

پیچھے نہیں ہٹتا۔ یہ منظر اُن کے دلوں میں ایک نئی روح پھونک دیتا۔

حافظِ ملت علیہ الرحمہ کا یہ طرزِ عمل دراصل اُس سنتِ نبوی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا تسلسل تھا جس میں حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے سخت بیماری کے باوجود عبادت اور امت کی خبرگیری جاری رکھی، اور فرمایا:

"الصلاةَ الصلاةَ وما ملكت أيمانكم."

"نماز! نماز! اور اپنے ماتحتوں کے حقوق کا خیال رکھو۔"

حافظِ ملت علیہ الرحمہ اس پیغام کے عملی مظہر تھے۔ آپ نے بیماری میں بھی عبادت، روزہ، قرآن، اور خدمتِ دین کو ترک نہ کیا۔ اس ان کی سیرت اس حقیقت کا اعلان کرتی ہے کہ "بیماری بندگی کا عذر نہیں، بلکہ بندگی کا امتحان ہے"۔

اگر ہم حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی اس کیفیت کو روحانی تناظر میں دیکھیں تو یہ دراصل "رضائے الٰہی" کے مفہوم کی عملی تصویر ہے، جب بندہ اپنے رب کی رضا پر راضی ہو جائے تو جسم کی کمزوری بھی عبادت میں رکاوٹ نہیں بنتی۔ یہ "مقامِ صبرِ جمیل" اور "موضعِ عبادتِ خالصہ" ہے، جہاں بندہ صرف خدا کے لیے جیتا اور عبادت کرتا ہے، خواہ حالات کیسے بھی ہوں۔

غرض حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی حیات مبارکہ کا ہر پہلو امت کے لیے ایک زندہ سبق ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اور آپ کو ان کی حیاتِ طیبہ سے حاصل ہونے والے درس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین (آمین)

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ دسمبر 2025ء)

(تحریر نومبر 2025ء)

عہدِ حاضر کے اہم مسلم سائنس داں

----***اقرابی بی***----

اقرابی بی قائداعظم یونیورسٹی پاکستان میں بی ایس بائیوکیمسٹری کی طالبہ ہیں۔ وہ YOLO میں اکیڈمک سکریٹری کے طور پر خدمات انجام دے رہی ہیں اور مختلف غیر منافع بخش تنظیموں کی ایونٹ مینجمنٹ ٹیم کا حصہ بھی ہیں۔ فطری طور پر اردو شاعری سے وابستگی ہے، عمدہ اشعار کہتی ہیں اور اپنے یوٹیوب چینل "حرف جنون" کے ذریعے اردو شعروادب کی ترویج واشاعت میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ علمی و ادبی کتابوں کے مطالعے کا بہترین ذوق رکھتی ہیں اور اردو ناولوں سے انھیں خاص شغف ہے۔

محترمہ اقرابی بی کا یہ مضمون "سائنس میگزین" کے شمارہ 12 مارچ 2025 میں **Inspiring minds; Muslim Scientists of the modern era** کے عنوان سے شائع ہوا، بزم دانش کے موضوع کی مناسبت سے ہم اس مضمون کا اردو ترجمہ شائع کر رہے ہیں۔ (مہتاب پیامی)

ماضی کی طرح آج بھی مسلمان سائنس کے اہم شعبوں میں اپنی اختراعات و ایجادات اور تحقیقات کے سبب نمایاں ہیں، یہاں ہم عہدِ حاضر کے بعض مسلم سائنس دانوں کا مختصر تعارف اور ان کے کارنامے زیرِ بحث لائیں گے۔

ڈاکٹر نذیر خواجہ :

ڈاکٹر نذیر خواجہ ایک مشہور پاکستانی ماہر فلکیات ہیں جو وزیر آباد، پنجاب میں مقیم ہیں۔ ایک متوسط گھرانے میں پلے بڑھے، زندگی میں مالی مشکلات بھی آئیں لیکن ان مشکلات نے انھیں بڑا سوچنے سے کبھی نہیں روکا۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے خلائی سائنس میں ماسٹرز کیا اور فلکیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکینڈینیویا کا رخ کیا۔ ڈاکٹر خواجہ نے وہاں پی ایچ ڈی کے دوران ہی جیو سائنسز میں جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں، ناسا کے مشن کیسینی کے لیے کام شروع کیا۔ انھوں نے ایسٹروبائیولوجی نیٹ ورک آف پاکستان (ABNP) قائم کیا، جس میں پاکستان کے طلبہ اور پیشہ ور افراد کے ساتھ جرمن اور امریکی سائنسدان بھی شامل ہیں۔

ان کی اہم کامیابیوں میں سے ایک فری یونیورسٹی برلن میں اپنے ساتھی کارکنوں کے ساتھ، زحل کے چاند میں سے ایک Enceladus میں ضروری نامیاتی مالیکیولز کی دریافت ہے۔ رائل فلکیاتی سوسائٹی (MNRAS) کے ماہانہ نوٹس میں شائع ہونے والی یہ اہم تحقیق مانی گئی۔ ان کی یہ تحقیق امریکہ اور جرمنی کے عالمی معیار کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم کے ساتھ ناسا کیسینی مشن کے ذریعہ انکشاف کردہ اعداد و شمار کے مطالعہ کا حصہ ہے۔

2019 میں، ڈاکٹر خواجہ کو NASA کی طرف سے Cassini's Cosmic Dust Analyzer (CDA) کے لیے "گروپ اچیومنٹ ایوارڈ" سے نوازا گیا۔ یورپی آسٹروبائیولوجی نیٹ ورک ایسوسی ایشن نے بھی انھیں 2018 میں "ہارنیک بریک ایوارڈ" سے نوازا تھا۔

مریم مرزاخانی:

مرزاخانی، ایک ایرانی ریاضی دان اور سٹینفورڈ یونیورسٹی میں ریاضی کی پروفیسر ہیں، وہ 12 مئی 1977 کو تہران، ایران میں پیدا ہوئیں۔ تہران کے فرزنیگان اسکول سے انھوں

نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ وہ نیشنل آرگنائزیشن فار ڈویلپمنٹ آف ایکسپیشنل ٹیلنٹ (NODET) کا حصہ تھیں۔ انھوں نے ٹورنٹو، اونٹاریو، کینیڈا اور ہانگ کانگ میں منعقدہ ایرانی نیشنل اولمپیاڈ اور کئی دیگر بین الاقوامی ریاضی اولمپیاڈ میں سونے کا تمغہ جیتا تھا۔ محض 17 سال کی عمر میں اتنی بڑی کامیابی حاصل کرنے والی پہلی ایرانی خاتون ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

1999 میں، انھوں نے شریف یونیورسٹی آف ٹیکنالوجی سے ریاضی میں بیچلر کی ڈگری حاصل کی۔ اس نے شور کے تھیورم کے لیے ایک سادہ سا ثبوت تیار کیا جس کے لیے اسے امریکن میتھ میٹیکل سوسائٹی سے تسلیم کیا گیا۔ 2004 میں ہارورڈ یونیورسٹی سے انھوں نے اپنی پی ایچ ڈی مکمل کی۔

مرزاخانی نے ریاضی کے انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ فیلو اور 2004 میں پرنسٹن یونیورسٹی میں بطور پروفیسر خدمات انجام دیں۔ مرزاخانی کی تحقیق بنیادی طور پر ٹیچملر تھیوری، ہائپر بولک جیومیٹری، ایرگوڈک تھیوری، تھیوری آف موڈیولی اسپیس آف ریمن سرفیسز، اور سمپلیکٹک جیومیٹری پر مرکوز تھی۔ مرزاخانی کو 2005 میں پاپولر سائنس کے چوتھے سالانہ "Brilliant 10" میں اعزاز سے نوازا گیا۔ 13 اگست 2014 کو انھیں ریاضی کے سب سے باوقار ایوارڈ "فیلڈز میڈل" سے بھی نوازا گیا۔

"ریمن کی سطحوں" کی حرکیات اور جیومیٹری اور ان کی ماڈیولی اسپیس میں اپنی شاندار شراکت کی وجہ سے دور حاضر کے ریاضی دانوں میں انھیں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

14 جولائی 2017 کو محض 40 سال کی عمر میں کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر کیلیفورنیا کے سٹینفورڈ ہسپتال میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ڈاکٹر یار جان عبد الصمد بلوچ :

ڈاکٹر یار جان عبد الصمد، پاکستان کے پہلے خلائی سائنسدان ہیں جو بلیدہ، بلوچستان میں مقیم ہیں۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم کراچی، پاکستان میں حاصل کی، اور غلام اسحاق خان انسٹی

ٹیوٹ (GIKI) سے گریجویشن کیا، 2009 میں انھیں یونیورسٹی کی جانب سے پاکستان انجینئرنگ کونسل کے بہترین گریجویٹ انجینئر آف دی ایئر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا تھا۔ پی ایچ ڈی مکمل کرنے کے بعد۔ ڈاکٹر صمد نے کیمبرج میں پوسٹ ڈاکٹرل ریسرچ ایسوسی ایٹ کے طور پر کام کرنا شروع کیا اور سینئر ریسرچ سائنٹسٹ اور ٹیچنگ فیلو کے عہدے پر ترقی کی۔

فی الحال، وہ کیمبرج یونیورسٹی کے کیمبرج گرافین سینٹر میں نینو میٹریل، سپیکٹروسکوپی، اور انجینئرنگ ڈیپارٹمنٹ میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کا تحقیقی کام خلا میں جانے والے سٹیلائٹس میں استعمال ہونے والے ڈیوائس کے کنکشن پر مرکوز ہے، جو یورپی اسپیس ایجنسی (ESA) اور دیگر تحقیقی اداروں کے تعاون سے انجام دیا گیا ہے۔ یہ آلہ توانائی اور بجلی کے بغیر کام کرنے اور خلائی جہاز کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کارآمد ہوتا ہے۔ انھوں نے خلا میں زیرو گریوٹی پر پیرابولک اور ساؤنڈنگ راکٹ خلا میں چھوڑ کر سائنسی تجربات کیے۔

ڈاکٹر نوید اے سید:

ڈاکٹر نوید سید پاکستانی نژاد کینیڈین نیورو سائنسدان ہیں، جو اس وقت کیلگری یونیورسٹی میں سیل بائیولوجی اینڈ اناٹومی کے پروفیسر اور ہیڈ ڈیپارٹمنٹ کے طور پر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انھوں نے دماغی خلیات کو جوڑنے کے لیے دنیا کی پہلی بایونک نیورو چپ ایجاد کی۔ اس دریافت سے سائنس کے شعبے میں منشیات کی جانچ کی تحقیق کا آغاز ہوا۔ انھوں نے پوری دنیا میں انسانی دماغ اور اس کی منی چپ کے درمیان تعلق کے بارے میں لیکچرز پیش کیے۔

ڈاکٹر نوید کو نیورو ڈیولپمنٹ میں مہارت حاصل ہے، اور دماغی خلیات کے مواصلات پر اینستھیٹک ایجنٹوں کا اثر اور ان کا سائٹوٹوکسک اثر ان کی تحقیق کا ایک مرکز ہے۔ اپنے جرمن ساتھیوں کے ساتھ مل کر، ڈاکٹر سید نے بائیونک ہائبرڈ تیار کیا، جس نے دماغی خلیات اور الیکٹرانکس کے درمیان براہ راست مکالمے کو قابل عمل بنایا جسے ٹائم میگزین اور ڈسکوری چینل پر نمایاں طور پر شائع کیا گیا۔ نیچر، سائنس، نیوران، اور جرنل آف نیورو سائنس وغیرہ

جرائد میں ان کے ایک سو بیس سے زیادہ تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے متعدّد بین الاقوامی اور قومی اعزازات حاصل کیے ہیں۔

ان کے شناختی ایوارڈز میں ٹورنٹو میں ایشین کمیونٹی کی جانب سے آؤٹ اسٹینڈنگ سائنٹسٹ ایوارڈ (2004)، ساؤتھ ایشین میڈیا ایکسپریس نیٹ ورک کی جانب سے کینیڈین سنسیشن ایوارڈ (2012)، پاکستان-کینیڈا ایسوسی ایشن (2012) کی جانب سے بایو میڈیکل ریسرچ میں نمایاں شراکت کے لیے ممتاز اچیومنٹ ایوارڈ بھی دیا گیا۔

تہانی عامر:

تہانی عامر، ایک امریکی مسلمان ہیں جو قاہرہ، مصر کے ایک مضافاتی علاقے میں پلے بڑھے۔ انھوں نے اپنے والد کو کار کا انجن کو ٹھیک کرتے ہوئے دیکھا تو انجینئرنگ کی طرف مائل ہوئے۔ ڈاکٹر عامر نے مکینیکل انجینئرنگ میں بیچلر، ایرو اسپیس انجینئرنگ میں ماسٹرز، اور اولڈ ڈومینین یونیورسٹی سے انجینئرنگ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1992 میں، انھوں نے NASA میں Computational Fluid Dynamics (CFD) میں کام کرنا شروع کیا۔

ڈاکٹر عامر کو بڑے پیمانے پر CFD کمپیوٹر کوڈز کے ساتھ کام کرنے اور رفتار کی جانچ کو انسٹال کرنے کے لیے ونڈ ٹنل کی چھت پر چڑھنے میں مہارت حاصل ہے۔ انھوں نے پتلی فلم کی تھرمل حرکات کی پیمائش کرنے کے لیے ایک نظام بھی ایجاد کیا ہے جس کا پیٹنٹ انھی کے نام ہے۔ یہ پیمائش ونڈ ٹنل میں ٹیسٹ کیے جانے والے ماڈلز پر باؤنڈری لیئر ٹرانزیشن لوکیشن کا تعین کرنے کے لیے کئی تکنیکوں کی تھرمل ماڈلنگ میں استعمال ہوتی ہے۔

خواتین میں سائنس کو فروغ دینے کے لیے ان کے کام اور لگن کے اعتراف میں، NASA نے انھیں NASA HQ ایوارڈ میں پبلک سروس ایوارڈ سے نوازا۔ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں دلچسپی رکھنے والی خواتین کے لیے ایک رول ماڈل ہیں۔

(ماہ نامہ اشرفیہ مئی 2025ء میں شائع).(ترجمہ: 28/ مارچ 2025ء)

تاریخ اور تاریخی مطالعات

تاریخ ایک ایسا آئینہ ہے جو ماضی کو اس کی تمام تر اچھائیوں اور برائیوں، نعمتوں اور لغزشوں کے ساتھ بالکل ویسا ہی منعکس کرتا ہے جیسا کہ وہ حقیقت میں تھا، نہ کہ ویسا جیسا ہونا چاہیے تھا یا جیسا ہم اپنی خواہشات کے مطابق دیکھنا چاہتے ہیں۔ اسی اعتبار سے دیکھا جائے تو تاریخ، حال کے لیے درس و عبرت کے ساتھ روشنی کا دروازہ ہے اور مستقبل کے لیے فکر و آگہی کا سرچشمہ۔ وہ قومیں جو اپنی تاریخ کو درست انداز میں مدون نہیں کرتیں، اس پر فخر نہیں کرتیں اور اس کی خطاؤں اور درستیوں سے سبق حاصل نہیں کرتیں، وہ دوسری اقوام کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتیں۔ بلکہ کوئی بھی قوم اس وقت تک اپنے لیے تہذیب، ثقافت اور اقوامِ عالم میں ایک معتبر مقام پیدا نہیں کر سکتی جب تک وہ ماضی کا مطالعہ نہ کرے، حال کو سنوارے اور مستقبل کی سمت کا شعوری ادراک نہ حاصل کرے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی تہذیب کے ادوارِ عروج میں تاریخ کو **"ابوالعلوم"** کہا جاتا تھا، اس لیے کہ یہ علم، اعتماد کو مضبوط کرتا ہے اور زندگی کی عملی درسگاہ بن جاتا ہے۔ تاریخ کی قراءت و کتابت اقوام اور نسلوں کے اعتماد کی بحالی میں بنیادی کردار ادا کرتی ہے، بالخصوص اُن زمانوں میں جب تہذیبی مسابقت عروج پر ہو، غالب تہذیب کی ثقافتی بالادستی مسلط ہو، اور اسلام کے ساتھ مغربی فکری کشمکش شدت اختیار کر جائے۔ ایسے حالات میں مسابقتی اقدار اور ایک مضبوط تاریخی شعور کے ذریعے تہذیبی و ثقافتی چیلنجز کا مقابلہ مزید مضبوط ہو جاتا ہے۔

جارج سنتیانا George Santayana (1863–1952) اپنے کتاب "دی لائف آف ریزن" میں لکھتے ہیں:

"Those who cannot remember the past are condemned to repeat it."

یہ اقتباس براہِ راست اس نکتے کی تائید کرتا ہے کہ تاریخ سے سبق نہ لینے والی اقوام زوال کا شکار ہوجاتی ہیں۔

فرانسیسی مورخ مارک بلوش (1944–1886) Marc Bloch نے لکھا:

"L'incompréhension du présent naît fatalement de l'ignorance du passé."

یعنی حال کی ناسمجھی لازماً ماضی کی ناآگہی سے جنم لیتی ہے۔

تاریخ نویسی، اس کی اہمیت اور اس کے ضوابط کو سمجھنے سے پہلے ضروری ہے کہ خود تاریخ کی حقیقت اور اس کے مفاہیم کو جانا جائے۔ اسی تناظر میں ابن خلدون نے فنِ تاریخ کی جو جامع تعریف پیش کی ہے، وہ تاریخ فہمی کی اساس سمجھی جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

إنه من الفنون التي تتداوله الأمم والأجيال وتُشدّ إليه الرّكائب والرّحال، وتسمو إلى معرفته السُّوقة والأغفال، وتتنافس فيه الملوك والأقيال [الرؤساء]، وتتساوى في فهمه العلماء والجهَّال، إذ هو في ظاهره لا يزيد على أخبار عن الأيّام والدول، والسّوابق من القرون الأول، تنمو فيها الأقوال، وتُضْرب فيها الأمثال، وتُطرف بها الأندية إذا غصَّها الاحتفال، وتؤدّي لنا شأن الخليقة كيف تقلبت بها الأحوال،

واتَّسع للدول فيها النِّطاق والمجال، وعمَّروا الأرض حتّى نادى بهم الارتحال، وحان منهم الزوال، وفي باطنه نظر وتحقيق، وتعليل للكائنات ومبادئها دقيق، وعلم بكيفيّات الوقائع وأسبابها عميق، فهو لذلك أصيل في الحكمة عريق، وجدير بأن يُعدَّ في علومها وخليق. (عبدالرحمن بن خلدون، مقدمة ابن خلدون، تحقيق خليل شحادة، بيروت: دار الفكر، 1421ھ/ 2001م، ص6)

ترجمہ: تاریخ اُن فنون میں سے ہے جنھیں اقوام اور نسلیں ایک دوسرے سے منتقل کرتی آئی ہیں، جن کے لیے سفر کیے جاتے ہیں اور جن کی طلب میں سواریوں کے کجاوے کسے جاتے ہیں۔ اس کی معرفت کی جستجو عام لوگوں اور سادہ ذہنوں تک کو بلندی عطا کرتی ہے، اور اس میں بادشاہ اور سردار ایک دوسرے سے مسابقت کرتے ہیں۔ اس کی فہم میں عالم اور جاہل بظاہر برابر دکھائی دیتے ہیں، کیوں کہ اس کی ظاہری صورت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ ایام، سلطنتوں اور گزشتہ صدیوں کے حالات و واقعات کی خبریں بیان کرتا ہے، جن میں اقوال پنپتے ہیں، مثالیں قائم کی جاتی ہیں، اور محفلوں کو رونق بخشی جاتی ہے۔ یہ ہمیں مخلوقات کے احوال سے آگاہ کرتا ہے کہ زمانے نے انھیں کس طرح کروٹیں بدل بدل کر دکھائیں، کیسے سلطنتوں کا دائرہ وسیع ہوا، انھوں نے زمین کو آباد کیا، یہاں تک کہ کوچ کا اعلان ہوا اور زوال کا وقت آ پہنچا۔ لیکن اس کے باطن میں گہری نظر، دقیق تحقیق، موجودات اور ان کے مبادی کی باریک تعلیل، اور واقعات کی کیفیات و اسباب کا عمیق علم پوشیدہ ہے۔ اسی بنا پر تاریخ حکمت میں راسخ، اس کی جڑوں میں پیوست، اور اس کے علوم میں شمار کیے جانے کی پوری طرح اہل

اور لائق ہے۔

مغرب نے اپنے متاخر ادوار میں تاریخ کے مطالعے اور اس پر لکھنے کی غیر معمولی اہمیت کو بخوبی محسوس کرلیا۔ چنانچہ علمِ تاریخ، علمِ عمرانیات (سوشیالوجی) کے ساتھ مل کر علومِ انسانی کی ریڑھ کی ہڈی بن گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی دنیا کے اکثر ممالک میں تاریخ کے کالجوں اور شعبوں سے فارغ التحصیل افراد سیاست، قیادت، فکری رہنمائی، حتیٰ کہ ریاستی، عسکری اور سکیورٹی اداروں میں کلیدی مناصب تک پہنچے۔ یہ صورتِ حال اس امر کی متقاضی ہے کہ تاریخ نویسی کی منہجیات پر بار بار لکھا جائے، اس کی اہمیت اجاگر کی جائے اور اہلِ علم کو متنبہ کیا جائے، کیوں کہ تاریخ کی اصولی بنیادیں ہی صحیح فہم اور بیدار شعور کی بہترین کھڑکی ہیں۔

اسی منہجی شعور کے تحت ڈاکٹر محمد السلمی نے اپنے بلاگ میں تاریخ کی کتب کے مطالعے اور تحریر کے اسلوب وطریقۂ کار پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے:

"التاريخ فن من الفنون المحببة إلى النفوس، وهو علم له أصول وقواعد، وله مصادر متعددة، ومناهج مقررة عند علماء الإسلام، وهو يعتني بمعرفة أخبار الماضين، وتحليل الحاضر، واستشراف المستقبل على ضوء السنن الإلهية التي تحكم سير حركة التاريخ وفق مشيئة الله وقَدَرِه، وهذه السنن مرتبطة بالأمر والنهي الرباني والاستقامة على ذلك أو عدمها. وقد أَلَّف أهل العلم في فنون التاريخ المختلفة؛ من الحوادث والأخبار، ومن قيام الدول

وسقوطها، ومن التراجم للرجال على الطبقات والعصور، أو بحسب التخصصات العلمية والاتجاهات الفكرية، أو حسب الخصائص الإقليمية." (منهج القراءة في كتب التاريخ.) مدونة محمد بن صامل السلمي، بتاريخ 20 أبريل 2016م، الرابط التالي: (https://bit.ly/33Rlvef

"تاریخ انسانی نفوس کے لیے ایک محبوب فن ہے، مگر یہ محض فن ہی نہیں بلکہ ایک ایسا علم ہے جس کے اپنے اصول، قواعد، متنوع مصادر اور واضح مناہج ہیں، جنھیں علماے اسلام نے متعیّن کیا ہے۔ یہ علم ماضی کی خبریں جاننے، حال کا تجزیہ کرنے اور مستقبل کو اُن الٰہی سنّتوں کی روشنی میں دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی مشیت اور تقدیر کے مطابق تاریخ کی حرکت کو منظم کرتی ہیں۔ یہ سنتیں براہِ راست ربّانی اوامر و نواہی اور ان پر استقامت یا انحراف سے جڑی ہوئی ہیں۔ اسی بنا پر اہلِ علم نے تاریخ کے مختلف فنون میں تصنیفات کیں؛ کہیں واقعات و حوادث پر، کہیں ریاستوں کے عروج و زوال پر، کہیں طبقات و تراجم پر، کبھی زمانوں کے لحاظ سے، کبھی علمی تخصصات و فکری رجحانات کے اعتبار سے، اور کبھی علاقائی خصوصیات یعنی ممالک و شہروں کی بنیاد پر۔

علماے اسلام نے تاریخ نویسی میں متنوع اسالیب اختیار کیے۔ بعض کتابیں مردوں اور عورتوں کے علمِ طبقات پر قائم ہیں، بعض سیرت و تراجم پر مشتمل ہیں جو حروفِ تہجی کے مطابق مرتب کی گئیں، اور کچھ ایسی ہیں جو سال بہ سال، عہد بہ عہد، اور واقعاتِ ایام وسِنین کی ترتیب پر لکھی گئیں۔ اسی طرح کچھ کتابیں ممالک اور خطوں کی تاریخ سے متعلق ہیں، جیسے بلاذری (متوفی 279ھ) کی "فتوح البلدان"۔ بعض کتب شہروں اور علاقوں کے علما کے

تعارف پر مبنی ہیں، جیسے ابن حبان (متوفی 354ھ) کی تصنیف جو علماے امصار پر ہے؛ یا کسی ایک شہر کے علما پر خصوصی کتب، جیسے امام حاکم نیشاپوری (متوفی 405ھ) کی "تاریخ نیشاپور"، ابوالقاسم حمزہ السہمی (متوفی 527ھ) کی "تاریخ جرجان"، خطیب بغدادی (متوفی 463ھ) کی "تاریخ بغداد"، اور ابن عساکر (متوفی 571ھ) کی "تاریخ دمشق" اور اس نوع کی بے شمار مثالیں اسلامی علمی ورثے میں موجود ہیں۔ اسی طرح مسلمانوں کے ہاں تاریخی تحریر کی دیگر جہات بھی نہایت وسیع ہیں، جیسا کہ ابن جبیر (متوفی 614ھ) اور ابن بطوطہ (متوفی 779ھ) کے سفرنامے۔

اسلام، اپنی مختلف محرکات کے ساتھ، دنیا کے چھوٹے بڑے خطوں اور اقوام کے بارے میں علمی آگہی کے فروغ کا ایک زبردست محرک رہا ہے، جیسے تاریخ کے دیگر پہلوؤں میں رہا۔ اس موضوع میں تفصیل بہت ہے، مگر یہ اس کا محل نہیں۔

تاریخ نویسی میں انحرافات کی چند صورتیں:

اسلامی تاریخ بھی دیگر علوم کی طرح آزمائشوں اور انحرافات سے محفوظ نہ رہ سکی۔ ابتدائی صدیوں ہی سے مختلف محرکات اور متنوع مقاصد کے تحت اس میں تحریف کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں۔ اس پر ابن خلدون نے نہایت دردمندی کے ساتھ گفتگو کی ہے، جہاں وہ حقیقی مؤرخین اور غیر مستند افراد کے درمیان واضح فرق کرتے ہوئے تاریخ میں مداخلت کرنے والوں پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "اسلام میں عظیم مؤرخین نے ایام و واقعات کی خبریں پوری جامعیت کے ساتھ جمع کیں، انھیں دفاتر کے اوراق میں محفوظ کیا؛ مگر لوگوں نے ان میں باطل کی سازشیں شامل کر دیں، جنھیں وہم و اختراع کے ساتھ گھڑ لیا، کمزور اور جعلی روایتوں کو زیب و زینت دے کر پیش کیا، اور بعد کے

بہت سے لوگوں نے بغیر تحقیق انھی آثار کی پیروی کی اور انھیں
ویسا ہی ہم تک منتقل کر دیا جیسا سنا تھا۔ انھوں نے نہ واقعات
کے اسباب پر غور کیا، نہ حالات کی رعایت رکھی، نہ لغو
روایتوں کو رد کیا۔ چنانچہ تحقیق نایاب ہوگئی، تنقیح کی نظر کمزور
پڑ گئی، اور غلطی و وہم خبروں کے ساتھی بن گئے۔ تقلید
انسانوں میں رچی بسی ہے، فنون میں دراندازی عام ہے۔
ناقل محض نقل کرتا ہے، جب کہ بصیرت صحیح کو پرکھتی ہے،
اور علم دل کے آئینے کو جلا بخشتا ہے۔"

اس کے بعد ابن خلدون ان چند عظیم مؤرخین کا ذکر کرتے ہیں جو شہرت، امامت اور علمی وقار کے حقیقی مستحق تھے اور واضح کرتے ہیں کہ ایسے لوگ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔

تاریخ اور اس کی روایات، اس کے رجال اور ریاستوں کے باب میں اس فکری انتشار کے سب سے نمایاں کرداروں میں بعض گروہ پیش پیش رہے، جن میں خاص طور پر روافض شامل ہیں، جنھوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے خلاف تاریخ کو مسخ کرنے، ان کی کردار کشی کرنے اور من گھڑت روایات گھڑنے میں خاص مہارت دکھائی۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث طویل ہے، اور اہلِ تخصص نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں۔

گزشتہ ادوار ہوں یا جدید زمانہ، تاریخ میں **تحریف و تزویر** کے منظرنامے کی قیادت اُن استشراقی حلقوں نے بھی کی جو بیش تر مغربی حکومتوں کی فکری، ادارہ جاتی اور مالی سرپرستی میں سرگرم رہے۔ اس منظم فکری یلغار پر اسلامی تاریخ کے ممتاز محقق ڈاکٹر **عماد الدین خلیل** نے تفصیل سے لکھا ہے۔ ان کے الفاظ میں:

"لقد اعتمد كثير من الباحثين في
التاريخ الإسلامي عبر القرنين الأخيرين،

وبخاصة في دوائر الفكر الاستشراقي، والغربي عموماً، منهجاً معكوساً في التعامل مع هذا التاريخ، منهجًا ينطوي على محاولة متعمَّدة أو غير متعمَّدة، لفك الارتباط بين الإسلام وبين التاريخ. بل إن بعض المحاولات التي تبلغ أقصى حِدَّتها في الاستشراق اللاهوتي ثم الماركسي، أرادت لمفردات التاريخ الإسلامي أن تُبحر باتجاه مضادٍّ للمطالب الإسلامية، وأن تتخذ موقفاً نقيضاً لمعطيات هذا الدين وثوابته. وهكذا أُرغمت الوقائع على مغادرة رَحِمَها الحقيقي الذي أُنتزعت منه انتزاعاً لكي تتشكل وَفْقَ منهج خاطئ في بيئة غير بيئتها، ونقول أشياء غير التي قالتها بالفعل. وينتهي الأمر إلى صياغة شبكة من الاستنتاجات التي جعلها التكرار المتواصل بمنزلة مُسلَّمات لا تقبل نقضاً ولا جدلاً. ولقد تم بذلك حفر خندق عميق بين طرفي القضية".(عماد الدين خليل، مقال بعنوان: (قيمة التاريخ)، موقع قصة الإسلام، بتاريخ 11 يوليو 2010م، الرابط التالي

(https: / /bit.ly /39THMf3

ترجمہ: گزشتہ دو صدیوں کے دوران اسلامی تاریخ کے بہت سے محققین، بالخصوص استشراقی اور عمومی طور پر مغربی فکری حلقوں میں، تاریخ سے معاملہ کرنے میں ایک الٹا منہج اختیار کیے رہے۔ یہ منہج دانستہ یا نادانستہ طور پر اسلام اور تاریخ کے باہمی ربط کو توڑنے کی کوشش پر مبنی تھا۔ بلکہ استشراق کے لسانی و مذہبی اور بعد ازاں مارکسی رجحانات میں یہ کوشش اپنی انتہا کو پہنچی کہ اسلامی تاریخ کے مفردات کو اسلامی مطالبات کے بر خلاف سمت میں بہا دیا جائے اور اس دین کی قطعی اساسات کے مقابل کھڑا کر دیا جائے۔ اس طرح تاریخی واقعات کو زبردستی ان کے حقیقی بطن سے جدا کر کے، ایک غلط منہج کے تحت، غیر مانوس ماحول میں نئی شکل دی گئی، حتیٰ کہ وہ باتیں کہلوانے لگے جو انھوں نے حقیقت میں کبھی کہی ہی نہ تھیں۔ آخر کار اس طرزِ فکر سے ایسے نتائج کا ایک پورا جال بُنا گیا اور عقیدے اور تاریخ کے درمیان ایک گہری خندق کھود دی گئی۔

عہدِ حاضر میں تاریخ نویسی کی ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ تاریخ کو محض ریاستوں اور حکومتوں، جنگوں، معاہدوں اور سیاسی کشمکش تک محدود کر کے پڑھا اور پڑھایا جائے، اور اس سے ملتِ اسلامیہ کی اجتماعی، سماجی، علمی اور تہذیبی زندگی کو بالکل الگ کر دیا جائے۔ اسی طرح اس کے علما، مفکرین، علمی ورثے اور تہذیبی سرمایہ کو اقوامِ عالم کے درمیان نمایاں کرنے سے بھی صرفِ نظر کر لیا جائے۔ ایک اور سنگین لغزش یہ ہے کہ روایات، اقوال اور خبروں کو شرعی میزان اور جرح و تعدیل کے اصولوں پر پرکھے بغیر قبول کر لیا جائے، حالاں کہ تاریخ کو اس باب میں محدثین اور علما کی منہجیات سے بھرپور استفادہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح بغیر کسی معلوم سند اور قابلِ اعتماد راوی کے روایت کو قبول کرنا یا لکھ دینا بھی ایک خطرناک انحراف ہے۔ جس طرح طب کے اپنے ماہرین ہوتے ہیں، اسی طرح تاریخ بھی اپنے متخصّص اساتذہ اور اہلِ فن رکھتی ہے۔

ڈاکٹر محمد السلمی نے تاریخ کے مطالعے پر اپنی علمی تحریر کے اختتام پر لکھا:

"ويبقى أنه يحتاج لإتقان العلم إلى
شيخ في التخصص يَدْرُس عليه العلمَ حتى
يُتقنه، ويستشيره في كلِّ ما أشكل عليه من
المسائل." (محمد بن صامل السلمي، ورقة علمية
بعنوان: منهج القراءة في كتب التاريخ. مدونة: محمد بن
صامل السلمي، بتاريخ 20 أبريل 2016م، الرابط
التالي: https://bit.ly/33Rlvef)

ترجمہ: کسی بھی علم میں کامل مہارت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اس فن کے کسی متخصّص استاد سے باقاعدہ طور پر علم حاصل کرے، یہاں تک کہ اسے اچھی طرح سمجھ لے، اور جن مسائل میں اشکال پیش آئے، ان میں اس سے مشورہ کرے۔

مائیکل پولانی (1891–1976) (Michael Polanyi) ایک ممتاز فلسفی، اور مفکر تھے۔ پولانی کی پہچان بالخصوص علم کی ماہیت (Theory of Knowledge)، سائنسی طریقِ کار اور انسانی فہم میں غیر مدوَّن علم (Tacit Knowledge) کے تصور کی وجہ سے ہے۔ پولانی کا سب سے معروف نظریہ Tacit Knowledge ہے، جس کا خلاصہ وہ اس جملے میں بیان کرتے ہیں:

"We know more than we can tell."

یعنی ہم بہت کچھ ایسا جانتے ہیں جسے ہم مکمل طور پر بیان نہیں کر سکتے۔

ان کے نزدیک علم صرف کتابوں، اصولوں اور واضح تعریفوں تک محدود نہیں، بلکہ اس کا ایک بڑا حصہ **تجربے، مشق**، شاگردی اور استاد کی قربت سے منتقل ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کسی بھی علم میں مہارت کے لیے apprenticeship (شاگردی) کو بنیادی شرط قرار دیتے ہیں۔ چناں چہ وہ کہتے ہیں:

"Mastery of any discipline requires apprenticeship under a specialist."

یعنی کسی بھی علم یا فن میں کامل مہارت حاصل کرنے کے لیے کسی ماہر اور متخصّص استاد کی باقاعدہ شاگردی اور رہنمائی ضروری ہوتی ہے۔

تاریخ کے مطالعے یا تصنیف میں ایک بڑا انحراف یہ بھی ہے کہ اس میدان میں وہ لوگ آگے آ بیٹھیں جو اس فن کی اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ ایسے افراد واقعات کو اپنی خواہش اور ذاتی رجحان کے مطابق بیان کرتے ہیں، بغیر کسی ذمہ داری اور علمی دیانت کے؛ گویا تاریخ کوئی ذاتی جاگیر ہو جس سے جیسے چاہیں کھیلیں، یا تاریخ پڑھنا اور لکھنا محض تفریح اور کھیل تماشا ہو! اس تناظر میں ڈاکٹر محمود محمد شاکر کا یہ قول نہایت اہم ہے:

"التاريخ لا يُكتب بالتحكُّم، وإنما يُكتب بالرواية، ثم الاستدلال ثم يُبذل الجهد في سد الفجوات، وسبيل ذلك أن نأخذ من الماضي أسباباً وعللاً وحوادثَ ذات خطر، فإن استقامت أن تمتد معك إلى الحاضر الذي تؤرخه، فهي حقيقةٌ بأن تكون شيئاً من التاريخ يوشك أن يكون حقاً كلُّه أو بعضُه."(محمود محمد شاكر، الفتنة الكبرى، مجلة الرسالة، القاهرة، فبراير 1984م، ص193-196، الرابط التالي: https://bit.ly/32P1Pqt)

ترجمہ: تاریخ زبردستی اور من مانی سے نہیں لکھی جاتی، بلکہ روایت سے، پھر استدلال سے، اور اس کے بعد خلاؤں کو پُر کرنے کے لیے علمی محنت سے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ماضی

سے اسباب، علل اور اہم واقعات اخذ کیے جائیں، اور اگر وہ حال تک صحیح طور پر جُڑ جائیں جیسے تم تاریخ بنا رہے ہو، تو وہ حقیقت کے قریب ہو جاتے ہیں، کبھی پورے کے پورے اور کبھی کسی حد تک۔

اسی لیے تاریخی مسائل میں روایت اور استدلال کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے، خصوصاً جب ان کے ساتھ معاشرتی زندگی کی قدیم دستاویزات بھی شامل ہو جائیں، جو کسی بھی معاشرے یا بستی کے زمان و مکان کے احوال کی حقیقی تصویر پیش کرتی ہیں۔

تاریخ کو مسخ کرنے والی ایک نہایت خطرناک صورت یہ بھی ہے کہ اس کی تفسیر غلط مناہج کے ذریعے کی جائے، حالاں کہ اسلام میں تاریخ کی تفسیر بھی ایک منضبط علمی منہج پر قائم ہے، جو محض مطالعے کے منہج سے کم اہم نہیں۔ اسی اصولی بنیاد پر ڈاکٹر محمد السلمی نے اپنی معروف کتاب "منهج كتابة التاريخ الإسلامي" تصنیف کی، جو آج ہر محقق اور مؤرخ کے لیے ایک مضبوط علمی رہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ تاریخ اور اس کی تفسیر کے بارے میں لکھتے ہیں:

"الحدث التاريخي: هو فعل الإنسان، بما يحمله من أفكار وتصورات، وما لديه من قدرات وإمكانات، وما يعتمل في نفسه من الرغبات والشهوات، ومن القيم والفضائل والاعتقادات في زمان ومكان من هذا الكون الفسيح المحكوم بمشيئة الله وعلمه وقدرته."(محمد بن صامل السلمي، مقال بعنوان: (كيف نفسر التاريخ؟)، مدونة د. محمد بن صامل السلمي، 17 أبريل 2016م، الرابط التالي

(https: / /bit.ly /33NZs84

ترجمہ: تاریخی واقعہ دراصل انسان کا وہ عمل ہے جو اس کے افکار و تصورات، اس کی صلاحیتوں و امکانات، اس کے باطنی جذبات، خواہشات و شہوات، اور اس کی اقدار، فضائل اور اعتقادات کے ساتھ، ایک خاص زمان و مکان میں ظہور پذیر ہوتا ہے اور یہ سب کچھ اس وسیع کائنات میں ہوتا ہے جو اللہ کی مشیت، علم اور قدرت کے تحت ہے۔

اس تعریف سے واضح ہوتا ہے کہ تاریخ کی تفسیر کے بنیادی ارکان تین ہیں: (1) انسان (2) زمان، (3) مکان، اور مشیتِ الٰہیہ۔ تاریخ کی صحیح تفسیر انھی ارکان کے بارے میں درست تصور اور ان کے باہمی تعلق کی صحیح تفہیم کا نام ہے۔ جو شخص صحیح تصور رکھتا ہو کتاب و سنت کی طرف رجوع کرے، وہ پوری انسانی تاریخ کی درست تفسیر کر سکتا ہے، کیوں کہ ان مصادر میں وہ باتیں واضح کر دی گئی ہیں جن کے تحت واقعات وقوع پذیر ہوتے ہیں اور جن کی بنیاد پر اقوام، ریاستوں اور افراد کا محاسبہ ہوتا ہے۔

بے شک یہ پوری کائنات، انسان، اس کے اعمال، اس کی ایجادات اور صنعتیں، سب کی سب اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں؛ لہٰذا مخلوق کو سمجھنے کے لیے خالق کی طرف رجوع ناگزیر ہے، اور جب ہم وحیِ الٰہی کی طرف لوٹتے ہیں تو راستے خود بخود متعیّن ہو جاتے ہیں۔

ان علمی مناہج اور اصولوں کے مطابق تاریخ کو پڑھنے اور لکھنے، اور تدوین میں پائے جانے والے انحرافات سے تجاوز کے نتیجے میں، مستشرقین اور ان کے شاگردوں کی وہ جھوٹی اور مسخ شدہ تحریریں بڑی حد تک اپنی حیثیت کھو بیٹھیں، جو انھوں نے اسلامی تاریخ کے بارے میں بعض کتب اور روایات میں شامل کر دی تھیں، اور جنھیں بعض عرب و اسلامی ممالک کے تعلیمی نصاب تک میں داخل کر دیا گیا تھا۔

یہ سب کچھ استعمار کے اُس دور کے ساتھ جڑا ہوا تھا جب مسلم دنیا پر قبضہ کر کے اس کی تاریخ کو مٹانے اور مسخ کرنے کی کوشش کی گئی؛ خصوصاً صلیبی جنگوں کے بعد جو تقریباً دو صدیوں

تک جاری رہیں۔

مگر اس تاریک دور کے بعد علم، معرفت اور دین میں ایک نئی بیداری نے جنم لیا، اور تاریخ کو بھی دیگر علوم کی طرح اس کا حق ملا۔مسلمانوں میں اپنے تاریخ، اپنی عظمت، اپنی تہذیب اور صحیح مصادر کے حوالے سے شعور بیدار ہوا، بلکہ اس پر فخر کا جذبہ بھی بیدار ہوا۔

یوں مسلمانوں کی جامعات، تحقیقات اور علمی مطالعات پر مبنی علمی بیداری نے بڑی حد تک ان تحریروں کا اثر زائل کر دیا جو تاریخِ اسلام کے خلاف فکری جرم کی مرتکب تھیں اور جن میں تاریخ اور اسلام کے درمیان بدنما فکری تفریق پائی جاتی تھی۔ یہ تبدیلی اُس وقت رونما ہوئی جب تاریخ کے بہت سے علما اور اساتذہ نے اپنے دینی منہج پر اعتماد کے ساتھ تاریخ کو از سرِ نو پڑھنا اور لکھنا شروع کیا، اور اپنی اس اسلامی تہذیب کی داستان دوبارہ بیان کی جو ایک طویل عرصے تک دنیا پر غالب رہی اور دیگر تہذیبوں کے علوم و معارف پر گہرے اثرات چھوڑ گئی۔

ابتدائی ادوار کے مؤرخین کی چند نمایاں مثالیں:

ابتدائی اسلامی ادوار میں تاریخ کی تدوین کرنے والوں میں جن شخصیات کو عوام و خواص کے درمیان غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی، ان میں سرِ فہرست عظیم مفسر اور مؤرخ علامہ ابن کثیر ہیں، جن کی شہرۂ آفاق تصنیف "البدایہ والنہایہ" ہے۔ اسی طرح عظیم مفسر و مؤرخ علامہ ابن جریر طبری اپنی کتاب "تاریخ الأمم والملوک" کی وجہ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ تاریخ و عمرانیات کے امام ابن خلدون، جن کی دو عظیم تصانیف "المقدمة" اور "تاریخ ابن خلدون" علمی دنیا میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ان مؤرخین کی کتابوں کی علمی اہمیت اور غیر معمولی شہرت کے باعث ان پر وسیع پیمانے پر علمی خدمت انجام دی گئی؛ جیسے تنقیحات، تدقیقات، مراجعات، روایات کی تخریج، شروحات اور اختصارات وغیرہ۔

ان عظیم مؤرخین اور ان کی تصانیف پر گفتگو کا مقصد یہاں محض اُن کی تدوینی

منہجیات کے بنیادی پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہے، جو تاریخ کے محقق اور مصنف کے لیے نہایت مفید ہیں، بالخصوص اس زاویے سے کہ انھوں نے اس فن کے ساتھ کس طرح علمی سنجیدگی، اعتماد پیدا کیا۔

یہاں قاری کے لیے اصل توجہ کا نکتہ یہ ہے کہ ایک بار پھر تاریخ کے مطالعے اور تحریر میں درست منہج کی اہمیت کو یاد دلایا جائے، اور یہ یاد دہانی ان مشہور مؤرخین کے عملی نمونوں کے ذریعے ہو، جو نہ صرف تاریخ کے راوی اور مدوّن تھے بلکہ تاریخ کے مفسر بھی تھے۔

علامہ طبری (224–310ھ) کی احتیاط پسندی:

جب ہم امام ابو جعفر محمد بن جریر طبری کی علمی زندگی، ان کے اساتذہ سے استفادے اور مختلف علوم میں ان کی تحصیلِ علم پر نظر ڈالتے ہیں تو بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ لکھنے کے لیے کن علمی اوصاف اور صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے ایک محقق نے لکھا:

”وممَّا يلاحظ أن أبا جعفر تلقَّى العلم في رحلته على معظم علماء عصره وسمع عن الكثير من الشيوخ الثقات أصحاب الأسانيد العالية، وهذا سيكون له الأثر الكبير في تكوين شخصيته، فأصبح إمام عصره، وتصدَّر مجالس العلم بين أقرانه، قال الخطيب البغدادي: “وكان قد جمع من العلوم ما لم يُشاركه فيها أحدٌ من أهل عصره، وكان حافظاً لكتاب الله عارفاً بالقراءات بصيراً بالمعاني، فقيهاً في أحكام القرآن، عالماً بالسنن وطرقها وصحيحها

وسقيمها وناسخها ومنسوخها، عارفاً
بأقوال الصحابة والتابعين ومسائل الحلال و
الحرام، عارفاً بأيام الناس وأخبارهم.“ (منهج
الطبري في تأليف كتاب تاريخ الرسل والملوك، 25 ذو
الحجة 1436ھ، وفيه نقل عن: (الخطيب البغدادي،
تاريخ بغداد، دار الكتاب العربي، بيروت، ج2،
ص136)

ترجمہ: یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ ابو جعفر طبری نے اپنے اسفارِ علمی کے دوران اپنے زمانے کے بیشتر علما سے علم حاصل کیا، اور بہت سے ثقہ اساتذہ سے سماع کیا جو عالی سندوں کے حامل تھے۔ اس کا ان کی شخصیت کی تشکیل پر گہرا اثر پڑا، حتیٰ کہ وہ اپنے عہد کے امام بن گئے اور اپنے ہم عصروں میں علمی مجالس کی صدارت کرنے لگے۔ خطیب بغدادی کہتے ہیں:

”انھوں نے اتنے علوم جمع کر لیے تھے کہ ان کے زمانے میں کوئی ان کا شریک نہ تھا۔ وہ قرآنِ کریم کے حافظ، قراءات کے ماہر، معانی پر گہری نظر رکھنے والے، احکامِ قرآن میں فقیہ، سنّتوں، ان کے طرق، صحیح و سقیم، ناسخ و منسوخ کے عالم تھے، صحابہ و تابعین کے اقوال، حلال و حرام کے مسائل اور لوگوں کے ایام و اخبار سے بھی بخوبی واقف تھے۔“

علامہ طبری نے اپنی کتاب ”تاریخ الامم والملوک“ کے مقدمے میں اپنی احتیاط پسند اور شفاف منہج کو نہایت وضاحت سے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

”وليعلم الناظر في كتابنا هذا أن
اعتمادي في كل ما أحضرتُ ذكره فيه مما
شرطت أني راسمه فيه؛ إنما هو على ما
رويتُ من الأخبار التي أنا ذاكرها فيه،

والآثار التي أنا مُسندها إلى رواتها فيه، دون ما أُدرِك بحجج العقول واستُنبِطَ بفكر النفوس إلا اليسير القليل منه؛ إذ كان العلم بما كان من أخبار الماضين، وما هو كائن من أنباء الحادثين غير واصل إلى من لم يشاهدهم ولم يدرك زمانهم؛ إلا بإخبار المخبرين، ونقل الناقلين، دون الاستخراج بالعقول، والاستنباط بفكر النفوس. فما يكن في كتابي هذا من خبرٍ ذكرناه عن بعض الماضين مما يستنكره قارئه، أو يستشنعه سامعه، من أجل أنه لم يعرف له وجهاً في الصحة، ولا معنى في الحقيقة، فلْيَعلم أنه لم يُؤتَ في ذلك من قِبَلنا، وإنما أُتِي من قِبَل بعض ناقليه إلينا، وأنَّا إنما أديَّنا ذلك على نحو ما أُدِّيَ إلينا." (أبو جعفر محمد بن جرير الطبري، تاريخ الطبري -تاريخ الأمم والملوك، تحقيق محمد أبو افضل إبراهيم، بيروت: دار سويدان، ج1/ ص7-8)

ترجمہ: اس کتاب کو پڑھنے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اس میں جو کچھ ذکر کیا ہے، اس میں میرا اعتماد انھی روایات اور آثار پر ہے جنھیں میں نے ان کے راویوں کے ساتھ نقل کیا ہے، نہ کہ عقل کے مجرد دلائل یا نفسی قیاسات پر، سوائے بہت قلیل امور کے۔ کیوں کہ گزشتہ

اقوام کے حالات اور موجودہ واقعات کا علم اُن لوگوں تک، نھوں نے وہ زمانے خود نہیں دیکھے، صرف راویوں کی خبر اور ناقلوں کی روایت کے ذریعے ہی پہنچ سکتا ہے، نہ کہ محض عقلی استخراج اور فکری استنباط سے۔ پس اگر اس کتاب میں کوئی ایسی خبر ہو جو قاری کو ناپسند یا ناقابلِ قبول محسوس ہو، تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی ذمہ داری ہم پر نہیں بلکہ اُن راویوں پر ہے جن سے وہ خبر ہم تک پہنچی، اور ہم نے اسے اسی طرح نقل کیا ہے جس طرح ہمیں منتقل کی گئی۔

علامہ طبری کے منہج کی بنیاد "اسناد" پر تھی۔ مؤرخ کا کام روایت نقل کرنا تھا، جب کہ اس کی جانچ پڑتال محقق کے ذمہ ہوتی ہے، اگرچہ یہ جانچ حدیث کے معیار سے کم درجے کی ہوتی ہے۔ اس بارے میں ایک محقق لکھتے ہیں:

"إن الدارس لكتابات مؤرخينا الأوائل يجدها في الغالب تعتمد منهجاً واحداً، إنه الإسناد الذي كان بمثابة الملاذ الذي يلجأ إليه المؤرخ المسلم لتوثيق خَبَرِه من جهة، ولتبرئة ذمته من الخبر إن كان غير صحيح، وتحميل نـاقليه مسؤولية صِدْقِه أو كذبه من جهة أخـرى، ولقد حاز المسلمون الريادة حين ابتدعوا هذا الأسلوب الذي لم يُعهد من قبل في كتابة الأحداث التاريخية ولم تعرفه أمة من الأمم السابقة أو اللاحقة، وهي ميزة تُحسَب لهم، وهذا يدخل في إطار الإبداع العلمي، و كما هو معلوم فإن التوثيق من الأشياء المطلوبة التي تُضفي

على الخبر التاريخي مصداقية أكبر."

(http://sadaqua.blogspot.com/2015/10/blog-post_22.html)

ترجمہ: جو شخص ہمارے ابتدائی مؤرخین کی تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے، وہ پاتا ہے کہ وہ عموماً ایک ہی منہج پر قائم تھیں، اور وہ ہے "**اسناد**"۔ یہ اسناد مسلمان مؤرخ کے لیے ایک محفوظ پناہ گاہ کی حیثیت رکھتی تھی، ایک طرف خبر کو مستند بنانے کے لیے، اور دوسری طرف اگر خبر غلط ہو تو اپنی ذمہ داری سے بری ہونے کے لیے اور اس کا بوجھ ناقلین پر ڈالنے کے لیے۔ مسلمانوں نے اس اسلوب میں سبقت حاصل کی، کیوں کہ تاریخ نویسی میں ایسا طریقہ نہ اس سے پہلے کسی قوم نے اختیار کیا اور نہ بعد میں۔ یہ ان کا ایک علمی امتیاز اور تخلیقی کارنامہ ہے، کیوں کہ توثیق تاریخی خبر کو کہیں زیادہ معتبر بنا دیتی ہے۔"

اسی محقق نے امام طبری کے بارے میں مزید لکھا:

"وقد جسَّد هذا المعنى مؤرخنا الكبير الإمام أبو جعفر الطبري، فقد أجاد في كتابه التاريخ الإسلامي بالرواية، وإن لم يحكم على ناقليها، فهذا لا يعتبر عيباً في مؤلَّفه [لاسيما وقد نَبَّه هو إلى ذلك]، فَجَمْعه لروايات كثيرة أحياناً قد تكون متناقضة يعتبر عملاً تركيباً ضخماً، ومن أراد تحقيقها قبولاً أو رفضاً فما عليه إلا تتبع أسانيدها والحكم عليها بما تستحق.

لقد ترك الطبري بصمة واضحة في مجال الكتابة التاريخية، ففي أيامه بلغ عِلْمَان

أساسيان متقاربان إلى حدٍّ كبير نُضْجاً كبيراً (علم الحديث) و(التاريخ)، فتدوين الحديث الشريف عُرِفَ عصره الذهبي في القرن الثالث الهجري، والحال كذلك بالنسبة لتدوين التاريخ الـذي سَيعْرِف نَقْلَة نوعية مع كتاب الطبري رحمه الله."

(http://sadaqua.blogspot.com/2015/10/blog-post_22.html)

ترجمہ: اس مفہوم کو مؤرخ امام ابو جعفر طبری نے عملی صورت میں پیش کیا۔ انھوں نے تاریخ کو روایات کے ذریعے بہترین انداز میں مرتب کیا، اگرچہ انھوں نے ہر راوی پر حکم نہیں لگایا، اور یہ ان کی کتاب کا نقص نہیں، خصوصاً جب وہ خود اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں۔ بسا اوقات متضاد روایات کو جمع کرنا ایک عظیم ترکیبی کام ہے، اور جو شخص ان روایات کو قبول یا رد کرنا چاہے، اس پر لازم ہے کہ وہ ان کی اسناد کی تحقیق کرے۔ طبری نے تاریخ نویسی میں نمایاں نقوش چھوڑے، ان کے عہد میں دو علوم: (1) حدیث اور (2) تاریخ، اپنی پختگی کو پہنچے۔ جس طرح تیسری صدی ہجری حدیث کی تدوین کا سنہرا دور تھی، اسی طرح اس دور میں تاریخ بھی طبری کی بدولت ایک نئے مرحلے میں داخل ہوئی۔

ابن کثیر (701–774ھ) اور ان کا منہج:

ابن کثیر کی مشہور تاریخی تصنیف "البدایہ والنہایہ" کا مطالعہ ان کے منہج کو سمجھے بغیر مکمل فائدہ نہیں دے سکتا۔ ان کا اسلوب مختلف ادوار میں کچھ مختلف ہے، تاہم عمومی طور پر انھوں نے اسناد کے ساتھ روایت کو اختیار کیا اور بہت سی روایات پر نقد بھی کیا ہے، کیوں کہ وہ خود محدث تھے۔ ابو عبداللہ الذہبی لکھتے ہیں:

" لحقيقة أن ابن كثير كان يشعر في كثير

من الأحيان أن ما يرويه هو من هذيانات المؤرخين وخرافاتهم. لكنه يذكره اتباعاً للمؤرخين السابقين للرد والتنبيه عليه. ويُقدِّم ابن كثير عذره في مثل هذه الأماكن قائلاً: "لولا أنها مُسَطَّرَةٌ في كثير من كتب التفسير وغيرها من التواريخ وأيام الناس، لما تعرضنا لسقاطتها وركاكتها ومخالفتها للمعقول والمنقول". "(أبو عبدالله الذهبي، مقال بعنوان: (منهج ابن كثير في كتابه البداية والنهاية)، صيد الفوائد، نقلا عن: البداية والنهاية: ج1/ ص114 و ج5/ ص96 – 97)

ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ ابن کثیر کو اکثر یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ نقل کر رہے ہیں وہ بعض مؤرخین کے اوہام اور خرافات پر مشتمل ہے، مگر وہ انھیں اس لیے ذکر کر دیتے تھے کہ پہلے مؤرخین نے نقل کیا تھا، تاکہ ان پر تنبیہ اور رد کیا جا سکے۔ ایسے مواقع پر وہ خود عذر پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں: "اگر یہ باتیں تفاسیر اور تاریخ کی بہت سی کتابوں میں درج نہ ہوتیں، تو ہم ان کی کم مائگی، بے معنویت اور عقل و نقل کے خلاف ہونے کی وجہ سے انہیں ذکر ہی نہ کرتے۔"

ابن کثیر کے منہج سے تاریخ کے قاری اور مصنف کو علمی دیانت، شجاعت اور عقیدے سے وابستگی کا سبق ملتا ہے۔ ان کی تحریر میں تاریخ، دین اور عقیدہ ایک دوسرے سے جدا نہیں بلکہ باہم مربوط ہیں۔ وہ جو لکھتے ہیں، اس میں احتساب اور ذمہ داری کا شعور نمایاں ہے۔

اسی پہلو پر ابو عبداللہ الذہبی لکھتے ہیں:

"صف ابن كثير بتحري الصدق، والتزم التثبت من الحقيقة، واجتنب التحيز والميل مع الهوى، إلا أننا نرى عنده أحياناً لوناً من الجدل والمناظرة في مسائل خلافية، مثل الخلاف بين المسلمين وأهل الكتاب، والخلاف بين أهل السنة و بين الشيعة، وفي ذكر الفِرَق المنحرفة الخارجة على الإسلام، فإنه في مثل هذه المواضع يُناظر ويُجادل ويَقْرَع الحجة بالبرهان ليثبت لما يعتقده صحيحاً في نظره، فهو هنا ليس مؤرخاً بل هو هنا عالم ديني شديد التمسك بموقف أهل السنة، يلسع بالنقد اللاذع من يخالفه ويجاهر بالعداء من ينابذه، ولا يتحرز من تخطئتهم وتكذيبهم وتجهيلهم، ولعنهم على طريقة أهل الجدل والمناظرة."(ایضا)

ترجمہ: ابن کثیر سچ کی جستجو میں معروف تھے، حقیقت کی تحقیق کو لازم پکڑتے تھے، تعصب اور خواہشِ نفس سے اجتناب کرتے تھے۔ البتہ بعض اختلافی مسائل میں، جیسے مسلمانوں اور اہلِ کتاب کے درمیان اختلاف، یا اہلِ سنت اور شیعہ کے مابین نزاع، اور اسلام سے خارج گمراہ فرقوں کے تذکرے میں وہ مناظرہ اور جدل کا اسلوب اختیار کرتے۔ ان مقامات پر وہ محض مؤرخ نہیں رہتے بلکہ ایک مضبوط اہلِ سنت عالم کی حیثیت سے دلائل کے ساتھ اپنا موقف ثابت کرتے، سخت تنقید کرتے، مخالفین کی تردید، تکذیب اور تجہیل سے

بھی گریز نہیں کرتے، اور یہ سب کچھ مناظرانہ اسلوب کے مطابق ہوتا ہے۔

ابنِ کثیر کے منہجِ تاریخ نگاری کے ذریعے تاریخ کا قاری اور مؤرخ یہ سیکھتا ہے کہ علمی امانت داری کے ساتھ تاریخ تحریر کیسے کی جاتی ہے۔ ان کی تاریخ نویسی کا امتیاز یہ تھا کہ وہ تاریخ کو عقیدہ و دین سے جوڑ کر لکھتے تھے، اور جو کچھ قلم بند کرتے اس میں احتساب کے اصولوں کی مکمل پاسداری کرتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس علم کا حق ادا کیا اور ایسی جرأت و صراحت کے ساتھ لکھا کہ ان کی تحریریں اُن کے دور کے ساتھ مابود کے طالبِ علم اور محقق دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ثابت ہوئیں۔

چناں چہ ابو عبداللہ الذہبی نے لکھا:

"تميز ابن كثير بجرأته في الحق و صراحته في النقد حتى في حوادث عصره، لا يحاكي أحداً ولا يجامل ولا يخاف في الحق لومة لائم. لهذا كله ولهذه الدقة والنزاهة والنقد والصراحة... كانت سبباً في إثارة إعجاب المؤرخين والعلماء به بعده، كما كانت سبباً في تقدير الدارسين له في عصرنا." (ایضاً)

ترجمہ: ابنِ کثیر حق کے معاملے میں بے باک اور تنقید میں نہایت واضح تھے، حتیٰ کہ اپنے عہد کے واقعات پر بھی کسی کی رعایت کیے بغیر قلم اٹھایا۔ وہ نہ کسی کی نقالی کرتے، نہ خوشامد، اور نہ ہی حق بات کہنے میں کسی ملامت کی پروا کرتے تھے۔ یہی دقتِ نظر، دیانت، تنقیدی شعور اور صراحتِ بیان بعد کے مؤرخین اور علما کے لیے باعثِ تحسین ہوئے، اور آج کے دور کے محققین کے نزدیک بھی ان کی قدر و منزلت کا سبب ہے۔"

ابنِ کثیر نے تاریخ کو محض فخر و تمجید تک محدود نہیں رکھا بلکہ اسلامی تاریخ کے بعض

کمزور اور زوال پذیر ادوار کا بھی غیر جانب دارانہ ذکر کیا، اور ان سے سبق و عبرت اخذ کیا. انہوں نے البدایہ والنہایہ"میں تاریخِ اسلام کے روشن اور درخشاں پہلوؤں کو نمایاں کیا تاکہ مسلمانوں کو خیر اور حق کی پیروی کی ترغیب ملے، اور ساتھ ہی بعض ادوار میں مسلمانوں کے ضعف اور انحطاط کی نشان دہی کی، ان کے اسباب واضح کیے تاکہ نصیحت، عبرت اور سبق حاصل ہو۔ واقعات اور تراجم کو یکجا کرنے کے باعث ان کی تاریخ میں سیاسی واقعات، فتنوں اور جنگوں کے ساتھ ساتھ علمی اور ثقافتی پہلو بھی بھرپور انداز میں محفوظ ہو گئے۔

ابنِ خلدون (732–808ھ) کی تاریخ نگاری:

مسلمانوں کے ہاں تاریخ نویسی کی اہمیت اس وقت مزید واضح ہو جاتی ہے جب ہم ان کے تصوراتِ تاریخ، اس کی حرکت، اصولِ تحریر اور اس سے استفادے کے طریقوں پر غور کرتے ہیں۔ ان میں سرِ فہرست عبد الرحمن بن محمد بن خلدون ہیں، جنھیں بجا طور پر علمِ تاریخ اور علمِ عمرانیات کا بانی کہا جاتا ہے۔ انھوں نے "فضل علم التاریخ و تحقیق مذاھبہ" (تاریخ ابن خلدون) میں تاریخ کی حقیقت اور اس کے اصول یوں بیان کیے:

" اعلم أنَّ فنَّ التَّأريخ فنٌّ عزيز المذهب، جمُّ الفوائد، شريف الغاية؛ إذ هو يُوقفنا على أحوال الماضين من الأمم في أخلاقهم. والأنبياء في سيرهم. والملوك في دولهم وسياستهم، حتَّى تتمَّ فائدة الاقتداء في ذلك لمن يَرُومُهُ في أحوال الدِّين والدُّنيا فهو محتاج إلى مآخذ متعدّدة ومعارف متنوِّعة وحُسن نَظَر وتثبّت يفضيان بصاحبهما إلى الحقِّ وينكّبان به عن المزلّات والمغالط،

لأن الأخبار إذا اعْتُمِدَ فيها على مجرد النقل، ولم تُحكَّم أصول العادة وقواعد السياسة وطبيعة العمران والأحوال في الاجتماع الإنساني، ولا قيس الغائب منها بالشاهد والحاضر بالذاهب، فربّما لم يُؤْمَن فيها من العُثور، ومزلَّة القَدَم والحيْد عن جادَّة الصِّدق وكثيراً ما وقع للمؤرِّخين والمفسِّرين وأئمَّة النَّقل من المغالط في الحكايات والوقائع لاعتمادهم فيها على مجرَّد النّقل غثَّاً أو سميناً ولم يَعرضوها على أصولها ولا قاسوها بأشباهها ولا سبروها بمعيار الحكمة والوقوف على طبائع الكائنات وتحكيم النّظر والبصيرة في الأخبار فضلُّوا عن الحق وتاهوا في بيداء الوهم والغلط ولا سيَّما في إحصاء الأعداد من الأموال والعساكر إذا عرضت في الحكايات إذ هي مظنَّة الكذب ومطيَّة الهذر ولا بدَّ من ردِّها إلى الأصول وعرضها على القواعد."(عبدالرحمن بن خلدون، مقدمة ابن خلدون، ص13)

ترجمہ: جان لو کہ فنِ تاریخ نہایت بلند پایہ، کثیر الفوائد اور اعلیٰ مقصد کا حامل علم ہے۔

یہ ہمیں گزشتہ امتوں کے اخلاق، انبیا کی سیرتوں اور بادشاہوں کی حکومتوں اور سیاستوں سے آگاہ کرتا ہے، تاکہ دین و دنیا کے معاملات میں اقتدا کا فائدہ حاصل ہو۔ مگر اس کے لیے متعدّد مصادر، مختلف علوم سے واقفیت، گہری نظر اور تحقیق و تثبّت ضروری ہے، کیوں کہ اگر محض روایت پر اعتماد کیا جائے، اور انسانی معاشرت، سیاست، عمرانی اصولوں اور حالاتِ زمانہ کو معیار نہ بنایا جائے، تو قدم لغزش کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مؤرخین اور مفسرین محض نقل پر اکتفا کرنے کی وجہ سے غلطیوں کا شکار ہوئے، خاص طور پر اموال اور افواج کی تعداد جیسے امور میں، جہاں مبالغہ اور وہم کا غلبہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ان خبروں کو اصولوں اور قواعد پر پرکھا جائے۔

فرانز روزنتال (Franz Rosenthal) "مقدّمہ ابن خلدون" کا انگریزی ترجمہ اور تشریح کی ہے، جس میں وہ اسے تاریخ، سماجی اور سیاسی علوم کا ایک مربوط منہج قرار دیتے ہیں۔ روزنتال کے مطالعے کا نتیجہ یہ ہے کہ ابن خلدون نے تاریخ کو صرف روایتی واقعات کے بیان سے نکال کر ایک علمی تجزیاتی فن میں بدل دیا، جس میں انسانی معاشرے، ریاست، سماجی تنظیمات، اور سیاسی صورتِ حال کو بنیاد بنایا گیا۔ چناں چہ وہ ترجمہ کے تعارف میں لکھتے ہیں:

> *"...Regarded as the earliest attempt made by any historian to discover a pattern in the changes that occur in man's political and social organization. Rational in its approach, analytical in its method, encyclopaedic in detail, it represents an almost complete departure from traditional historiography, discarding conventional concepts and clichés and seeking, beyond the mere chronicle of events, an explanation — and hence a*

philosophy — of history."

ترجمہ: ... "یہ (المُقدّمہ) تاریخ نگاروں کی جانب سے انسان کے سیاسی اور سماجی ڈھانچوں میں ہونے والی تبدیلیوں میں ایک نمونہ تلاش کرنے کی سب سے قدیم کوشش کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس کا طریقۂ کار عقلی، اسلوب تجزیاتی، مواد حوالہ جاتی وجامع ہے، اور یہ روایتی تاریخ نگاری سے تقریباً مکمل انحراف کی نمائندگی کرتا ہے، عام تصورات کو چھوڑ کر، محض واقعات کی تاریخ درج کرنے کے علاوہ ایک وضاحتی تشریح، اور اس طرح تاریخ کے فلسفے، کی تلاش کرتا ہے۔

روزنتال نے ببانگ دہل اعلان کیا کہ ابنِ خلدون پہلے مفکر ہیں جنھوں نے سماجی اور سیاسی علوم کو یکجا کر کے تاریخ کے مطالعے میں استعمال کیا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تاریخ کو ایک زندہ قوت کے طور پر دیکھا جو ماضی کو حال سے مسلسل عمل کے ذریعے جوڑتی ہے۔ انسان، ماحول، انفرادی کوششیں اور سماجی تنظیمیں، یہ سب تاریخ کا خام مواد ہیں۔ اگرچہ ان کا تجزیہ بعض اوقات سخت بھی ہو جاتا ہے، مگر اس کے باوجود وہ علمِ تاریخ اسلامی روایت میں ایک غیر معمولی اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔

ان تمام مباحث سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک تاریخ نویسی ایک سنجیدہ، دقیق اور تخصصی علم تھا، کوئی ایسی چراگاہ نہیں جس میں ہر ناواقف داخل ہو جائے۔ جیسے دیگر علوم میں غیر اہل کی مداخلت تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے، اسی طرح تاریخ میں نااہل قلم کار، قوموں کے فکری، اعتقادی اور اخلاقی انحراف کا سبب بن سکتے ہیں۔ ابنِ کثیر اور ابنِ خلدون کے تحریری نمونے اس بات کا ثبوت ہیں کہ علمی منہج ہی تاریخ کو سطحیت اور نمائشی دانشوری سے محفوظ رکھ سکتا ہے، اور تاریخ کو ایک زندہ، بامعنی اور باوقار علم بنا سکتا ہے۔

(ماہ نامہ اشرفیہ فروری، مارچ 2026ء میں دو قسط میں شائع)

(تحریر دسمبر 2025ء)

ملکہ زینوبیا

ملکہ زینوبیا (پیدائش: تقریباً 240 عیسوی، وفات: نامعلوم)، پالمائرین سلطنت کی ملکہ، ایک ایسی تاریخی شخصیت جس نے رومن سلطنت کے زوال پذیر دور، جسے "تیسری صدی کا بحران" (235-284 عیسوی) کہا جاتا ہے، میں روم کے اقتدار کو چیلنج کیا۔ یہ دور رومن تاریخ کا انتشار انگیز دور تھا، جس کی خصوصیت مسلسل خانہ جنگی، سماجی بدامنی، معاشی عدم استحکام، اور سب سے اہم، رومن سلطنت کا تین الگ الگ خطوں میں تقسیم ہونا تھا: گالک سلطنت، رومن سلطنت، اور پالمائرین سلطنت۔ زینوبیا کی قیادت میں پالمائرین سلطنت اسی بحران کی پیداوار تھی، جب مرکزی رومن حکومت کی کمزوری نے دور دراز کے علاقوں کو خود مختار سیاسی وجود بننے کا موقع فراہم کیا۔

تیسری صدی کا بحران:

تیسری صدی کا بحران رومن سلطنت کے لیے ایک تباہ کن دور تھا۔ مسلسل خانہ جنگی نے رومن اقتدار کو کمزور کر دیا تھا، اور کئی علاقوں نے خود کو آزاد سیاسی اکائیوں کے طور پر قائم کیا۔ اس بحران کی وجہ سے سلطنت تین حصوں میں بٹ گئی: مغربی یورپ میں گالک سلطنت، وسطی رومن سلطنت، اور مشرقی علاقوں میں پالمائرین سلطنت۔ روم کی مرکزی حکومت اس قدر کمزور ہو چکی تھی کہ وہ اپنے مضبوط علاقوں کو کنٹرول کرنے سے قاصر تھی، جس نے زینوبیا جیسے مقامی رہنماؤں کو موقع فراہم کیا کہ وہ اپنی طاقت کو مستحکم کریں۔

اس وقت پالمائرا، جو موجودہ شام میں واقع ہے، ایک اہم تجارتی مرکز تھا جو روم اور مشرق کے درمیان ایک پل کا کردار ادا کرتا تھا۔ یہ شہر اپنی ثقافتی تنوع اور معاشی خوش حالی

کے لیے مشہور تھا۔ زینوبیا نے اس شہر کی طاقت کو استعمال کرتے ہوئے ایک ایسی سلطنت قائم کی جو مصر سے لے کر ایشیا مائنر تک پھیلی ہوئی تھی۔

خاندان، ولادت اور تعلیم و تربیت:

زینوبیا، جس کا پورا نام جولیا اور یلیا زینوبیا تھا، تقریباً 240ء میں پالمائرا، شام میں پیدا ہوئی، اس کی ابتدائی زندگی کے بارے میں معلومات محدود ہیں، لیکن تاریخی ذرائع کے مطابق وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ شاید شامی یا عربی النسل سے تھی، اور اس کا تعلق پالمائرا کے اشرافیہ سے تھا۔ اس وقت شام رومن سلطنت کا ایک صوبہ تھا، جسے 116/115ء میں روم نے اپنی سلطنت میں شامل کیا تھا۔ زینوبیا رومن شہری تھی، کیونکہ اس کے خاندان کو غالباً شہنشاہ مارکس اور یلیئس (161-180ء) کے دور میں رومن شہریت کا درجہ دیا گیا تھا۔ ہسٹوریا اگسٹا کے مطابق، اس کے والد کا خاندان روم کی سیویرن خاندان کی مشہور خاتون جولیا ڈومنا (170-217ء) سے تعلق رکھتا تھا، جو رومن تاریخ کی ایک بااثر شخصیت تھی۔

زینوبیا نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ وہ یونانی اور لاطینی زبانوں سے واقف تھی اگرچہ ان زبانوں میں اس کی مہارت محدود تھی۔ تاہم، وہ مصری اور آرامی زبانوں میں روانی سے بات کر سکتی تھی۔ طبری کی روایت کے مطابق، زینوبیا کو بچپن میں خاندانی ریوڑوں اور چرواہوں کی نگرانی کی ذمہ داری سونپی گئی تھی، اس تجربے نے اسے کم عمری میں ہی مردوں پر حکمرانی کرنے اور قائدانہ صلاحیتیں پیدا کرنے کا موقع دیا۔ اسی دوران اس نے گھوڑ سواری میں مہارت حاصل کی جو بعد میں اس کی فوجی مہمات میں نمایاں طور پر کام آئی۔ تاریخی روایات بتاتی ہیں کہ وہ اپنی فوج کے ساتھ لمبے فاصلوں تک پیدل چل سکتی تھی، شکار میں مردوں کا مقابلہ کر سکتی تھی، اور شراب پینے میں کسی کو بھی پیچھے چھوڑ سکتی تھیں۔ یہ صلاحیتیں اس دور کے معیار کے مطابق غیر معمولی تھیں، خاص طور پر ایک ایسی عورت کے لیے جو ایشیا کے اس روایتی

معاشرے میں رہتی تھی جہاں خواتین سے عام طور پر گھریلو زندگی کی توقع کی جاتی تھی۔

زینوبیا کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کے تعلیمی اور ثقافتی شعور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایڈورڈ گبن اپنی مشہور کتاب میں اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ؛ زینوبیا ایسی خاتون تھی جس نے ایشیا کے معاشرتی حالات اور جنسی پابندیوں کو توڑتے ہوئے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ وہ نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ اپنی پاک دامنی اور بہادری میں کلیوپیٹرا سے بھی آگے تھی۔ اس کی سیاہ رنگت، موتیوں جیسے سفید دانت، اور چمکتی ہوئی سیاہ آنکھیں اس کی شخصیت کو ایک خاص دلکشی دیتی تھیں۔ اس کی آواز طاقت ور مگر دلنشین تھی اور اس نے اپنی ذہانت کو مطالعہ سے مزید نکھارا تھا۔ ذاتی مطالعے کی بدولت اس نے یونانی، سریانی، اور مصری زبانوں میں یکساں مہارت حاصل کی اور لاطینی زبان سے بھی کچھ حد تک واقف تھی۔ اس نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے مشرقی تاریخ کا ایک خلاصہ بھی مرتب کیا تھا اور مشہور فلسفی لونجینس کی سرپرستی میں ہومر اور افلاطون کے ادب کا بھی مطالعہ کیا تھا۔ یہ تعلیمی پس منظر اسے ایک ایسی حکمران بناتا تھا جو نہ صرف فوجی میدان میں بلکہ ثقافتی اور فکری طور پر بھی نمایاں تھی۔

پاک دامنی:

تاریخی ذرائع میں زینوبیا کی پاک دامنی کو خاص طور پر اجاگر کیا گیا ہے۔ وہ اس نظریے کی حامی تھی کہ جنسی تعلقات صرف افزائش نسل کے لیے ہونے چاہئیں۔ اس کی شادی پالمائرا کے گورنر اودینا تھس سے ہوئی تھی، جو سلطنتِ روم کا وفادار اتحادی تھا۔ اودینا تھس نے روم کے لیے کئی فوجی مہمات سر کیں، جن میں ساسانی سلطنت کے خلاف کامیابیاں بھی شامل تھیں۔ شادی کے بعد، اس نے اپنے شوہر کو صرف اسی مقصد کے لیے ہم بستری کی اجازت دی۔ یہ فکر اس دور کے معاشرتی اصولوں کے برعکس تھی جس سے اس کی مضبوط شخصیت اور نظم و ضبط کی عکاسی ہوتی ہے۔ اس کی یہ خصوصیت قدیم ذرائع، حتیٰ کہ عربی روایات میں بھی

اس کے کردار کو ایک عظیم اور قابل احترام ملکہ کے طور پر پیش کرتی ہے۔

267ء میں ایک شکار کے دوران اپنے بھتیجے کے ساتھ تنازعہ کے بعد اودینا تھس اور اس کے بیٹے کی ہلاکت ہو گئی۔ کچھ ذرائع نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ زینوبیا نے اپنے بیٹے وہابالا تھس کو بادشاہ بنانے کے لیے اودینا تھس کا قتل کرایا، لیکن جدید مورخین نے اس نظریے کو مسترد کر دیا ہے۔ اودینا تھس کی موت کے بعد، زینوبیا نے اپنے کم عمر بیٹے وہابالا تھس کے نام پر بطور نائب السلطنت اقتدار سنبھالا۔ اس نے اپنے دربار کو دانشوروں اور فلسفیوں سے سجایا، جن میں مشہور افلاطونی فلسفی کیسیئس لونجینس (213-273ء) بھی شامل تھے، جن پر بعد میں روم کے ساتھ زینوبیا کے تعلقات خراب کرنے کا الزام لگایا گیا۔

ابتدائی دور اور روم کے ساتھ تعلقات:

اودینا تھس کے دور میں پالمائرا اور روم کے تعلقات دوستانہ رہے، کیونکہ اس کی فوجی مہمات روم کے مفادات کے ساتھ ساتھ اس کے اپنے مفادات کے لیے بھی تھیں۔ جب زینوبیا نے اقتدار سنبھالا، اس نے اپنے شوہر کی پالیسیوں کو جاری رکھا۔ تیسری صدی کے بحران کے دوران روم میں انتشار پھیلا ہوا تھا، جہاں 26 شہنشاہ آئے اور چلے گئے۔ اودینا تھس شاید یہ سوچتا تھا کہ وہ اپنی فوجی کامیابیوں اور دولت کے ذریعے روم کے تخت پر قابض ہو سکتا ہے۔ زینوبیا نے بھی ممکنہ طور پر یہ خیال کیا کہ وہ یا اس کا بیٹا روم پر حکومت کر سکتا ہے، اور اسی لیے اس نے اودینا تھس کے انداز میں اپنی سلطنت کو مضبوط کیا۔

زینوبیا نے اپنے دور کے ابتدائی برسوں میں ایک شاندار دربار قائم کیا۔ رچرڈ اسٹون مین لکھتے ہیں کہ اودینا تھس کی موت کے بعد پانچ سالوں میں زینوبیا نے خود کو مشرق کی ملکہ کے طور پر قائم کر لیا تھا۔ وہ پالمائرا کے شاندار محلات میں رہتی تھی، انطاکیہ اور دمشق کی بہترین ریشمی پوشاکوں میں ملبوس ہوتی تھیں اور ان کے پاس اودینا تھس کی فوجی کامیابیوں کی شہرت اور بدوی سپاہیوں کی طاقت تھی۔ اس طاقت اور اثر و رسوخ کے ساتھ، اس نے روم

کے اقتدار کو چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا۔

مصر کی فتح:

268 عیسوی میں گیلیئنس کی ہلاکت اور اس کے بعد کلاوڈیئس دوم اور کوئنٹیلس کے مختصر ادوار نے روم کو مزید کمزور کر دیا۔ اس افراتفری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زینوبیا نے 269ء میں اپنے جنرل زبداس کی قیادت میں مصر پر حملہ کیا اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس وقت مصر روم کے لیے اناج کی فراہمی کا ایک اہم ذریعہ تھا، اور اس کی فتح زینوبیا کی سلطنت کے لیے بڑی کامیابی تھی۔

زینوبیا نے اس فتح کو روم کے خلاف بغاوت کے طور پر پیش نہیں کیا۔ ایک شامی-مصری شخص تیما جینیس نے رومی گورنر کی غیر موجودگی میں مصر میں بغاوت شروع کی تھی، اور زینوبیا نے اپنے حملے کو روم کے مفادات کے تحفظ کے طور پر پیش کیا۔ البتہ کچھ مورخین کا خیال ہے کہ تیما جینیس کو زینوبیا نے ہی بغاوت کے لیے اکسایا تھا تاکہ اسے حملے کا جواز مل سکے۔ ابتدا میں شامی فوج کامیاب رہی، لیکن رومن فوج نے واپسی پر انھیں مصر سے نکال دیا۔ زینوبیا کی فوج نے رومیوں فوج کا پیچھا کیا اور شام کے قریب ایک جوابی حملے میں رومن فوج کو تباہ کر دیا۔ اس طرح مصر زینوبیا کی سلطنت کا حصہ بن گیا۔

سلطنت کی توسیع:

مصر کی فتح کے بعد زینوبیا نے لیونٹ اور ایشیا مائنر کے علاقوں کے ساتھ سفارتی مذاکرات کیے اور انھیں اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ روم کے اندرونی انتشار کی وجہ سے ان علاقوں کے مقامی رہنماؤں کے لیے پالمائرین سلطنت ایک پرکشش متبادل تھی۔ زینوبیا نے اپنی سلطنت کو اس طرح بڑھایا کہ وہ روم کے ساتھ کھلی دشمنی سے بچتی رہی۔ اس نے وہابالاتھس اور اوریلین (شہنشاہ روم) کے نام سے مشترکہ سکے جاری کیے اور پالمائرا میں

اوریلین کے نام سے کتبے نصب کروائے۔ اس کے باوجود اس نے اپنے بیٹے کے لیے ''آگسٹس'' اور خود کے لیے ''آگسٹا'' کے خطابات اختیار کیے، جو رومن شاہی خاندان کے خصوصی خطابات تھے۔ اس کے علاوہ اس نے ساسانی پارسیوں کے ساتھ تجارتی معاہدے کیے اور روم کے مفادات کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی سلطنت کو وسعت دی۔ 271ء تک اس کی سلطنت موجودہ عراق سے ترکی اور مصر تک پھیل چکی تھی۔

زینوبیا اور اوریلین:

جب تک زینوبیا اپنی سلطنت کو مضبوط کر رہی تھیں، روم کے دوسرے شہنشاہ یا تو اس کی سرگرمیوں کو نظر انداز کر رہے تھے یا ان کے پاس وسائل کی کمی تھی۔ لیکن اوریلین (حکومت: 270-275ء) ایک مختلف قسم کا حکمران تھا۔ وہ ایک فوجی افسر سے ترقی کر کے شہنشاہ بنا تھا اور اس کی ترجیح رومی سلطنت کی وحدت بحال کرنا تھی۔ 272ء تک اوریلین نے وینڈلز، ایلیمانی، اور گوتھس کو شکست دی اور مشرقی صوبوں کو زینوبیا سے واپس لینے کے لیے تیار ہو گیا۔

اوریلین نے کوئی سفارتی خط و کتابت نہیں کی بلکہ اپنی پوری فوج کے ساتھ پالمائرین سلطنت پر حملہ کر دیا جب کہ ہسٹوریا آگسٹا میں اوریلین کے ایک خط کا ذکر ہے جس میں اس نے زینوبیا سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا، اور زینوبیا کے مغرورانہ جواب کا بھی تذکرہ ہے۔ تاہم، مورخین اسے بعد کی ایجادات سمجھتے ہیں، جو اوریلین کی رحم دلی اور زینوبیا کی ہٹ دھرمی کو اجاگر کرنے کے لیے بنائی گئیں۔

ایشیا مائنر میں داخل ہوتے ہی اوریلین نے زینوبیا کے شہروں کو تباہ کیا۔ جب وہ ٹیانا پہنچا، جو مشہور فلسفی اپولونیئس آف ٹیانا کا شہر تھا، تو اسے خواب میں اپولونیئس نے رحم دلی کی تلقین کی، اوریلین نے ٹیانا کو معاف کر دیا، اور اس رحم دلی نے دیگر شہروں کو مزاحمت کے بجائے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کیا۔ جلد ہی اوریلین شام پہنچ گیا، اوریلین کے شام پہنچنے کی خبر پا کر زینوبیا نے اپنی فوج کو منظم کیا، اور دونوں فوجیں دافنے کے قریب عمائے کی لڑائی میں آمنے

سامنے ہوئیں۔ اوریلین نے جھوٹی پسپائی کی حکمت عملی اپنائی، جس سے پالمائرین فوج تھک گئی۔ جب وہ پیچھا کرتے ہوئے کمزور ہوئی، تو رومن فوج نے ایک گھیرے کی شکل میں حملہ کر کے اسے شکست دی۔ پالمائرین فوج کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا، اور زینوبیا اپنے جنرل زبداسؔ کے ساتھ ایمیسا فرار ہوگئی، جہاں اس کے پاس مزید فوجی اور خزانہ موجود تھا۔

اوریلین نے اس کا پیچھا کیا۔ ایمیسا کے قریب ایک اور لڑائی ہوئی، جہاں اوریلین نے وہی حکمت عملی دوبارہ استعمال کی۔ پالمائرین گھڑسواروں نے رومن فوج کا پیچھا کیا، لیکن رومن فوج نے مڑکر حملہ کیا اور پالمائرین کو تباہ کر دیا۔ اوریلین نے ایمیسا پر قبضہ کر لیا اور غالباً زینوبیا کا خزانہ بھی لوٹ لیا۔ تاہم، زینوبیا ایک بار پھر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئی۔

گرفتاری:

271 عیسوی میں اوریلین نے پالمائرین افواج کو ایمیسا اور انطاکیہ کی لڑائیوں میں شکست دی۔ اوریلین نے پالمائرا پر قبضہ کیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ زینوبیا فرار ہوگئی ہے، تو اس نے اپنے گھڑسوار دستوں کو اس کی گرفتاری کے لیے بھیجا۔ زینوبیا شاید پارسیوں سے امداد کی امید رکھتی تھی، لیکن جب کوئی مدد نہ آئی تو اس نے اپنے بیٹے وہابالا تھس کے ساتھ اونٹ پر سوار ہوکر پارسیوں کے پاس فرار ہونے کی کوشش کی لیکن 272ء میں اس کو فرات کے کنارے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہوئے گرفتار کر لیا گیا۔ اسے زنجیروں میں جکڑ کر اوریلین کے سامنے پیش کیا گیا۔ زینوبیا نے اپنی بے گناہی کا دعویٰ کیا اور اپنے فیصلوں کا الزام اپنے مشیروں، خاص طور پر کیسیئس لونجینس پر ڈال دیا، چنانچہ اسے فوراً سزائے موت دے دی گئی۔ اس کے بعد زینوبیا کو روم لے جایا گیا۔

زینوبیا کا انجام:

پالمائرا کو رومن سلطنت میں دوبارہ شامل کر لیا گیا، اور زینوبیا کی سلطنت کا خاتمہ ہو

گیا۔ زینوبیا کے انجام کے بارے میں تاریخی ذرائع متضاد ہیں۔ کچھ روایات، جیسے ہسٹوریا اگسٹا، وغیرہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسے روم کی سڑکوں پر زنجیروں میں جکڑ کر پریڈ کرائی گئی اور بعد میں اس کی موت ہوگئی۔ تاہم، زیادہ معتبر ذرائع، جیسے زوسیمس اور زونارس، بتاتے ہیں کہ اوریلین نے اسے معاف کر دیا اور اسے روم میں ایک آرام دہ زندگی گزارنے کی اجازت دی۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ زینوبیا کو روم میں زنجیروں میں پریڈ کرنے یا ان کی سزا دینے کی کہانی شاید بعد کے مورخین نے پروپیگنڈے کے طور پر پھیلائی، تاکہ اوریلین کی فتح کو مزید شاندار بنایا جا سکے۔

زینوبیا کے انجام کے بارے میں مختلف ذرائع مختلف روایات پیش کرتے ہیں۔ زوسیمس کے مطابق، وہ اور اس کا بیٹا باسفورس میں ڈوب گئے، لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ زینوبیا روم پہنچی مقدمہ چلا، اور بری ہو کر ایک ولا میں رہی، جہاں ایک بار پھر اس کی شادی ایک رومن شخص سے ہوئی۔ ہسٹوریا اگسٹا دعویٰ کرتی ہے کہ زینوبیا کو اوریلین کے فتحیہ جلوس میں سونے کی زنجیروں اور زیورات سے لدی ہوئی روم کی سڑکوں پر گھمایا گیا، جس کے بعد اسے روم کے قریب ایک محل دیا گیا جہاں اس نے اپنی باقی زندگی عیش و آرام میں گزاری۔

زونارس کہتے ہیں کہ اسے کبھی زنجیروں میں نہیں باندھا گیا اور نہ پریڈ کرائی گئی، زونارس یہ بھی کہتے ہیں کہ اوریلین نے زینوبیا کی ایک بیٹی سے شادی بھی کی تھی۔

طبری اور دیگر روایات:

طبری کی روایت میں اوریلین یا روم کا ذکر نہیں ہے، ان کے مطابق، زینوبیا نے ایک قبیلے کے سردار جاذیمہ کو شادی کی رات قتل کیا، اور اس کے بھتیجے نے بدلہ لینے کے لیے اس کا پیچھا کیا۔ وہ پالمائرا سے فرار ہوئی اور فرات کے نیچے بنائی گئی ایک سرنگ میں داخل ہونے والی تھی کہ پکڑی گئیں۔ اس کے بعد یا تو اس نے زہر پی کر خودکشی کی یا اسے سزائے موت دی گئی۔

ہسٹوریا اگسٹا کو ایک غیر معتبر ذریعہ سمجھا جاتا ہے، جو اکثر واقعات اور شخصیات کو مبالغہ

آمیز انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ رومن شہنشاہوں کی عظمت کو اجاگر کیا جاسکے۔ رچرڈ اسٹون مین لکھتے ہیں کہ اس کی تفصیلات پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا، اس کے مقابلے زوسیمس اور زونارس کے بیانات زیادہ قابل اعتماد ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ زینوبیا کو روم لے جایا گیا ہو لیکن اسے فتحیہ جلوس میں پیش کرنے کی کہانی شاید افسانوی ہے۔ اوریلین نہیں چاہتا تھا کہ روم کے عوام ایک عورت کی طاقت کے سامنے شرمندہ ہوں، اس لیے اس نے زینوبیا کی شکست کو زیادہ توجہ نہ دینے کی کوشش کی۔ زینوبیا کے مقدمے، بریت، اور روم میں زندگی گزارنے کی کہانی زیادہ قابل قبول ہے۔ مغربی ذرائع میں اس کی سزائے موت کا کوئی ثبوت نہیں، اور اس کی موت کا خودکشی یا سزا والا ورژن شاید عربی روایات سے آیا۔

سٹوریا اگسٹا اور ایڈورڈ گبن کے بیانات زینوبیا کو ایک ایسی خاتون کے طور پر پیش کرتے ہیں جو اپنی ذہانت، خوب صورتی، اور بہادری کے باعث اپنے دور کی سب سے نمایاں شخصیت تھی۔ گبن کا بیان، جو ہسٹوریا اگسٹا سے بہت حد تک متاثر ہے، زینوبیا کی شبیہ کو بعد کی نسلوں تک ایک ہیروئن کے طور پر پہنچانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ البتہ، عربی ذرائع، جیسے طبری کی روایات، اسے کم بہادر اور زیادہ چالاک کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ اس کے باوجود، تمام ذرائع اس بات پر متفق ہیں کہ وہ ایک غیر معمولی رہنما تھی۔

زینوبیا کی کہانی صرف ایک عسکری یا سیاسی رہنما کی کہانی نہیں ہے، بلکہ یہ ایک ایسی عورت کی داستان ہے جس نے ایک مردانہ معاشرے میں اپنی صلاحیتوں سے ایک سلطنت بنائی۔ اس نے نہ صرف فوجی مہمات سر کیں بلکہ ایک ایسی ثقافتی شناخت قائم کی جو آج بھی پالمائرا کی آثار قدیمہ میں جھلکتی ہے۔ اس کی سلطنت اگرچہ عارضی تھی، لیکن اس نے رومن سلطنت کے کمزور ڈھانچے کو بے نقاب کیا اور ثابت کیا کہ مقامی رہنما عالمی طاقتوں کو چیلنج کر سکتے ہیں۔ زینوبیا کو بعد کی نسلوں نے ایک باغی، ایک ملکہ، اور ایک ہیروئن کے طور پر یاد کیا۔ جدید دور میں، وہ نسوانی طاقت اور خود مختاری کی علامت بن گئی ہے۔ اس کی کہانی شام کی

ثقافتی شناخت کا بھی حصہ ہے، جہاں پالمائرا کے کھنڈرات آج بھی اس کے عظیم کارناموں کی گواہی دیتے ہیں۔

ماٰخذ:

- زوسیمس۔490ء۔
- ہسٹور یا اگسٹا (چوتھی صدی عیسوی)۔
- زونارس (بارہویں صدی عیسوی)۔
- طبری (839-923عیسوی)
- عدی بن زید (چھٹی صدی عیسوی) کے بیانات پر مبنی

(ماہنامہ اشرفیہ جون 2025ء میں شائع۔ تحریر: 2/ مئی 2025ء)

حمورابی اور اس کے قوانین

تمدنی تاریخ میں بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کے کارنامے صدیوں کی گرد کے باوجود روشن رہتے ہیں۔ حمورابی کا نام ایسی ہی شخصیات میں شامل ہے، وہ قدیم بابل کا چھٹا بادشاہ تھا اور قیاساً 1792 قبل مسیح سے 1750 قبل مسیح تک بابل کا حکمران رہا۔ تاہم اس کی اہمیت صرف ایک حکمران کے طور پر نہیں، بلکہ ایک ایسے قانون ساز اور مصلح کی صورت میں ہے جس نے معاشرے کو عدل وانصاف اور ریاستی نظام کے مضبوط اصول و قوانین فراہم کیے۔

حمورابی کا تعلق اموری قبیلے سے تھا۔ اس کے والد سن مبلت بابل کے حکمران تھے، اور ان کی وفات کے بعد عین عالمِ شباب میں حمورابی نے اقتدار کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس وقت بابل کی سلطنت بہت بڑی نہ تھی، بلکہ اصل میں اس وقت بابل اردگرد کی کئی طاقتور ریاستوں کے درمیان محض ایک چھوٹا اور کمزور شہر تھا۔ حمورابی کی سیاسی بصیرت اور جنگی حکمت عملی نے آہستہ آہستہ اس کمزور ریاست کو بین النہرین کی مرکزی قوت میں تبدیل کر دیا۔ اس نے پہلے ہمسایہ ریاستوں سے معاہدات کیے، پھر مناسب وقت پر لارسا، ماری، اشور، ایسن اور ایلام جیسی بڑی طاقتوں کو شکست دے کر پورے جنوبی اور وسطی عراق کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اس طرح بابل پہلی بار ایک مضبوط اور متحد سلطنت بن کر ابھرا۔

حمورابی کی اصل شہرت اس کی قانون سازی سے ہے۔ اس کا مرتب کردہ قانون جسے "قانونِ حمورابی" کہا جاتا ہے، انسانی تاریخ کے اولین تحریری قانونی نظاموں میں شمار ہوتا ہے۔ یہ قانون ایک سیاہ ڈائیورائٹ کے پتھر پر کندہ تھا، جس میں معاشی معاملات، عدالتی فیصلوں، خاندانی حقوق، تجارت، زراعت، جرائم اور ان کی سزاؤں تک ہر بات واضح تھی۔

اس قانون کا بنیادی اصول عدل اور توازن تھا۔ مشہور جملہ **"آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت"** اسی قانونی تصور کی تعبیر سمجھا جاتا ہے۔ حمورابی چاہتا تھا کہ کوئی شخص قانون سے ناواقفیت کا سہارا نہ لے سکے، اس لیے اس نے یہ قانون عوام کے سامنے واضح اور تحریری شکل میں پیش کیا۔

اس کے دور میں ریاستی نظم اور شہری سہولیات بھی خاصی بہتر ہوئیں۔ نہریں تعمیر ہوئیں، زراعت مستحکم ہوئی، فوجی نظام مضبوط کیا گیا، اور شہر علمی و ثقافتی رنگ میں پروان چڑھے۔ اس طرح بابل صرف سیاسی ہی نہیں، تہذیبی طور پر بھی ایک روشن مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔

حمورابی کی وفات 1750 ق م کے قریب ہوئی، مگر اس کی میراث اس کے بعد بھی زندہ رہی۔ آج بھی اسے عادل حکمراں کے طور پر جانا جاتا ہے۔ بطور حکمراں اس نے یہ تصور دیا کہ ریاست تلوار سے زیادہ قانون اور انصاف پر قائم ہوتی ہے۔

حمورابی کے قوانین:

حمورابی کے قوانین کو کو بابلی قوانین کے مکمل مجموعہ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ حمورابی کے قانونی فیصلوں پر مشتمل ہے جو اس کے دور حکومت کے اختتام پر پتھر کی ٹیبلٹ پر ریکارڈ کیے گئے تھے۔ یہ ٹیبلٹ (تختی) بابل کے قومی دیوتا "مردوک" کے مندر میں رکھی گئی تھی۔ اس میں بہت سے مسائل سے متعلق 282 قوانین شامل ہیں، جیسے قیمتوں اور تجارت سے متعلق اقتصادی دفعات؛ خاندانی قوانین، جیسے شادی اور طلاق؛ حملہ اور چوری سے متعلق فوجداری قوانین؛ اور سول قوانین، جیسے غلامی اور قرض۔ ان مسائل سے متعلق سزائیں مجرموں کی حیثیت اور جرائم کے حالات کے مطابق مختلف ہوتی ہیں۔

ضابطہ حمورابی میں بہت سے مسائل سے متعلق قوانین کا ایک سلسلہ شامل ہے، جیسے غلامی، قرض، شادی، وراثت، اور تجارتی قوانین، اس کے علاوہ بہت سے ایسے قوانین جو جرائم کے لیے سزا کی ڈگریوں کا تعین کرتے ہیں۔ ہم اس کے بعض قوانین کو اختصار کے ساتھ ذیل

میں نقل کرتے ہیں:

عدل وانصاف کے عمومی اصول:

❁ قانون سب کے لیے برابر ہے، چاہے حاکم ہو یا رعایا۔
❁ کسی فرد پر الزام بغیر ثبوت کے ثابت نہیں ہوگا۔
❁ جھوٹی گواہی سخت جرم ہے اور اس پر سخت سزا مقرر ہے۔
❁ قاضی کے فیصلے کو تبدیل کرنا جرم ہے، اور غلط فیصلہ کرنے والے قاضی کو عہدے سے ہٹا دیا جائے گا۔

خاندان اور گھرانے سے متعلق قوانین:

❁ نکاح ایک باقاعدہ معاہدہ ہے، زبانی نہیں۔
❁ شوہر بیوی کی مالی اور جسمانی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔
❁ بیوی شوہر کے گھر اور عزت کی محافظ سمجھی گئی۔
❁ اگر بیوی بے قصور ثابت ہو جائے تو اس پر الزام لگانے والا سزا پائے گا۔
❁ طلاق کی صورت میں بیوی کے حقوق (مہر، نان ونفقہ) کی ادائیگی لازم ہے۔
❁ بچوں کی پرورش اور وراثت میں انصاف ضروری ہے۔
❁ گود لیے گئے بچے کو حقیقی بیٹے کے برابر حقوق ملیں گے۔

املاک وجائیداد کے قوانین:

❁ زمین کی ملکیت دستاویزی ہونی چاہیے۔
❁ اگر کوئی زمین کاشت کے لیے لے مگر کاشت نہ کرے تو وہ زمین واپس لی جائے گی۔
❁ نہر یا آب پاشی کے نظام میں غفلت کی وجہ سے پیدا ہونے والا نقصان مجرم سے وصول ہوگا۔
❁ عمارت کی حفاظت کی ذمہ داری کاریگر پر ہے۔

❁ اگر کاریگر کی خرابی سے گھر گر جائے اور کسی کی جان جائے تو کاریگر کو موت کی سزا اور گھر دوبارہ بنانے کی ذمہ داری اسی پر۔

تجارت و کاروبار کے قوانین:

❁ خرید و فروخت میں دھوکا (فراڈ) سنگین جرم ہے۔

❁ ناپ تول میں کمی کی سزا جرمانہ یا کاروباری اجازت کی ضبطی ہے۔

❁ سود کی حد مقرر ہے؛ حد سے زیادہ سود لینا جرم ہے۔

❁ قرض لینے والا دیوالیہ ہو تو اس کے اہلِ خانہ کو غلام بنانے کی اجازت محدود مدت کے لیے تھی (زیادہ سے زیادہ 3 سال)۔

نوکری، اجرت اور محنت سے متعلق قوانین:

❁ کسان، مزدور، لوہار، بڑھئی اور چرواہے کی اجرت مقرر ہے۔

❁ چرواہا اگر جانوروں کا نقصان اپنی غفلت سے کرے تو بھرپائی کرے گا۔

❁ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کی جائے۔

چوری اور ڈاکہ سے متعلق قوانین:

❁ چوری بڑا جرم ہے، اور کئی حالتوں میں سزاے موت مقرر ہے۔

❁ اگر چوری شدہ مال کسی کے گھر میں مل جائے تو گھر کا مالک مجرم ہو گا۔

❁ ناداری یا بھوک کی وجہ سے چور پر ہلکی سزا مقرر تھی (یہ انصاف کی بڑی مثال ہے)۔

❁ مندر کی اشیا چرانا سنگین ترین جرم اور اس کی سزا سخت ترین تھی۔

قتل اور جسمانی نقصان کے قوانین:

❁ جان بوجھ کر قتل کی سزا قتل ہے۔

❁ غلطی سے قتل کی صورت میں دیت (مالی تاوان) لازم ہے۔

❁ ایک شخص کی وجہ سے دوسرے کے اعضا ضائع ہونے پر اسی کے برابر بدلہ یا مالی معاوضہ دیا جائے گا۔

❁ باپ اپنے بیٹے کے جرم میں سزا کا مستحق نہیں، اور بیٹا باپ کے جرم میں نہیں۔

غلامی اور انسانی حقوق سے متعلق قوانین:

❁ کسی آزاد شخص کو غلام بنانا جرم ہے۔

❁ غلام اگر قابلیت دکھائے تو آزادی کا حق حاصل کر سکتا ہے۔

❁ غلام کو بغیر وجہ سزا دینا منع ہے؛ غلام بھی انسان ہے۔

عدالت اور گواہی کے قوانین:

❁ گواہی حلف کے ساتھ دی جائے۔

❁ جھوٹی گواہی دینے والے کو اسی سزا کا سامنا کرنا ہو گا جس سزا کا خطرہ ملزم پر تھا۔

❁ عدالت کا فیصلہ سب کے لیے حتمی ہے۔

زراعت اور آب پاشی کے قوانین:

❁ اگر کوئی کسان نہر کا بند کھول دے اور پانی سے دوسروں کی فصلیں خراب ہوں تو نقصان وہ خود پورا کرے گا۔

❁ اگر پانی کی زیادتی سے نقصان بے احتیاطی کے بغیر ہوا ہو تو بوجھ اجتماعی ہو گا۔

❁ بیج حکومت کی مقررہ شرح پر ملے گا اور قرض کی ادائیگی فصل کے حساب سے ہو گی۔

❁ زمین بٹائی پر دینے کی صورت میں پیداوار کا طے شدہ حصہ مالک کو دیا جائے گا۔

❁ اگر فصل قدرتی آفت سے برباد ہو جائے تو کسان پر قرض کا بوجھ سست رفتار میں ادا کرنے کا حق ہے۔

تجارت اور ذخیرہ اندوزی کے متعلق قوانین:

❁ ذخیرہ اندوزی جرم ہے، خصوصاً خوراک اور اجناس میں۔

❁ بازار کی قیمتیں حکومتی تحریری فیصلے کے مطابق مقرر ہوں گی۔

❁ اگر کوئی تاجر قرض لے کر بھاگ جائے تو اس کے شریک یا ضامن ذمہ دار نہیں ہوں گے، بلکہ تاجر خود مجرم ہو گا۔

❁ بیواؤں اور یتیموں کا مال تجارت میں لگانے سے پہلے عدالتی اجازت ضروری ہے۔

بحری و زمینی سفر اور قافلوں کے قوانین:

❁ دریائی سفر میں جہاز کو نقصان جہاز ران کی ذمہ داری ہے، بشرطے کہ نقصان اس کی غلطی سے ہو۔

❁ اگر جہاز ڈوب جائے مگر مال محفوظ ہو تو جہاز ران مال واپس کرے گا۔

❁ مسافر قافلوں کی حفاظت حکومتی نگرانی میں ہو گی۔

طبی اور علاج کے قوانین:

❁ اگر حکیم یا طبیب کا علاج مریض کی جان لے لے تو اسے سخت سزا دی جائے گی۔

❁ اگر علاج سے مریض کی آنکھ یا عضو ضائع ہو جائے تو نقصان کا معاوضہ یا بدلہ لازم ہے۔

❁ اگر مریض پہلے سے لاعلاج ہو تو طبیب بری الذمہ ہو گا؛ یعنی سزا نہیں۔

❁ دائی کی غفلت سے بچہ مر جائے تو اس پر جرمانہ اور دوبارہ کام سے روکنے کی سزا تھی۔

مویشی اور مال مویشی کے بارے میں قوانین:

❁ چرواہے کی لاپرواہی سے جانور گم یا مر جائیں تو چرواہا تاوان ادا کرے گا۔

❁ اگر چرواہا مالک کی مرضی کے خلاف جانور کو کسی اور چراگاہ میں لے جائے تو جرمانہ ہو گا۔

❁ بیل یا گھوڑا اگر دوسرے کی فصل خراب کرے تو مالک ذمہ دار ہوگا۔

غلامی سے متعلق مزید قوانین:

❁ غلام کو کسی بھی جرم کی سزا جدید قانون کی طرح یکساں نہیں تھی؛ لیکن حمورابی نے واضح کیا کہ غلام انسان ہے، محض چیز نہیں۔

❁ اگر غلام پر ظلم ثابت ہو جائے تو مالک کو سزا یا جرمانہ دیا جا سکتا ہے۔

❁ اگر کوئی غلام ایک نئی جگہ پر اپنی قابلیت ثابت کرے، تو آزادی کا حق مل سکتا ہے۔

مذہب اور معابد کے قوانین:

❁ مندر کی اشیاء کی حفاظت ریاست اور پجاری کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔

❁ مندر یا مذہبی اوقاف کی زمین فروخت یا گروی نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

❁ مذہبی مقامات کی توہین سنگین ترین جرم تھا، جس کی سخت ترین سزائیں تھیں۔

معاشرتی اخلاق اور نظم کے قوانین:

❁ والدین کی بے ادبی کرنا قابلِ سزا جرم تھا۔

❁ استاد کی توہین یا سرکاری منصب دار کی حکم عدولی، عدالتی جرم شمار ہوتی تھی۔

❁ کوئی شخص جھگڑے میں خود انصاف نہیں کرے گا؛ عدالت ہی فیصلہ کرے گی۔

قرض اور مالی ذمہ داری کے قوانین:

❁ اگر کوئی شخص قرض لیتے وقت اپنی زمین یا مکان ضمانت رکھے تو قرض کی مدت پوری ہونے تک وہ زمین قرض خواہ کی ملکیت میں شمار نہیں ہوگی، صرف زیرِ استعمال رہے گی۔

❁ دیوالیہ ہونے کی صورت میں قرض خواہ صرف پیداوار کا حصہ لے سکتا ہے، جائیداد ضبط نہیں کر سکتا۔

❁ اگر کوئی شخص قرض ادا نہ کر سکے اور اس کے پاس کچھ نہ ہو تو زیادہ سے زیادہ تین سال کے لیے اس کا گھرانہ محنت مزدوری کرے گا؛ اس کے بعد قرض ختم ہو جائے گا۔ یہ قانون اس زمانے کے لیے بہت انسانی اور نرم سمجھا جاتا ہے۔

تجارت اور مال کے تبادلے کے مزید قوانین:

❁ ہر تجارت گواہ اور تحریر کی موجودگی میں ہو گی۔

❁ بغیر گواہ کے خریدی یا بیچی گئی چیز پر مقدمہ قائم نہیں ہو سکے گا۔

❁ اگر کوئی تاجر مال کی قیمت چھپا کر زیادہ رقم لے تو اس پر دگنا جرمانہ ہو گا۔

❁ سرکاری تاجر (جسے بادشاہ مقرر کرے) کا حساب ہر سال ریاست کے سامنے پیش کرنا ضروری تھا۔

سفر، رہائش اور سرائے کے قوانین:

❁ کاروان سرائے کا مالک مسافروں کے سامان کا محافظ ہو گا۔

❁ اگر اس کی غفلت سے سامان چوری ہو جائے تو وہ فرائض کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو گا اور نقصان کی تلافی کرے گا۔

❁ قافلے پر حملہ کی صورت میں نقصان ریاست پورا کرے گی، کیوں کہ حفاظت اس کی ذمہ داری ہے۔

جانوروں کے نقصان کے متعلق مزید قوانین:

❁ اگر کسی شخص کا کتا یا شکار کا جانور کسی کو زخمی کرے، تو مالک ذمہ دار ہو گا اور معاوضہ ادا کرے گا۔

❁ اگر بیل سینگ مار کر کسی کو زخمی کرے، اور پہلے بھی ایسا ہوا ہو تو مالک کو سخت سزا دی جائے گی کیوں کہ یہ غفلتِ مسلسل ہے۔

خواتین کی عزت اور عفت کے متعلق قوانین:

❁ جھوٹا الزام (خصوصاً عورت کی پاک دامنی کے خلاف) سنگین جرم تھا اور اس پر سخت سزا دی جاتی تھی۔

❁ اگر عورت پر بدکاری کا الزام لگے اور وہ دریا کے امتحان (Trial by Water) سے بے گناہ ثابت ہو جائے تو الزام لگانے والا سزا پاتا تھا۔

❁ زبردستی عورت کو قید یا محفوظ مقام سے لے جانا قتل یا موت کی سزا کے ساتھ جرم تھا۔

بیواؤں اور یتیموں کے تحفظ کے قوانین:

❁ بیوہ کے پاس مہر اور وراثت محفوظ حق ہیں، کوئی رشتہ دار یا شوہر کا خاندان ان حقوق کو چھین نہیں سکتا۔

❁ یتیم کا مال تجارت میں لگانے والے کو عدالت کے سامنے حساب دینا ہو گا۔

❁ یتیم کے مال میں خیانت بڑا جرم تھا اور اس پر بھاری مالی جرمانہ + سماجی بائیکاٹ لازم تھا۔

معاہدات اور دستاویزی تحریر کے قوانین:

❁ کوئی بھی اقتصادی یا سماجی معاہدہ گواہوں اور تحریری دستاویز کے بغیر معتبر نہیں ہو گا۔

❁ اگر معاہدہ تحریری ہو اور بعد میں کوئی فریق انکار کرے تو دستاویز فیصلہ کن دلیل ہو گی۔

❁ اگر فریقین نے معاہدہ زبانی کیا اور جھگڑا کھڑا ہو گیا تو گواہوں کی گواہی فیصلہ کرے گی۔

❁ اگر گواہ جھوٹی شہادت دے تو وہی سزا اس پر نافذ ہو گی جو ملزم پر عائد ہونے والی تھی۔ یہ قانون انصاف کے توازن کی اعلیٰ مثال ہے۔

کرایہ داری اور خدمات کے قوانین:

❁ کرائے کی زمین کا کرایہ پیداوار کے تناسب سے ادا ہو گا۔

❁ اگر کرایہ دار زمین کی مناسب دیکھ بھال نہ کرے تو نقصان وہ خود پورا کرے گا۔

❁ کرائے کا گھر اگر کرایہ دار کی غفلت سے خراب ہوا تو مرمت کرایہ دار کرے گا۔

❁ اگر گھر قدرتی آفت سے ٹوٹ جائے تو مالک ذمہ دار نہیں۔

اسلحہ اور جنگی سازوسامان کے قوانین:

❁ جنگی ہتھیار ریاست کی ملکیت سمجھے جائیں گے۔

❁ فوجی سازوسامان کو نجی تجارت میں بیچنا یا اسمگل کرنا سنگین جرم تھا۔

❁ اگر فوجی سپاہی جنگ سے بھاگ جائے تو اس کی اعزازی زمین ضبط کر لی جاتی تھی۔

❁ سپاہی کی شہادت کے بعد اس کے خاندان کو راشن اور زمین ریاستی تحفظ کے تحت فراہم کی جاتی تھی۔

❁ یہ قانون شہدا کے خاندان کی سماجی کفالت کا قدیم ترین ثبوت ہے۔

چوری، اغوا اور قید سے متعلق مزید قوانین:

❁ بچے کا اغوا سزائے موت کے درجے کا جرم تھا۔

❁ غلام یا خادمہ کو چوری کے لیے بھڑکانا جرم + جرمانہ + سزا کا باعث بنتا تھا۔

❁ چور اگر چوری کرتے ہوئے مارا گیا تو اس پر مقتول کا خون بہا واجب نہیں تھا۔

❁ مگر اگر چور پکڑا جائے تو چوری شدہ مال سے دگنی قیمت ادا کرے گا؛ نہ کر سکے تو سخت سزا ہوگی۔

عدالت اور وکلا کے کردار کے قوانین:

❁ مقدمہ کھلی عدالت میں سنا جائے گا، بند کمروں میں نہیں۔

❁ وکیل کا فرض تھا کہ ثبوت اور قانون کی وضاحت پیش کرے؛ جھوٹ پر مبنی وکالت جرم تھی۔

❁ قاضی کے فیصلے کے خلاف اپیل کا حق محدود مگر موجود تھا — مگر بلا دلیل اپیل جرم سمجھا جاتا تھا۔

وراثت اور تقسیمِ جائیداد کے مزید تفصیلی قوانین:

❁ وراثت خاندانی درجہ بندی کے تحت تقسیم ہوگی: پہلے بیٹے، پھر بیٹیاں، پھر بھائی، پھر خاندان کے قریبی مرد۔ بیٹی کو جزوی وراثت مگر مہر کے برابر مالی تحفظ کا حق دیا جاتا تھا۔

❁ اگر وراثت میں اختلاف ہو جائے تو فیصلہ مقامی عدالت کرے گی۔

❁ کسی وارث کو جان بوجھ کر محروم کرنے والا شخص قانوناً مجرم ہوگا۔

پیشہ ور کاریگروں کے قوانین:

❁ لوہار، بڑھئی، معمار، سنار وغیرہ کی اجرت متعیّن تھی، وہ اپنی مرضی کی قیمت نہیں لے سکتے تھے۔

❁ کاریگر اپنی چیز کے عیب چھپانے کا مجرم قرار پاتا تھا۔

❁ اگر لوہار نے ایسا ہتھیار تیار کیا جو لڑائی میں ٹوٹ گیا اور مالک قتل یا زخمی ہو گیا، تو پیشہ ور ذمہ دار ہوگا۔

❁ کاریگر کی ذمہ داری اُس کے کام کے معیار کے برابر تھی۔

تعلیم و تربیت کے قوانین:

❁ استاد کی عزت قانونی طور پر محفوظ تھی۔

❁ شاگرد کا استاد کو گالی دینا یا مارنا جرم تھا۔

❁ استاد شاگرد پر ظلم اور بے جا سزا نہیں دے سکتا تھا؛ ایسا ثابت ہو جانے پر اسے سزا ملتی تھی۔ یہ قانون اس بات کی دلیل ہے کہ حمورابی صرف سخت سزا نہیں بلکہ سماجی توازن کا بھی قائل تھے۔

بعض دیگر قوانین:

❁ اگر کوئی غلام اپنے آقا کی بات نہیں مانتا تو تفتیش کار اسے محل میں لے جا کر اس سے تفتیش کرے اور پھر اسے اس کے آقا کے پاس واپس کرے۔

❁ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کا قرض دار ہے، اور اس کی فصل طوفانوں کی زد میں آجائے، یا ناکام ہو جائے، یا سال بھر میں بارش نہ ہونے کی وجہ سے نہ بڑھے، تو وہ اپنے قرض خواہ کو اس سال میں کوئی غلہ نہیں دے گا اور نہ ہی کرایہ ادا کرے گا۔

❁ اگر کوئی مرد کسی عورت سے شادی کرتا ہے اور وہ اس سے بچے پیدا کرتی ہے اور پھر مر جاتی ہے تو اس کا جہیز اس کے بچوں کو جاتا ہے نہ کہ اس کے باپ کو۔

❁ اگر کوئی آدمی دوسرے آدمی کی آنکھ نکالتا ہے تو اس کی آنکھ نکال دی جائے گی۔

❁ اگر کوئی مرد حاملہ عورت کو مارتا ہے، اور اس کے نتیجے میں اس کا جنین ضائع ہو جاتا ہے، تو وہ اس کے نقصان کے معاوضے کے طور پر دس مثقال ادا کرے گا۔

❁ اگر کوئی ڈاکٹر مریض کی ٹوٹی ہوئی ہڈی کا علاج کرتا ہے تو مریض اسے پانچ شیکل ادا کرے گا۔

❁ یہ قانون کہتا ہے کہ اگر کوئی ویٹرنری سرجن گدھے یا بیل کا آپریشن کرتا ہے، تو جانور کا مالک سرجن کو علاج کے لیے ایک مثقال کا چھٹا حصہ ادا کرے گا۔

(ماہنامہ اشرفیہ دسمبر 2025ء میں شائع)

(تحریر نومبر 2025ء)

ہجرتوں کا سنگم
وسطی ایشیا کی تاریخ اور مسلم ورثہ

وہ خطہ جسے آج دنیا وسطی ایشیا کے نام سے جانتی ہے اصل میں پانچ آزاد جمہوری ریاستوں پر مشتمل ہے: ازبکستان، قازقستان، کرغیزستان، ترکمانستان اور تاجکستان۔ یہ ساری ریاستیں کبھی سوویت یونین کے ماتحت تھے اور 1991ء میں سوویت نظام کے انہدام کے بعد انھوں نے آزادی کو دریافت کیا۔ مگر یہ آزادی اصل میں ایک بڑی ذمہ داری اور صدیوں کی آزمائش بن کر ان کے سامنے آئی۔ آزادی کے بعد ان ریاستوں کو ایک ایسی تیز رفتار آبادی، ایسی کمزور اور ناپختہ انتظامی مشینری ورثے میں ملی جو اپنی نئی زندگی کا بار اٹھانے کے قابل نہ تھی۔

جب یہ خطے سوویت یونین کا حصہ تھے تو انھیں نہ سیاسی عدمِ تحفظ کا اندیشہ تھا، نہ معاشی ابتری کا اور نہ ہی کسی قسم کے سماجی اضطراب کا۔ گویا وہ ایک بڑے درخت کے سائے میں تھے جہاں نہ ان پر کسی طوفانی بارش کا اثر ہو سکتا تھا نہ جلد کو جھلساتی ہوئی دھوپ ان پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔ سوویت عہد میں یہ خطے ترقی کے دریا سے سیراب ہو رہے تھے، اس لیے یہ خود سوویت یونین کے ٹوٹنے کے خلاف تھے۔ مگر جب وہ درخت جڑ سے اکھڑ گیا تو یہ خطے بے سایہ ہو گئے۔ گویا ایک طوفان آیا اور سب کچھ تہس نہس کر گیا۔

گزشتہ دو دہائیوں سے وسطی ایشیائی قیادت کو طرح طرح کے طوفانوں سے دوچار ہونا پڑا: سیاسی تحفظ، سرحدی تحفظ، ماحولیاتی تحفظ، توانائی کا تحفظ، ہر سمت نئے زخم اور نئے اندیشے۔ اس اچانک زوال کے بعد شفا پانے کے لیے ان ریاستوں نے سوویت تاریخ کو پسِ پشت ڈالنے کی کوشش کی اور اپنے قدیم ثقافتی اور مذہبی ورثے کو سہارا بنایا۔ اپنی شناخت کو زندہ

رکھنے کے لیے وہ دوبارہ اپنے مسلم ماضی کی طرف متوجہ ہوئیں۔

دیکھا جائے تو وسطی ایشیا کا خطہ ہمیشہ ہجرتوں کا سنگم رہا ہے: ترکوں کا قافلہ، ایرانی تہذیب کا جادو، اسلام کی روشنی، یونانی اثرات کی بازگشت اور کبھی کبھی چینی قدموں کی چاپ۔ لیکن یہاں سب سے گہرا اور سب سے پائیدار رنگ ترک اور اسلامی تہذیب کا ہی رہا۔ یہی سبب ہے کہ اس سرزمین کو ماضی میں ترکستان کہا جاتا تھا۔

وسطی ایشیا ہمیشہ سے بڑی طاقتوں کے کھیل کا میدان رہا ہے۔ اس کی جغرافیائی حیثیت نہ صرف اس کے ماضی کے خدوخال کو تراشتی رہی ہے بلکہ آج کی نسلی اور سیاسی صورتِ حال پر بھی اس کے اثرات محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ روسی یلغار کے بعد اس خطے کی جغرافیائی سرحدیں بھی روسی مفادات کے مطابق کھینچی گئیں۔

یوں موجودہ وسطی ایشیا کا ہر منظر، ہر خواب اور ہر سوال اپنے ماضی کی کسی نہ کسی داستان کا تسلسل ہے، جہاں ترکستان کی صدا آج بھی گونجتی ہے اور اسلام کی روحانی ہوا اب بھی ان کے اجتماعی وجود کو سانسیں فراہم کررہی ہے۔

تاریخی اعتبار سے قازقستان کو شمال مغربی ایشیا کا حصہ سمجھا جاتا تھا، جب کہ افغانستان اور ایران کے شمالی خطے مثلاً خراسان کو وسطی ایشیا کی سرزمین میں شامل مانا جاتا رہا۔ مگر آج جسے ہم وسطی ایشیا کہتے ہیں، اس کی موجودہ جغرافیائی تعریف اس خطے کی ثقافتی جغرافیہ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ مثال کے طور پر:

- وسطی ایشیا کی جنوبی ریاستیں، یعنی تاجکستان اور ازبکستان، اپنی روحانی اور تہذیبی فضا میں زیادہ تر ایرانی و اسلامی ثقافت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ ان کی فکری اور نظریاتی وابستگیاں اپنے جنوبی ہمسایوں سے ہیں نہ کہ قازقستان اور کرغیزستان سے۔
- قازقستان پر چین اور روس کے واقعات زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں بہ نسبت افغانستان یا ایران کے۔

▪اسی طرح ترکمانستان کی فضاؤں پر پاکستان اور افغانستان کی آندھیاں زیادہ گہرا اثر ڈالتی ہیں۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ خطہ ایک ایسے کاغذ کی مانند ہے جس پر تاریخ کے ہر حادثے نے اپنی من چاہی لکیر کھینچی اور ہر تہذیب نے اپنی چھاپ چھوڑ دی، اور انھی نقوش نے آج کے وسطی ایشیا کی شناخت کو تراشا۔

وسطی ایشیا کی یہ سرزمین تین ہزار برس سے زیادہ عرصے سے انسانی قافلوں اور تہذیبی ہجرتوں کی گزر گاہ رہی ہے۔ یہ خطہ کبھی بازارِ دنیا رہا ہے جہاں قدیم دنیا کی عظیم تہذیبیں ایک دوسرے سے ملیں، تجارت کے کارواں رکے، اور خیالات و عقائد کا تبادلہ ہوا۔ یہاں ایران کی باریک بینی اور فکری گہرائی بھی ہے اور یونانی فلسفۂ دانش بھی، یہاں ہند کی روحانی میراث بھی ہے اور چین کی حکمت و صنعت بھی اور ان سب سے بڑھ کر اسلام کی نورانی تہذیب بھی ہے۔ یہ سارے عوامل اس خطے کے کاسۂ دل میں گھل مل کر ایک منفرد رنگ پیدا کرتے رہے ہیں۔

مگر روس کی ظالمانہ یلغار نے اس خطے کو مجروح کیا، اس نے یہاں کے سماجی جڑوں کو کاٹا، اقتصادی بنیادوں کو ہلایا، اور سیاسی ڈھانچوں کو مسخ کیا، اس نے ان اقوام کو ان کی ترک و ایرانی تہذیبی بنیادوں سے کاٹ کر ایک ایسے سوویت ورثے کی جانب منتقل کیا جو اُن کی اپنی روح سے بیگانہ تھا۔ اور جب سوویت اتحاد کا سورج غروب ہوا، تو یہ ریاستیں ایک ایسے بیابان میں تنہا کھڑی رہ گئیں جہاں نہ سایہ دار درخت تھے، نہ محفوظ چھاؤں۔ انھیں اپنی تقدیر خود لکھنی پڑی اور اپنی شناخت خود وضع کرنی پڑی۔

تاریخ کے آئینے میں دیکھا جائے تو وسطی ایشیا کے باشندے زیادہ تر خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے، ان کی گزر بسر شاہراہِ ریشم (Silk Road) کی مرہونِ منت تھی۔ یہی سبب ہے کہ یہ خطہ صدیوں تک ایک ایسا چوراہا رہا جہاں یورپ، مغربی ایشیا، جنوبی ایشیا اور مشرقی

ایشیا سب آپس میں گلے ملتے رہے۔ اسلام سے قبل اور اوائلِ اسلام میں اس خطے پر ایرانی تہذیب کا غلبہ تھا۔ یہاں دو قسم کے لوگ بستے تھے:

(1) خانہ بدوش ترک قبائل۔ اور

(2) مستقل سکونت رکھنے والے لوگ جن میں ایرانی (تاجک) اور ترک (ازبک، قرہ قلپاق وغیرہ) شامل تھے۔

زاری حکومت کے ماہرینِ بشریات نے اس مقیم آبادی کو "سارت" لفظ سے یاد کیا ہے۔ یہ ایک ایسا لفظ جس کی نہ کوئی واضح جڑ ہے اور نہ کوئی معین معنیٰ، مگر انھوں نے اس پر نسلی اور لسانی دلالت کا بوجھ ڈال دیا۔ ان کے نزدیک یہ لفظ تاجک (ایرانی نسل) باشندوں اور ان پر غالب آنے والے ازبک (ترکی نسل) فاتحین کے باہمی تعلق کو ظاہر کرتا تھا۔ مگر حقیقت یہ تھی کہ "سارت" کہلانے والے خود کو کسی خاص نسل یا قوم کا فرد نہیں سمجھتے تھے، بلکہ بس "مسلمان" جانتے تھے۔

چھٹی صدی سے مغرب کی جانب سے ترک قبائل کی یلغاروں کے سبب مذکورہ خانہ بدوشوں میں ترکیت کی چھاپ گہری ہوئی، اس نسبت سے یہ خطہ ترکستان کہلایا۔ تیرہویں صدی میں ترک قبائل (قازق چرواہوں) نے وسطی ایشیا کے کئی شہر اجاڑ دیے اور اس طرح مقامی بستیوں پر ترک اثرات اور بھی بڑھ گئے۔ آج صرف تاجک وہ واحد قوم ہے جسے خالصتاً ایرانی نسل کا تسلسل مانا جا سکتا ہے، اور اس کی دلیل ان کی زبان ہے جو فارسی (ایران و افغانستان) سے نہایت قریب ہے۔

ازبک ترک، سوویت یونین میں سب سے بڑی ترک قوم تھے اور دنیا میں بھی ترکیہ کے ترکوں کے بعد سب سے بڑی ترک نسل سمجھی جاتی ہے۔

پانچویں اور چھٹی صدی تک ترکوں نے جنوبی وسطی ایشیا میں جگہ بنالی تھی، جسے اس سے قبل ساسانی سلطنت نے روک رکھا تھا۔ پھر آٹھویں صدی میں عربوں کی یلغار نے ترکوں کی

آمد کے دروازے کھول دیے۔ دسویں صدی کے اواخر میں سامانی سلطنت نے وسطی ایشیا کو اپنے زیرِ نگیں کر لیا اور بخارا اور سمرقند جیسے شہر ان کے زیرِ سایہ آ گئے۔ سامانیوں نے ہی فارسیِ نو کو بطور ایک مکمل اسلامی زبان پروان چڑھایا۔

اگرچہ عربوں نے زمین داری اور انتظامی ڈھانچوں پر گہرا اثر ڈالا، لیکن ثقافتی میدان میں فارسی کا رنگ زیادہ غالب رہا اور آج تک باقی ہے۔ ترک بولنے والے خانہ بدوش زیادہ تر گھاس کے میدانوں کی سرحدوں پر رہے۔ دسویں صدی سے کئی خانہ بدوش اسلام کی راہ پر چلتے ہوئے مشرقِ وسطیٰ کی طرف ہجرت کرنے لگے، مگر حقیقی طور پر ان کا اسلام میں داخل ہونا اٹھارویں صدی میں مکمل ہوا۔

سامانی سلطنت کے بعد تیرہویں صدی وسطی ایشیا کی تاریخ کا سب سے بڑا صدمہ لے کر آئی۔ غیر مسلم خانہ بدوش قبائل (منگولوں) نے وسطی ایشیا پر یلغار کی اور شہروں کو جلا کر خاک کر دیا۔ سب سے زیادہ تباہی مسلمانوں کو سہنی پڑی۔ معاصر مؤرخ ابن الاثیر لکھتے ہیں کہ چنگیز خان کی فوجوں نے وسطی ایشیا کو ایسی بربادی میں ڈالا جیسی تاریخ نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ منگولوں نے نہ صرف جسمانی و سیاسی تباہی پھیلائی بلکہ ثقافتی و مذہبی ڈھانچوں کو زمین بوس کر دیا اور اسلامی اخلاقی اقدار کو منگول ضابطۂ حیات کے تابع کر دیا گیا۔ منگولوں نے اپنا قانون "یاسا" نافذ کیا، جو اسلامی شریعت کے متوازی تھا۔ یوں اسلام کی بالادستی منگول طاقت کے نیچے دب گئی۔

پندرہویں صدی تک مختلف صوفی بزرگوں کے ظہور نے اسلام کو دوبارہ وسطی ایشیا میں زندہ کیا۔ ان میں خاص طور پر نقشبندیہ اور کبرویہ سلسلے کے مشائخ نمایاں ہیں جنھوں نے پورے خطے میں دینِ اسلام کی تعلیمات پھیلائیں۔ چودھویں اور پندرہویں صدی کے بعد تو منگول حکمراں بھی ترک رنگ میں رنگ گئے اور انھوں نے اسلام قبول کر لیا، کیوں کہ ان کی افواج زیادہ تر مقامی ترکوں پر مشتمل تھیں۔ اس طرح خطہ رفتہ رفتہ منگول رسوم و رواج کے اثر

سے نکل گیا۔ آخری منگول سلطنت یعنی تیموری سلطنت نے اسلامی فنون اور ثقافت کو وسطی ایشیا میں ایک نئی جِلا بخشی اور اس خطے کی روحانی و تہذیبی شناخت کو از سرِ نو پروان چڑھایا۔

زار شاہی اور سوویت دور:

منگولوں کے بعد وسطی ایشیا پر جو آخری بڑی یلغار ہوئی وہ روسی یلغار تھی، جو زار شاہی کے زیرِ سایہ شروع ہوئی اور پھر سوویت دور تک جاری رہی۔ روسیوں نے 1865ء میں تاشقند (جو اس وقت ترکستان کا قلب تھا) کی دیواریں توڑ کر وسطی ایشیا پر قبضہ جمایا۔ وہ رفتہ رفتہ خطے کے جنوبی حصوں کی طرف بڑھتے گئے اور سب سے پہلے قازقستان کو اپنے پنجۂ استبداد میں قید کیا، پھر وہاں سے پورے وسطی ایشیا تک اپنی گرفت بڑھائی۔ اس سے قبل خطے پر اسلام کی فکری و روحانی بالادستی تھی، مگر روسی اقتدار نے وقت کے ساتھ ساتھ مذہبی اور تہذیبی منظرنامہ ہی بدل ڈالا۔ روسی حکومت نے سماجی و سیاسی ڈھانچے میں نئی پالیسیوں کا نفاذ کیا، اور مذہب کی صورتِ حال کو یکسر بدل دیا۔ اس طرح وسطی ایشیا نوآبادیاتی دنیا کے حصے کے طور پر جدیدیت میں داخل کیا گیا۔

زار شاہی کے زمانے میں مذہبی پالیسی کچھ نرم تھی۔ انھوں نے خطے میں سائنس و ٹیکنالوجی، تعلیم، ریل، تار برقی (ٹیلی گراف) جیسے مظاہر متعارف کروائے۔ ان کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ اسلام کو نظر انداز کر کے یہ سمجھتے تھے کہ بغیر ریاستی حمایت کے اسلام رفتہ رفتہ خود ہی کمزور پڑ جائے گا۔ روسی اصل میں خطے کے قدرتی وسائل پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ اسلام کی شدت پسندی کو کمزور کرنے کے لیے "غفلت کی پالیسی" اپنائے ہوئے تھے۔ اسی دوران روسیوں کی لائی ہوئی جدیدیت نے ایک نئی فکری لہر کو جنم دیا جسے جدیدازم کہا جاتا ہے۔ اس تحریک کے رہنما وہ دانشور تھے جو اسلام کی نئی تعبیر اور اصلاح کے خواہاں تھے۔ انھوں نے جدید تعلیم کو اسلام کے ساتھ جوڑ کر یہ باور کرایا کہ یہ تعلیم ہی مسلمانوں کو زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر سکتی ہے اور ان کی بقا کا ذریعہ ہے۔ یہ تحریک دراصل

اصولِ جدید یعنی نئی تعلیمی بنیادوں پر استوار تھی۔

ان جدیدیوں نے اسلام کو روایتی رسوم و رواج سے الگ کر کے اسے سیاسی و معاشی بنیادوں سے وابستہ کیا۔ ان کے انقلابی نظریات نے روسی حکام کو تشویش میں ڈال دیا کیوں کہ یہ نوآبادیاتی اقتدار کے لیے خطرہ بنتے جا رہے تھے۔

1917ء میں روسی انقلاب برپا ہوا اور زار شاہی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد بولشویکوں نے سوویت یونین قائم کیا اور وسطی ایشیا کو اس میں ضم کر دیا۔ نئی سرحدیں خالصتاً سوویت سیاسی و معاشی مفادات کے مطابق طے کی گئیں۔ بولشویکوں نے مارکس ازم کو بنیاد بنایا، جس کا مقصد طبقاتی نظام کا خاتمہ اور، یکساں سوشلسٹ معاشرہ تشکیل دینا تھا۔ سوشلزم میں نسل، قومیت اور کوئی طبقاتی تفریق باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا قوم پرستی، جو زمین، تاریخ، ثقافت اور نسلی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے سوشلسٹ فکر میں ناقابلِ قبول تھی۔ اسی معاملے میں سوویت پالیسی نہایت سخت تھی۔ اسلام اور اس سے وابستہ تحریکیں، مثلاً ”پان اسلامزم، جدیدیت اور ترکستانی تحریک“ روسی اقتدار کے لیے بڑا خطرہ سمجھی گئیں۔ بولشویکوں نے اسلام کو ”پسماندگی“ سے تعبیر کیا اور اسے ترقی کی راہ میں رکاوٹ مانا۔ ان کے نزدیک کسی ملک کی سماجی و معاشی ترقی کے لیے مذہب سے آزادی لازمی شرط تھی۔

سوویت حکمرانوں نے اسلام اور روایتی رسوم پر سخت پابندیاں عائد کر دیں، مساجد بند کر دی گئیں، 1920ء میں ثقافتی انقلاب برپا ہوا جس نے دینی تعلیم کو نشانہ بنایا، جدید اسکول قائم کیے گئے جہاں جدید تعلیم دی جاتی، ناخواندگی کے خلاف مہم شروع ہوئی، ترکی الاصل زبانوں کے بجائے لاطینی رسم الخط رائج کیا گیا، عورتوں کو پردہ ترک کرنے پر مجبور کیا گیا اور انھیں مزدوری پر لگایا گیا، نیز تنہائی کی پالیسی (Isolationism) اپنائی گئی جس نے وسطی ایشیا کا رابطہ باقی مسلم دنیا سے توڑ ڈالا۔ یہ ساری چیزیں خطے کے مذہبی اور تہذیبی ڈھانچے پر ایک کاری ضرب تھی۔

مگر ان سب کے باوجود دین اسلام انڈر گراؤنڈ حالت میں پھر بھی زندہ رہا۔ اسے ”غیر سرکاری اسلام“ یعنی (Unofficial Islam) کہا گیا۔ لوگ گھروں میں عبادات کرتے، خفیہ مساجد قائم ہوئیں، حتیٰ کہ چائے خانے بھی مسجد کا متبادل بن گئے۔ علاوہ صوفی سلسلوں کی خفیہ انجمنیں بھی سرگرم عمل رہیں۔

سرکاری اسلام اور سیاسی کھیل:

جب 1941ء میں جرمنی نے روس پر حملہ کیا تو اسٹالن نے مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ”سرکاری اسلام“ متعارف کرایا۔ ریاست کی زیرِ نگرانی مدارس کھولے گئے، چند لوگوں کو حج کی اجازت دی گئی، اور مساجد میں مقررین بھیجے گئے۔ یہ سب دراصل مسلمانوں پر قابو پانے کی ایک سیاسی حکمتِ عملی تھی۔ اس طرح زیرِ زمین اسلام اور سرکاری اسلام دونوں متوازی چلتے رہے، ایک اصلی روحانی اسلام اور دوسرا سیاسی اسلام۔

گورباچوف کا دور:

بعد ازاں گورباچوف کے دور میں گلاسناسٹ (Glasnost) یعنی ”آزادی و کشادگی“ کی پالیسی نے اسلام کو دوبارہ ابھرنے کا موقع دیا۔ لوگ کھلے عام اپنے مذہب پر عمل پیرا ہونے لگے۔ اس دور میں ہزاروں مساجد تعمیر ہوئیں، اسلامی ادب کی اشاعت ہوئی، سعودی عرب سے قرآن مجید کے نسخے لائے گئے۔ اور مقامی علما اچانک عوامی رہنما بن کر سامنے آئے۔ یہ سب اس حقیقت کی غمازی کرتا ہے کہ وسطی ایشیا کے لوگوں کی روح میں اسلام کس قدر گہری جڑیں رکھتا تھا۔

سوویت دور کے بعد!!

1991ء میں جب سوویت یونین کا بت پاش پاش ہوا، تو وسطی ایشیا کی ریاستیں اچانک ایک ایسے سمندر میں اتر گئیں جہاں کنارے تھے نہ بادبان، اور ہوا کا رخ بھی نامعلوم۔ آزادی کا یہ تحفہ بظاہر ایک نئی صبح تھی، لیکن حقیقت میں یہ ایک صحرائے بے آب و گیاہ تھا جہاں انھیں

اپنے قدموں کے نشانات سے راستوں اور منزلوں کی شناخت کرنی تھی۔70 برس کی غلامی نے ان ریاستوں کو اپنی تہذیبی اور مذہبی جڑوں سے کاٹ دیا تھا۔ مساجد اجڑی ہوئی تھیں، مدارس ویران ہو چکے تھے، اور ایمان کی صدائیں صرف گھروں اور خانقاہوں کی سرگوشیوں میں باقی تھیں۔ آزادی کے بعد پہلی بار انھیں اپنے اصل چہرے کو آئینے میں دیکھنے کا موقع ملا۔

آزادی کے فوراً بعد یہ ریاستیں ایک آزمائش میں داخل ہوئیں۔ معیشت ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی، سرحدیں غیر یقینی عالم میں گم تھیں، سیاست نو آموز اور غیر پختہ تھی۔ مگر ان تمام بحرانات کے درمیان ان کے پاس ایک ایسی پناہ تھی جس نے صدیوں کے طوفانوں میں انھیں محفوظ رکھا تھا، وہ پناہ تھی "اسلام"۔ سوویت زوال کے ملبے سے اٹھتے ہی سب سے پہلا جذبہ یہی ابھرا کہ اپنی قومی اور سماجی شناخت کو مسلم امّت کے رنگ میں ڈھالا جائے۔

اسی پس منظر میں ہزاروں مساجد دوبارہ تعمیر ہوئیں، مدارس کے دروازے کھلنے لگے، اور قرآن کی تلاوت سرِ عام گونجنے لگی۔ عوام کے دلوں میں چھپی وہ سرگوشی جو برسوں زیرِ زمین "غیر رسمی اسلام" کے طور پر زندہ رہی، اب ایک نعرۂ تکبیر لگاتی ہوئی بیدار ہو چکی تھی۔ تاہم آزادی کا یہ سفر آسان نہ تھا۔ ان ریاستوں کو توانائی کے وسائل کے تحفظ سے لے کر سرحدی تنازعات، ماحولیاتی مسائل اور سیاسی عدم استحکام تک کئی زخم سہنے پڑے۔ مگر اس تمام درد کے باوجود ایک نئی روح پیدا ہو رہی تھی، وہ روح جو کہتی تھی کہ روسی ورثے سے نہیں بلکہ اپنے دینی اور تہذیبی میراث سے نئی شناخت بنانی ہے۔

اس طرح وسطی ایشیا نے ایک نئی تاریخ رقم کرنا شروع کی۔ ایک طرف جدید ریاستی ڈھانچوں کی تعمیر تھی، دوسری طرف صدیوں پرانی اسلامی روایت کی بازیافت۔ یہ ایک ایسا امتزاج تھا جو ماضی کے زخموں کو مرہم بھی دیتا تھا اور مستقبل کی سمت بھی متعیّن کرتا تھا۔

ماخذ:

- عباس علی عمید زنجانی، اسلامی انقلاب اور اس کی جڑیں، تہران: تہران یونیورسٹی،

1998ء۔

- سی۔ای۔ بوسورتھ، ایرانی دنیا کی سیاسی اور سلاطینی تاریخ (عیسوی 1000-1217)۔(ایڈیٹر: جے۔ اے۔ بوائل) دی کیمبرج ہسٹری آف ایران، جلد پنجم: کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1968ء۔
- اقبال آشتیانی، ایران کی تاریخ، تہران: تہران یونیورسٹی پبلی کیشن، 2001ء۔
- جنواذ، جے، اسلام کی مختصر تاریخ: اسلام کا پھیلاؤ، انٹرنیشنل جرنل آف بزنس اینڈ سوشل سائنس، ریاست ہائے متحدہ امریکا، 2013ء، جلد 4، نمبر 17، ص 213-217۔
- اے. کے. ایس. لیمبٹن، معاشرے کا انہدام: وسطی اسلامی خطے قبل از اسلام سے پہلی جنگ عظیم تک، کیمبرج یونیورسٹی پریس، 1970ء۔
- محمد رضا، ایران کے تاریخی مکتوبات، تہران: کیہان پبلیکیشنز، 1987ء۔
- رضا خضری، س، عباسی خلافت کی تاریخ ابتدا سے آل بویہ تک، تہران: سائنس اینڈ لائف پبلی کیشن، 1998ء۔
- مائیکل سکر، اسلامی دنیا کا زوال: معاہدۂ کارلووٹز سے سلطنتِ عثمانیہ کے انہدام تک، پراگر پبلیکیشنز، 2000ء۔
- سعیدیان، عبدالحسین، دنیا کے اقوام، چوتھا ایڈیشن، تہران: سائنس اینڈ لائف پبلی کیشن، 1991ء۔

(ماہنامہ اشرفیہ اکتوبر 2025ء میں شائع)
(تحریر: اگست 2025ء)

مبارک پور کی معاشی و معاشرتی تاریخ

روایت، جدوجہد اور بقا کی داستان:

ضلع اعظم گڑھ کی آغوش میں آباد قصبہ مبارک پور، محض ایک جغرافیائی حقیقت کا نام نہیں بلکہ ہنر، روایت اور محنت کی ایک زندہ علامت ہے۔ یہ قصبہ اپنے ریشمی اور مرکب کپڑوں کی نفاست، رنگوں کی دلکشی اور دست کاری کی باریکی کے لیے نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیا بھر میں جانا جاتا رہا ہے۔ مبارک پور کی گلیوں میں گونجتے کرگھوں کے سُر تال کی آوازیں صدیوں سے محنت کش کاریگروں کی سانسوں سے وابستہ رہی ہیں۔

مبارک پور کی یہ روایت صرف ایک صنعتی سرگرمی نہ تھی، بلکہ ایک ثقافتی ورثہ تھی جو سانگی، گلٹا اور جمدانی (جامدانی) جیسے روایتی کپڑوں کی تیاری میں جھلکتی تھی۔ ان کپڑوں میں صرف دھاگے نہیں بُنے جاتے تھے بلکہ صدیوں پرانی ہنرمندی، فنی لطافت اور نسلوں کی یادیں بھی سموئی جاتی تھیں۔ مبارکپور کی بنائی ہندوستانی برآمدات کا فخر تھی، جس نے مغلیہ دور سے لے کر قبل از استعماری زمانے تک عالمی منڈیوں میں اپنی ایک الگ پہچان قائم کی۔

تاہم، جب برطانوی استعمار کی آہنی زنجیریں ہندوستان کے گلے کا پھندا بن گئیں، تو دست کاری کے اس تاج پر بھی زوال کے گرد و غبار چھا گئے۔ مشینی ٹیکسٹائل انڈسٹری کی یلغار نے کاریگروں کے ہنر کو رفتہ رفتہ پس منظر میں دھکیل دیا، مشینوں کی بے جان رفتار نے ہاتھ کی نرم جنبشوں کو گم کر دیا۔ استعماری معیشت نے جہاں ایک طرف مشینی مصنوعات کو سرکاری سرپرستی دی، وہیں دوسری جانب مبارک پور جیسے علاقوں میں محنت کش بنکروں کی معیشت کو کمزور کر کے رکھ دیا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے سنگم پر جب دست کاروں کی آواز دھیمی پڑنے لگی، تب مبارک پور کے بنکروں نے ایک نئی راہ کا انتخاب کیا۔ انھوں نے خالص ریشمی ساڑیوں کی تیاری میں اپنی مہارت کو نئی جہت دی۔ ان ساڑیوں کی نزاکت، نفاست اور رنگوں کی ہم آہنگی نے انھیں نہ صرف ملکی بلکہ بین الاقوامی سطح پر ممتاز مقام دلوایا۔ اس کامیابی میں بنارس کے تاجروں کی فراخ دلانہ حمایت اور سرکاری سرپرستی نے بھی اہم کردار ادا کیا۔

لیکن یہ کامیابی دیرپا نہ تھی۔ جب بیسویں صدی کے وسط میں صنعتی انقلاب نے پاور لوم کی صورت میں نئی دنیا آباد کی، تو ہاتھ کی بنائی ایک بار پھر پسپا ہونے لگی۔ مئو جیسے قریبی علاقوں میں پاور لوم کی تیز رفتاری اور کم لاگت نے روایتی دست کاری کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ مگر مبارک پور کے ہنر مند، جن کے ہاتھوں کی حرکت رزقِ حلال کی جستجو میں عبادت کی طرح تھی، انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ اپنی روایات کے ساتھ جُڑے رہے، جیسے کوئی دریا اپنی پرانی گزر گاہ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہو۔ اس صنعت کا دل مسلم بنکر برادری کے سینے میں دھڑکتا رہا۔ اس برادری کے لیے بنائی محض ذریعۂ معاش نہیں بلکہ ان کی تہذیبی شناخت، سماجی مرتبت اور شخصی وقار کا سنگم تھی۔ انھوں نے نہ صرف معاشی بحرانوں کا سامنا کیا بلکہ بدلتے زمانے کے ذہنی دباؤ کو بھی سہنا سیکھا۔ ان کی بقا کی جدوجہد صرف روزگار کے لیے نہیں بلکہ اپنی ذات، اپنے وجود اور اپنی تاریخ کو بچانے کے لیے تھی۔ آج اگر ہم مبارک پور کی بنائی کے زوال کو سمجھنا چاہیں، تو ہمیں اسے محض مذہبی یا طبقاتی تناظر میں محدود کرنا دانش مندی نہ ہوگی۔ اس صنعت کا زوال کئی تہوں پر پھیلا ہوا ایک پیچیدہ عمل ہے، استعماری معیشت کی سازش، صنعتی ترقی کی یلغار، خام مال کی فراہمی میں کمی، اور صارفین کے رجحانات میں تیزی سے آتی تبدیلیاں، سب نے مل کر مبارک پور کے بنکروں کے لیے راستے تنگ کیے۔ تاہم، اس تمام پس منظر میں ایک روشنی کی کرن اب بھی باقی ہے—وہ ہے ان کاریگروں کا عزم، ان کی لگن اور ان کا ہنر، جو آج بھی ان کے دلوں میں زندہ ہے۔ اگر مناسب

سرپرستی، تربیت، اور مارکیٹ تک رسائی دی جائے، تو مبارک پور کی بنائی ایک بار پھر دنیا میں اپنی پہچان واپس پا سکتی ہے۔

مشرقی اتر پردیش کی بنکر تہذیب:

مبارکپور کے تناظر میں ایک تاریخی و سماجی مطالعہ:

قدیم ہندوستان کی تہذیبی گزرگاہوں میں سے ایک، مشرقی اتر پردیش، محض زمین اور دریا کی سرزمین نہیں بلکہ ہنر اور حرفت کی وہ دنیا ہے جہاں وقت کی چادر پر بُنائی کے حسین نقوش ابھرتے رہے ہیں۔ اس خطے کی فضا صدیوں تک سوت کی مہک اور کھڈیوں کی لے میں گونجتی رہی۔ زمانۂ قدیم کے دانشور کوٹلیہ نے جس وقت کاشی اور الٰہ آباد (وتس دیس) کو اعلیٰ درجے کے روئی کے کپڑے کی تیاری کے مراکز قرار دیا، اسی لمحے اس خطے کے ہنر کو ایک تاریخی سند بھی عطا ہو گئی۔

مسلم بنکروں کی آمد اور ان کے توسط سے اس صنعت میں قرونِ وسطیٰ کے دوران جو نکھار آیا، وہ ایک معاشرتی تبدیلی کا مظہر تھا۔ وہ ہنر جو پہلے صرف شہری دست کاروں تک محدود تھا، اب نسلاً بعد نسل منتقل ہونے والے پیشے کی صورت اختیار کر گیا۔ اسلام قبول کرنے والے ان کاریگروں نے محض مذہب نہیں اپنایا، بلکہ اپنے ہنر کو بھی ایک نئی روح بخشی۔ اودھ کے نوابوں کی سرپرستی ہو یا ایسٹ انڈیا کمپنی کا ظہور، ٹانڈہ، مبارک پور، مئوناتھ بھنجن اور کوپاگنج جیسے قصبے اپنی بنائی کی روایت پر مضبوطی سے قائم رہے۔

انیسویں صدی کا سورج جب طلوع ہوا، تو وہ مغربی دنیا کی صنعتی چمک کے ساتھ آیا۔ مشینی انقلاب نے دھیرے دھیرے اس خطے کی روایتی معیشت کی بنیادیں ہلا دیں۔ انگلستان سے درآمد شدہ مشینی دھاگا اور کپڑا، جس نے مقامی منڈیوں میں اپنی جگہ بنائی، اس نے محض مقامی کاتنے والوں کا روزگار نہیں چھینا بلکہ مقامی صنعت کے پورے تنظیمی ڈھانچے کو متزلزل کر دیا۔ بنارس، جو اس صنعت کا مرکز رہا، اپنی عظمت برقرار رکھنے کی تگ و دو میں رہا، مگر مئو اور

مبارک پور جیسے معاون خطے مسلسل پس منظر میں جاتے رہے۔

مبارکپور کی کہانی انوکھے تضادات کا مجموعہ ہے۔ اگرچہ اسے مئوناتھ بھنجن جیسی شہرت کبھی نہ مل سکی، اور ضلع کی قدیم دستاویزات میں بھی اس کا نمایاں ذکر نہیں ملتا، مگر یہ قصبہ اپنی جگہ ایک زندہ روایت کا امین رہا۔ انیسویں صدی میں یہ قصبہ ترقی کی آس میں مسلسل سماجی و معاشی زلزلوں سے دوچار رہا۔ ہندو ساہوکاروں اور مسلم بنکروں کے درمیان تناؤ کی کہانیاں بھی اسی دوران ابھر کر سامنے آئیں۔ فرقہ وارانہ خلیج کے پس منظر میں، یہ کشمکش محض ذات یا مذہب کی نہیں، بلکہ معاشی طاقت کی تھی، جو اپنے آپ میں نوآبادیاتی نظام کی گہری ستم ظریفی تھی۔

جب بیسویں صدی کی صبح نمودار ہوئی، تو مبارک پور نے خود کو بنارس کی ریشمی صنعت کے ایک معاون خطے کی حیثیت سے از سرِ نو دریافت کیا۔ آس پاس کے علاقوں، املو، نوادہ، سریاں، رسول پور اور مصطفیٰ آباد کے لوگ بھی اس صنعت سے جڑتے گئے۔ مگر ریشمی کپڑا، جس کی تیاری میں مبارک پور کے بنکروں کو مہارت حاصل تھی، ایک ایسا فن تھا جو ہر کسی کے لیے قابلِ حصول نہ تھا۔ بھاری سرمایہ، خاص تربیت، اور دیرینہ تجربہ، یہ تمام شرطیں اس فن کو عام بنکروں کے لیے ناقابلِ عمل بناتی رہیں۔

زوال، جدوجہد اور باز آفرینی:

تاریخ کے اوراق پر جب مشرقی اتر پردیش کے قصبوں کی داستان رقم کی جاتی ہے، تو مبارک پور ایک ایسا نام بن کر ابھرتا ہے جس کی کہانی نہ صرف بنکروں کی مہارت بلکہ وقت کے بے رحم تھپیڑوں، معاشی آفات، اور سماجی تبدیلیوں کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ 1801 میں جب یہ علاقہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ اقتدار آیا، تو اس وقت مبارک پور زندگی کی روانی، بازاروں کی چہل پہل، اور کھڈیوں کی جھنکار کے ساتھ۔ ایک ابھرتا ہوا مرکز تھا۔ آبادی کی ساخت میں ایک نمایاں توازن پایا جاتا تھا؛ کل آبادی کا چوتھائی حصہ مسلم بنکروں پر مشتمل تھا جب کہ کچھ ہندو تاجر خوش حال معیشت کے علم بردار تھے، مگر یہ رونقیں زیادہ دیر قائم نہ رہ سکیں۔ صرف چند

دہائیوں میں، 1865 سے 1877 کے درمیان، ہندو تاجروں کی مالی چمک ماند پڑ گئی، اگرچہ بنائی کی صنعت نے اب بھی خود کو سنبھالے رکھا۔ مبارک پور کی کھڈیوں کی تعداد 1700 تک پہنچ چکی تھی، گویا ہنر ابھی سانس لے رہا تھا، مگر اس کی سانسیں بوجھل ہو چکی تھیں۔

مبارک پور میں اتوار اور جمعرات کو لگنے والے خوردہ بازار محض تجارت کے مقام نہ تھے، بلکہ یہ اس ثقافتی زندگی کا تسلسل تھے جو کبھی دریا کی طرح رواں دواں تھی۔ قریبی دیہات، جیسے املو میں بھی بازار کی روایت اسی طرح قائم تھی۔ ان بازاروں میں دھاگوں کے سودے، روزمرہ کی اشیاء، اور فنونِ لطیفہ کی چھوٹی جھلکیاں ہوا کرتی تھیں۔ قریب ہی، کوپاگنج کی بنیاد 1745ء میں ارادت خان نے رکھی تھی اور مئو کے بنکروں کو یہاں لا بسایا تھا، اور اگروال برادری کے تاجروں کو یہاں کارخ کرنے کی دعوت دی تھی۔ یہ بستیاں محض اقتصادی اکائیاں نہ تھیں، بلکہ بنکروں اور تاجروں کی وہ مشترکہ کوششیں تھیں جنھوں نے مشرقی اتر پردیش کے کینوس پر ٹیکسٹائل کا روشن رنگ بھرا۔

سانگی اور گلٹا، ریشم اور سوت کے امتزاج سے بنے ان پارچہ جات میں مہارت مبارکپور اور خیر آباد تک محدود تھی۔ یہ فن نہ صرف مخصوص تھا بلکہ ایک پوشیدہ خزانہ تھا، جس کی کوئی معتبر تاریخی ابتدا معلوم نہیں۔ یہ ہنر نسلوں میں منتقل ہوتا رہا، مگر اس کی راہیں وقت کی دھول میں گم رہیں۔

مبارک پور کی شناخت میں فنِ گلٹا کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ یہ کپڑا، جس کی تخلیق ریشم اور سوتی دھاگے کے امتزاج سے کی جاتی ہے، اپنی باریک کاریگری اور جمالیاتی صفات کے باعث خاصی اہمیت رکھتا ہے۔ گلٹا کا لفظ فارسی "غلطیدن" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی لوٹ پوٹ ہونے کے ہیں، جو شاید اس کی چمک دار اور ہموار سطح کی طرف اشارہ ہے۔

اس فن کی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اگرچہ گلٹا میں سوتی دھاگا نمایاں طور پر استعمال ہوتا تھا، تاہم تیار شدہ کپڑے کی اوپری سطح اس قدر ہموار اور چمک دار ہوتی کہ سوتی عناصر

بالکل غائب دکھائی دیتے۔ صرف پچھلی جانب سوتی دھاگے کا وجود ظاہر ہوتا، اور ریشمی دھاگے کی موجودگی کم محسوس ہوتی۔ گلٹا کی بناوٹ میں عموماً خانہ دار (چیک) ڈیزائن شامل ہوتا تھا، جنھیں ایک، دو یا تین پتلی لکیروں سے محدود کیا جاتا۔ ان لکیروں کے درمیان کا حصہ بعض اوقات مختلف رنگ کے ریشم سے بھرا جاتا، جس سے نہ صرف بصری تنوع پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ فنی نزاکت کا بھی اظہار بن جاتا ہے۔ چیک اور دھاری دار طرز کا یہ امتزاج محض ایک جمالیاتی اسلوب نہیں، بلکہ اس کے پیچھے نسلوں کی ہنرمندی، محنت، اور تہذیبی ورثے کا عکس جھلکتا تھا۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں قدرت نے اپنے قہر سے اس خطے کو آزمایا۔ قحط، سیلاب اور طاعون کی مسلسل وباؤں نے 1882، 1894، 1895، 1897، 1904، 1905 اور 1907 میں مبارکپور کے بنکروں کی کمر توڑ دی۔ دھاگے کی قیمتوں میں اضافہ، زراعت کی ناکامی، اور بازاروں کی سکڑتی ہوئی مانگ، سب کچھ گویا ہنر کو آہستہ آہستہ خاموش کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ مگر اس گہرے اندھیرے میں ایک روشن کرن بھی پھوٹی۔ 1896 سے 1904 کے درمیان ریلوے لائنوں کی تعمیر نے ٹیکسٹائل کی تجارت میں نئی روح پھونکی۔ بمبئی، کلکتہ اور کانپور جیسے بڑے مراکز سے رابطے کے سبب کچھ روشنی کی امید پیدا ہوئی، اور کچھ بنکروں کو مجبوری میں ہجرت سے بچا لیا گیا۔

تاہم، تجارتی مندی نے ان کو مجبور کیا کہ وہ سوتی رومال اور دکنی پگڑیوں جیسے کم قیمت مگر طلب میں زیادہ مصنوعات کی طرف رخ کریں۔ ریشمی ساڑیاں اگرچہ اب بھی بنائی جا رہی تھیں، مگر ان کی محدود کھپت نے صنعت کی عظمت کو سہارا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اس دوران مغربی بنگال سے آنے والے تھوک تاجروں کی آمد دُرگا پوجا کے موقع پر ایک عارضی جنبش ضرور پیدا کرتی، لیکن یہ تجارت بھی دلالوں اور بیوپاریوں کے شکنجے میں پھنسی ہوئی تھی، دستکار کو اس کا پورا حق کبھی نہ ملا۔

اور جب طاعون کی وبا نے بنکروں کے گھروں پر دستک دی، تو محض جسم ہی بیمار نہ ہوئے، مزاج بھی زہر آلود ہو گیا۔ ایک وقت آیا جب کہا جانے لگا کہ "طاعون کے نقصانات نے ان کے نقطۂ نظر کو تلخ بنا دیا ہے" یہ تلخی ہنر کی خاموشی، خوابوں کی شکست، اور ایک زندہ تہذیب کی سسکتی سانسوں کی گواہی تھی۔

جدوجہد اور زری ساڑیوں کی سنہری داستان:

وقت کا پہیہ اگر ایک لمحے کو تھم جائے اور ہم ماضی کی گلیوں میں قدم رکھیں، تو مبارک پور کا نقشہ ایک ایسی برادری کے طور پر ابھرتا ہے جس کے ہاتھوں میں دھاگے تھے، مگر آنکھوں میں خواب، جن کی بنیاد صرف روزی روٹی نہیں، بلکہ عزت، پہچان، اور ثقافت تھی۔ بنکر برادری کے لیے بنائی محض پیشہ نہیں تھی، بلکہ ایک تہذیب تھی — ایسا اثاثہ جسے وہ سینے سے لگا کر نسلوں تک سنبھالتے رہے۔

مبارک پور کے بُنکروں نے ہمیشہ اپنی پیداواری سرگرمیوں کو برادری کی چھتری تلے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ ان کے لیے کھڈیوں پر بننے والا ہر دھاگا، ہر کڑھائی، ان کے وقار اور شناخت کا مظہر تھا۔ یہ وہی برادری تھی جس نے اپنی اجتماعی سوچ کو پیداوار تک تو محدود رکھا، لیکن جب بات ہجرت اور سیاسی سرگرمیوں کی آئی، تو کوئی متفقہ لائحہ عمل نہ بن سکا۔ یہی وہ درار تھی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ مفاد پرستوں نے برادری کی حدود کو اپنے مالی مفادات کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا، اور اس اجتماعی ادارے کی اتھارٹی آہستہ آہستہ کمزور پڑنے لگی۔

محلہ پورہ صوفی کے ایک خوشحال بُنکر عبد المجید، نے 1902 سے 1934 کے درمیان مبارک پور کی روزمرہ کی زندگی، بازار کے نرخ، برادری کے مسائل اور مقامی سیاست پر مبنی ایک ڈائری مرتب کی۔ اگرچہ انھوں نے اپنی کھڈی یا فنِ بنائی کا براہِ راست ذکر نہیں کیا، لیکن ان کے اندراجات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ محض ایک کاریگر نہیں، بلکہ ایک ایسے شخص تھے جو برادری کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے۔ ان کے قلم سے نکلا ہر جملہ، ہر

تبصرہ، مبارک پور کی سماجی ساخت کا آئینہ دار ہے۔ ان کا کہنا تھا:

"اب کے سال روزگار ہواں، جس سے مبارکپور
آباد ہواں، آج تک ایسا روزگار کبھی نہ ہواں اور نہ ہوگا۔"

یہ الفاظ 1919 کی اس خوش حالی کے لیے تھے، جب سنگھی اور گلٹا کپڑے 10 سے 41 روپے فی گز تک فروخت ہوئے، اور مبارکپور کے بُنکروں نے ایسا معاشی عروج دیکھا جو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ ہر محلے میں بھینسیں خریدی گئیں، حتیٰ کہ دودھ نہ دینے والی بھینسیں بھی۔ فضول خرچی عام ہوئی، اور 142 افراد نے حجِ بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ مگر یہ مسرت زیادہ دیرپا نہ رہی۔

بیسویں صدی کے آغاز میں، جب بنائی کی صنعت دیگر علاقوں میں دم توڑ رہی تھی، مبارکپور میں ابھی امید باقی تھی۔ 1920 کی دہائی میں عام ریشم کی جگہ زری کی ساڑھیوں نے لینا شروع کی، اور 1930 میں بروکیڈ (زری) ساڑھیوں کی ہتھ کرگھا صنعت کی بنیاد محلہ پرانی بستی میں رکھی گئی۔ عبید حسین انصاری، اس تبدیلی کے علم بردار تھے۔ انھوں نے اپنی بانی سے اس صنعت کا آغاز کیا اور مقامی افراد کو تربیت دے کر ایک نئی راہ متعیّن کی۔

یہ وہ وقت تھا جب مبارک پور کی گلیوں میں دھاگے کی بو، رنگوں کی جھلک اور کھڈیوں کی آوازیں ایک بار پھر گونجنے لگیں۔ مبارکپور، املو، اور سریاں کے کاریگروں نے 15 دن کے اندر بروکیڈ ساڑی بنانی سیکھ لی۔ آج بھی مبارک پور کی ہر گلی، ہر آنگن میں کوئی نہ کوئی زری ساڑی ضرور ملتی ہے، جو اس سنہری روایت کی خاموش مگر زندہ گواہ ہے۔

1950 تک مبارکپور میں 5275 ہتھ کرگھے موجود تھے، جن میں سے 20 فیصد کپاس کے کپڑے کے لیے مخصوص تھے۔ اس وقت معاشرتی سطح پر ایک واضح تقسیم نظر آتی تھی:

- امیر بنکر ریشم کی بنائی کرتے۔
- غریب کپاس پر قناعت کرتے،

- اور کچھ متوسط گھرانے دونوں میں مشغول ہوتے۔

ریشمی ساڑیاں گھر کے اندر، ذاتی ہتھ کرگھوں پر بنائی جاتیں۔ مگر یہ سب کچھ ایک مکمل خود مختاری کی علامت نہیں تھا، کیوں کہ کئی چھوٹے کارخانوں میں بنکر ایسے مالکان کے رحم و کرم پر کام کرتے تھے جو دھاگا فراہم کرتے، مزدوری طے کرتے، اور زیادہ تر منافع خود سمیٹ لیتے۔ ہنر مند کاریگر اپنے ہی فن میں استحصال کا شکار ہو رہے تھے۔ وہ ایسے کاریگر تھے جنھوں نے ہنر کو ورثہ بنایا، جن کے فن نے زبان کا کام کیا، اور جن کی کھڈیوں نے دھڑکنوں کو ترتیب دیا۔ مگر یہ کہانی صرف سنہری ساڑیوں، چند خوش حال برسوں یا عبد المجید کی ڈائری تک محدود نہیں؛ اس میں تو ان سروں کی بھی داستان ہے جو جھک کر کپڑا بنتے رہے، ان آنکھوں کی بھی کہانی ہے جو دھاگے میں مستقبل ڈھونڈا کرتی تھیں، اور ان دلوں کی بھی فریاد ہے جو کبھی اپنا حق نہ پا سکے۔

ساہوکار، دلال، اور دھاگے کی سیاست:

مبارک پور کی ریشمی صنعت کی بنیاد جن ہاتھوں نے رکھی، وہی ہاتھ وقت کے ساتھ بازار کی سرد و گرم ہوا کے تھپیڑوں میں بے بس ہو گئے۔ سب سے چھوٹی پیداواری اکائی، یعنی ایک تنہا جولاہا، محض ہنر کے بل پر اس وسیع اور پیچیدہ نظام میں اپنی شناخت قائم رکھنے کی کوشش کرتا رہا، لیکن سرمایہ، خام مال اور بازار تک رسائی کی کمی نے اسے دلالوں کے شکنجے میں جکڑ دیا۔

بنکر کو وہ دھاگا، جو اس کے فن کی روح تھا، خود خریدنے کی طاقت نہ تھی۔ تاجر، جو دلال کا روپ دھارے ہوئے ہوتا، نہ صرف اسے دھاگا مہیا کرتا بلکہ اس کے تیار کردہ کپڑے کو بھی اپنے مقررہ نرخ پر خرید لیتا۔ یوں بنکر مکمل طور پر اس دلال کے رحم و کرم پر ہوتا، جو اس کے فن کو صرف آرڈر کی شکل میں تولتا۔ یہ دلال نہ صرف تجارت کے ایک بڑے حصے پر قابض تھے بلکہ ان کا ادارہ اس قدر مضبوط تھا کہ وہی پیداوار، خریداری اور فروخت، سب کچھ طے کرتے۔

ورک شاپ کے مالکان، اگرچہ بظاہر آزاد نظر آتے، مگر در حقیقت وہ بھی ان دلالوں

کے سامنے بے بس تھے۔ ماہر بنکر ان کے پاس کام کرتے، جنھیں فی کپڑا یا فی ساڑی کے حساب سے اجرت دی جاتی، مگر یہ محنت تب تک بے معنی ہو جاتی جب تک دلال تیار مال اٹھا کر لے نہ جاتا۔ انھیں اکثر نقد رقم کے بجائے تین یا چار ماہ مؤخر ادائیگی کے چیک دیے جاتے، جس سے سرمایہ منجمد اور نظام بے کیف ہو جاتا۔ 1960 کی دہائی کے آغاز میں ایسے 21 دلالوں نے مبارکپور میں اپنا جال بچھایا ہوا تھا، جو ماہانہ لگ بھگ دس ہزار ریشمی ساڑیاں بازار تک پہنچاتے اور خود خاطر خواہ منافع سمیٹ کر چلے جاتے ہیں۔

بیسویں صدی کی تیسری دہائی میں جب ہیوی ہینڈلوم بروکیڈ ساڑھیوں کی مانگ نے صنعت کو نئی بلندیوں تک پہنچایا، وہ لمحے مبارک پور کے لیے سنہری تھے۔ تاہم، یہ چمک زیادہ دیر برقرار نہ رہ سکی۔ دوسری جنگ عظیم اور آزادی کے بعد کی سیاسی تبدیلیوں نے اس صنعت کی بنیادیں ہلا دیں۔ جاپان سے درآمد شدہ خام ریشم پر انحصار اس قدر بڑھ گیا کہ قیمتیں عام صارف کی دسترس سے باہر ہو گئیں، اور مقامی بازار سمٹنے لگے۔

اس سے بڑا دھچکا اُس وقت لگا جب برصغیر کی تقسیم نے مبارکپور کے روایتی خریداروں (یعنی پاکستان اور مشرقی پاکستان (بعدازاں بنگلہ دیش) کا بازار چھین لیا۔ فرقہ وارانہ فسادات نے کئی ماہر بنکروں کو ہجرت پر مجبور کر دیا۔ نہ صرف ہنر بکھر گیا بلکہ بازار بھی سمٹ گیا۔ اس کے بعد جب پاکستان نے ریشمی مصنوعات پر بھاری ٹیکس عائد کیے، تو مبارک پور کی زری ساڑیاں خریداروں کی فہرست سے غائب ہونے لگیں۔

خام مال، رنگ، اور روایت کا بدلتا چہرہ:

بروکیڈ ساڑی کی تیاری میں دو بنیادی عناصر شامل ہوتے تھے: خالص ریشم اور زری کا دھاگا۔ ریشمی دھاگا شہتوت اور ٹسر کی اقسام میں دستیاب تھا، جو اگرچہ اتر پردیش کے چند اضلاع میں تھوڑی بہت پیداوار دیتے تھے، مگر مبارک پور کے کاریگر مغربی بنگال کے مالدہ سے درآمد شدہ ریشم کو فوقیت دیتے تھے۔ اسے گھر کے اندر ہی سستے، کیمیائی اینلائن رنگوں

سے رنگا جاتا، یہ تبدیلی روایت سے ہٹ کر سہولت اور ارزانی کی طرف ایک علامتی قدم تھا۔

زری کے دھاگے کی کہانی بھی کم پیچیدہ نہ تھی۔ 1963 تک سونے کا بازار کھلا تھا، اور وارانسی و سورت جیسے شہروں کے تاجر خالص سونے یا چاندی کے تار فراہم کرتے تھے۔ لیکن جیسے ہی "دفاعِ ہند (ترمیمی) رول" کے تحت سونے پر کنٹرول نافذ ہوا، زری ساڑی کی لاگت آسمان چھونے لگی پھر سنہری اور نقرئی "لوریکس" نے سونے کا نعم البدل بن کر مارکیٹ میں قدم رکھا، مگر اصل چمک باقی نہ رہی۔

سماجی تناؤ اور شناخت کی تلاش:

ایسے میں معاشی دباؤ اور پیداواری زوال کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر بھی گہرا انتشار جنم لینے لگا۔ ہندو ساہوکاروں کے مسلم بنکروں کے ساتھ تعلقات میں درار پڑنے لگی۔ معاشی کمزوریوں نے مذہبی کشیدگی کو ہوا دی، اور بنکر اپنی شناخت کو مذہب کے دائرے میں ڈھالنے لگے۔ اسلامائزیشن کا یہ عمل صرف عقیدے کی تبدیلی نہ تھا، بلکہ ایک پُر پیچ ردِ عمل تھا اُن سماجی اور اقتصادی حقائق کا، جو ہر قدم پر بنکروں کو پیچھے دھکیل رہے تھے۔ ان بنکروں کے اندر بھی نسلی، اور پیشہ ورانہ تقسیم موجود تھی ــــ وہ صرف ایک طبقے کے مسلمانوں نہیں تھے، بلکہ وہ تو ایک تہذیب کے زخم خوردہ وجود کا عکس تھے، جو اپنے فن، اپنی معیشت، اور اپنی سماجی شناخت کو نئی کروٹوں پر دیکھ رہا تھا۔

مذہبی تنوع اور مسلکی رقابتیں:

جیسا کہ ہم نے کہا؛ مبارک پور کی سرزمین صرف ریشمی دھاگوں اور بروکیڈ ساڑھیوں ہی کی آماجگاہ نہ تھی، بلکہ یہاں مذہبی فکر و فہم کے مختلف رنگ بھی پوری شدت سے رائج تھے۔ وقت کے ساتھ اس قصبے میں جہاں صنعتی حرکیات نے اپنی ایک دنیا آباد کی، وہیں مذہبی رجحانات نے بھی سیاست، معاشرت اور شخصی روابط پر گہرے نقوش ثبت کیے۔ مبارک پور

میں مکاتب ہائے فکر کی موجودگی نہ صرف مذہبی فکر کی گہرائی کی مظہر ہے، بلکہ ان کے باہمی تعلقات نے مقامی سیاست، تعلیم اور ثقافتی اداروں کی تشکیل پر بھی دیرپا اثرات مرتب کیے۔

مبارک پور میں سب سے پہلا اور قدیم اسلامی مذہب سنی حنفی تھا، جو عموماً برصغیر کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ اٹھارہویں صدی میں جب اودھ کی نوابین نے مذہبی فضا کو نئی جہتیں عطا کیں، تب شیعہ مذہب نے بھی اس خطے میں قدم جمائے۔ نواب آصف الدولہ کے عہد میں رمضان علی شاہ نے یہاں اپنا امام باڑہ تعمیر کروایا، جو نہ صرف ان کے مذہبی شعائر کا مرکز تھا بلکہ شیعہ وجود کی سماجی پہچان بھی۔ اس وقت کئی شیعہ مبلغین نے مبارک پور کا رخ کیا، اور نوابی سرپرستی میں اس کو فکری پشت پناہی حاصل ہوئی۔

بوہرہ اسماعیلی شیعہ بھی مبارکپور میں انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں سے قبل موجود تھے، اور ان کے وجود کا استناد ملا نثار علی مبارک پوری سے ہوتا ہے، جنھوں نے اس مذہب کی بنیاد یہاں رکھی۔ بعد ازاں، غیر مقلدین نے بھی قدم جمانے شروع کیے، یہاں اس کے بانی مبانی شاہ ابو اسحاق لوہراوی تھے، جن کا انتقال 1234 ہجری میں ہوا۔ سب سے آخر میں دیوبندی مکتبِ فکر نے 1317 ہجری میں یہاں اپنی شناخت قائم کی۔ مولانا محمود معروفی اور مولانا حکیم الٰہی بخش نے اس کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔

ان مختلف مکاتبِ فکر نے نہ صرف اپنے عقائد کی تبلیغ کی بلکہ اپنے اپنے مدارس بھی قائم کیے، جو ان کی فکری تربیت گاہیں بن گئیں۔ سنیوں کا مدرسہ "اشرفیہ" (دار العلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم)، دیوبندیوں کا "جامعہ عربیہ احیاء العلوم"، اہل حدیث کا "دار التعلیم"، اور شیعوں کا "باب العلم" یہ تمام مدارس اپنے اپنے مذاہب کی علمی روایت کے امین کل بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ بوہروں کا مدرسہ ملا نثار علی سرائمیری نے قائم کیا تھا، جسے بمبئی کے بوہروں کی جانب سے مالی امداد حاصل ہوتی تھی۔ اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل میں یہ مدرسہ طویل عرصے تک غیر فعال رہا، لیکن دینی تعلیم امام باڑہ اور گھریلو سطح پر جاری

رہی۔ تمام مذاہب کے لوگ ایک دوسرے سے ملتے جلتے رہے، اور سب کے اندر ایک دوسرے کے خلاف کشیدگی پروان چڑھتی رہی۔

مقامی قیادت اور باہمی تعلقات:

1909-10 میں مبارک پور پولیس نے اپنے مشاہدے میں درج کیا کہ مبارک پور میں فرقہ وارانہ کشیدگی صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کے اندر بھی گہری خلیجیں موجود ہیں۔ سنی، اہل حدیث، شیعہ اور دیوبندی سب اپنے اپنے تشخص میں ممتاز اور الگ شناخت رکھتے تھے، ان کے عبادت کے مراکز جدا تھے، اور وہ ایک دوسرے کی مساجد میں نماز ادا نہیں کرتے تھے۔ البتہ محرم کے دوران تمام فرقے، اہل حدیث کے سوا، عزاداری میں شریک ہوتے۔ تعزیے کے جلوس کے دوران بدامنی کا آغاز اکثر محلہ شاہ محمد پور سے ہوتا، جو کہ ایک شیعہ اکثریتی علاقہ تھا۔

اس دور کی مقامی قیادت بھی مسالک کے نمائندہ چہرے تھے۔ سنی قیادت میں شیخ عبد الوہاب، شیخ طیب گرہستھ، حکیم الٰہی بخش اور حاجی عبد الحق شامل تھے۔ اہل حدیث کی نمائندگی مولوی سلامت اللہ، عبد المجید اور حکیم محمد شفیع کے پاس تھی، جب کہ شیعوں کی قیادت حکیم یار علی کے ہاتھ میں تھی۔ سرکاری امور میں یہ رہنما نہایت اہم کردار ادا کرتے تھے، اور بعض مواقع پر مقامی انتظامیہ کو یہ مشورہ دیا گیا کہ بدامنی کے تدارک کے لیے حکیم یار علی سے تعاون حاصل کیا جائے، کیوں کہ وہ معاملات کو سلجھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

بمبئی کا "غلہ کیس"

1940 کی دہائی کا ہندوستان ایک بے قراری کی کیفیت میں سانس لے رہا تھا۔ باہر کی دنیا میں جنگ کے بادل گرج رہے تھے، تو اندرون ملک فاقہ کشی کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ بمبئی، جو برطانوی ہندوستان کا دلِ تھا، اپنے بظاہر جگمگاتے بازاروں، اونچی عمارتوں اور بندرگاہ

کے شور میں ایک ایسی سچائی کو چھپائے بیٹھا تھا جو بھوک کی چیخوں سے گونجتی تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب چاول کی خوشبو محض یاد بن چکی تھی، اور گندم کے دانے سونے کی مانند قیمتی ہو گئے تھے۔ اناج کی قلت، جو قدرتی سے زیادہ مصنوعی تھی، ہر گھر کی دہلیز پر ایک سوال بن کر دستک دے رہی تھی: "کیا کل چولہا جلے گا؟" اور تب سامنے آیا بمبئی کا "غلہ کیس"۔

اس مقدمے میں کچھ ایسے نامور تاجروں کو کٹہرے میں کھڑا کیا گیا، جن کی تجوریاں لبریز تھیں، مگر دل خالی۔ الزام یہ تھا کہ انھوں نے دانستہ طور پر اناج کو گوداموں میں قید رکھا، بازار میں قلت پیدا کی، اور بھوکی نگاہوں کو قیمتوں کے طمانچے کھانے پر مجبور کیا۔ ان کے لیے غلہ محض ایک شے تھی، جس کی رسد و طلب کا کھیل منافع کا ذریعہ تھا، جب کہ عوام کے لیے وہ زندگی کا سہارا تھا۔

عدالتوں میں بیانات دیے گئے، سرکاری افسران نے فائلوں پر مہریں لگائیں، اور اخباروں میں شہ سرخیاں بنیں۔ حکومت نے راشن کارڈ، کنٹرول نرخ اور نگرانی کے قوانین کا اعلان کیا، مگر "**جہاں بھوک سوال بن جائے، وہاں ضابطے جواب نہیں بنتے**"۔

"غلہ کیس" اپنی تمام تر قانونی موشگافیوں کے باوجود، ایک آئینہ تھا، ایسا آئینہ جس میں نوآبادیاتی معاشی نظام کی بدصورتی، سرمایہ داری کی بے حسی، اور عوامی بے بسی عیاں تھی۔ یہ محض ایک مقدمہ نہ تھا بلکہ ایک تہذیبی المیہ تھا جہاں کچھ انسانوں نے اناج کے دانوں کو سونے کی طرح تولا، اور دوسرے انسان اپنی بھوک کا مول بھرتے رہے۔ غلہ کیس، بمبئی کے تاریخ کے صفحات میں ایک ایسی سطر ہے، جو نہ صرف قانون، بلکہ اخلاق، معیشت اور انسانیت کے دائرے میں ہمیشہ سوال بن کر زندہ رہے گی۔

"غلہ کیس" اور بوہروں کی اندرونی کشمکش:

بمبئی کا مذکورہ "غلہ کیس" بوہری جماعت کی تاریخ میں ایک اہم موڑ ثابت ہوا۔ ملا رحمت علی مبارک پوری اور ملا سیف الدین کے درمیان تنازعہ کھڑا ہوا، جس میں بمبئی کے ملا

سیف الدین نے نے "غلہ کیس" کا حوالہ دیتے ہوئے مبارک پور کے بوہروں کے لیے مالی امداد بند کروادی۔ نتیجتاً، ملا رحمت علی کو بمبئی سے نکل کر مبارک پور میں پناہ لینی پڑی۔ یہ واقعہ نہ صرف مذہبی قیادت کی داخلی تقسیم کا غماز تھا بلکہ یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ مذہبی تنازعات صرف عقائد تک محدود نہیں، بلکہ وہ معاشی مفادات اور سیاسی اثر و رسوخ کے دائرے میں بھی داخل ہو چکے تھے۔

تعلیم کا متوازی نظام:

مدارس کے ساتھ ساتھ گھریلو تعلیم کا نظام بھی مبارک پور کی علمی فضا کا اہم حصہ رہا ہے۔ بزرگ حضرات گھروں سے قرآن، اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم دیا کرتے، جب کہ خواتین بھی محلے کے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرتیں، خود میرا بھی معاملہ ایسا ہی رہا۔ میری والدہ محترمہ نے مجھے قرآن مجید ناظرہ کی تعلیم دی اور اردو ہندی کی ابتدائی کتابیں بھی مجھے انھی سے پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔ یہ روایتی نظام آج بھی اس معاشرتی نقش کا حصہ ہے جہاں تعلیم صرف اداروں تک محدود نہ تھی، بلکہ گھروں کی دہلیز پر بھی علم کے چراغ روشن کیے جاتے تھے۔ ان دہلیزوں پر روشن ابتدائی تعلیم کے چراغ نہ صرف علم کی منتقلی کا ذریعہ بنے بلکہ ایک اجتماعی شعور کی بیداری کا سبب بھی۔ گھروں سے دی جانے والی یہ تعلیم خاص طور پر لڑکیوں کے لیے روشنی کی کرن ثابت ہوئی، جنھیں رسمی تعلیمی اداروں میں رسائی حاصل نہ تھی، ان کی ابتدائی تربیت انھی تعلیم یافتہ خواتین کے ذریعے ہوئی، جو مذہب، اخلاق، اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے گھروں کی چار دیواری کے اندر دیتی تھیں۔

قرآن مجید کو زبانی یاد کرنے والے حافظ حضرات بھی گھروں ہی سے تعلیم دیتے، اور یہ نظام خالصتاً مذہبی اقدار کے گرد گھومتا تھا۔ یہ وہ فکری ماحول تھا جہاں معاشرتی تربیت اور دینی شعور، تعلیم کے بنیادی ستون تھے۔ فارسی ادب پر مہارت رکھنے والوں کو "میاں صاحب" کہا جاتا، جو معاشرے میں علمی مقام کے حامل سمجھے جاتے۔ مبارک پور اب محض ایک قصبہ نہ

رہا، بلکہ ایک نوخیز اسلامی مرکز میں ڈھلنے کی کوشش میں مصروف تھا، جہاں تعلیم، مذہب اور سماجی تنظیمیں ایک دوسرے سے جُڑی ہوئی قوتیں تھیں۔

اسلامائزیشن اور تجارتی خودمختاری:

1920 کی دہائی میں مذہبی اور سماجی احیا کے یہ آثار تجارتی میدان میں بھی نمایاں ہونے لگے۔ مبارک پور کی مسلم کمیونٹی نے نہ صرف مذہبی اداروں کو مضبوط کیا، بلکہ تجارتی اتحادوں پر بھی نظر ثانی کی۔ "اسلامائزیشن" اب محض وضع قطع یا رسوم و عبادات کی حد تک محدود نہ رہا، بلکہ اس نے معیشت، معاشرت اور قیادت کی از سرِ نو تشکیل کا آغاز کر دیا۔ یہی وہ دور تھا جب ہندو تاجروں اور ساہوکاروں کے ساتھ تجارتی روابط منقطع کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ جمعہ، 12 دسمبر 1919 کو مبارک پور کے قریب اٹھائیس مواضعات کے بنکر گاؤں گجھڑا میں جمع ہوئے اور فیصلہ کیا کہ آئندہ وہ بابو مہابیر، بابولال اور کمتا پرساد اگروال سے ریشم اور دھاگے کا لین دین نہیں کریں گے۔ یہ اعلان تجارتی خودمختاری کی پہلی باقاعدہ دستک تھا۔

9 جنوری 1920 کو ایک پنچایت محلہ پورہ دلہن میں منعقد ہوئی، جہاں خلاف ورزی کرنے والوں پر جرمانے عائد کیے گئے۔ عبد المجید پر سب سے زیادہ 101 روپے کا جرمانہ لگایا گیا۔ 8 فروری 1920 کو گولا بازار میں پنچایت کے موقع پر بابو مہابیر چودھری نے اپنی دکان کھولی، جس پر انھیں 200 روپے کا جرمانہ اور 25 روپے پنچایت کے اخراجات کے طور پر ادا کرنے پڑے۔ اسی موقع پر سریاں گاؤں کے کریم بخش دلال کو دو سو روپے جرمانہ ہوا، دو گھنٹے کھڑا رکھا گیا، اور "گوش مالی" کی سزا دے کر معاف کر دیا گیا۔ تاہم، اسی گاؤں کے اسمٰعیل کے بیٹے صابر کو برادری سے بے دخل کر دیا گیا، جو ان فیصلوں کی شدت اور اثر پذیری کا غماز تھا۔

مقامی پنچایتیں، سیاست میں عوامی شمولیت کا نمونہ:

مذہبی اور تجارتی اداروں کے ساتھ ساتھ، مبارک پور میں پنچایتوں نے خود کو سماجی

انصاف اور سیاسی تحریکوں کا مرکز بھی بنالیا۔ عدم تعاون اور خلافت تحریکوں کے دوران ان پنچایتوں نے قائدانہ کردار ادا کیا۔ جولائی 1921 میں پچری گاؤں کے باغ میں منعقد ہونے والی "چوراسی" پنچایت اسی سیاسی شعور کا مظہر تھی۔ اس پنچایت کو منشی یعقوب اور مولوی شبلی خیرآبادی نے طلب کیا تھا، جس میں چار افراد پر الزام عائد کیا گیا: احمد اللہ دلال، حاجی حسن، عبداللہ حاجی اور سبحان مہتر۔

یہ اجلاس 24 جولائی کو صبح 9 بجے شروع ہوااور اگلی رات 8 بجے فیصلہ سنایا گیا۔ تین افراد پر جرم ثابت ہونے کے بعد احمد اللہ دلال پر 100 روپے، حاجی حسن اور حاجی عبداللہ پر 50-50 روپے کا جرمانہ عائد کیا گیا، جسے خیرآباد کی خلافت کمیٹی کے فنڈ میں جمع کرایا گیا۔ سبحان مہتر کو معاف کردیا گیا۔ یہ فیصلہ اس قدر مؤثر تھا کہ خیرآباد کے عوام نے اسے نہایت تسلی بخش قرار دیا۔

احمد اللہ دلال، حاجی حسن اور حاجی عبداللہ نے خود کو سزا سے بچانے کے لیے "افسرانِ قوم" کو راضی کرنے کی کوشش کی، لیکن عوامی پنچایت کے سامنے یہ تدبیریں ناکام رہیں۔ 26 جولائی کی صبح 4 بجے یہ تاریخی پنچایت ملتوی ہوئی۔

کوپاگنج میں پنچایت کی فیصلہ کن کارروائی:

کوپاگنج میں، جب بعض شراب فروش ٹھیکے داروں نے عدم تعاون تحریک کے رضاکاروں پر سختی کی، تو پنچایت نے نہ صرف ان کے خلاف فیصلہ سنایا بلکہ انھیں جوتوں سے مارنے کی سزا بھی دی۔ یہی نہیں، بلکہ ان افراد کو کانگریس کی ضلعی کمیٹی میں اپیل کرنے کی اجازت بھی نہیں دی گئی۔ اس عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنچایتیں صرف مقامی نظام انصاف تک محدود نہ تھیں بلکہ وہ قومی تحریکوں کی اخلاقی پشت پناہ بھی بن چکی تھیں۔

مبارک پور کا داخلی اضطراب:

جب خلافت اور عدم تعاون کی تحریکیں ہندوستان کے طول و عرض میں جوش و

خروش سے گونج رہی تھیں، مبارک پور بھی اس سیاسی بیداری سے لاتعلق نہ رہا۔ تاہم، یہاں کی سیاست ایک الگ ہی رنگ لیے ہوئے تھی، یہ وہ رنگ تھا جس میں برادری کی پہچان، مذہبی وابستگی، ذاتی رنجشیں اور مفادات کی چالاک بساط ایک ساتھ بچھی ہوئی تھی۔

1922ء میں وہ لمحہ آیا جب برادری کی یکجہتی کے پردے چاک ہونے لگے۔ عدم تعاون اور خلافت تحریک جیسے قومی نظریات کے برعکس، مبارک پور کی سیاست میں ذاتی اور برادری کے مفادات غالب دکھائی دیے۔ ایک واقعے میں چھ بنکر بابوبال کشن اگروال کی کپڑے کی دکان پر احتجاج کرنے کے جرم میں چھ ماہ کی قید با مشقت سزا کاٹنے پر مجبور ہوئے۔ یہ لمحۂ حیرت تھا، کیوں کہ ان کے خلاف گواہی دینے والے پانچ افراد بھی اسی برادری کے تھے۔

اس موقع پر عبدالمجید، جنھیں خود "سوراج" یا خلافت تحریک سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی، نے مسلم اخوت کی بنیاد پر ان سزا یافتہ افراد سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اُن کے الفاظ، "یہ لوگ خود مسلمان ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کو قید کروا رہے ہیں" دراصل ایک داخلی اضطراب کی بازگشت تھے۔ یہاں "مسلمان" محض مذہب کا حوالہ نہ رہا، بلکہ "انصاری" کی شناخت کا استعارہ بن چکا تھا، جس سے واضح ہوا کہ برادری کے اندر فکری اور سماجی تقسیم اب ناقابلِ انکار حقیقت بن چکی ہے۔

مذہبی قیادت کی کشمکش:

مبارک پور کی مقامی سیاست کا ایک اور رنگ محمد امین گرہست اور مولوی شکراللہ کی کشمکش سے اجاگر ہوتا ہے۔ امین گرہست، ایک با اثر زمیں دار، اہل سنت و جماعت کے دَم دار رہنما اور طویل عرصے تک میونسپل بورڈ کے چیئرمین بھی تھے۔ ان کے مدِمقابل دیوبندی مسلک کے علم بردار مولوی شکراللہ تھے، اپنے دور میں خلافت کمیٹی کے سیکریٹری اور ایک سخت گیر انسان تھے۔ اگرچہ ان کی نجی شناخت پر بھی اعتراضات اٹھائے گئے ہیں لیکن ان کی سیاسی چالاکی اور خطیبانہ مہارت نے انھیں مبارک پور کی دیوبندی جماعت کا نمایاں رہنما بنا دیا۔

1930 کی دہائی میں ان دونوں گروپوں کے درمیان اکثر جھڑپیں اور لاٹھی چارج کی نوبت آتی تھی۔ تاہم وہ وقت بھی آیا جب انھوں نے اپنی پسپائی قبول کرلی اور امین گرہست کو اچھا آدمی کہنے لگے۔

مقامی حکومت اور جدید نظام کا سامنا:

1929ء میں اعظم گڑھ ضلع کے تمام نوٹیفائیڈ علاقوں کو ٹاؤن ایریا میں بدلنے کی تجویز پر بحث نے مقامی سیاست کو مزید پیچیدہ بنادیا۔ 30 جولائی 1930 کو مبارک پور کی نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا، جس کی صدارت شیخ عبدالمجید نے کی۔ اراکین میں شیخ محمد امین، شیخ محمد شفیع اور بابو گنیش پرساد شامل تھے۔ اجلاس میں حکومت کو یاد دہانی کرائی گئی کہ مبارک پور 1908 سے نوٹیفائیڈ ایریا کے درجے پر فائز ہے، اور اس کی آبادی اب 12،500 نفوس پر مشتمل ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مبارک پور اپنی شناخت کی بازیافت کے سفر پر گامزن تھا، مگر یہ سفر داخلی تضادات، شخصی کشمکش اور سیاسی چالاکیوں سے لبریز تھا۔ اس وقت مبارک پور اپنی تاریخ کے ایک نازک دور سے گزر رہا تھا۔ برطانوی راج کے تحت مقامی نظم ونسق کے جو تجربے برسوں پہلے "نوٹیفائیڈ ایریا" کی صورت میں شروع ہوئے تھے، وہ اب نئے سوالات اور نئے امکانات کی طرف بڑھ رہے تھے۔ لیکن ہر تبدیلی اپنے ساتھ اختلاف، انتشار اور بعض اوقات غیر متوقع تباہی بھی لے کر آتی ہے۔

1939ء میں نوٹیفائیڈ ایریا کمیٹی نے اپنی مدت کے اختتام تک، یعنی 1932 تک، موجودہ حیثیت برقرار رکھنے کی سفارش کی۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی کہ پچھلے انتخابات کے بعد شکست خوردہ گروہ کے ساتھ پورا سال قانونی جنگ میں گزر چکا تھا، اور نظم ونسق کی کوئی مؤثر پیش رفت ممکن نہ ہوسکی۔ تاہم، کمیٹی کے اندرونی مباحث نے ایک اور رخ اختیار کیا جب زرعی علاقوں، خاص طور پر املو جیسے گاؤں کی شمولیت پر بحث چھڑ گئی۔ 16 جولائی 1930 کو کمیٹی کے صدر کی جانب سے پیش کردہ رپورٹ میں املو خاص کا ذکر بڑے معنی خیز انداز میں

کیا گیا۔ یہ گاؤں، جو بنیادی طور پر زرعی تھا، اس کے دو محلے، پورہ محبت اور پورہ محمود، ریشمی صنعت میں مہارت رکھتے تھے، جہاں کی اکثریت بنکروں پر مشتمل تھی۔ قریبی دیہات جیسے نوادہ، سریاں، رسول پور، اور علی نگر بھی ریشمی کپڑا بنانے اور اس کی تجارت کرنے والوں سے بھرے ہوئے تھے۔ چناں چہ، کمیٹی نے اکثریتی رائے سے مبارک پور کو ٹاؤن ایریا قرار دینے کی منظوری دے دی، لیکن یہ فیصلہ سب کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ 2 اگست 1930 کو مبارک پور کے 95 باشندوں نے انگوٹھے کے نشانات ثبت کرتے ہوئے ایک درخواست ضلع مجسٹریٹ کو پیش کی، جس میں انھوں نے کہا کہ "اگرچہ موجودہ نوٹیفائیڈ ایریا کے ارکان اس تبدیلی کے خلاف ہیں، ہم مبارک پور کے عوام اسے خوش آئند سمجھتے ہیں، بشرطے کہ املو اور سکٹھی جیسے زرعی علاقے اس حدود سے باہر رکھے جائیں۔"

مقامی معیشت کا زوال اور گم ہوتی شناخت:

مبارک پور کی معیشت اور انتظامی حیثیت کی نزاکت اُس وقت اور واضح ہو گئی جب 12 دسمبر 1929 کو ایس۔ ایم۔ جعفر، ٹاؤن مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "یہ قصبہ زوال پذیر ہے"۔ 1928ء، 1929ء کی آمدنی اگرچہ 6883 روپے تھی، لیکن اقتصادی اور صنعتی سرگرمیاں ماند پڑ چکی تھیں۔ ضلع مجسٹریٹ این۔ سی۔ مہتا نے 2 اپریل 1930 کو کمشنر گورکھپور کو رپورٹ پیش کی، جس میں صاف کہا گیا کہ "مبارک پور کی تجارت عرصۂ دراز سے ماند ہے اور اس کے احیا کی امید کم ہے۔" یہی رائے ٹاؤن ایریا کے درجہ دینے کے فیصلے کا جواز بنی۔

مگر 1940 کی دہائی میں وقت نے جیسے ایک اور کروٹ لی۔ نئے ضلع مجسٹریٹ نے اپنی معائنہ رپورٹ میں لکھا: "ٹاؤن ایریا کا درجہ دینا ایک غلطی تھی، مبارک پور اب بھی اتنی اہم اور خوش حال جگہ ہے کہ اسے دوبارہ نوٹیفائیڈ ایریا بنایا جانا چاہیے۔" اس کے باوجود سب ڈویژنل مجسٹریٹ نے اس خیال کو رد کر دیا اور کہا: "ٹاؤن ایریا کا درجہ ملنے کے بعد سے اس کی

خوش حالی مزید گھٹ گئی ہے۔"

اُس وقت ریشمی صنعت، جو کبھی مبارک پور کی پہچان تھی، اب فیشن سے باہر ہو چکی تھی، اور زری و ریشم کی بڑھتی قیمتوں اور بھاری ٹیکسوں نے باقی صنعت کو بھی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ آمدنی محض 3200 روپے پر آ چکی تھی، اور انتظامیہ کے لیے مزید مالی بوجھ اٹھانا ممکن نہ تھا۔

مذہبی تصادم اور آزاد ہندوستان کا خواب:

جب ہندوستان نے 1947 میں آزادی حاصل کی، تو مبارک پور جیسے قصبے میں یہ آزادی نہ صرف سیاسی، بلکہ مذہبی آزادی کے طور پر بھی محسوس کی گئی۔ 28 جولائی 1948 کو، جب پرانی بستی میں ایک ہندو گھر میں مذہبی اجتماع کے دوران شنکھ بجایا گیا، تو یہ عمل محض ایک عبادت نہ رہا، یہ ایک پرانی پابندی کو توڑنے کی علامت بن گیا۔ مسلمانوں کی اکثریت نے اسے جارحیت سمجھا اور قریب ڈھائی تین سو افراد پر مشتمل ہجوم نے حملہ کر دیا۔

پولیس رپورٹ میں کہا گیا کہ "مسلمانوں کی اکثریت کے سبب ہندو شنکھ نہیں بجا سکتے تھے، مگر آزادی کے بعد ہندوؤں نے پرانی روایات کو توڑنے کی کوشش کی۔" یہ صرف ایک مذہبی جھگڑا نہ تھا، بلکہ اس میں شناخت، عزت اور تاریخ کا بوجھ بھی شامل تھا۔ رپورٹ کے مطابق 1906 میں بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا، جب ایک مسلمان پولیس افسر نے رشوت کے بدلے شنکھ بجانے کی اجازت دی تھی۔

سیاسی تبدیلی اور فرقہ وارانہ فسادات:

وقت کے ساتھ ساتھ مذہبی تقسیم میں سیاسی رنگ بھی شامل ہو گیا۔ 1959 میں مبارک پور میں ہولی کے موقع پر ہونے والا آخری ہندو-مسلم فساد دراصل ایک سیاسی کشمکش کا شاخسانہ تھا۔ مقامی مسلمانوں کی کمیونسٹ پارٹی سے وابستگی اور ہندو اکثریت کی اس پر مخالفت نے اس تصادم کو مزید سنگین بنا دیا۔

1960 کے بعد مبارک پور کی معیشت نے کئی نشیب و فراز دیکھے، جن میں روایتی دست کاری کی صنعت کی زوال پذیری، خواتین کی بڑھتی ہوئی شرکت، اور عالمی منڈیوں سے وابستگی شامل ہیں۔ 1960 کی دہائی کے بعد، مبارک پور کی معیشت کا مرکز ریشمی ساڑیوں کی تیاری رہا، جو قومی اور بین الاقوامی سطح پر مقبول تھیں۔ تاہم، وقت کے ساتھ ساتھ، پاور لومز کے بڑھتے ہوئے استعمال اور صنعتی تبدیلیوں نے ہاتھ سے بنے کپڑوں کی مانگ کو متاثر کیا، جس سے مقامی صنعت کو نقصان پہنچا۔ معاشی دباؤ، بے روزگاری، اور تعلیم کی کمی جیسے عوامل نے خواتین کو دستکاری کے شعبے میں کام کرنے پر مجبور کیا۔ ایک مطالعے کے مطابق، خواتین کی بڑی تعداد نے اقتصادی ضروریات کی بنا پر اس صنعت میں قدم رکھا، جس سے ان کی معاشی حالت میں بہتری آئی۔

حوالہ جات:

- جے۔ سی۔ رے، "ٹیکسٹائل انڈسٹری"۔ جرنل آف بنگال اینڈ اوڈیسا ریسرچ سوسائٹی۔ حصہ سوم، جلد 3، صفحات 181-186، 206-207۔ (1917)

جے۔ سی۔ رے کی اس تحریر میں 1917 کے دوران بنگال اور اڑیسہ میں ٹیکسٹائل صنعت کی حالت پر تحقیق کی گئی ہے۔ یہ مضمون ہاتھ سے بنے کپڑوں، ان کی تیاری کے طریقے، استعمال ہونے والے خام مال اور مزدوروں کی معاشی حالت کے تجزیے پر مبنی ہے۔

- اے۔ یوسف علی۔ اے مونوگراف آن سلک فیبرکس پروڈیسڈ ان دی نارتھ ویسٹرن پروونسز اینڈ اودھ۔ (شمال مغربی صوبوں اور اودھ میں تیار کردہ ریشمی کپڑوں پر ایک مونوگراف)۔ الہ آباد، 1900ء۔ صفحات 102-103؛

اے۔ یوسف علی نے اپنے مونوگراف میں شمالی ہند کے ریشمی کپڑوں کی تفصیل بیان کی ہے، جن میں مبارک پور کی مخصوص بُنائی اور ڈیزائنز کا ذکر ہے۔

- قاضی اطہر مبارک پوری۔ تذکرہ تذکرہ علماے مبارک پور

قاضی اطہر مبارک پوری نے اپنے تذکرے میں مبارک پور کے علما کے ساتھ ساتھ یہاں کی

معاشرتی اور اقتصادی زندگی، خاص طور پر دستکاری کی صنعت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

- پنکج راگ، (مقالہ) 1857: نیڈ فار الٹرنیٹیو سورسز۔ (مجلہ) سوشل سائنٹسٹ، جلد 26، شمارہ 1-4، جنوری-اپریل 1998، صفحہ 123۔

پنکج راگ کے اس مضمون میں 1857 کی بغاوت کے بارے میں نئی تحقیق کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے جس میں مقامی تاریخی ذرائع اور عوامی بیانیے کو رسمی نوآبادیاتی ریکارڈ کے ساتھ ملانے کی کوشش کی گئی ہے۔

- جے۔ آر۔ ریڈ۔ رپورٹ آن دی سٹلمنٹ آپریشن ان دی ڈسٹرکٹ آف اعظم گڑھ (ضلع اعظم گڑھ میں تصفیہ کی کارروائیوں کی رپورٹ) صفحہ 148۔

یہ رپورٹ برطانوی دور میں ضلع اعظم گڑھ میں زمین کی تقسیم، محصولات، اور دیہی معیشت کے سروے پر مبنی ہے، جس میں کسانوں، دستکاروں، اور زمین داروں کی معاشی حالت کا تجزیہ شامل ہے۔

- گیانندر پانڈے۔ اکونومک ڈس لوکیشن ان نائنٹینتھ سنچری ایسٹرن یوپی۔ (انیسویں صدی کے مشرقی اتر پردیش میں معاشی انقطاع"۔ مجلہ "رورل ساؤتھ ایشیا" لندن، 1983، صفحات 89-129؛

گیانندر پانڈے نے مشرقی اتر پردیش میں انیسویں صدی کے دوران ہونے والے معاشی انقطاع اور دیہی اقتصادی ڈھانچے کی تبدیلی کا گہرا تجزیہ پیش کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح نوآبادیاتی پالیسیوں، محصولات کی زیادتی، اور صنعتی سامان کی درآمد نے روایتی دستکاری، خاص طور پر جولاہوں کی معیشت کو شدید متاثر کیا

- گیانندر پانڈے۔ دی کنسٹرکشن آف کمیونلزم ان کولونیل نورتھ انڈیا۔ (نوآبادیاتی شمالی ہندوستان میں فرقہ واریت کی تشکیل) دہلی، 1990۔

اس کتاب میں، وہ فرقہ واریت کو نوآبادیاتی سماجی تعمیر کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ معاشی زوال اور شناختی سیاست کے امتزاج نے مذہبی تفریق کو ہوا دی۔

- ایف. ایچ. فشر۔ اسٹیٹسٹکل ڈیسکرپٹیو اینڈ ہسٹوریکل اکاؤنٹ.....اعظم گڑھ۔ (شماریاتی، توضیحی و تاریخی خاکہ....اعظم گڑھ) صفحات 171-172۔

ایف۔ ایچ۔ فشر کی یہ کتاب انیسویں صدی کے وسط میں ضلع اعظم گڑھ کی معاشرتی و اقتصادی صورتِ حال پر مبنی ہے۔ صفحات 171-172 پر وہ مبارک پور کا ذکر کرتے ہیں جہاں ریشمی کپڑا بنانے کی صنعت بہت نمایاں تھی۔ انھوں نے فنی مہارت، تجارتی راستوں، اور مقامی منڈیوں کی تفصیل بھی پیش کی ہے اور واضح کیا ہے کہ کس طرح ان صنعتوں کو زوال پذیر پالیسیوں نے نقصان پہنچایا۔

- ڈی. ایل. ڈریک بروک مین۔ اعظم گڑھ: ایک گزٹیر، صفحہ 62۔

ڈریک بروک مین نے اعظم گڑھ کے مختلف قصبوں، خصوصاً مبارک پور، کی سماجی و اقتصادی زندگی کا مفصل تذکرہ کیا ہے۔ صفحہ 62 پر وہ مبارک پور کی ریشمی صنعت، بنکروں کی آبادی، اور ان کے مخصوص طرزِ معاشرت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ مبارک پور کا کپڑا پورے شمالی ہند میں مشہور تھا اور یہاں کی صنعت مقامی ہنر و کاریگری پر مبنی تھی۔

- مبارک پور فساد کیس، محکمہ سیاسیات کی کارروائیاں. جنوری 1905. سلسلہ نمبر 10، فائل نمبر 1904/254، بکس نمبر 662، یو۔پی۔ اسٹیٹ آرکائیوز۔

یہ ایک سرکاری ریکارڈ ہے جو 1904 کے اواخر میں مبارک پور میں پیش آنے والے فرقہ وارانہ فساد سے متعلق ہے۔ فائل میں درج گواہیوں، انتظامی رپورٹوں اور مقامی سماجی تناؤ کی تفصیلات محفوظ ہیں۔ کیس میں بتایا گیا کہ معمولی مذہبی رسومات کے دوران پیدا ہونے والی چپقلش نے کس طرح بڑے فساد کی شکل اختیار کی، اور کس طرح پولیس و نوآبادیاتی حکومت نے صورتِ حال پر قابو پایا۔ یہ مواد اس بات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے کہ برطانوی راج میں مقامی اختلافات کو کس طرح سے "سیاسی خطرہ" تصور کیا جاتا تھا۔

- عبد المجید کی ڈائری بحوالہ مولانا قمر الزماں مبارک پوری۔ اندراج: 10 اگست 1919، (1902–1934؟)

یہ ایک ذاتی ڈائری کا اندراج ہے جو عبد المجید نے غالباً 10 اگست 1919 کو لکھا تھا۔ اگرچہ مکمل مخطوطہ غیر مطبوعہ ہے، مگر یہ تحریر 1902 سے 1934 کے درمیانی عرصے کا احاطہ کرتی ہے۔ یہ مخطوطہ مولوی قمر الزماں مبارک پوری کے پاس محفوظ تھا، ان کے انتقال کے بعد اب یہ کہاں ہے، اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں۔

یہ ڈائری مقامی سطح پر برادری کی سماجی، مذہبی اور سیاسی زندگی کا گہرا عکس پیش کرتی ہے، خاص طور پر 1919 کے آس پاس کے دنوں میں جب تحریک خلافت، عدم تعاون، اور مقامی ہنگامہ خیز حالات ملک بھر کی طرح یہاں بھی شدت اختیار کر چکے تھے۔

- آر. آئی. ورما۔ سلک ٹکسٹائل انڈسٹری ان اتر پردیش وتھ اسپیشل ریفرنس ٹو مبارک پور، اعظم گڑھ ہینڈی کرافٹ سروے مونوگراف نمبر 7۔

آر. آئی. ورما نے اس مونوگراف میں اتر پردیش کی ریشمی صنعت کا تفصیلی جائزہ پیش کیا ہے، جس میں خاص طور پر مبارک پور، ضلع اعظم گڑھ پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ یہ مطالعہ 1961 کی مردم شماری کے

تحت دستکاری کی صنعتوں کے ایک سروے کا حصہ ہے، جو ہنڈی کرافٹس سروے مونوگراف نمبر 7 کے طور پر شائع ہوا۔ صفحہ 9-10 پر مبارک پور مبارک پور کو ریشمی کپڑے کی تیاری کا ایک پرانا اور مشہور مرکز قرار دیا گیا ہے۔ لکھا گیا ہے کہ یہاں تیار ہونے والے کپڑے نہ صرف ریاست کے اندر بلکہ بیرونِ ریاست بھی بھیجے جاتے تھے۔ انھوں نے لکھا کہ اگرچہ مبارک پور میں ریشم کی صنعت ایک روایتی پیشہ ہے، لیکن بیسویں صدی کے وسط میں اسے مختلف معاشی چیلنجز کا سامنا تھا، جیسے کہ: خام مال کی قیمتوں میں اضافہ، جدید مشینری کی کمی، بازار تک رسائی میں رکاوٹیں، اور روایتی ہنرمندوں کی کم آمدنی۔ رپورٹ میں یہ بھی درج ہے کہ اگر حکومت اور نجی شعبے کی طرف سے مناسب تعاون ملے تو مبارک پور میں ریشم کی صنعت کو دوبارہ فروغ دیا جا سکتا ہے۔

(نوٹ: یہ مضمون ماہ نامہ اشرفیہ جولائی، اگست 2025ء میں دو قسطوں میں شائع ہوا)

(تحریر: جون 2025ء)

جلال الدین رومی-احوال و آثار

مولانا جلال الدین رومی کی ولادت 6 ربیع الاول (604ھ) کو شہر بلخ میں ہوئی۔ ان کے والد، سلطان العلما بہاء الدین محمد، جو بہا ولد کے نام سے مشہور تھے، اس دور کے عظیم علما اور خطیبوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ جلال الدین کی پیدائش ایسی حالت میں ہوئی جب منگولوں کی خطرناک یلغار سرزمین منگولیا سے شروع ہو کر خراسان کی سرزمین تک پہنچ رہی تھی۔ رومی کے والد نے خطرہ محسوس کیا اور 1218ء میں اپنے خاندان کے ساتھ اپنے آبائی شہر بلخ سے ہجرت فرمائی۔ ایک روایت کے مطابق، ایران کے شہر نیشاپور میں قیام پذیر ہوئے اور وہیں ان کی ملاقات مشہور صوفی شاعر فریدالدین عطآر سے ہوئی۔ کچھ عرصہ بعد بہاء الدین ولد نے حج کے لیے رخت سفر باندھا۔ واپسی میں کئی ملکوں کا سفر کرتے بالآخر اناطولیہ پہنچے، غالباً اسی وجہ سے مولانا جلال الدین کو رومی کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس وقت اناطولیہ سلطنتِ سلاجق کے تحت تھا اور امان و امن اور خوش حالی کا گہوارہ تھا۔ لارندا (کرمان) میں ایک مختصر قیام کے بعد، یہیں ان کے پہلے بیٹے جلال الدین کی ولادت ہوئی اور بہاء الدین ولد کی اہلیہ نے وفات پائی۔ 1228ء میں بہاء الدین ولد کو قونیہ بلایا گیا جو دار الحکومت تھا۔ قونیہ میں انھیں سرکاری سطح پر تعلیم و تعلم کا شعبہ سونپا گیا۔ بہاالدین ولد نے یہاں متعدّد مدارس میں تعلیم دی۔ قونیہ کے لوگ بہاء الدین ولد اور محمد جلال الدین دونوں سے بے حد متاثر تھے۔ رومی کے والد ان کی تربیت کر رہے تھے تاکہ وہ ان کے بعد ان کی جگہ لے سکیں۔ قونیہ میں ہی 1231ء میں بہاء الدین ولد کا انتقال ہوا، بعد ازاں ان کی مسند تدریس کو جلال الدین رومی نے زینت بخشی۔

حالاں کہ مولانا کا اصل نام محمد تھا لیکن قونیہ کے لوگ انھیں محبت سے ”جلال الدین“، ”خوداوندگر“ اور ”مولانا خدوانگر“ کے القابات سے پکارتے تھے۔ بعد کے زمانے میں ان کے لیے ”مولوی“، ”مولانا“، ”مولوی رومی“ اور ”مولاے روم“ جیسے القابات استعمال ہونے لگے۔ اپنی غزلیات اور مثنوی میں لفظ ”خاموش“ کو انھوں نے اس کثرت سے استعمال کیا کہ ”حلقۂ ادب“ میں انھیں خاموش یا خموش کے لقب سے بھی یاد کیا جانے لگا۔

بہاء الدین محقق ترمذی:

1232ء میں بہاء الدین ولد کے تلمیذ رشید حضرت برہان الدین محقق ترمذی قونیہ پہنچے اور جلال الدین سے ملاقات کی۔ سید برہان الدین محقق ترمذی المعروف سید سردان (پیدائش 561ھ/1165-66ء-وفات 637ھ/1239-40ء) انھوں نے بہاء الدین ولد سے تعلیم حاصل کی اور ان کے وصال کے بعد ان کے خلیفہ ہوئے رومی کے بچپن میں انھوں نے بھی رومی کو تعلیم دی، جب مولانا کے خاندان نے قونیہ کی طرف ہجرت کی تو انھوں نے ترمذ میں سکونت اختیار کرلی۔ وہ بہاء الدین کی وفات کے ایک سال بعد قونیہ پہنچے اور دوسری بار پچیس سالہ مولانا کی ظاہری اور باطنی علوم کی تربیت سنبھالی۔

اپنے مقالے میں، فریدون سپاہ سالار نے انہیں ”حضرت سید الاقطاب، فخر الاولیاء والکاملین اور تاج الاولیاء“ کہا ہے۔۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اسم اعظم کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے اور غیب کے اسرار سے آگاہ تھے۔

ان کو اپنے استاد کی وفات کا علم کیسے ہوا اس کا ذکر مناقب العارفین اور نفحات الاعلان میں ایک قصہ میں ہے کہ چونکہ وہ غیب کے راز جانتے تھے اس لیے انھیں خبر ہوگئی تھی۔ بہاولد کی موت کا علم ہونے کے بعد انھوں اپنے آپ کو نوجوان جلال الدین کی رہنمائی کا پابند سمجھا جسے ان کی روحانی صلاحیتوں نے پہچان لیا تھا اور اسی وجہ سے وہ قونیہ روانہ ہوگئے۔ وہ 629ء میں قونیہ میں داخل ہوئے۔

جب برہان الدین قونیہ پہنچے تو پچیس سالہ رومی لاراندے میں رہ رہے تھے اور ایک مشہور مبلغ تھے جو مختلف طبقوں کے لوگوں میں اثرورسوخ رکھتے تھے۔ افلاکی کی روایت کے مطابق ترمذی کی قونیہ آمد اس طرح تھی کہ جب وہ قونیہ پہنچے تو مسجد سنجاری میں ٹھہرے اور رومی کوہا اپنی آمد کی اطلاع بھجوائی۔

برہان الدین کی آمد رومی کے لیے تسلی کا باعث تھی کیوں کہ وہ بہرحال ایک رہنما کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے۔

رومی کے اصرار پر جب برہان الدین منبر سے خطاب فرمانے لگے تو ان کے بولنے کا انداز اور لہجہ بہاولد جیسا تھا، بس کیا تھا، بے شمار ایسے لوگ جو بہاولد کے شاگرد تھے، وہ برہان الدین کی شاگردی میں آگئے۔

برہان الدین نے جلال الدین رومی کو ایرانی صوفی نظریات سے آگاہ کیا، سچ تو یہ ہے کہ انھوں نے جلال الدین کی روحانی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا اپنے علم سے مطمئن نہ تھے اور دمشق جاکر تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ رکھتے تھے اور برہان الدین ترمذی کے علاوہ کوئی ان کے جذبات سے واقف نہیں تھا۔ انھوں نے رومی کو بشارت دی کی جلد ہی ایک عارف باللہ تم سے ملاقات کرے گا اور تمھیں راہِ معرفت پر گامزن کردے گا۔ لیکن رومی کو اس بات کی فکر تھی کہ وہ دوسرے شیوخ سے مختلف نہ ہوجائیں، کیونکہ وہ شیخ جو شریعت کے قوانین کو اچھی طرح جانتے تھے جن کے بارے میں رومی کو علم تھا طریقت اور علم میں خام اور ناتجربہ کار تھے، اور رومی حضرت حق سے تعلق کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتے تھے۔

ایک دن رومی نے راہ چلتے ایک فقیر کو دیکھا اور دل میں انجانے خوف و خدشے نے سر اٹھایا، اس وقت ان کے ساتھ برہان الدین ترمذی بھی تھے، رومی گھبرا کر بھاگنا چاہتے تھے لیکن برہان الدین نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا۔ اچانک اس شخص نے برہان الدین اور رومی کا ہاتھ پکڑ کر کچھ سرگوشی کی، اس سے رومی بے ہوش ہوگئے، وہ شخص اچانک غائب ہو

گیا۔ رومی جب ہوش میں آئے برہان الدین ترمذی نے بتایا کہ یہ تبریز کا شمس الدین پرند تھا جو مستقبل میں تمھارا دوست اور تمھارا آئینہ ہوگا۔ اس کے قرب کے سبب ساری دنیا تمھارے قدموں میں جھک جائے گی۔

تقریباً آٹھ سال کا عرصہ برہان الدین ترمذی اور رومی نے ساتھ گزارا۔ 1240ء کے قریب جب برہان الدین نے محسوس کیا کہ اپنا سارا علم جلال الدین کے سینے میں منتقل کر چکے ہیں تو وہ قونیہ سے رخصت ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ جلال الدین نے ملک شام کے ایک یا دو سفر کیے، یہاں ان کی ملاقات مشہور صوفی فلسفی ابن عربی سے بھی ہوئی۔

شمس الدین تبریزی:

شمس الدین تبریزی 582ھ میں تبریز میں پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کے بارے میں کوئی علم نے، شمس الدین نے اپنی تحریروں میں صرف ان کی شفقت و محبت کا تذکرہ کیا ہے، ان کے نام اور اپنے خاندانی احوال درج نہیں کیے ہیں۔ البتہ بعض منابع میں ان کے والد کا نام "جلال الدین" درج ہے اور یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے والد نومسلم تھے اور تبریز شہر میں کپڑے کی فروخت اور تجارت کرتے تھے۔

شمس الدین فطرتاً نوعمری سے ہی پرہیزگار تھے، ان کی نوجوانی کے دنوں میں شہر تبریز میں پانسے پھینکنے اور جوا کھیلنے جیسی برائیاں عام تھیں، مگر شمس الدین ہمیشہ ان برائیوں سے بے زار رہے اور کبھی ان کے قریب نہی گئے۔ ان کے بارے میں بعض انگریزی مورخین نے لکھا ہے کہ وہ شراب نوشی کیا کرتے تھے، لیکن عربی و فارسی مآخذ و مراجع میں کہیں اس بات کا ذکر نہیں ہے، خدا جانے انھوں نے کہاں سے لکھ دیا۔ وہ ایامِ شباب ہی میں تصوف کی طرف مائل ہو گئے تھے اور تھوڑے ہی عرصے میں اپنے اساتذہ سے بھی آگے نکل گئے تھے۔

شمس الدین کے ابتدائی استاذ ابوبکر زنبلؒ تھے بعد میں جب ان کو احساس ہوا کہ شیخ نے جو کچھ علم دے دیا اس کے علاوہ ان کے پاس مزید کچھ نہیں تو علم کی پیاس نے انھیں دنیا

گردی پر آمادہ کیا، انھوں نے خدا جانے دنیا کس کس کونے کا سفر کیا، ابدال اور مردان طریقت اور اولیاے کاملین سے ملاقاتیں کیں اور جہاں تک ہو سکا استفادہ کیا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ انہوں نے کچھ عرصہ بابا کمال خوجندی کی شاگردی میں بھی گزارا۔ بعض کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ نے شیخ اوہادی کرمانی سے ملاقات کی اور بغداد کی خانقاہوں میں ان کے ساتھ گفتگو اور تبادلہ خیال میں کچھ وقت گزارا۔

بہر حال انھوں نے اپنی ساری زندگی سفر میں گزاری، جہاں سے ہو سکا علم حاصل کیا۔ شمس خود اپنے مقام و مرتبے سے پوری طرح واقف تھے، کمال کا صبر و تحمل رکھتے تھے، ان کا درویشانہ حلیہ اور الجھے ہوئے بال دیکھ کر کبھی کوئی مذاق اڑاتا تو کبھی پلٹ کر جواب نہیں دیتے اور نہ کوئی انتقامی کارروائی کرتے، مال و دولت سے انھیں بیر تھا، کبھی کسی کام کا معاوضہ انھوں نے کسی سے طلب نہیں کیا، اپنی عمر کے ساٹھویں سال میں پہنچے تو کسی ایسے شخص کی تلاش میں نکلے جو ان کے علوم کا وارث بننے کے لائق ہو۔ اس مقصد کے لیے وہ قونیہ میں داخل ہوئے اور 40 سالہ مولانا کو اپنے فیضان سے مالا مال کیا۔

شمس تبریزی ایک صوفیانہ شخصیت کے مالک تھے چند مقامات پر انھوں نے تدریس کا بھی کام کیا مگر کبھی کوئی معاوضہ نہیں لیا۔ مگر بعد میں مدارس سے بے زار ہو گئے اور خانقاہوں سے بھی کوئی دل چسپی باقی نہیں رہی، وہ اپنے آپ کو اکیلا سمجھتے تھے، ہمیشہ سرایوں میں رہتے یا کھلے آسمان کے نیچے راتیں گزارتے، اس زمانے میں خانقاہیں مسافروں کے لیے بہترین قیام گاہ ہوا کرتی تھیں مگر کبھی کسی خانقاہ میں نہیں ٹھہرے، جب کسی نے ان سے پوچھا کہ وہ کسی درس گاہ یا خانقاہ میں کیوں نہیں رہتے؟ تو انھوں نے کہا:

”وہ بحث کرنے والے ہیں اور دلیل دینا میرا کام نہیں ہے۔“

شمس تبریزی اکثر سیاہ لباس پہنتے، لوگ ان کی سادگی کو پسند کرتے تھے تاہم س ان کی صوفیانہ شخصیت اور پر اسرار زبان کی وجہ سے ان سے زبانی رابطہ قائم کرنا کارِ دشوار تھا تھا۔

سفر کرتے ہوئے جب وہ قونیہ میں داخل ہوئے جو مولانا جلال الدین رومی کا شہر تھا تو وہیں کسی نے ان سے پوچھا: تم شہر میں کیا کر رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: میں یہاں ایک عالم سے ملنے آیا ہوں اور ایک خدائی منصوبے کی تکمیل کے لیے قونیہ میں آیا ہوں۔

جلال الدین رومی سے ملاقات:

شمس اور رومی کے درمیان ملاقات 30/ نومبر 1244ء کو ہوئی۔ اس ملاقات کے سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ رومی ایک دن ایک باغ میں تالاب کے کنارے اپنے شاگردوں کو فقہ کا درس دے رہے تھے، اتنے میں ایک مسافر آیا، اس نے مولانا کی کتابوں کی طرف اشارہ کرکے پوچھا یہ کیا ہے؟ مولانا نے کہا یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔ اتنا سنتے ہی اس مجذوب فقیر نے ساری کتابیں اٹھا کر تالاب میں پھنک دیں۔ یہ دیکھ کر مولانا کے اوسان خطا ہوگئے۔ انھوں نے برہمی سے کہا، یہ تم نے کیا ہے؟ معلوم بھی ہے وہ کتنی قیمتی کتابیں تھی؟ فقیر نے مسکراتے ہوئے تالاب میں ہاتھ ڈالا اور کتابیں نکال کر باہر رکھ دیں، رومی نے دیکھا کہ کتابیں بھیگنا تو دور کی بات ان پر پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں پڑا تھا۔ یہ دیکھ کر حیرت سے مولانا نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ اس پر اس بزرگ نے مسکراتے ہوئے کہا: یہ تم نہیں سمجھ سکتے۔

ایک اور روایت میں ہے کہ ایک دن شمس تبریزی قونیہ آئے اور مسجد میں جلال الدین رومی سے ملاقات کی غرض سے پہنچے۔ کہا جاتا ہے کہ جب شمس رومی کے قریب پہنچے، انھوں نے رومی سے پوچھا: کیا تمھیں حقیقت کی تلاش ہے؟ رومی نے جواب دیا کہ وہ علم کے پیاسے ہیں، اور اس کے بعد شمس نے ان سے ایک سوال کیا جس نے رومی کے ذہن کو ہلا دیا۔

شمس نے رومی سے کہا: "تم جو کچھ جانتے ہو، وہ سب کتابوں میں ہے، لیکن تمھیں حقیقت کا علم چاہیے، جو کتابوں سے باہر ہے۔" شمس کا یہ جملہ رومی کے لیے ایک نیا دروازہ تھا، جس نے ان کی سوچ کو تبدیل کر دیا۔

شمس تبریزی نے مولانا رومی سے کہا:

"اگر تم اپنی روح کو زندہ رکھنا چاہتے ہو تو تمہیں دل کی سننی ہوگی، نہ کہ صرف دماغ کی۔ کتابوں سے کچھ نہیں ملے گا جب تک تمھارا دل سچائی کو قبول نہیں کرتا۔"

شمس، جب رومی سے ملے، تو وہ اپنی عمر کے ساٹھویں برس میں تھے۔ تب تک وہ ایک بے باک، غیر سماجی اور طاقتور روحانی مسافر کے طور پر جانے جاتے تھے۔ ان کا لقب "پرندہ" تھا۔ "پرندہ" اس لیے کہ وہ ایک جگہ زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرتے تھے۔ یہ بھی روایت کی جاتی ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں دو دور دراز شہروں میں موجود ہوتے، گویا وہ اپنی روح یا وجود کو اپنی مرضی سے پرواز کرواسکتے تھے یا منتقل کر سکتے تھے۔

شمس الدین کو خود ایک ایسے شاگرد کی تلاش تھی جو اس وقت کے بہت سے اساتذہ سے بڑا مقام رکھتا ہو۔ انہوں نے رومی کو اپنے اگرد کے طور پر منتخب کیا۔ رومی اور شمس کی ملاقات کا ابتدائی تاثر اتنا گہرا تھا کہ رومی نے شمس کو اپنے گھر میں جگہ دی۔

شمس تبریزی کی شخصیت ایک عجیب و غریب تھی۔ وہ عام طور پر خاموش رہتے اور کم لوگوں سے بات کرتے تھے، لیکن مولانا رومی کے ساتھ ان کی گفتگو بہت گہری اور معنوی ہوتی تھی۔ شمس اکثر اس بات پر زور دیتے کہ انسان کو اپنی روحانیت میں آزادی کی ضرورت ہے، اور اس کے لیے انسان کو اپنے دل کے دروازے کھولنے کی ضرورت ہے۔ ایک دن شمس تبریزی نے رومی سے ایک سوال کیا:

"اگر تمھیں اپنے آپ سے محبت کرنے کی ضرورت ہو تو تم اپنے آپ کو کس طرح دیکھوگے؟"

مولانا رومی نے اس سوال کا جواب دینے میں کچھ وقت لیا، اور جب وہ جواب دینے لگے تو ان کے الفاظ میں محبت اور حقیقت کی گہرائی تھی، انھوں نے کہا:

"میں اپنے آپ کو اُس دریا کی طرح دیکھوں گا جو کبھی خشک نہیں ہوتا، اور میں اُس چراغ کی طرح دیکھوں گا جو کبھی مدھم نہیں پڑتا۔"

یہ وہ لمحہ تھا جب مولانا رومی کی زندگی کا رخ بدل گیا، اور انہوں نے شمس تبریزی کو

اپنی روح کا استاد تسلیم کیا۔ وہ شمس تبریزی کے فلسفہ اور تصوف کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہوئے اور ان کی تعلیمات کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیا۔

رومی کی تربیت:

شمس کی آمد کے ساتھ ہی ان کے معمولات تبدیل ہو گئے، رومی کا اکثر وقت شمس الدین کے ساتھ بند حجرے میں گذرنے لگا۔ شمس الدین کی ملاقات نے رومی کے دل پر پڑا ہوا پردہ ہٹا دیا، رومی خدا کی تلاش میں تھے اور بالآخر اسے شمس الدین کے دل میں پایا، یہیں سے وہ نظریۂ وحدۃ الوجود کے قائل ہوئے۔ انھوں نے سمجھ لیا کہ پیر ہی واحد راستہ ہے جس سے گذر کر انسان خدا کی معرفت حاصل کر سکتا ہے۔ انھوں نے پیر کے ساتھ انسلاک ہوا ایسا کیمیا سمجھا جو وجود کے سیاہ تانبے کو خالص سونے میں بدل دیتا ہے۔ شمس تبریزی نے رومی کو خالی کرنے کی کوشش کی، جو مذہبی صورتوں سے آراستہ تھا، اور اسے اندر سے امیر بنا دیا۔ انھوں نے رومی کو ایسا پڑھایا کہ خاموش رہنے پر مجبور کیا۔ ''خاموشی'' تصوف کے مراحل میں سے ایک ہے، اس سے گزر کر صوفی تصوف کے ایک نئے مرحلے کی طرف اپنا راستہ کھولتا ہے۔ شاید، صوفیانہ خاموشی کے مرحلے کے دوران، وہ شمس تبریزی کی موجودگی میں تھے، جس کی وجہ سے رومی نے ''خموش'' کنیت کا انتخاب کیا۔ شمس الدین تبریزی کی غالب شخصیت نے جلال الدین کے سامنے الوہی ہی جلال و جمال کی گتھیاں کھولیں۔

مولانا رومی نے ایک دن شمس تبریزی سے پوچھا:

''اگر انسان سچائی کو تلاش کرے تو کیا اسے مل جائے گی؟''

شمس تبریزی نے جواب دیا:

''سچائی تمھارے اندر ہے، تمہیں اسے باہر نہیں تلاشنا، بس اپنی آنکھیں کھولو اور دل کو صاف کرو، پھر تمہیں ہر طرف سچائی ہی سچائی دکھائی دے گی۔''

اس کے بعد مولانا رومی کی شاعری اور تصوف میں ایک نیا رنگ آیا۔ انھوں نے اپنے

اشعار میں سچائی، محبت اور حقیقت کی تلاش کو موضوع بنایا۔ وہ سمجھنے لگے کہ انسان کا مقصد صرف علم کا حصول نہیں بلکہ اس علم کو حقیقت میں بدلنا ہے۔

شمس تبریزی نے رومی کے عشق کے سانچے میں ڈھالا، ان کی بنیادی تعلیم ہی محبت تھی۔ وہ مولانا رومی سے کہتے تھے:

"محبت وہ قوت ہے جو انسان کو دنیا کی ہر چیز سے آزاد کرتی ہے۔ جب انسان سچی محبت میں ڈوب جاتا ہے تو وہ ہر چیز میں خدا کی موجودگی کو محسوس کرتا ہے۔"

مولانا رومی کی شاعری میں اس محبت کا تذکرہ بہت ملتا ہے، خاص طور پر دیوانِ شمس میں، جس میں وہ شمس تبریزی کے ساتھ اپنی ملاقاتوں اور ان کی باتوں کو بیان کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ شمس تبریزی نے مولانا رومی سے پوچھا: "کیا تم جانتے ہو کہ محبت کیا ہے؟"

رومی نے جواب دیا:

"محبت وہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے نکل کر انسان کو خدا کے قریب لے جائے۔ محبت کی حقیقت کو انسان اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اپنے اندر کے غرور اور تکبر کو ترک نہ کرے۔"

شمس تبریزی نے کہا:

"محبت میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی، اور نہ ہی اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔ محبت خود ہی ایک مقصد ہے، اور یہ انسان کو ہر رکاوٹ سے آزاد کر دیتی ہے۔"

عوام و خواص کی ناراضگی:

کئی ماہ تک دونوں عارف ایک ساتھ قریب رہے، اور رومی نے اپنے مریدوں اور اہلِ خانہ کو نظر انداز کیا، جس سے لوگ برگزشتہ ہو گئے۔ عام لوگوں سے لے کر عالم دین اور رومی کے قریبی لوگ بھی ان کی بدلی ہوئی حالت کو برداشت نہ کر سکے۔ شمس تبریزی کے ساتھ، رومی سما کے صوفی رقص میں حصہ لیتے اور موسیقی اور رقص کے ذریعے خدا سے قربت کا تجربہ

کرتے تھے۔ جو لوگ رومی کی حالت کو نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے شمس تبریزی کو اس تبدیلی کا سبب سمجھا اور ان کے خلاف بغاوت کر دی۔ کیوں کہ ان کے نزدیک رومی کے یہ اعمال کسی قیمتی اور مشہور عالم دین کے لائق نہیں تھے۔

جیسا کہ آپ تصور کر سکتے ہیں، مسئلہ پہلے دن سے ہی پیدا ہونے لگا تھا۔ شمس ایک سادہ مسافر تھے، بے شک وہ ایک طاقتور روحانی شخصیت کے مالک تھے لیکن تھے تو غریب، بے گھر مسافر، مزید یہ کہ شمس شدید غیر سماجی تھے اور سخت مزاج تھے، ابتدائی طور پر یہ مسئلہ رومی کی مقناطیسی شخصیت کی وجہ سے نظر انداز کیا، لیکن یہ رفتہ رفتہ ایک بڑے مسئلے کی شکل اختیار کر گیا۔

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اس صورتحال کی نوعیت کیا تھی۔ یہاں دو بالکل مختلف شخصیات، سماجی طبقاتی ڈھانچے کے دو انتہاؤں (حقیقی معنوں میں دونوں سروں) سے، ایک انتہائی منظم معاشرے میں ایک دوسرے کے قریب آ رہی تھیں۔ یہ کہانی روس کی زارینہ الیگزینڈرا اور راسپوتن کی کہانی سے کچھ مختلف نہیں۔ در حقیقت، ان دونوں کہانیوں میں حیرت انگیز مماثلت ہے، جہاں راسپوتن اور شمس دونوں کو اشرافیہ طبقے نے ناپسند کیا، اور ان کا خاتمہ اجنبیوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ اندرونی افراد کے ذریعے کیا گیا۔

رومی کے سماجی حلقے میں شمس کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی، رومی اُس علاقے کے سب سے بڑے شہری تھے، یہاں تک کہ وہ امیر (حکمران) سے بھی بلند مقام رکھتے تھے، کیوں کہ امیر ان کے شاگردوں میں سے ایک تھا۔ اس کے باوجود، رومی نے اپنی تمام عقل و دانش کو استعمال کرتے ہوئے شمس کو زیادہ سے زیادہ دیر تک اپنے قریب رکھنے کی کوشش کی۔

شمس الدین کی گم شدگی:

جب لوگوں کی ناراضگی زیادہ بڑھ گئی اور بار بار دھمکیاں ملنے لگیں شمس نے شہر چھوڑنے کا فیصلہ کیا، تقریباً ڈیڑھ سال کی صحبت اور دوستی کے بعد رومی کے علم میں لائے بغیر

قونیہ چھوڑ کر کسی نامعلوم ملک چلا گیا۔ اس مقام پر رومی اور شمس کے درمیان پہلی رفاقت ختم ہوگئی۔ جلد ہی، رومی شدید غم کی حالت میں چلے گئے۔ انہوں نے شمس کی کوئی خبر لانے کے لیے انعامی اعلانات جاری کیے۔ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ یہ خبر آئی کہ شمس کو دمشق (آج کے شام) میں دیکھا گیا ہے۔ رومی نے فوراً ایک تحائف سے بھرا قافلہ کے ساتھ اپنے بیٹے سلطان ولد کو انھیں واپس لانے کے لیے بھیجا۔

شمس تبریزی کے نام مولانا کا منظوم مکتوب:

مولانا شبلی نعمانی نے سوانح مولانا روم میں لکھا ہے کہ جب شمس کے دمشق میں ہونے کی خبر ملی تو رائے یہ قرار پائی کہ سب مل کر دمشق جائیں اور شمس کو منا کر لائیں، سلطان ولد اس قافلہ کے سپہ سالار بنے، مولانا نے شمس کے نام ایک منظوم خط لکھا اور سلطان ولد کو دیا کہ خود پیش کرنا، خط یہ تھا۔

به خدائیکه در ازل بوده است حی و دانا و قادرِ قیوم
نور او شمع های عشق افروخت تا بشد صد ہزار سِر معلوم
از یکے حکم او جہان پر شد عاشق و عشق و حاکم و محکوم
در طلسمات شمس تبریزی گشت گنج عجائبش مکتوم
که ازاں دم که تو سفر کردی از حلاوت جدا شدیم چو موم
همه شب ہمچو شمع می سوزیم زاتشی جفت و انگبین محروم
در فراق جمال تو ما را جسم ویران جان ہمچون موم
آن عنان را بدین طرب بر تاب رفت کن پیل عیش را خرطوم
بے حضورت سماع نیست حلال ہمچو شیطان طرب شده مرحوم
یک غزل بے تو ہیچ گفته نشد تا رسد آن به مشرقه مفهوم

بس بذوق سماع نامۂ تو غزلی پنج و شش بشد منظوم

شام از نور صبح روشن باد

اے بتو فخر شام و ارمن و روم

ترجمہ:

- بخدا کہ وہ ازل سے ہی موجود ہے، زندہ، دانا، قدرت رکھنے والا اور ہمیشہ قائم رہنے والا۔
- اس کے نور نے عشق کے چراغ جلائے، یہاں تک کہ ہزاروں راز آشکار ہو گئے۔
- اس کے ایک ہی حکم سے سارا جہان بھر گیا، عاشق، معشوق، حاکم اور محکوم سب پیدا ہو گئے۔
- شمس تبریزی کے طلسم میں اس کے حیرت انگیز خزانے چھپے ہوئے ہیں۔
- جب سے تم نے رخصت لی، ہم موم کی طرح اپنی مٹھاس سے جدا ہو گئے۔
- ہم ساری رات شمع کی مانند جلتے ہیں، آگ میں گھرے ہوئے ہیں اور شہد کی مٹھاس سے محروم ہیں۔
- تمھارے حسن کی جدائی نے ہمیں ایسا کر دیا کہ ہمارا جسم ویران ہو گیا اور روح موم کی طرح پگھل گئی۔
- اس لگام کو خوشی کے ساتھ موڑو، تاکہ خوشی کے ہاتھی کا خرطوم راستہ چھوڑ دے۔
- تمھارے بغیر سماع (روحانی رقص) حلال نہیں، جیسے شیطان خوشی سے محروم کر دیا گیا ہو۔
- تمھارے بغیر کوئی غزل مکمل نہیں ہو سکتی، جب تک اس کا صحیح مفہوم مشرق تک نہ پہنچے۔
- تمھارے کلام کے ذوق میں ڈوب کر پانچ یا چھ غزلیں نظم ہو چکی ہیں۔
- رات، صبح کے نور سے روشن رہے، اے وہ ہستی جس پر شام، ارمن اور روم سب فخر کرتے ہیں!

سلطان ولد کی ملاقات جب شمس سے ہوئی تو انھوں نے مذکورہ مکتوب شمس تبریزی کی خدمت میں پیش کیا، تحائف پیش کیے اور قدموں میں گر کر ان سے قونیہ واپس چلنے کی التجا کی، انھوں نے کہا کہ ان کے والد زندگی اور موت کی کشمکش میں ہیں اور بتایا کہ شہر قونیہ کا ہر فرد شرمندہ ہے کہ وہ ان کے لیے تکلیف کا باعث بنے۔ سلطان ولد نے تحائف سے بھرے قافلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ تحائف صرف میرے والد جلا الدین رومی کی طرف سے نہیں بلکہ قونیہ کے ہر فرد کی جانب سے ہیں۔ بہر حال انھوں نے شمس کو اپنے ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ اس سفر میں سلطان ولد نے پورے راستے شمس کو گھوڑے کی پشت پر سوار رکھا اور خود پیدل تمام راستہ طے کیا۔

دوسری بار شمس الدین کی گم شدگی:

مگر چند ہی ہفتوں میں رومی کے خاندان اور ان کے متعلقین پر پچھتاوے اور مایوسی کا احساس غالب آ گیا۔ لوگ کہنے لگے کہ ہمیں چند مزید مہینے انتظار کرنا چاہیے تھا، ہمارے استاد رومی یقینی طور پر شمس کو بھول جاتے۔ شمس کے خلاف دھمکیوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو گیا۔ اس بار، رومی نے شمس کی اپنے گھر میں موجودگی کو قانونی حیثیت دینے کا فیصلہ کیا اور اپنی سوتیلی بیٹی کیمیاؔ کی شادی شمس سے کر دی۔ کیمیاؔ ایک نہایت نفیس، مہذب، اور اشرافیہ گھرانے میں پرورش پانے والی شہزادی جیسی لڑکی تھی۔ اس کی عمر اس وقت تقریباً 12 سال تھی۔ اس دوران رومی کے گھر کا ماحول نسبتاً پر سکون ہو گیا کیونکہ اب شمس خاندان کے ایک قریبی رکن بن گئے تھے۔ لیکن چند ہی مہینوں بعد کیمیاؔ کی اچانک موت ہو گئی، اور اس کے ساتھ ہی شمس اور رومی کی رفاقت کا بھی اختتام ہو گیا اور ایک رات شمس غائب ہوئے تو پھر کبھی رومی سے نہیں ملے۔

شمس کا پر اسرار انجام

شمس کی گمشدگی کے بارے میں کئی قیاس آرائیاں ہیں: ایک نظریہ یہ ہے کہ شمس رات

کی تاریکی میں رومی کو چھوڑ کر واپس اپنی آوارہ زندگی کی طرف چلے گئے، جیسا کہ وہ ہمیشہ سے تھے۔ ایک اور خیال یہ ہے کہ شمس رومی کے سب سے چھوٹے بیٹے اور کیمیا کے سوتیلے بھائی کے ہاتھوں مارے گئے، کیونکہ شمس نے رومی کی بے داغ شہرت کو نقصان پہنچایا۔ ایک قیاس یہ بھی ہے کہ شمس کی گمشدگی ایک کامیاب قتل کی سازش تھی، جو مذہبی گستاخی کے الزامات کے تحت عمل میں لائی گئی۔ ایک اور کہانی یہ کہتی ہے کہ شمس بھارت (اور آج کے پاکستان) چلے گئے اور اس وقت کے چند روحانی شخصیات کے لیے تحریک کا ذریعہ بنے۔

بعض تذکروں میں ہے کہ مولانا کے چند مریدوں نے حسد کی وجہ سے رومی کا قتل کر دیا تھا، جب کہ نفحات الانس میں ہے کہ مولانا کے صاحب زادے علاء الدین محمد نے یہ حرکت کی تھی۔ نفحات الانس میں شمس کی شہادت کا سنہ 645ھ لکھا ہے۔ البتہ سپہ سالار نے جو کہ مولانا کی ہمنشینی میں چالیس برس تک رہے، انھوں نے صرف ان کے غائب ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔

یہ تمام نظریات شمس کے پراسرار انجام کی طرف اشارہ کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کی بھی حتمی تصدیق آج تک ممکن نہیں ہو سکی۔ شمس کا انجام ان کے کردار کی طرح ہی پراسرار رہا۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ قونیہ میں ایک کنویں کے قریب انھیں دفن کیا گیا تھا، لیکن یہ تمام باتیں قیاسی ہیں، حقیقت کا پتہ کسی کو نہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ شمس کی لاش کبھی برآمد نہیں ہوئی، رومی کو کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ شمس کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ یہ سمجھتے رہے کہ ان کا پسندیدہ "پرندہ" دوبارہ کہیں اڑ گیا، لیکن اس بار انعام کا لالچ دینے کے باوجود کوئی خبر نہ آئی۔ انھوں نے شمس کے فوت ہو جانے کے نظریہ کی ہمیشہ تردید کی، اس سلسلے میں ایک رباعی بھی انھوں نے کہی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

کون کہتا ہے کہ وہ لافانی مر گیا؟ کون کہتا ہے کہ امید کا "سورج" مر گیا؟ دیکھو، یہ تو 'سورج' کا دشمن ہے جو چھتوں پر چڑھ آیا ہے، آنکھیں بند کیے چیخ رہا ہے، اوہ، سورج مر گیا۔"

ایک اور مقا پر فرمایا:

"جب تک شمس تبریزی میرے ساتھ تھا، میری روح زندہ تھی۔ جب وہ گیا، تو میری روح میں ایک خلا محسوس ہونے لگا، لیکن اب میں جانتا ہوں کہ وہ خلا دراصل خدا کی موجودگی کا اشارہ ہے۔"

رومی نے 40 دن انتظار کیا، اور جب شمس کی کوئی خبر نہ آئی تو انہوں نے سیاہ لباس پہن لیا اور ہمیشہ کے لیے سیاہ لباس پہنتے رہے۔ انھوں نے شمس کو مردہ قرار دے دیا، لیکن اس کے بعد بھی ان کی یاد اور گہرے اثرات ان کی شاعری اور فکر میں ہمیشہ موجود رہے۔ انھوں نے شمس الدین کی جدائی میں بے شمار اشعار کہے ہم یہاں ایک شعر نقل کرتے ہیں۔

از فراق شمس دین افتادہ ام در تنگنا　　　او مسیح روزگار و درد چشمم بی دوا

(دیوان شمس، غزل:155)

ترجمہ: میں شمس دین کی جدائی میں تنگی میں مبتلا ہوں، وہ دنیا کا مسیحا ہے اور میری آنکھوں کا درد لاعلاج۔

جلال الدین رومی پر شمس الدین تبریزی کا اثر:

شمس اور رومی کے تعلق کی بنیادی وضاحت یہ ہے کہ اگر شمس نہ ہوتے تو رومی کا نام تاریخ میں کبھی محفوظ نہ رہتا۔ شمس وہ کٹھن لیکن ضروری تحریک تھے جنہوں نے رومی کی روحانی اور تخلیقی صلاحیتوں کو مکمل طور پر ابھرنے کا موقع دیا۔ اس عمل میں، رومی ایک عظیم روحانی استاد اور عالمی معیار کے فنکار بن گئے، جن کی تخلیقات آج بھی لوگوں کو متاثر کرتی ہیں۔ دوسری طرف، شمس کو وہ شاگرد ملا جس کی وہ ہمیشہ تلاش میں تھے۔ شمس اور رومی کے درمیان کا گہرا تعلق ایک ایسی محبت کی عکاسی کرتا ہے جو روایتی حدود سے ماورا ہے، جس نے دونوں کی زندگیوں کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ یہ تعلق آخر کار ایک المیہ میں بدل گیا، جہاں شمس کو محبت اور روحانی قربانی کے بدلے اپنی زندگی گنوانی پڑی۔ دونوں کے لیے یہ تعلق ایک ذاتی ضرورت تھی شمس کے لیے ایک مثالی شاگرد کی تکمیل اور رومی کے لیے اپنے روحانی

اور تخلیقی سفر کو عروج تک پہنچانا۔

یہ کہانی ان تمام پہلوؤں کا امتزاج ہے: محبت کی گہرائی، المیے کی شدت، اور ذاتی ترقی کی ناگزیریت۔ شمس اور رومی کے درمیان کا یہ پیچیدہ تعلق، انسانی جذبات، روحانی جستجو، اور فن کے درمیان کے گہرے تعلق کی ایک زندہ تصویر ہے، جو آج بھی دنیا بھر کے قارئین اور مفکرین کے لیے ایک معمہ اور تحریک کا ذریعہ ہے۔

شمس الدین تبریزی کی جدائی نے رومی کو شاعر بنادیا۔ 26000 اشعار پر مشتمل مثنوی معنوی، 300000 اشعار پر مشتمل غزلیات اور کئی سو رباعیات ان کے عشق کے مختلف مراحل کو ظاہر کرتی ہیں، مورخین کے بیان کے مطابق، اس کی شاعری کی بڑا حصہ عالمِ جذب صوفیانہ رقص کی حالت میں کہا گیا، اس حالت میں مولانا کی زبان سے جو بھی اشعار نکلتے مولانا کے قریبی اور چہیتے مرید مولانا حسام الدین چلپی قلم بند کر لیا کرتے تھے۔

دیوان شمس کی وجہ تسمیہ:

رومی نے اپنے پہلے عظیم الشان کارنامے کو شمس الدین تبریزی کے نام سے منسوب کیا۔ پچھلے چند سو سالوں میں رومی کے اس عظیم شاہکار کا نام شمس کے نام پر رکھنے کے کئی وجوہات پیش کی گئی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ رومی بغیر شمس کے شاعر نہ ہوتے، اس لیے اس مجموعے کا نام انھوں نے استاد کے نام پر رکھنا مناسب سمجھا۔ بعض کا کہنا ہے کہ رومی آخر میں خود شمس بن گئے تھے، اس لیے یہ مجموعہ در حقیقت شمس کی زبانی ہے جو رومی کے ذریعے بول رہے ہیں۔

میری ذاتی رائے میں ان دونوں باتوں سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بیش تر قیاسات ایسے افراد کی جانب سے کیے گئے ہیں جو تخلیقی نوعیت کے نہیں ہیں۔ کوئی بھی فنکار جانتا ہے کہ خواہ کسی سے کس قدر تحریک ملے، اصل تخلیق آخر کار تخلیقی فرد کا اپنا اظہار ہوتا ہے۔ ہم سب کسی نہ کسی چیز سے متاثر ہو کر تخلیق کرتے ہیں۔ وہ کسی کو شوق، ماحول، بچپن، ثقافت، پیدا

ہونے کی جگہ، رومانی تجربات، دوسرے فنکاروں، تاریخی واقعات یا قدرتی چیزوں سے متاثر ہو سکتے ہیں۔

رومی نے اپنے استاد کا نام اس مجموعے کے ساتھ منسلک کر کے یہ یقینی بنایا کہ شمس کا نام ان کے ساتھ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ رومی خوب جانتے تھے کہ ان کے شاگرد، اہل خانہ اور مورخین اس پُر پیچ، مشتعل، درویش کو یاد رکھنے میں دلچسپی نہیں رکھیں گے۔ وہ شمس کو رومی کی عیب دار شخصیت کے طور پر دیکھتے تھے۔ رومی نے ہمیشہ کی طرح اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ انھوں نے نہ صرف اس مجموعے کا نام شمس کے ساتھ رکھا، بلکہ شمس کو آخر میں اپنی ہر نظم کے آخر میں تخلص کے طور پر استعمال کیا۔ انھوں نے اپنے جانشینوں کو یقین دلایا کہ ان کے پاس کوئی متبادل نہیں ہو گا مگر شمس کو آگے بڑھانا۔ یہاں تک کہ اگر اس عظیم شاہکار کا عنوان بھی بدل دیا جاتا، تو بھی چند سو اشعار شمس کو تاریخ کی کتابوں سے مٹانے کے قابل نہ ہوتے۔

صلاح الدین زرکوب:

شمس الدین کی جدائی کے برسوں بعد، رومی کو قونیہ کے ایک ان پڑھ صلاح الدین زرکوب سے ملنے کا اتفاق ہوا، یہاں رومی زندگی میں دوسری بار کسی سے متاثر ہوئے اور وہ تھے صلاح الدین زرکوب۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، پیشے سے سنار تھے۔ ایک دن مولانا صلاح الدین زرکوب کی دُکان کی طرف سے گزر رہے تھے، اس وقت زرکوب اپنی دکان میں ہتھوڑی سے سونے پر ضرب لگا رہے تھے۔ اس ضرب کی آواز نے مولانا پر وجد کی کیفیت طاری کر دی اور وہ بازار میں ہی اپنے معروف صوفیانہ رقص کی حالت میں جھومتے جھومتے بے ہوش ہو گئے۔ صلاح الدین زرکوب نے جب یہ حال دیکھا تو حتی المقدور مولانا کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ اس طرح مولانا اور صلاح الدین زرکوب کے درمیان مواخات کا رشتہ قائم ہو گیا۔ بعد میں یہ رشتہ حقیقی رشتہ داری میں بھی تبدیل ہو گیا اور زرکوب کی صاحب زادی فاطمہ کا عقد مولانا کے بیٹے سلطان بہاء الدین ولد سے ہوا۔

صلاح الدین زرکوب سے مولانا کو دلی لگاؤ تھا۔ انھوں نے بارہا ان کی ستائش کی ہے دیوانِ شمس میں ان کے اشعار اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ زرکوب سے مولانا کو کس قدر انس تھا، ملاحظہ فرمائیں:

ای شه صلاح الدین من، ره دان من ره بین من
ای فارغ از تمکین من، ای برتر از امکان من
(دیوان شمس، غزل:1805)

ترجمہ: اے صلاح الدین (میرے دوست)، میرے رہنما، میرے رہبر، اے جو میرے محدودات سے آزاد ہے، اے جو میرے امکانات سے بڑھ کر ہے۔

یہ شعر دوست یا محبوب کے لیے عقیدت کا اظہار ہے۔ شاعر اپنی رہنمائی کے لیے اس ہستی کے سامنے التجا کرتا ہے، جو اس کے محدود وجود سے بالاتر ہے اور جو اس کے دل کی گہرائیوں کو بخوبی جانتا ہے۔

ایک اور مقام پر کہتے ہیں۔

شه صلاح الدین که تو هم حاضری هم غایبی
ای عجوبه واصلم بیا بیا بیا بیا

ترجمہ: اے شاہ صلاح الدین تُو حاضر بھی ہے اور غائب بھی، اے حیرت انگیز اور میری اصل حقیقت، آجا، آجا، آجا، آجا!

مولانا کی صلاح الدین سے ہم نشینی بھی لوگوں کو راس نہ آئی اور ان کے خلاف بھی فتنے پیدا کیے گئے، لیکن جب حریفوں نے دیکھا کہ مولانا کا تعلق ان سے منقطع نہیں ہو سکتا تو اپنی حرکتوں سے بدقت ہزار باز آئے۔ اس طرح مولانا سے ان کا ربط ایک طویل عرصے تک رہا۔ 662ھ چار روز بیمار رہ کر وفات پائی۔ آخری وقت میں مولانا ان کے سرہانے موجود تھے۔ صلاح الدین زرکوب کی وفات نے ان کے دل پر گہرے رنج و غم کے داغ لگائے۔

انھوں نے صلاح الدین کے فراق میں بہت سے اشعار کہے، ایک شعر حسب ذیل ہے ۔

ای ز ہجران در فراقت آسمان نگریستہ
دل میان خون نِشستہ عقل و جان نگریستہ

(دیوان شمس، غزل:2297)

ترجمہ: اے! تیرے فراق میں آسمان بھی آنسو بہا رہا ہے، دل خون میں ڈوبا بیٹھا ہے، اور عقل و جان تیری راہ تک رہی ہیں۔

صلاح الدین زرکوب کی وفات کے بعد، حسام الدین چلپی مولانا کے روحانی محبوب اور نائب بنے۔ رومی کا سب سے اہم کارنامہ "مثنوی معنوی"، انھی کے اثر میں مرتب کیا گیا۔ حسام الدین چلپی نے مولانا کو حکیم عطار نیشا پوری اور حکیم سنائی کے شاعری کے نمونوں کی پیروی کرنے کا مشورہ دیا، جنھوں نے طویل شاعری میں روحانی تعلیمات دی تھیں، جن میں کہانیاں، ضرب المثل، اور کہانیاں شامل تھیں۔ رومی نے حسام الدین کے مشورے پر عمل کیا اور تقریباً 26000 اشعار کہے۔

حسام الدین چلپی:

حسام الدین محمد بن حسن حسام الدین چلپی مولانا جلال الدین رومی کے چہیتے شاگرد خلیفۂ خاص اور جانشین تھے۔ رومی نے مثنوی معنوی انھی حسام الدین کو خطاب کرتے ہوئے اور انھی کی فرمائش پر کہی، غزلوں میں بھی ان کا تذکرہ ملتا ہے، چلپی کا تذکرہ مولانا کے مکتوبات میں بھی ملتا ہے۔

حسام الدین چلپی کی ولادت 622ھ/1225ء میں شہر قونیہ میں ہوئی۔ ان کے خاندان کی جڑیں مغربی آذر بائیجان کے شہر ارومیہ سے تھیں۔ ان کے والد، جو اپنے آباؤ اجداد کی روایت کے مطابق ایک فتوۃ برادری کے رہنما تھے، کے انتقال کے بعد حسام الدین کو ان کی جگہ جانشین کے طور پر تسلیم کیا گیا۔ افلاکی (ص 738-739) نے بتایا کہ حسام الدین

نے اپنے والد کی برادری کو رومی کی جماعت میں لے جاکر ان کے تمام اثاثے بھی منتقل کیے۔

645ھ/1247ء میں شمس الدین تبریزی کے غائب ہونے کے بعد، رومی نے اپنے شاگردوں کو تعلیم دینے میں زیادہ وقت گزارا اور اپنی جماعت کی وقف کی املاک کی انتظامیہ ایک نائب کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا، پہلے نائب صلاح الدین زرکوب منتخب ہوئے۔ ان کے بعد ان کی جگہ پر حسام الدین چلپی فائز ہوئے اور رومی کی وفات تک اس عہدے پر فائز رہے، مثنوی کے اشعار میں حسام الدین پر رومی کے اعتماد کی بھرپور جھلک نظر آتی ہے۔ افلاکی (ص:755) کے مطابق رومی نے حسام الدین کو حضرت ضیاء الدین وزیر کی خانقاہ کا منتظم اعلیٰ بھی بنایا تھا۔

بیان کا جاتا ہے کہ مثنوی شریف کے اولین و آخرین ناقل حسام الدین چلپی ہی ہیں جنھوں نے مولانا سے سن کر پوری مثنوی قلم بند کی۔ 660ھ/1262ء میں جب حسام الدین کی زوجہ کا انتقال ہوا تو یہ سلسلہ کچھ دنوں کے لیے رک گیا، بعد ازاں مثنوی کی تکمیل کا آغاز ہوا، اور حسب سابق حسام الدین نے اسے قلم بند کیا۔

672ھ/1273ء میں رومی کی وفات کے بعد، ان کے شاگردوں اور اہل خانہ نے متفقہ طور پر حسام الدین چلپی کو ان کے جانشین کے طور پر قبول کیا۔ سپہ سالار (ص:146) کے مطابق، شاگردوں کے درمیان حسام الدین اور رومی کے بیٹے سلطان ولد کے درمیان جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا، مگر یہ مسئلہ سلطان ولد نے خود حل کر لیا کہ حسام الدین مجھ سے زیادہ اس منصب کے لائق ہیں۔ بحیثیت جانشین رومی ہی 683ھ/1284ء میں قونیہ میں انتقال فرما گئے۔

قونیہ میں زلزلہ اور جلال الدین رومی کا وصال:

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ 672ھ میں قونیہ میں شدت کا زلزلہ آیا، اور مسلسل چالیس دن تک پے در پے آتا رہا، لوگ حیران و پریشان مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور وجہ دریافت کی تو مولانا نے کہا کہ ”زمین بھوکی ہے لقمۂ تر چاہتی ہے، اور انشاء اللہ کامیاب

ہو گی۔"اسی زمانہ میں مولانا نے یہ غزل لکھی۔

با این ہمہ مہر و مہربانی دل می دہدت کہ خشم رانی
وین جملہ شیشہ خانہ ہا را درہم شکنی بہ لن ترانی
در زلزلہ است دار دنیا کز خانہ تو رخت می کشانی
نالان تو صد ہزار رنجور بی تو نزیند ہین تو دانی
دنیا چو شب و تو آفتابی خلقان ہمہ صورت و تو جانی
ہر چند کہ غافلند از جان در مکسبہ و غم امانی
اما چون جان ز جا بجنبد آغاز کنند نوحہ خوانی
خورشید چو در کسوف آید نی عیش بود نہ شادمانی
تا ہست از او بہ یاد نارند ای وای چو او شود نہانی
ای رونق رزم و جان بازار شیرینی خانہ و دکانی
خاموش کہ گفت و گو حجابند
از بحر معلق معانی

(دیوان شمس، غزل:2729)

ترجمہ:

- اتنی ساری محبت اور مہربانی کے باوجود، دل تجھے اختیار دیتا ہے کہ تو خشم و غضب سے پیش آئے۔
- اور ان تمام شیشہ خانوں کو "لن ترانی" کی صدا کے ساتھ چکنا چور کر دے۔
- دنیا کی بنیاد لرز رہی ہے، کیونکہ تو اپنے گھر سے کوچ کی تیاری کر رہا ہے۔
- ہزاروں نالاں اور بیمار تیری جدائی سے بے حال ہیں، یہ تو خوب جانتا ہے کہ وہ تیرے

بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔

- دنیا رات کی مانند ہے اور تو آفتاب کی مانند، لوگ سب صرف صورت ہیں، جبکہ تو اصل جان ہے۔
- اگرچہ وہ اپنی حقیقت سے غافل ہیں، دنیا کے دھندوں اور غموں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔
- مگر جب جان ذرا بھی جنبش میں آتی ہے، تو وہ نوحہ و ماتم کا آغاز کر دیتے ہیں۔
- جیسے سورج کو گرہن لگ جائے، تو نہ خوشی باقی رہتی ہے اور نہ شادمانی۔
- جب تک تو موجود ہے، لوگ تجھے یاد نہیں کرتے، مگر ہائے افسوس! جب تو اوجھل ہو جائے گا۔
- اے جنگ کی رونق اور بازارِ جاں، گھر اور دکان کی شیرینی!
- خاموش رہو، کیونکہ الفاظ ہی وہ پردے ہیں جو بحرِ معانی کی گہرائیوں کو چھپا دیتے ہیں۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ:

چند روز کے بعد مزاج ناساز ہوا، اکمل الدین اور غضنفر کہ اپنے زمانے کے جالینوس تھے علاج میں مشغول ہوئے لیکن نبض کا یہ حال تھا کہ ابھی کچھ ہے ابھی کچھ ہے، لوگوں نے سمجھا کہ اب کوئی دن کے مہمان ہیں۔

بیماری کی خبر عام ہوئی تو تمام شہر عیادت کے لیے ٹوٹا شیخ صدر الدین جو شیخ محی الدین اکبر کے تربیت یافتہ تھے، عیادت کے لیے تشریف لائے، اس وقت مولانا نے فرمایا کہ عاشق اور معشوق میں بس ایک پیرہن کا پردہ رہ گیا ہے۔ آپ نے وصیت فرمائی کہ جنازہ کی نماز مولانا صدر الدین پڑھائیں گے۔ بالآخر 5/ جمادی الثانی 672ھ کو یہ آفتاب غروب ہو گیا، مگر اپنے عشق کی شعاعوں کو رہتی دنیا تک کے لیے چھوڑ گیا۔

مولانا شبلی کہتے ہیں کہ:

رات کو تجہیز و تکفین کا سامان مہیا گیا گیا صبح کو جنازہ

اٹھا، بچے، جوان، بوڑھے، امیر، غریب، عالم جاہل ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے آدمی جنازہ کے ساتھ تھے اور چیخیں مار مار کر روتے جاتے تھے، ہزاروں آدمیوں نے کپڑے پھاڑ ڈالے عیسائیوں اور یہودیوں تک جنازہ کے آگے آگے انجیل اور توریت پڑھتے اور نوحہ کرتے جاتے تھے۔ بادشاہ وقت جنازہ کے ساتھ تھا، اس نے ان کو بلا کر کہا کہ تو تم کو مولانا سے کیا تعلق؟ بولے کہ یہ شخص اگر تمھارا محمد تھا تو ہمارا موسیٰ اور عیسیٰ تھا، رش کا وہ عالم تھا کہ صبح کا نکلا جنازہ بدقت ہزار شام تک جنازہ گاہ میں پہنچا، مولانا شیخ صدر الدین نماز جنازہ پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے لیکن چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے، جب طبیعت کسی طرح نہ سنبھلی تو قاضی سراج الدین نے نماز پڑھائی۔ پورا شہر جنازے میں شریک تھا۔ دور دراز کے علاقوں سے چل کر آنے والے مردانِ خدا بھی کثیر تعداد میں موجود تھے۔ انتقال کے بعد بھی لوگ مسلسل مزار شریف پر حاضر ہوتے اور دعائیں کرتے تھے، انتقال کے چالیس دن بعد تک مزار شریف پر کثیر ہجوم ہوتا اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

سخنِ مولانا

علامہ محمد تقی جعفری تفسیر المثنوی کی چوتھی جلد میں لکھتے ہیں:

”جلال الدین اسلامی ثقافت کے باغ میں ایک زرخیز درخت تھا اور اس نے اسلام کی پائیدار ثقافت کی تعمیر کی اور

اس ابدی دین کو انسان بننے کے لیے ضروری اور کافی سمجھا۔
اس کا عقیدہ تھا کہ ایک شخص اسلامی ثقافت کو سیکھ کر اس پر عمل
پیرا ہو کر اپنی شخصیت کو ''انا اللہ وانا الیہ راجعون'' کی منزل تک
پہنچا سکتا ہے۔ جلال الدین نے اپنے بہترین افکار اور بصیرت
میں بہت سے حقائق اور سچائیوں کا فارسی زبان میں اظہار کیا
اور ان کی فکر و فہم کی عظمت اور اس یقین میں کوئی شک نہیں
کہ وہ انسانی ثقافت کی تاریخ کے نادر آدمیوں میں سے ہیں''۔

رومی کا اسلوب ان کے عہد کے عام اسلوب سے ہٹ کر ہے، ان کی غزلیات کا موضوع بھی زیادہ صوفیانہ ہے۔ وہ اپنی شاعری میں مصنوعیت سے گریز کرتے ہیں اور عمومی شعری معیارات کی پاس داری بھی نہیں کرتے، انھوں نے اپنی غزلیات میں وہی الفاظ اور تشریحات استعمال کی ہیں جو ان کے ذہن میں معنی کے اظہار کے لیے آئیں۔ ان کی شاعری اس حقیقت کا اظہار یہ ہے کہ جب تک روح تعصب اور وہم کے کردار سے پاک نہیں ہو جاتی، وہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ حالاں کہ یہ معانی دوسرے صوفیا کے یہاں بھی ملتے ہیں، مگر اسلوب کی جو ندرت رومی کے یہاں ہے وہ کسی اور کے یہاں نہیں ہے۔

رومی کے بارے میں دلچسپ بات ان کا طرز زندگی ہے۔ ان کا طرز زندگی ان کی شاعری سے بہت ہم آہنگ ہے جب کہ بہت سے شاعروں اور فلسفیوں کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ رومی کی مقبولیت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی زندگی پر بھی توجہ دی جا سکتی ہے اور اس سے تحریک حاصل کی جا سکتی ہے۔ رومی حقیقت کے پیغامبر تھے، ان کی بصیرت نہایت واضح تھی، وہ ایک عظیم طاقت کے مظہر تھے۔ یہ سمجھنا ضروری ہے کہ ان کی بے پناہ عالمی مقبولیت ان کی منفرد اور نہایت حقیقی شخصیت کی وجہ سے ہے۔ رومی کوئی کمزور اور خاموش شاعر نہیں تھے جو کسی کٹیا میں بیٹھ کر لوگوں کو خوش کرنے کے لیے شعر

کہتے ہوں۔ رومی کی شخصیت مکمل جادوئی تھی، ایک آزاد روح کا اظہار جو جمود، پرانے سماجی اصول، فرسودہ ثقافتی پابندیاں، گھسے پٹے مذہبی خیالات اور غلامانہ ذہنیت کو چکنا چور کرتی تھی۔

علما کا ایک گروہ مولانا کی شخصیت اور ان کے افکار کا جائزہ ابن عربی کے افکار کی بنیاد پر کرتا ہے، لیکن یہ کہنا ضروری ہے کہ مولانا کی فکری بنیادوں میں موجود شواہد اور درستگی کے مطابق اس عظیم ایرانی شخصیت کے کام محبت اور جنون کے درمیان ایک نتیجہ خیز مجموعہ ہیں۔

رومی کا خیال ہے کہ عالمِ بالا کی طرف اپنے عروج کے قوس میں، انسان کو خالص نیکی کو اپنانا چاہیے، خوبصورتی سے پیار کرنا چاہیے، اور اپنے آپ کو اس حد تک محبوب کی صفات میں غرق کر دینا چاہیے جس حد تک وہ کر سکتا ہے۔

کائنات کے بارے میں رومی کے خیال میں، محبت اور ادراک کے دو اہم اجزا علم کے دیگر شعبوں سے زیادہ نمایاں ہیں۔ اس طرح کے رومانوی نظارے میں خدا کے وجود میں خالص اچھائی اور لامحدود کشش ظاہر ہوتی ہے اور پورا وجود خالق اور مخلوق کے درمیان پیار و محبت کا ایک متحرک منظر سمجھا جاتا ہے۔

رومی کی شاعری میں ایک لامحدود اور روحانی جذبے کے ساتھ تمام ناممکن چیزیں ممکن ہیں اور تمام دکھوں، خوشیوں اور تمام دردوں کو سکون میں بدل دیا گیا ہے۔ ان کے سر میں محبت کا جذبہ ہے اور یہ ناقابل فہم جذبہ بعض اوقات مختلف رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ گویا کسی ایک نکتے پر توجہ دینے اور سوچ کو ایک چیز پر مرکوز کرنے سے ایک قسم کی ''خود فراموشی'' ہوتی ہے۔ ان کی زبان میں غزلیات کی رعنائی اور جذبہ محبت زیادہ نمایاں ہے۔ رومی کے دیوان میں عاشق کے اوصاف کی ہمہ جہت، تضاد اور ہمہ گیریت ان کی اندرونی کیفیتوں اور مدہوشیت کا ثبوت ہے۔ رومی کی شاعری میں عشق کے موضوع پر ہم آگے گفتگو کریں گے، فی الحال ہم زادہ مناسب یہ سمجھتے ہیں کہ سب سے پہلے کلامِ رومی میں شمس الدین تبریزی کے ذکر دل پذیر کی چند جھلکیاں اپنے قارئین کے سامنے پیش کر دی:

کلامِ رومی میں ذکرِ تبریزی:

مولانا نے مثنوی میں فرمایا:

مولوی ہرگز نہ شد مولاے روم
تا غلامِ شمس تبریزی نہ شد

(مثنوی معنوی دفترِ اول، شعر:1445)

ترجمہ: یہ مولوی کبھی مولاے روم نہ ہوتا اگر وہ شمس تبریزی کا غلام نہ ہوتا۔

مولانا رومی کی غزلیات میں شمس تبریز کا ذکر ان کے عشق، عرفانی تجربات اور روحانی تعلیمات کا مرکز ہے۔ شمس کے ساتھ رومی کی ملاقات نے ان کی زندگی اور شاعری میں ایک گہرا انقلاب برپا کیا۔ دیوانِ شمس تبریز (دیوانِ کبیر) میں شمس کو نہ صرف بطورِ مرشد بلکہ محبوبِ حقیقی اور عشقِ الٰہی کے مظہر کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ رومی کے کلام میں شمس کو ایک ایسا نورانی وجود قرار دیا گیا ہے جو ان کے اندرونی پردوں کو ہٹا کر حقیقتِ مطلقہ کے مشاہدے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ شمس ان کے لیے ایک ایسے آئینے کا کردار ادا کرتا ہے جس میں رومی اپنی روحانی حقیقت کو دیکھتے ہیں۔ رومی کے نزدیک شمس ایک ایسا مرشد ہے جو انہیں روحانی بلندیوں تک پہنچاتا ہے۔ وہ شمس کو اپنے قلب کی روشنی اور اپنے عرفانی سفر کا رہبر سمجھتے ہیں۔ رومی کے کلام میں شمس کی یاد عشقِ الٰہی کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ وہ شمس کو ایک ایسے محبوب کے طور پر دیکھتے ہیں جس کے ذریعے وہ خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ شمس کے ساتھ ان کی وابستگی کسی عام انسانی تعلق سے بڑھ کر عشقِ حقیقی کی شکل اختیار کر جاتی ہے۔

شمس کی جدائی نے رومی کی شاعری کو گہرے درد اور جذبات سے بھر دیا۔ شمس کے چلے جانے کے بعد ان کی غزلیات میں جدائی اور فراق کا رنگ نمایاں ہوا، جو عرفانی گہرائی کا مظہر بھی ہے۔ رومی کی نظر میں شمس تبریز ظاہری دنیا سے ماورا ایک روحانی رہنما تھے۔ ان کی شخصیت مولانا کے عرفانی سفر کی بنیاد بنی۔ شمس کے ذریعے مولانا نے خدا کے جمال کا مشاہدہ

کیا اور ان کے ذریعے خود کو پہچاننے کی راہ ہموار کی۔ ان کے نزدیک شمس کی موجودگی اور غیر موجودگی دونوں حقیقت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ وہ شمس کو ہر جگہ اور ہر شے میں محسوس کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شمس ان کے لیے ظاہری طور پر ایک انسان اور باطنی طور پر خدا کے قرب کا ذریعہ ہیں۔

انھوں نے رومی کی شاعری میں شمس کو اکثر ایک راز کی طرح پیش کیا گیا ہے۔ وہ اشاروں، کنایوں، اور مخفی انداز میں شمس کی عظمت بیان کرتے ہیں تاکہ ان کی روحانی حقیقت صرف ان لوگوں پر آشکار ہو جو معرفت رکھتے ہیں۔

ہم نے دانستہ مثالیں دینے سے گریز کیا ہے، آئندہ کسی جلد میں ہم شمس الدین تبریزی کے تئیں مولانا کی عقیدت کیشیوں کا تفصیلی تذکرہ کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

حسن و جمال کی کار فرمائیاں:

الوہی حسن و جمال تصوف کے عقائد میں سے ایک ہے اور یہ حدیث نبوی ”ان اللہ جمیل ویحب الجمال“ کا آئینہ دار ہے۔ شاہ نعمت اللہ ولی نے اپنی شاعری میں اس حدیث کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

او جمیل است و دوست دار جمال
دوستدار جمال خود بہ کمال

(دوبیتی، شمارہ: 35)

یعنی اللہ نہ صرف خود جمیل (خوبصورت) ہے بلکہ حسن و جمال کو پسند بھی کرتا ہے، اور خود جمال کو کمال کے ساتھ پسند کرتا ہے۔

جمال خداوند، لطف و رحمت کے اوصاف اور وہ غیبی الہام ہے جو سالک کے دل میں داخل ہوتا ہے۔ مولانا انسان اور اس کی ذریت کو جمالِ الٰہی کا آئینہ سمجھتے ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ خدا کی خلافت اور جانشینی کے اعتبار سے انسان کو تمام صفاتِ حق کا حامل ہونا چاہیے۔

جمال کو معشوق کے کمالات کے اظہار کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے، جو عاشق کی رغبت کو بڑھانے کے لیے ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا کے عقیدے کے مطابق، یار کا حسن و جمال ہر حسن و جمال سے برتر اور اعلیٰ ہے، اور دنیا کے حسن و جمال اسی کے حسن کا سایہ ہیں:

جان و جمال روح بسی خوب و بافر است
لیکن جمال و حسن تو خود چیز دیگر است

(دیوان شمس، غزل:449)

یہ شعر اس بات کی عکاسی کرتا ہے کہ مادی یا روحانی حسن اپنی جگہ پر شاندار ہے، لیکن محبوب یا معشوق کا حسن ان تمام چیزوں سے کہیں بڑھ کر ہے، جو کسی اور چیز سے موازنہ نہیں رکھتا۔

دیگر مثالیں ملاحظہ فرمائیں، فرماتے ہیں کہ دوست کا حسن و جمال وہی جمال الٰہی ہے جو دلوں کا قبلہ او جان کا قرار ہے۔

بدان جمال الٰہی کہ قبلۂ دل ہاست
کہ دم بہ دم ز طرب سجدہ می برد جانت

(دیوان شمس، غزل:486)

ترجمہ: اس الٰہی حسن کو جان لے جو دلوں کا قبلہ ہے، جو ہر لمحہ خوشی سے تیری جان کو سجدے پر مجبور کرتا ہے۔

یہ شعر خدا کے جمال کی عظمت کو بیان کرتا ہے، جو دلوں کی توجہ کا مرکز ہے اور اس کا حسن و جلال روح کو ہر لمحہ شکر اور عبادت کی طرف راغب کرتا ہے۔

اس کا حسن وفاداری ہے حالاں کہ وہ وفا نہ کرے۔ مولانا کہتے ہیں ؎

عشقش شکر بس است اگر او شکر نداد
حسنش ہمہ وفاست اگر او وفا نکرد

(دیوان شمس، غزل:861)

ترجمہ: اس کی محبت خود شکر ہے، چاہے وہ اور شکر نہ بھی دے، اس کا حسن سراسر وفا ہے، چاہے وہ وفا نہ بھی کرے۔

یہ شعر محبوب یا معبود کی محبت اور حسن کی لامحدودیت کو بیان کرتا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اس کی محبت اور حسن اپنی ذات میں اتنے کامل ہیں کہ کسی اور نعمت یا وعدے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

مولانا کہتے ہیں ؎

چون آینہ نقش خود زدایيم
چون عکس چنان جمال خواہیم
(دیوان شمس، غزل:3165)

ترجمہ: جب ہم آئینے کی طرح اپنے نفس کے نقوش مٹا دیں، تب ہم اس عکس کی طرح اس عظیم جمال کے خواہاں ہوں گے۔

یہ شعر خودی کو ختم کر کے حقیقی حسن وجمال (اللہ یا معشوقِ حقیقی) تک پہنچنے کا پیغام دیتا ہے۔ آئینہ خود کچھ نہیں دکھاتا، جب تک اس میں کوئی عکس نہ ہو۔ اسی طرح انسان کو اپنی انا اور خود پسندی کو مٹانا ہوگا تاکہ حقیقی حسن کی جھلک اس کے دل میں ظاہر ہو سکے۔

رومی نے دیوان شمس میں تقریباً 179 مرتبہ "جمال" کا ذکر کیا ہے اور "حسن" کا ذکر 148 مرتبہ کیا ہے، مجموعی طور پر انہوں نے یہ صفات اپنے عاشق کے لیے تقریباً 327 مرتبہ استعمال کی ہیں جو کہ ایک قابل ذکر تعداد ہے۔

تصوف اور عشق:

اسلامی تصوف تیسرے ہجری میں خشک زہد اور دنیا سے بے اعتنائی کے خول سے باہر نکل آیا اور عام لوگوں کے درمیان زیادہ پھیل گیا۔ اس کے بعد عرفان کی تعلیمی اہمیت بڑھ گئی۔ عام لوگوں کے لیے صوفیانہ تعلیمات اور تجربات کو بیان کرنا ایک خاص طرز بیان کا تقاضا

کرتا ہے، جو نہ صرف کہنے والے کو اپنے تجربات کی حقیقت بیان کرنے میں مدد دے بلکہ سامعین کے لیے ان تصورات کو سمجھنا بھی ممکن بنائے۔ حکایت اور تمثیل کا فروغ اسی مقصد کے تحت ہوا۔ تمثیل کا کردار مشکل بات کو آسان بنانا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ انتزاعی (تجریدی) تصورات کو بیان کرنے کے لیے جاندارانہ تصویریں تخلیق کرنا کہنے والے کے لیے معاون ثابت ہوتا ہے۔

اسلامی عرفان میں سب سے زیادہ تکرار ہونے والے تصورات میں سے ایک ''محبت'' ہے، جو اپنے ارتقائی سفر میں ''عشق'' میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ایسے اوصاف کو قبول کرتی ہے جو عارف کے اندرونی احوال کو عشق کے ساتھ اس کے تعلق میں ظاہر کرتے ہیں۔ عشق کی ابتدائی تصویریں (پانچویں صدی ہجری سے پہلے کی) زیادہ تر تشبیہ کے ذریعے پیش کی گئی ہیں، اور ہر صوفی کا عشق کے بارے میں تصور، عشق کے اس کے ساتھ مخصوص رویے کا مرہون منت ہے۔

عشق مولانا جلال الدین رومی کے دیوان غزلیات شمس میں بنیادی محرک ہے۔ مولانا کوشش کرتے ہیں کہ عشق کو اس طرح بیان کریں جیسا کہ انھوں نے خود اسے محسوس کیا۔ اسی لیے وہ اپنی منفرد اور انتزاعی تجربات کو عام انسانوں کی مادی زندگی اور ان کے عمومی تجربات سے جوڑ کر قابل فہم بناتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے مولانا زبان کی تمام تر صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں، اور ان میں سب سے نمایاں اور موثر تکنیک (Personification) ہے۔

جو عشق، غزلیات شمس میں ایک ذی شعور وجود کے طور پر ظاہر ہے، اس تجزیے کی بنیاد مولانا کا عشق کے مظاہر اور ان مراحل کی تفہیم ہے جن میں عشق، ایک جاندار وجود کے طور پر، اپنے اوصاف عاشق پر القا کرنے کے لیے طے کرتا ہے۔

عشق کی تشخیص و جاندار سازی:

سب سے پہلے ہم یہاں عشق، غزلیات شمس اور تشخیص و جاندار سازی پر مبنی مقالات

اور تحقیقی مقالوں میں سے کچھ اہم تحقیقات کا خلاصہ درج کریں گے۔

لیلاولی زادہ پاشا(1397) -

اپنی ڈاکٹریٹ کے مقالہ "باز تاب مفہوم عشق در غزلیات شمس و قرآن کریم با رویکرد استعارہ شناختی" میں لیلاولی زادہ پاشا نے مولانا کی غزلوں میں موجود استعاراتی تصور "عشق" اور اس سے متعلقہ خوشوں کا تجزیہ کیا اور اسے قرآن کریم سے موازنہ کیا۔ اس تحقیق کا مقصد مولانا کی فکری دنیا اور ان کی قرآنی کائنات بینی کو بہتر طور پر سمجھنا تھا۔ اس مطالعے کا نتیجہ یہ ہے کہ استعارات قرآن اور مولانا کی غزلوں کے کلام میں ہر جگہ موجود ہیں اور انتزاعی تصورات کو سمجھانے کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ تحقیق یہ ظاہر کرتی ہے کہ استعاراتی تصور "خداوند، معشوق ہے" مولانا کے پورے کلام کی گہرائی میں نمایاں ہے۔ مولانا اس تصور کو "ہدایت، قدرت، صحت، خوبصورتی، تخلیقیت، اور تباہی" جیسی استعارات کے ذریعے بیان کرتے ہیں اور ان کے ذریعے خدا کے معشوق ہونے کو واضح کرتے ہیں۔

زرکانی و دیگران(1394) -

مقالہ "تطور استعارۂ عشق از سنایي تا مولانا "میں زرکانی اور ان کے ساتھیوں نے سنایي، عطار، اور مولانا کے تصور عشق کا تجزیہ کیا۔ اس کا مقصد ان تینوں شخصیات کی "عشق" کی استعارات کے استعمال میں جدت اور ان کے نظریات کی تبدیلیوں کو ظاہر کرنا تھا۔ یہ تحقیق استعاراتی علمیات کے نظریے پر مبنی ہے، جس میں عشق کے تصور میں وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلیوں کو دکھایا گیا ہے۔ استعارات کے تجزیے میں، ان کے سنائی سے پہلے کے منابع کا جائزہ لیا گیا، اور پھر انہیں ادراکاتی زاویے سے تحلیل کیا گیا، تاکہ سنائی سے مولانا تک عشق کی استعاراتی ارتقا کا سفر واضح کیا جا سکے۔

زرکانی و دیگران(1392) -

مقالہ "تحلیل شناختی استعارہ ہای عشق در غزلیات سنایي" میں، ادراکاتی استعاراتی

نظریے کی بنیاد پر سنائی کی غزلوں میں عشق سے متعلق استعارات کا تجزیہ کیا گیا۔ اس تحقیق میں پہلے سنائی کی غزلوں میں موجود عشق کے استعارات کی تفصیل پیش کی گئی، جنہیں مضمون کی بنیاد پر تین اقسام میں تقسیم کیا گیا:

- عشق کی واضح تصویر پیش کرنے والے استعارات
- عشق کی منفی صفات والے استعارات
- اور دوہرے معنی رکھنے والے استعارات

پھر، ان گروہوں کا ادراکاتی تجزیہ کیا گیا اور سنائی کے بلاغی حربوں کا جائزہ لیا گیا۔ تحقیق کے نتائج سے معلوم ہوا کہ سنائی، ان الفاظ کو اہمیت دے کر جو اپنے دور کی غالب آئیڈیالوجی میں منفی سمجھے جاتے تھے، اس آئیڈیالوجی کو چیلنج کرنا چاہتے تھے۔ وہ ایسی استعارات تخلیق کرتے تھے جو حقیقت کے بعض پہلوؤں کو نمایاں اور بعض کو پوشیدہ کرتے تھے، تاکہ اپنی پسندیدہ آئیڈیالوجی کو فروغ دے سکیں۔

داورپناہ (1381) -

مقالہ ”شخصیت بخشی بہ مفاہیم انتزاعی در غزلیات شمس“ میں، داورپناہ نے دیوان کبیر میں موجود ان تصورات اور معانی کا تجزیہ کیا جنھیں شخصیت دی گئی ہے اور ان کا روحانی احوال، جذبات، اور شاعر کے صوفیانہ تجربات سے تعلق کا مطالعہ کیا۔ تحقیق کے مطابق، عشق، عقل، غم، دل، اور جان وہ تصورات ہیں جو دیگر مفاہیم کے مقابلے میں زیادہ شخصیت یافتہ ہیں۔ ان پر انسانی افعال کی نسبت انسانی صفات اور اعضا سے زیادہ ہے، جو ظاہر کرتی ہے کہ مولانا کے نزدیک روحانی تصورات نہ صرف حقیقی اشیا سے مختلف نہیں بلکہ بعض اوقات زیادہ واضح اور محسوس ہوتے ہیں۔ یہ مولانا کی ان تصورات کے ساتھ گہری قربت اور مریدوں کے ساتھ انس کا عکاس ہے۔ اس شخصیت بخشی کا مقصد محض کلام کو سجانا نہیں، بلکہ کلام کی اصل ذات اور شاعر و قاری کے درمیان معنی اور مقصد کے بیک وقت اظہار کو ممکن بنانا ہے۔

موجودہ تحقیق اور دیگر تحقیقات میں فرق:

اس موجودہ تحقیق کو دیگر تحقیقات سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ عشق کے تصور کو ایک ذی شعور وجود کے طور پر جاندار بنانے اور اس کے رویوں کے تجزیے پر زور دینا ہے۔ محققین نے مولانا کے عشق کے تصور اور اس کے مظاہر کو، خاص طور پر غزلیات شمس میں، ترتیب دیا ہے۔ انہوں نے عشق کی مختلف خصوصیات کی ظاہر ہونے کی ترتیب اور ان کی تکرار کا تجزیہ کیا ہے، جو مولانا کے ذاتی تجرباتِ عشق کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

تحقیقی طریقۂ کار:

یہ تحقیق کتابی ذرائع کے طریقہ کار پر مبنی ہے۔ اس میں غزلیات شمس کے منتخب متون، جو محمد رضا شفیعی کدکنی کی انتخاب اور تصحیح کردہ ہیں، کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان تمام اشعار کو نکالا گیا جن میں عشق کو واضح طور پر ایک جاندار وجود کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

بعد ازاں، مولانا کے عمومی تصور، جو ان کی دیگر تصانیف خصوصًا مثنوی معنوی میں عشق کے انسان پر ظاہر ہونے کے بارے میں بیان ہوا ہے، کی بنیاد پر ان مظاہر کو درجہ بندی کی گئی۔ مولانا کے مطابق، عشق انسان پر ابتدا میں اپنی سختیوں اور شدتوں کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے، اور جو ان امتحانات میں کامیاب ہوتا ہے، وہ آہستہ آہستہ عشق کی خوبصورتیوں سے آشنا ہوتا ہے۔

اسی بنیاد پر، مستخرج تصورات کو تین بنیادی اقسام میں تقسیم کیا گیا:

- صفات قہری – شدت اور سختی کی صفات
- صفات مہری – محبت اور نرمی کی صفات
- صفات زائشی – پیداواری یا تخلیقی صفات

ہر قسم کے لیے ذیلی شاخیں متعیّن کی گئیں، اور ہر تصویر اور اس سے متعلق صفات کی

تکرار (بسامد) نکال کر درج کی گئیں۔

اس تحقیق میں ان صفات کی تلاش کی گئی ہے جن میں عشق کسی فرد پر متجلی ہوتا ہے۔ لہٰذا، ان تمام مثالوں کو نظر انداز کیا گیا جہاں عشق محض مخاطب کیا گیا ہو یا اس کے انسانی اجزا کا ذکر ہو۔ کیونکہ ان اشعار میں، اگرچہ عشق کو جاندار تصور کیا گیا ہے، لیکن وہ صفات جو تحقیق کے دائرہ کار میں آتی ہیں، ان کا ذکر موجود نہیں ہوتا۔

نظریاتی بنیادیں:

محبت کے تصور کی اولین جھلکیاں دیکھنے کے لیے ہمیں دوسری صدی ہجری میں جانا ہوگا، جہاں رابعہ عدویہ نے محبت کو خدا کے علاوہ کسی اور کے لیے ناممکن قرار دیا۔ محبت کو تصوف کی بنیاد کے طور پر پیش کیا گیا، اور تصوف کے اس مفہوم نے وقت کے ساتھ ترقی کرتے ہوئے محبت کو ایک ذاتی اور شعوری تعلق میں تبدیل کیا۔

پانچویں صدی ہجری تک، محبوب حقیقی کی محبت کے تصور نے نئی معنوی تصویریں تخلیق کیں جو محبت کو مزید تخیلاتی اور جاندار بنا گئیں۔ محبت، جو قرآن میں ایک پاکیزہ اور خاص معنوی تصور تھا، وقت کے ساتھ عشق کی صورت اختیار کر گئی، جو کہ خالق اور مخلوق کے درمیان محبت کے تعلق سے متاثر ہوا۔ چھٹی صدی ہجری میں یہ تصور اپنی تکمیل کو پہنچا، اور عشق صوفیانہ ادب میں ایک مرکزی حیثیت حاصل کر گیا، جس نے ادب کی لطافت اور گہرائی کو کئی گنا بڑھا دیا۔

تصوف کی تعلیمات جب زاہدانہ حلقوں سے باہر نکل کر عوام الناس میں مقبول ہوئیں (تیسری صدی ہجری میں)، تو ان کا مقصد محض روحانی تربیت سے آگے بڑھ کر تعلیمی پہلو بھی اختیار کر گیا۔ اس عوامی مقبولیت کے باعث صوفیانہ بیانیہ میں تبدیلیاں آئیں، اور مشکل صوفیانہ تجربات کو سمجھانے کے لیے مختلف اسالیب اور بیانیوں کا استعمال کیا گیا۔

خیالی تصویروں کا کردار:

تصوف میں خیالی تصویریں نہ صرف کلام کی آرائش اور جذباتی اثر بڑھانے کا ذریعہ ہیں بلکہ مفاہیم کو واضح اور قابل فہم بنانے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ جب صوفیانہ تجربات اور روحانی حقائق کو بیان کرنا ہو، تو خیالی تصویریں سننے والے کے ذہن کو ان تجربات کے قریب لے جاتی ہیں۔ یہ خاص طور پر اس وقت زیادہ ضروری ہوتا ہے جب باتیں ایسی ہوں جنہیں عام زبان میں بیان کرنا مشکل یا ناممکن ہو۔

شخصیت بخشی (جاندار نگاری):

خیالی تصویروں کے اس مجموعے میں، شخصیت بخشی ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ شخصیت بخشی، نہ صرف قاری کے لیے تفہیم کو آسان بناتی ہے بلکہ شاعر یا مصنف کے لیے بھی اپنے ذاتی تجربات کو بیان کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جیسا کہ مختلف ادوار میں مشاہدہ کیا گیا ہے، انسان اپنے اردگرد کی دنیا سے قربت پیدا کر کے اپنے خیالات کو بہتر انداز میں بیان کر سکتا ہے۔

فلسفی کاسیرر کے مطابق، جب انسانی عقل تخیل کے ابتدائی اثرات کو پس پشت ڈالتی ہے، اور خرد کو ترجیح دیتی ہے، تو شخصیت بخشی اساطیری خیالات کی جگہ لے لیتی ہے۔ اس تصور کی جڑیں اسٹوئک فلسفہ سے جا ملتی ہیں، جو معنوی تصورات کو استعاروں کے ذریعے بیان کرتا ہے، جنہیں کبھی کبھی شیطانی قوتوں کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے۔

شخصیت بخشی اور استعارہ مکنیہ:

شخصیت بخشی، استعارہ مکنیہ تخیلیہ یا مجازی نسبت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہے۔ یہ ادبی تکنیک مغربی ادبا کے نزدیک ان معنوی یا غیر جاندار اشیا کو انسانی صفات سے مزین کرنے کا عمل ہے، جو ایک جاندار کی مانند عمل کرتے ہیں۔

اس تصور کو جدید عرب ناقدین نے ''تشخیص'' کا نام دیا ہے، اور شفیعی کدکنی کے

مطابق یہ ایک ایسا ادبی حربہ ہے جو اشیا یا مجردات کو انسانوں کی طرح دکھانے کا تاثر دیتا ہے۔ تاہم، قدیم بلاغت کے ماہرین نے اس صنعت کو الگ سے نہیں، بلکہ استعارہ مکنیہ کے ذیل میں بیان کیا ہے۔

شخصیت بخشی کا ادبی پس منظر:

شمس قیس رازی، جو بلاغت اور شاعری کے اصولوں پر گہری نظر رکھتے تھے، شاید پہلے لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے استعارے کی وضاحت کے دوران شخصیت بخشی کے حوالے سے واضح مثالیں پیش کیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "اور دیگر اقسامِ مجاز میں سے وہ جو شاعری کے لیے خاص ہے اور صرف منظوم کلام میں استعمال ہوتا ہے، وہ غیر جاندار اشیا اور جانوروں کے ساتھ مکالمہ ہے، جیسے کہ تلوار اور قلم کی گفتگو، شمع اور چراغ کی بات چیت، پھول اور بلبل کی مناظرات، اور کھنڈرات، ہواؤں، ستاروں وغیرہ کی مخاطبات۔"

اگر ہم قدیم علما کے استعارہ مکنیہ پر دیے گئے شواہد کا بغور جائزہ لیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ استعارہ مکنیہ اکثر شخصیت بخشی کے قریب تر ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ یہ دائرہ انسانوں کے علاوہ جانوروں تک بھی پھیل جاتا ہے۔

شخصیت بخشی میں ارتقا:

ابتدائی شاعری میں شخصیت بخشی زیادہ تر محسوساتی دنیا اور ان چیزوں تک محدود تھی جو پانچ حسیات کے ذریعے سمجھ میں آسکتی تھیں۔ تاہم، جیسے جیسے شاعری اور شعری تفکر میں ترقی ہوئی، اور شاعروں کو پیچیدہ خیالات اور علامتی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی، شخصیت بخشی اور استعارہ مکنیہ کا دائرہ طبیعاتی دنیا سے باطنی دنیا اور غیر مرئی عناصر تک وسیع ہو گیا۔

تصوف اور شخصیت بخشی کا امتزاج:

عرفان کے پھیلاؤ کے ساتھ، وہ شعرا جو صوفیانہ مسلک رکھتے تھے، اپنے نفسانی تجربات اور روحانی مشاہدات کو بیان کرنے کے لیے کلمات اور معنوی تصورات کو جاندار بنانے سے غافل نہیں رہے۔ انھوں نے شخصیت بخشی کو مبالغے کے ساتھ استعمال کیا تاکہ تصوف کے طریقے کو عام کیا جاسکے اور اس کی تعلیم کو عام فہم بنایا جاسکے۔ ایسے شاعروں کے کلام میں شخصیت بخشی ایک اہم عنصر کے طور پر نظر آتی ہے۔

یہ ارتقائی عمل اس بات کا مظہر ہے کہ شاعری، خاص طور پر صوفیانہ شاعری، نہ صرف فطرت کی عکاسی تک محدود تھی بلکہ اسے انسانی تجربات، باطنی کیفیات، اور ناپیدا عناصر کی ترجمانی کے لیے بھی استعمال کیا گیا۔ یہ شاعری انسان اور ماورائی حقیقت کے درمیان رابطے کو بیان کرنے کے لیے شخصیت بخشی کے فن کو بروئے کار لاتی ہے۔

دیوان شمس میں عشق کی تصویر:

عشق، تصوف کے سب سے پیچیدہ اور مرکزی تصورات میں سے ایک ہے، اور ہر شاعرِ عارف اپنی عاشقانہ تجربات، عشق کے رویوں اور اس کے اثرات کو بیان کرنے کے لیے بہترین اور گہری تصویریں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ رجحان سنائی کی شاعری میں، جو تصوف کو باضابطہ طور پر شاعری میں متعارف کروانے والے ہیں، بہت نمایاں ہے۔ وہ عشق کو "عروسِ عشق"، "لشکرِ عشق" اور "دایۂ عشق" جیسی تصویروں سے بیان کرتے ہیں۔ یہ تصور عطّار کی شاعری میں مزید پختہ ہوا، جہاں عشق کو "طرار" اور "قلاوز" جیسے صفات کے ساتھ پیش کیا گیا۔

مولانا رومی کی شاعری، خاص طور پر دیوان شمس میں، عشق کی تصاویر اپنے عروج کو پہنچتی ہیں۔ مولانا کے کلام کی جڑ اور ان کے خیالات کی بنیاد ان کے عشق کے گہرے روحانی تجربات ہیں، نہ کہ صرف دینی علوم یا عقلی استدلال۔ دیوان شمس میں عشق کوئی محض تصور یا معنوی شے نہیں ہے، بلکہ ایک جاندار اور محسوس کی جانے والی مخلوق ہے۔ ایسا وجود جسے دیکھا جاسکتا ہے،

اس سے بات کی جا سکتی ہے، اسے چھوا جا سکتا ہے، اور اس کے لمس کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔

مولانا کے کلام میں عشق کی شخصیت بخشی (Personification) بہت نمایاں ہے۔ یہ نہ صرف ان کے روحانی تجربات اور جذبات کا عکس ہے بلکہ ان تجربات کو زبان دینے کا ذریعہ بھی ہے۔ ان کے لیے شخصیت بخشی نہ صرف ایک ادبی حربہ ہے بلکہ ایک مقصد بھی ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے اندرونی تجربات کو بیان کرتے ہیں۔

مثنوی میں عشق کا ظہور:

مولانا کی فکری دنیا پر غور کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ عشق ایک شعوری اور جاندار ہستی کے طور پر خود کو مرحلہ وار ظاہر کرتا ہے۔ یہ انسانی روح کو بتدریج ترقی دیتا ہے اور اسے عشق کے حقیقی مقام اور اس کی غایت، یعنی عشق کے ساتھ اتحاد، کے لیے تیار کرتا ہے۔ مولانا اپنے مثنوی معنوی کے تیسرے دفتر میں عشق کی تجلیات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

عشق از اول چرا خونی بود   تا گریزد ہر کہ بیرونی بود؟

(مثنوی معنوی)

مولانا کے بیان کے مطابق، عشق کی پہلی جھلک اس کی "خونی" صفت کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ صفت مولانا کے کلام میں مختلف صورتوں میں سامنے آتی ہے۔ عشق اور انسان کی پہلی ملاقات کسی عام تعارف کی طرح نہیں ہوتی، کیوں کہ عشق کی راہ الٹی ہے، جو خرابی سے آبادانی کی طرف جاتی ہے۔ اسی لیے، عشق اپنے آغاز میں سب سے زیادہ ہیبت ناک چہرہ دکھاتا ہے۔

اردو میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کی شاعری میں عشق ایک جاندار، محسوس کی جانے والی مخلوق کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو ابتدائی طور پر انسان کو خوفزدہ کر سکتا ہے، لیکن بعد میں وہی عشق روحانی ترقی اور خوشحالی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

عشق کے قہری اوصاف-مولانا کی نظر میں:

خونخوار عشق:

مولانا کے کلام میں عشق کی ابتدائی جھلکیاں سخت اور قہری صفات کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں، تاکہ سالک کو دنیاوی تعلقات اور مادی رکاوٹوں سے آزاد کر کے روحانی سفر کے لیے تیار کیا جا سکے۔ ان صفات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1)-عشق اپنے ابتدائی مراحل میں سالک کے لیے ایک دشمن کی شکل اختیار کرتا ہے، جو اسے شدید آزمائشوں سے گزارتا ہے۔ مولانا کے غزلیات میں عشق کے قہری صفات میں سب سے نمایاں "خونخواری" اور "جنگجوئی" ہیں۔ مولانا عشق کو "خونخوار دشمن" کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو کسی بھی جرم یا خطا کے بغیر سالک کی جان کا طلب گار ہوتا ہے۔ عشق کی شدت اور اس کا بے رحم رویہ مولانا کے کلام میں ان الفاظ میں ظاہر ہوتا ہے:

عشق چو خونخواره شود وای ازو وای
کوه احد پاره شود خاصه چو ماها
(دیوان شمس، غزل:53)

ترجمہ: جب عشق خونخوار ہو جائے تو ہائے افسوس، احد کا پہاڑ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، خاص طور پر ہماری طرح۔

عشق چو خون خواره شود رستم بیچاره شود
کوه احد پاره شود آه چه جای دل من
(دیوان شمس، غزل:1814)

ترجمہ: جب عشق خونخوار ہو جائے تو رستم جیسے بہادر بھی بے بس ہو جاتے ہیں، کوہ احد ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے پھر میرے دل کی کیا حیثیت؟

جنگجو عشق:

عشق کا دوسرا قہری روپ ایک جنگجو کا ہے، جو ہر چیز کو تباہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ جنگجو عشق کسی بھی قسم کی عافیت طلبی یا سکون کو برداشت نہیں کرتا۔

صنما سپاہ عشقت بہ حصار دل درآمد
بگذر بدین حوالی کہ جہان بہ ہم برآمد
(دیوان شمس، غزل:772)

ترجمہ: اے محبوب، تیرے عشق کا لشکر میرے دل کے قلعے میں داخل ہو گیا ہے۔ اس طرف سے گزر جا، کیونکہ دنیا ایک ساتھ جمع ہو گئی ہے۔

بہ جان عشق کہ جانی ز عشق جان نبرد
وگر درونہ صد برج و صد بدن باشد
(دیوان شمس، غزل:920)

ترجمہ: اور اگر سو برج اور سو جسم بھی ہوں تو عشق کی جان کی قسم، کہ عشق کی جان نہیں بچتی۔

مولانا کی نظر میں عشق ابتدا میں دشمن کی طرح سالک کو آزمائش میں ڈالتا ہے، لیکن اس کا مقصد سالک کو اندرونی پاکیزگی اور روحانی طاقت کے لیے تیار کرنا ہوتا ہے۔ یہ قہری صفات عشق کے ابتدائی مراحل ہیں، جو بالآخر فرد کو اس کے روحانی سفر کی طرف لے جاتے ہیں۔

تکبر کے خلاف جنگ:

عشق، سالک کے تکبر اور برتری کے احساس کو ختم کرنے کے لیے میدان میں آتا ہے، بالکل ویسے ہی جیسے موسیٰ نے فرعون کے غرور کو شکست دی تھی۔ مولانا کے اشعار میں اس کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

بر ای عشق چو موسی سر فرعون تکبر
ہلہ فرعون! بہ پیش آ کہ گرفتم در و بامت
(دیوان شمس، غزل:405)

ترجمہ: اے عشق، جیسے موسیٰ نے فرعون کی تکبر کو برباد کیا، اے فرعون! آگے آ، کیونکہ میں نے تیرے دروازے اور بام کو پکڑ لیا ہے۔

خواب، چون ماہی اندر آب گریخت
عشق ہمچون نہنگ لب بگشاد
(دیوان شمس، غزل:501)

ترجمہ خواب یوں ہے جیسے مچھلی پانی میں بہ گئی، عشق یوں ہے جیسے مگرمچھ نے لب کھول دیے۔

شد ز بلندی عشق چرخ فلک پست دوش
گرز برآورد عشق کوفت سر عقل را
(دیوان شمس، غزل:1276)

ترجمہ: عشق کی بلندی سے آسمان بھی پست ہو گیا، عشق نے اپنا گرز اٹھایا اور عقل کے سر کو کچل دیا

عشق بطور چور:

عشق سالک کی دنیاوی وابستگیوں اور تعلقات کو ختم کر کے اسے آزاد کرتا ہے۔ عشق ایک چور کی طرح ہر اس چیز کو چھین لیتا ہے جو سالک کی توجہ اور دل کو منتشر کرے، یہاں تک کہ اس کے پاس کچھ بھی باقی نہ رہے:

رختی کہ داشتیم بہ یغما ببرد عشق
از سود و از زیان و ز بازار فارغیم
(دیوان شمس، غزل:1710)

ترجمہ: وہ سامان جو ہمارے پاس تھا، عشق نے لوٹ لیا، ہم نفع و نقصان اور بازار سے بے نیاز ہیں۔

عشق است آن دزدی کہ او از شحنگان دل می برد
در خدمت آن دزد بین تو شحنگان بی کران
(دیوان شمس، غزل:1810)

ترجمہ: عشق وہ چور ہے جو دل کے خزانوں کو لوٹ لیتا ہے، اس چور کی خدمت میں، دیکھو، خزانے بے کراں ہیں۔

حیلت گر اور مکار عشق:

عشق اس مرحلے پر اپنی شدت کو کم کر کے سالک کو اپنی طرف راغب کرتا ہے۔ عشق اپنی رازدارانہ خصوصیات کے ذریعے سالک کو حیرت میں مبتلا کرتا ہے اور اسے اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ یہ استدلال یا منطق کی بجائے حیرت اور جذبے کے ذریعے اثر ڈالنے کا ہنر رکھتا ہے:

عشق ست یکی جانی دررفتہ بہ صد صورت
دیوانہ شدم باری من در فن و آیین ش
(دیوان شمس، غزل:1227)

ترجمہ: عشق ایک جان ہے جو سو صورتوں میں آتا ہے، میں اس کے فن اور طریقے میں دیوانہ ہو گیا ہوں۔

اس شعر میں عشق کی بوالعجبی اور شعبہ بازی بھی پنہاں ہے۔ عشق کے شعبدہ باز اور حیرت انگیز پہلو سالک کو عشق کی حقیقت سے روشناس کرواتے ہیں۔ اس مرحلے میں عشق کی شدت مزید کم ہو جاتی ہے، اور سالک عشق کی کرشماتی اور عجیب و غریب حرکات سے متاثر ہوتا ہے۔

عقل گوید کہ: من او را بہ زبان بفریبم
عشق گوید کہ: خمش باش! بہ جان بفریبم
(دیوان شمس، غزل:1634)

ترجمہ: عقل کہتی ہے: میں اسے زبان سے بہکاؤں گا، عشق کہتا ہے: خاموش رہو، میں

اسے جان سے بہکاؤں گا!

مولانا کے مطابق، عشق سالک کے اندرونی اور نفسیاتی عیوب کو ختم کرنے کے لیے مختلف مراحل سے گزرتا ہے۔ یہ ابتدا میں سخت رویہ اختیار کرتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ اپنی شدت کو کم کر کے سالک کو اپنے رازوں اور حیرت انگیزیوں سے آشنا کرتا ہے۔ عشق کا یہ سفر سالک کو اپنی ذات سے بے خبر کر کے عشق کی حقیقت میں فنا کرنے کی طرف لے جاتا ہے۔

عشق بطور صیاد (شکاری):

جب سالک عشق کی شدت، حیرت اور حیران کن حرکات سے گزر کر زندہ رہتا ہے، تو عشق اسے شکار کرتا ہے۔ عشق ایک شکاری کی طرح اپنے جال بچھاتا ہے اور سالک کو اپنی ملکیت بنالیتا ہے:

سایہ افکندست عشقش ہمچو دامی بر زمین
عشق چون صیاد او بر آسمانست ای پسر
(دیوان شمس، غزل:1082)

ترجمہ: عشق وہ آسمانی صیاد ہے اے بیٹے جو اپنے سائے کو زمین پر جال کی طرح پھیلا دیتا ہے۔

شکار را بہ دوصد ناز می برد این شیر
شکار در ہوسِ او دوان قطار قطار
(دیوان شمس، غزل:1138)

ترجمہ: یہ شیر شکار کو دو سو ناز کے ساتھ لے جاتا ہے، شکار اس کی ہوس میں قطار در قطار دوڑتا ہے۔

عشق بطور منتخب کرنے والا:

اس مقام پر عشق کی طاقت اور اختیار مزید واضح ہو جاتی ہے۔ عشق اپنے لیے موزوں اور

لائق فرد کو منتخب کرتا ہے، اور منتخب شدہ شخص کو بے اختیار اور مستانہ حالت میں لے آتا ہے:

هر که را اختیار کردش عشق
مست و بی‌اختیار خواهد بود
(دیوان شمس، غزل:974)

ترجمہ: جسے عشق منتخب کرتا ہے، وہ مست اور بے اختیار ہو جاتا ہے۔

عشق بطور مہمان:

جب عشق کے قہری رویے نرم ہو جاتے ہیں اور سالک عشق کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھنے لگتا ہے، تو عشق ایک مہمان کے طور پر اس کی زندگی میں داخل ہوتا ہے۔ سالک اب نہ صرف عشق کو قبول کرتا ہے، بلکہ اس کا مشتاق بھی ہوتا ہے:

جمله مهمانند در عالم ولیک
کم کسی داند که او مهمان کیست
(دیوان شمس، غزل:432)

ترجمہ: دنیا میں سب مہمان ہیں، لیکن کم لوگ جانتے ہیں کہ عشق جیسا مہمان کون ہے!

عشق بطور صاحب اختیار و سلطان:

اس مرحلے میں عشق سالک پر مکمل اختیار حاصل کر لیتا ہے اور اپنی سلطنت قائم کرتا ہے۔ عشق، ایک فرماں بردار سالک پر اپنی قوت کا اظہار کرتا ہے، لیکن یہ قوت قہری ہونے کے باوجود محبت کی بنیاد پر استوار ہوتی ہے:

عشق همایون پیست خطبه به نام ویست
از سر ما کم مباد سایهٔ این کیقباد
(دیوان شمس، غزل:884)

ترجمہ: عشق ایک عظیم بادشاہ ہے، خطبہ اسی کے نام پر پڑھا جاتا ہے۔ ہمارے سر سے

اس کی سایہ کم نہ ہو، اے کیقباد!

عشقا توی سلطان من از بہر من داری بزن

روشن ندارد خانہ را قندیل ناآویختہ

(دیوان شمس، غزل: 2275)

ترجمہ: اے عشق، تو میرے سلطان ہو، میرے لیے اپنا طبل بجا، گھر کی روشنی نہیں ہے، کیونکہ کوئی چراغ لٹکایا نہیں گیا۔

عشق کی صفات مہری:

جب عشق، سالک کو آزمائشوں سے گزار کر اس کی خودی اور رذائل نفسانی کو ختم کر دیتا ہے، تب محبت اور شفقت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ عشق اب ایک رہنما اور مددگار کے طور پر ظاہر ہوتا ہے جو سالک کو منزل کی طرف لے جاتا ہے۔ عشق، سالک کو محبت سے راستہ دکھاتا ہے اور اس کی ہر مشکل میں مدد کرتا ہے۔ عشق، سالک کے لیے ایک مشفق دوست اور ہمراہی بن جاتا ہے، جو اسے کبھی تنہا نہیں چھوڑتا۔ عشق، سالک کو ایک مکمل انسان بناتا ہے، جو خودی سے آزاد ہو کر عشق کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔ یہ تمام مثالیں دیوانِ شمس میں موجود ہیں۔

اس مرحلے میں، عشق مثبت اور مہربانہ رویوں کے ذریعے سالک کو اس کی تمام مطلوبہ نعمتوں سے نوازتا ہے، خود راہبر بن کر سالک کو سکھاتا اور اسے اپنی رہنمائی میں تربیت دیتا ہے۔ ابتدا میں پیر، معلم، رہنما اور راہبر کی حیثیت سے جلوہ گر ہوتا ہے اور سالک کو اپنی تعلیمات پیش کرتا ہے، بعد ازاں سالک کے ساتھ مزید قریبی تعلق قائم کرتا ہے اور اسے اپنی عیش و مستی کا ساتھی بناتا ہے۔ عشق کی یہ مہربانی اس وقت عروج پر پہنچتی ہے جب عشق معشوق کے روپ میں ظاہر ہوتا ہے، اور اس مقام پر پہلی بار سالک کو "عاشق" کہا جا سکتا ہے۔

ذیل میں عشق کے ان مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے جو اس کے مہربان رویے کو ظاہر کرتے ہیں:

عشق بطور راہنما:

عشق ایک پیر اور مرشد کی خصوصیات رکھتا ہے اور اپنے تمام جلووں کے ذریعے سالک کو شعور بخشتا ہے۔ مولانا رومی کے غزلیاتِ شمس میں محبت کو قابلِ اعتماد، رہنما، راز گو اور مفسر کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ عشق قابلِ اعتماد ہے، لہٰذا اس کے احکامات کو بغیر کسی شک و شبہ کے قبول کیا جانا چاہیے۔

ای عشق چست معتمد مستی سلامت می کند
بشنو سلام مست خود دل را مکن ہمچون حجر
(دیوان شمس، غزل:1019)

ترجمہ: اے عشق جو کہ چست اور قابلِ اعتماد ہے، تو ہی مستی کو سلامت رکھتا ہے، اپنے مست کا سلام سن، دل کو پتھر جیسا نہ بنا۔

مولانا رومی بعض اوقات عشق کو نبی قرار دیتے ہیں، جو عشق کی قابلِ اعتماد حیثیت کو واضح کرتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عشق خلیل (حضرت ابراہیم) کی مانند ہے، اگر وہ تمھیں اپنی آگ میں بلائے تو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ غالباً یہیں سے علامہ اقبال نے بھی اپنا فلسفۂ عشق اخذ کیا ہے، اپنی نظم مسجد قرطبہ میں فرماتے ہیں:

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ
عشق خدا کا رُسول، عشق خدا کا کلام
عشق کی مستی سے ہے پیکرِ گِل تابناک
عشق ہے صہبائے خام، عشق ہے کاس الکرام
عشق فقیہِ حرم، عشق امیرِ جُنود
عشق ہے ابن السّبیل، اس کے ہزاروں مقام
عشق کے مِضراب سے نغمۂ تارِ حیات

عشق سے نُورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

آئیے دیکھتے ہیں علامہ جلال الدین رومی کیا فرماتے ہیں۔

عشق خلیل است درآ درمیان
غم مخور ار زیر تو آتش بود
(دیوان شمس، غزل:994)

ترجمہ: عشق تو خلیل ہے، لہذا درمیان میں آجا، یعنی عشق میں پڑ جا غم نہ کر اگر تیرے نیچے دہکتی ہوئی آگ موجود ہو۔

یہ عشق کا خلیل ہونا ہے کہ وہ آگ کی زبان کو جانتا ہے اور اسے صفا (پاکیزگی) میں تبدیل کر دیتا ہے۔

کہیں عشق عیسیٰ مسیح کی صورت پیش کیا گیا ہے، جو ہر اس شخص کو دوبارہ زندہ کرتی ہے جو اس کے سامنے اپنی موت قبول کرے۔

چو عشق عیسی وقتست و مردہ می جوید
بمیر پیش جمالش چو من تمام مترس
(دیوان شمس، غزل:1214)

ترجمہ: عشق عیسیٰ کی طرح ہے اور مردوں کو ڈھونڈتا ہے، اس کے حسن کے سامنے مر جاؤ، ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

مولانا رومی نے محبت کی زندہ ہستی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے سب سے زیادہ توجہ محبت کی رہنمائی پر دی ہے۔ یہ صفت بار بار ان کے اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے، چاہے وہ براہ راست ہو یا ضمنی طور پر۔ محبت ابتدا سے ہی سالک کو اپنے بنائے ہوئے راستے پر لے جاتی ہے، اور اس کا لازمی جزو رہنمائی ہے۔

عشق بطور راز گو:

محبت کے قرب کا مقام، باہمی اعتماد اور راز گوئی کا مقام ہوتا ہے، کیوں کہ اسرار کو غیر کے سامنے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی غیر موجود نہ ہو، محبت ایک علامتی منظر پیش کرتی ہے تا کہ گفتگو کی رازدارانہ کیفیت کو واضح کرے۔

باقیش عشق گوید با تو نہان ز من
ز اصحاب کہف باش ہم ایقاظ و رقود
(دیوان شمس، غزل:863)

ترجمہ:عشق کی حقیقت وہ باتیں ہیں جو مجھ سے چھپی ہوئی ہیں اور صرف تم سے کہی جا رہی ہیں۔ اصحابِ کہف کی طرح بن جاؤ جو جاگتے ہوئے بھی آرام میں تھے اور سوتے ہوئے بھی ہوشیار۔

از بس کہ نوح عشقت چون نوح نوحہ دارد
کشتی جان ما را دریای راز کردہ
(دیوان شمس، غزل:2391)

ترجمہ: تمھارے عشق کا نوحہ، حضرت نوح کی نوحہ خوانی کی طرح ہے، کہ اس نے ہماری روح کی کشتی کو رازوں کے سمندر میں ڈال دیا ہے۔

عشق بطور مفسر اور مترجم:

کوئی دوسرا محبت کی کیفیات کو اس طرح بیان نہیں کر سکتا جیسا کہ خود محبت کرتی ہے۔ محبت وہ سب کچھ بیان کرتی ہے جو لازم ہو، اور اسے کمال بلاغت کے ساتھ پیش کرتی ہے:

عشق را از من مپرس از کس مپرس از عشق پرس
عشق در گفتن چو ابر درفشانست ای پسر
ترجمانی من و صد چون منش محتاج نیست

در حقایق عشق خود را ترجمانست ای پسر

(دیوان شمس، غزل:1097)

ترجمہ:

- عشق کے بارے میں مجھ سے نہ پوچھو، کسی اور سے بھی نہ پوچھو، خود عشق سے پوچھو۔ عشق بولنے میں اس چمکتے ہوئے بادل کی مانند ہے، اے بیٹے!
- میری اور مجھ جیسے بے شمار لوگوں کی ترجمانی عشق کو درکار نہیں عشق اپنی حقیقتوں میں خود ہی اپنی ترجمانی کرتا ہے، اے بیٹے!
- مولانا کے مطابق عشق کو سمجھنے کے لیے کسی بیرونی وضاحت یا تشریح کی ضرورت نہیں۔ عشق کی حقیقت کو جاننے کے لیے خود عشق کا تجربہ کرنا ضروری ہے، کیونکہ عشق اپنی روشنی اور بارش سے خود کو ظاہر کرتا ہے، جیسے چمکتا ہوا بادل۔

خامش کنم خامش کنم تا عشق گوید شرح خود

شرحی خوشی جان پروری کان را نباشد غایتی

(دیوان شمس، غزل:2442)

ترجمہ: میں خاموش ہو جاتا ہوں، میں خاموش ہو جاتا ہوں تاکہ عشق خود اپنی وضاحت کرے۔ ایسی وضاحت جو خوشی اور روح کو تسکین دینے والی ہو، اور جس کی کوئی حد یا انتہا نہ ہو۔

رومی کہتے ہیں کہ الفاظ عشق کی حقیقت کو بیان کرنے میں قاصر ہیں، اس لیے بہتر ہے کہ خاموشی اختیار کی جائے اور عشق خود اپنی حقیقت آشکار کرے، جو دل و جان کو سرور بخشنے والی ہے۔

عشق بطور موسیقار:

خوشی اور مسرت کا پہلا مظہر موسیقی ہے۔ اسی لیے عشق خوشی کے اظہار کے پہلے مرحلے میں ایک موسیقار کے طور پر سامنے آتا ہے، جو طرب اور خوشی کی علامت ہے۔

تا کہ عشقت مطربی آغاز کرد
گاہ چنگم گاہ تارم روز و شب
(دیوان شمس، غزل:302)

ترجمہ: جب تمھاری محبت نے ساز چھیڑنا شروع کیا، کبھی میں چنگ (بربط) بن گیا، کبھی تار (ستار) بن گیا، دن اور رات۔

عشق محبوب کے ساتھ جڑنے پر زندگی کو ایک موسیقی کی مانند بنا دیتا ہے۔ رومی کہتے ہیں کہ محبت کی تاثیر نے اس کی ذات کو ایسا ساز بنا دیا ہے جو ہر لمحہ محبوب کی دھن پر بجتا ہے، چاہے دن ہو یا رات۔ یہ محبت کے رنگین اثر اور مسلسل سرشاری کی عکاسی کرتا ہے۔

دہان عشق می خندد کہ نامش ترک گفتم من
خود این او می دمد در ما کہ ما ناییم و او نایی
(دیوان شمس، غزل:2499)

ترجمہ: عشق کا دہن مسکرا رہا ہے کہ میں نے اس کا نام زبان سے ترک کر دیا۔ یہ تو خود وہی (عشق) ہے جو ہم میں پھونک رہا ہے، کیونکہ ہم بانسری ہیں اور وہ بانسری نواز۔

یہ عشق کی لطیف حقیقت اور انسان کی عاجزی کا بیان ہے۔ رومی عشق کا نام زبان پر نہیں لاتے اس کے باوجود عشق اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم تو محض نَے (بانسری) ہیں، اور عشق وہ نَے نواز ہے جو اپنی پھونک سے ہماری زندگی میں دھن اور معنی بھر رہا ہے۔

عشق بطور ساقی:

ادبی روایت میں خوشی اور طرب کی ایک ضروری علامت ”شراب“ اور اس سے وابستہ چیزیں ہیں۔ یہاں تک کہ شراب کے بغیر محفل رسمی نہیں لگتی۔ اس مرحلے میں عشق خود ساقی بن جاتا ہے، جو ہر شخص کی طاقت اور گنجائش کو جانتا ہے اور ہر ایک کو اس کی اہلیت کے مطابق حصہ دیتا ہے۔

عشق را دیدم میان عاشقان ساقی شده
جان ما را دیدنِ ایشان مبادا بی شما
(دیوان شمس، غزل:140)

ترجمہ: میں نے عشق کو عاشقوں کے درمیان ساقی بنتے دیکھا، ہماری جان کے لیے ان (عاشقوں) کا دیدار کبھی تمھارے بغیر نہ ہو۔

رومی کہتے ہیں کہ عشق عاشقوں کے درمیان ساقی کی طرح شرابِ محبت بانٹ رہا ہے، اور ہماری روح کے لیے یہ لازمی ہے کہ ان عاشقوں کا دیدار محبوب کی موجودگی کے بغیر نہ ہو۔

عشق گردان کرد ساغرہای خاص
عشق می داند کہ او گردان کیست
(دیوان شمس، غزل:428)

ترجمہ: عشق نے خاص پیمانوں کو گردش دی، اور عشق ہی جانتا ہے کہ وہ گردش کیا ہے۔

رومی کہتے ہیں کہ محبت خاص لوگوں کو اپنے دائرے میں شامل کرتی ہے اور انھیں اپنی حقیقتوں کا حصہ بناتی ہے، لیکن اس سب کے پیچھے کون ہے اور یہ سب کیسے ہوتا ہے، صرف عشق ہی اس حقیقت سے واقف ہے۔ یہ انسان کی محدود فہم اور عشق کی لامحدود حکمت کا اظہار ہے۔

عشق بطور مست:

عشق جب وسعت میں آتا ہے تو وہ نہ صرف ساز بجانے والا اور موسیقار ہوتا ہے بلکہ خود بھی مست اور جنون انگیز ہو جاتا ہے۔ اس مرحلے پر محبت اور سالک کے درمیان کوئی فاصلہ باقی نہیں رہتا۔ عشق کبھی مسرت بخشتا ہے اور کبھی خود اسی مسرت میں مست ہو کر سالک کے ساتھ شریک ہو جاتا ہے۔

چہ خوشی عشق چہ مستی چو قدح بر کف دستی

خنک آن جا کہ نشستی خنک آن دیدہ جان را

(دیوان شمس، غزل:162)

ترجمہ: عشق کی خوشی اور مستی کا کیا کہنا، جب جام ہاتھ میں ہو! وہ جگہ خوش نصیب ہے جہاں تم بیٹھے ہو، اور وہ آنکھیں خوش قسمت ہیں جو دل کی حقیقت کو دیکھتی ہیں۔

یار ما عشق است و ہر کس در جہان یاری گزید
کز الست این عشق بی ما و شما مست آمد ست

(دیوان شمس، غزل:391)

ترجمہ ہمارا محبوب خود عشق ہے، اور دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی کی محبت میں مبتلا ہے۔ عشق وہ تحفہ ہے جو ہم اور تم سب کو روزِ الست سے مست ہو کر آیا ہے۔

عشق بطور یار اور معشوق:

عشق اور سالک کی قربت یار اور معشوق کے تعلق میں اپنی انتہا کو پہنچتا ہے۔ اسی مرحلے پر سالک کو "عاشق" کا نام دیا جاتا ہے۔ ابتدا میں عشق سالک کے یار کے طور پر ظاہر ہوتا ہے، پھر اس کی میزبان بنتا ہے، اور بعد میں معشوق کی صورت میں اپنے ناز و ادا اور غیرت کو ظاہر کرتا ہے۔

جب عشق اپنے مہربان پہلو کو سالک پر ظاہر کرتی ہے تو وہ ایک بہترین دوست کے تمام اوصاف سے مزین ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں سالک کا عشق میں غرق ہونا اور دنیا والوں سے کنارہ کشی کرنا لازمی ہے۔

ہلہ ای عشق بیا یار منی در دو جہان
از ہمہ خلق بریدم بہ تو برچفسیدم

(دیوان شمس، غزل:1637)

ترجمہ: آؤ، اے عشق! میری مدد کرو، تم ہی میرے یار ہو دونوں جہانوں میں۔ میں نے

تمام مخلوق سے قطع تعلق کر لیا ہے، اور تمھاری محبت میں خود کو جڑ لیا ہے۔

اس طرح مولانا رومی نے عشق کی بے شمار صفات گنوائی ہیں تاحال ہم اتنے ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

دیوانِ شمس کا دوست، محبوب اور عاشق:

مولانا کے مطابق محبوب صابر ہے اور صبر کرنے والوں کے ساتھ رہنا پسند کرتا ہے۔ اس کا صبر ایسا ہے کہ ایوب بھی اس کے صبر کے ساتھ اس کا ساتھ نہیں دے سکتا اور عاشق اس کے صبر کے سامنے کم صبر کرتا ہے:

فرمود رب العالمین با صابرانم ہم نشین
ای ہم نشین صابران افرغ علینا صبرنا
(دیوان شمس، غزل:20)

ترجمہ: رب العالمین نے فرمایا: میں صبر کرنے والوں کا ہم نشین ہوں۔ اے صبر کرنے والوں کے ہم نشین! ہم پر اپنا صبر انڈیل دے۔

یہ شعر اللہ کی اس رحمت اور قربت کو بیان کرتا ہے جو صبر کرنے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ دوسرے مصرع میں بندہ عاجزی سے دعا کرتا ہے کہ اے صبر عطا کرنے والے، ہمیں بھی صبر کی توفیق عطا فرما تاکہ ہم تیری معیت میں رہ سکیں۔

رومی کا عاشق وفاداروں میں سب سے زیادہ وفادار ہے اور کسی کو اپنے دروازے سے نہیں ہٹاتا اور تمام وفاداریوں کا سرچشمہ ہے:

از شاہ وفادارتر امروز کسی نیست
خر جانب او ران کہ تو را ہیچ نراند
(دیوان شمس، غزل:652)

ترجمہ: آج کے دن شاہ سے زیادہ وفادار کوئی نہیں، اسی کی طرف رخ کر، کہ وہ تجھے کبھی

رد نہیں کرے گا۔

بگشا در بیا در آ، کہ مباد عیش بی شما
بہ حق چشم مست تو، کہ توی چشمۂ وفا
(دیوان شمس، غزل:263)

ترجمہ: دروازہ کھول اور اندر آ، کہ تمھارے بغیر خوشی نامکمل ہے، تیری مست آنکھوں کی قسم، کہ تو ہی وفا کا سرچشمہ ہے۔

یہ اشعار محبوب (یا معشوقِ حقیقی) کی وفا، رحمت اور محبت کو بیان کرتے ہیں۔ شاعر عقیدت کے ساتھ محبوب کی وفاداری کا اقرار کرتا ہے اور اس سے قربت کی خواہش رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی طلب کا اظہار ہے جو محبت، وفا، اور وصل کے لیے بے قرار ہے۔

رومی کا عاشق رازوں کی حفاظت کرنے والا ہے، فرماتے ہیں۔

بیا بیا کہ تو راز زمانہ می‌دانی
بپوش راز دل من کہ رازدار توام
(دیوان شمس، غزل:476)

آؤ، آؤ کہ تم زمانے کے رازوں کو جانتے ہو، میرے دل کا راز چھپا لو، کہ میں تمھارا رازدار ہوں۔

یہ شعر کسی صاحبِ حکمت ہستی سے التجا ہے۔ شاعر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ مخاطب زندگی کے اسرار و رموز سے آگاہ ہے اور اپنے دل کی پوشیدہ باتیں اسی کو سونپنے کا خواہاں ہے، کیونکہ اسے اپنے رازوں کی حفاظت پر یقین ہے۔ یہ شعر اعتماد اور محبت کی گہری کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔

رومی اپنے دوست کو تمام روحوں کی امید اور ناامید لوگوں کی امید مانتے ہیں:

نومید مشو جانا کاومید پدید آمد

امید ہمہ جانہا از غیب رسید آمد
امید تو ہر دمی بگوید
دستت گیرم بہ فضل خود زود
(دیوان شمس، غزل:631)

ترجمہ:

- مایوس نہ ہو، جانِ من، کہ امید ظاہر ہو چکی ہے، سب جانوں کی امید غیب سے پہنچ چکی ہے۔
- تیری امید ہر لمحہ یہ کہتی ہے: میں اپنے فضل سے جلد ہی تیرا ہاتھ تھام لوں گی۔

یہ اشعار امید اور یقین کا ایک حسین پیغام ہیں۔ شاعر یہ بیان کرتا ہے کہ اللہ کی رحمت اور فضل کے سبب مایوسی کا کوئی جواز نہیں۔ امید دل کی گہرائیوں سے اٹھتی ہے اور انسان کو یقین دلاتی ہے کہ اللہ کے فضل سے اس کی مشکلات ختم ہوں گی اور وہ سہارا پائے گا۔

رومی کا دوست عاشق کے لیے راستہ اور رہنما دونوں ہے۔ وہ اپنی دعوت کے ساتھ عاشق کو راستہ دکھاتا ہے اور اسے اس راستے پر ہموار کر کے اسے جسم اور دنیا کی قید سے توحید کی طرف لے جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

چون ان اللہ یدعوا را شنیدی کژ مکن رو را
زہی راعی، زہی داعی، زہی راہ و زہی رہبر
(دیوان شمس، غزل:1024)

ترجمہ: جب "ان اللہ یدعوا" (بے شک اللہ بلاتا ہے) کو سنو، تو اس میں کجی نہ کرو (یعنی دل سے قبول کرو)، کیا ہی عظیم رعایت فرمانے والا، کیا ہی شاندار بلانے والا، کیا ہی بہترین راستہ اور رہنما ہے!

یہ شعر انسان کو دوست کی دعوت پر اخلاص کے ساتھ لبیک کہنے کی ترغیب دیتا ہے۔

دوست کو چرواہے اور رہنما کے طور پر بیان کیا گیا ہے، جو بہترین راستے کی طرف بلاتا ہے۔ شاعر دوست کے عظیم داعی اور رہبر ہونے کی تعریف کرتے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے کی نصیحت کرتا ہے۔

ای صورت عشق ابد، خوش رو نمودی در جسد
تا رہ بری سوی احد جان را از این زندان ما
(دیوان شمس، غزل:29)

ترجمہ: اے عشقِ ابد کی صورت، جسم میں داخل ہو کر تو نے اپنی عمدہ صورت دکھائی، تاکہ تو ہمیں یکتا کی طرف لے جائے، اور ہماری جان کو اس قید سے آزاد کرے۔

حق کے اظہار کی مختلف سطحیں ہیں۔ کبھی ٹوٹنے والوں کو جوڑ دیتا ہے اور ذلت کے گہرائیوں سے عزت کی بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے، کبھی موت کا سبب بنتا ہے اور کبھی زندگی کا۔ ایک کامل انسان ایک جامع وجود اور تمام اسماء وصفات کا آئینہ ہے، مولانا کہتے ہیں کہ سچائی کی تلاش چراغ کے لیے سورج کی تلاش کے مترادف ہے۔ وہ نہ وہ ہے اور نہ وہ، بلکہ وہ اس کا خالق ہے، محبوب کا وجود مخالف صفات سے بھرا ہوا ہے اسی لیے رومی اس کو معیارِ استدلال سے بیان کرنا ناممکن سمجھتے ہیں۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر ہے اور اس کی صفات حسن، جلال، فضل اور محبت کا مظہر ہیں۔ وہ ہر لمحہ ایک لباس اور ایک وصف کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے کہ رومی کو اس تبدیلی میں کوئی تناسخ نظر نہیں آتا اور وہ ایک ہی عاشق ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور عاشق کی حالتوں میں اس تبدیلی اور تبدیلی کو خالص وحدت تصور کرتے ہیں۔

رومیؔ کے نزدیک سچی محبت اپنی خصوصیات والی محبت ہے، کیونکہ اس میں عاشق پائے جاتے ہیں اور محبوب غائب ہو جاتا ہے، اور عاشق اپنے کمال اور حسن کی قسم کھاتا ہے۔

در ہمہ عالم چنین عشقی کہ دید　　عاشقان پیدا و دلبر ناپدید

(دیوان شمس، غزل:824)

ترجمہ: عاشق پیدا ہوتے ہیں، مگر دلبر گم ہو جاتا ہے، دنیا میں ایسا عشق کہیں نظر نہیں آیا۔

دیوان شمس میں فرماتے ہیں۔

سوگند می خورم بہ جمال و کمال او کز چشم خویش ہم پنہانست آن یکی

(دیوان شمس، غزل:317)

ترجمہ: میں اس کے جمال و کمال کی قسم کھاتا ہوں، کہ اپنی آنکھوں سے بھی وہ ایک چھپا ہوا راز ہے۔

یہ شعر عاشق و معشوق کے درمیان کی کشش اور عشق کی پیچیدگی کو بیان کرتا ہے۔ عاشق دنیا میں محبت کی تلاش میں نکلتا ہے، مگر حقیقی محبوب اس کی نظر سے پوشیدہ ہوتا ہے، اور اس کا کمال صرف دل ہی پہچان سکتا ہے۔

رومیؒ کے مطابق ایک عاشق درد سے واقف ہے اور ہر اس چیز سے نفرت کرتا ہے جو خوشگوار ہو۔ کہتے ہیں۔

داروی درد دلم درد وی است دل بہ دردش ز چہ رو نسپارم

(دیوان شمس، غزل:1678)

ترجمہ: درد کی دوا میرے دل کا اپنا درد ہے، میرا دل اس درد کو کیسے چھوڑ دے؟

طرب نخواہد آن کس کہ درد او بشناخت نشان نماند او را کہ بشنود نامش

(دیوان شمس، غزل:1287)

ترجمہ: وہ خوش نہیں ہو سکتا جو اپنے درد کو پہچانتا ہے، اس کا نشان ختم ہو جاتا ہے جو اس کا نام سن لے۔

یہ شعر اس درد کی گہرائی کو بیان کرتا ہے جو انسان کو حقیقی چیزوں سے جوڑتا ہے۔ بعض اوقات انسان کو اپنے درد میں سکون ملتا ہے، کیونکہ وہ اسی سے اپنے مقاصد کو سمجھتا ہے اور روحانی ارتقا کا حصہ بنتا ہے۔

رومیؔ کا خیال ہے کہ محبوب کی طرف عاشق کی خواہش اس کی طرف سے ہونے والی کشش کا نتیجہ ہے اور عاشق کے پاس اپنا کوئی اختیار نہیں ہے، فرماتے ہیں:

من بہ خود کی رفتمی او می کشد
تا نہ پنداری کہ خواہان می روم

(دیوان شمس، غزل:1667)

ترجمہ: میں خود کی طرف جا رہا ہوں، مگر وہ مجھے کھینچ رہا ہے، تاکہ یہ نہ سمجھے کہ میں اپنی مرضی سے جا رہا ہوں۔

یہ شعر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ انسان ظاہری طور پر اپنی مرضی سے کسی راستے پر جا رہا ہے، لیکن حقیقت میں اس کے ہر قدم کو ایک الٰہی طاقت (محبوب، معبود) اس کی رہنمائی کر رہا ہے۔ شاعر اس بات کو باور کرواتا ہے کہ اس کی خواہشِ دل، دراصل کسی اور کی محبت کا اثر ہے۔

دیوان اور مثنوی کے تناظر میں نظریۂ عشق:

مولانا اپنی عظیم لغت دانی اور بے مثال تعبیر سازی کی قوت کے باوجود اپنے تمام کلام میں اس بات کا شکوہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے معانی کی دلہنوں کے لیے الفاظ کا مناسب لباس نہیں پاتے۔ یہ شکوہ خاص طور پر اس وقت بڑھ جاتا ہے جب وہ عشق کی بات کرتے ہیں۔ ایک عاشق کے طور پر جو اپنے عشق کے سربستہ راز کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ الفاظ ان کے جسم کو چیرنا چاہتے ہیں:

در بیان ناید جمالِ حالِ او — ہر دو عالَم چیست؟ عکسِ خالِ او
چون کہ من از خالِ خوبش دَم زَنم — نطق می خواہد کہ بِشکافَد تَنَم

(مثنوی دفتر دوم، بخش:6)

ترجمہ:

- اس کے حال کے جمال (خوبصورتی) کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ یہ دونوں جہان کیا ہیں؟

بس اس کے خال کا عکس ہیں۔

- جب میں اس کے خوبصورت خال کا ذکر کرتا ہوں، تو میرا کلام چاہتا ہے کہ میرا جسم پھٹ جائے (یعنی یہ بیان میری طاقت سے باہر ہے)۔

شاعر کہتا ہے کہ محبوب کا حسن و جمال ایسا ہے کہ اسے الفاظ میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ دونوں جہان (دنیا اور آخرت) اس کے خال یا ایک چھوٹے سے حصے کے عکس سے زیادہ کچھ نہیں۔ جب شاعر اس خوبصورتی کا ذکر کرتا ہے، تو اس کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے کہ اس کے جذبات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں، اور وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کا جسم اس شدت کو برداشت نہیں کر پائے گا۔

مولانا اس عجیب و غریب اور حیرت انگیز تجربے میں اکیلے نہیں تھے۔ بہت سے عارف اور اندرونی تجربات کے حامل لوگ ایسے تھے جن پر معانی کا لشکر اس شدت سے حملہ آور ہوتا تھا کہ ان کا علمی سرمایہ بے بس ہو جاتا اور ان کی عقل کا پرندہ اشتیاق کے جال میں گرفتار ہو کر بے ترتیب باتیں کرنے لگتا۔

بعض عرفائے محققین اس مسئلے کو مشرق و مغرب کے تمام عرفانی مکاتبِ فکر میں، چاہے وہ ماضی کے ہوں یا حال کے، ایک مشترک خصوصیت مانتے ہیں۔ ان کے مطابق، عرفانی متون سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ عارف اپنے تجربات اور گہرے مشاہدات کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے زبان کو ناکافی یا حتیٰ کہ بالکل بے کار محسوس کرتے ہیں۔ وہ یہ اظہار کرتے ہیں کہ جو کچھ وہ اپنے تجربات میں پاتے ہیں، وہ ناقابلِ بیان یا ناقابلِ اظہار ہوتا ہے۔ عارف زبان کا استعمال تو کرتے ہیں، لیکن ساتھ ہی یہ اعتراف بھی کرتے ہیں کہ وہ الفاظ جو وہ استعمال کرتے ہیں، ان کے اصل مدعا اور مقصد کو پہنچانے میں ناکام رہتے ہیں:

معاصر یورپی اور امریکی افراد جنھوں نے عرفانی تجربات کیے ہیں، اس مسئلے کو اسی

شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں جیسا کہ قدیم عرفا محسوس کرتے تھے۔ ولیم جیمز اور دیگر محققین نے ان حوالوں کی بنیاد پر "ناقابلِ بیانیت" کو ہر مکتبِ فکر اور ثقافت میں عرفان کی ایک مشترک خصوصیت قرار دیا ہے۔

مولانا اپنی مختلف تصانیف میں بارہا الفاظ اور زبان کی تنگ دامنی کا ذکر کرتے ہیں اور اپنے احوال اور واردات کو الفاظ کے دائرے سے بہت وسیع تر سمجھتے ہیں۔ عشق کے حوالے سے گفتگو میں وہ خود کو دیگر موضوعات کی نسبت زیادہ بے بس محسوس کرتے ہیں اور یہ ان کے نزدیک اسی لیے ہے کہ وہ "سمندر کو کوزے میں بند کرنے" کو محض ایک ناممکن خیال سمجھتے ہیں۔ کہتے ہیں۔

عشق اندر فضل و علم و دفتر و اوراق نیست
ہر چہ گفت و گوی خلق، آن رہ رہِ عشاق نیست
(دیوان شمس، غزل:395)

ترجمہ: عشق علم و فضل، کتابوں اور کاغذوں میں نہیں پایا جاتا۔ جو کچھ لوگ باتیں کرتے ہیں، وہ (عشق کی) راہ، عشاق کی راہ نہیں ہے۔

عشق و کتاب سے ماورا ایک ایسی کیفیت ہے جو انسانی عقل و شعور کی عام حدود سے باہر ہے۔ یہ ایک جذبہ ہے جو کتابوں کے مطالعے، علم کی گہرائیوں یا منطقی دلائل سے حاصل نہیں ہوتا۔ صوفی شعرا نے بارہا اس بات کی نشاندہی کی ہے کہ عشق کا راستہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو خود اس راہ سے گزرے ہوں۔ یہ جذبات اور احساسات کی ایک ایسی دنیا ہے جسے الفاظ میں قید نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا رومی درج بالا شعر میں یہ واضح کر رہے ہیں کہ عشق ایک تجربہ ہے، ایک اندرونی کیفیت، جو صرف وہی لوگ جان سکتے ہیں جنھوں نے اپنی ذات کو فنا کر کے محبوب کی محبت میں خود کو گم کر دیا ہو۔ عام لوگ جو عشق کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، ان کی باتیں عشاق کی

راہ کو سمجھنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ عشق کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے صرف باتیں کافی نہیں ہیں بلکہ دل کی گہرائیوں میں محبوب کی محبت کو محسوس کرنا ضروری ہے۔

مولانا مثنوی میں کہتے ہیں۔

دَر نگنجد عشق در گفت و شنید　　عشق دریایی است قعرش ناپدید

قطرہ‌ہایِ بحر را نتوان شمرد　　ہفت دریا پیشِ آن بحر است خُرد

(مثنوی دفتر پنجم، بخش:114)

ترجمہ:

- عشق گفت و شنید (بات چیت) میں سما نہیں سکتا۔ یہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی گہرائی ناپید اہے۔
- سمندر کے قطروں کو شمار کرنا ممکن نہیں۔ اور وہ عشق کا سمندر ایسا ہے کہ سات سمندر اس کے سامنے حقیر و چھوٹے نظر آتے ہیں۔

یہاں رومی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ عشق کو محض الفاظ میں بیان کرنا یا گفتگو میں قید کرنا ممکن نہیں، یہ ایک بے کنار سمندر ہے، جس کی گہرائی کو کوئی نہیں ماپ سکتا۔ ش مزید کہتے ہیں کہ اگر ہم عشق کے سمندر کے قطروں کو شمار کرنے کی کوشش کریں تو یہ ناممکن ہوگا، کیونکہ اس کی وسعت انسانی سمجھ سے باہر ہے۔ عشق کے سامنے دنیا کے مشہور سات سمندر بھی چھوٹے اور بے وقعت نظر آتے ہیں۔

یہ اشعار اس بات کو اجاگر کرتے ہیں کہ عشق انسانی شعور کی حدود سے آزاد ایک عظیم اور ناقابل بیان حقیقت ہے۔ یہ جذبات اور احساسات کی ایک ایسی دنیا ہے جو صرف انہی لوگوں پر منکشف ہوتی ہے جو عشق کے راستے پر قدم رکھتے ہیں۔

مولانا کی تصانیف میں اس قسم کی باتیں کثرت سے ملتی ہیں، باوجود اس کے کہ انھوں نے عشق کے بارے میں بہت کچھ کہا ہے، وہ ہمیشہ خود کو عشق کی توضیح اور بیان کے حوالے سے

عاجز اور شرمندہ محسوس کرتے ہیں۔ مولانا زبان کو، جو زیادہ تر مواقع پر وضاحت اور روشنی فراہم کرتی ہے، عشق کی تشریح میں ناکارہ قرار دیتے ہیں۔ وہ زبان کو اس خون کے مانند سمجھتے ہیں جس سے دوسرے خون کو دھونا ممکن نہیں، مثنوی میں فرماتے ہیں:

ہَرچہ گویم عشق را شَرح و بیان — چون بہ عشق آیم، خَجِل باشم از آن

گَرچہ تفسیرِ زبان، روشَن گر است — لیک عشقِ بی زَبان، روشن تراست

چون قلم اندر نوشتن می شتافت — چون بہ عشق آمد، قلم بر خود شِکافت

عقل، در شَرحش چو خَر در گِل بخفت — شَرحِ عشق و عاشقی، ہم عشق گُفت

(مثنوی دفتر اول، بخش:6)

ترجمہ:

- جو کچھ میں عشق کی تشریح اور بیان میں کہوں، جب خود عشق کے عالم میں پہنچتا ہوں تو اس سب پر شرمندہ ہو جاتا ہوں۔
- اگرچہ زبان سے کی گئی تشریح روشن اور واضح ہو سکتی ہے، لیکن بے زبان عشق (جس کا اظہار خاموشی میں ہو) اس سے بھی زیادہ واضح اور روشن ہے۔
- جب قلم لکھنے میں تیزی دکھا رہا تھا، تو عشق کے مقام پر پہنچ کر وہ خود ہی ٹوٹ گیا۔
- عقل، عشق کی وضاحت میں ایسی الجھ گئی جیسے گدھا کیچڑ میں پھنس جائے۔ عشق اور عاشقی کی وضاحت، خود عشق نے ہی کر دی۔

مولانا فرماتے ہیں: بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے دل ان باتوں سے لبریز ہوتے ہیں، لیکن وہ انہیں الفاظ اور عبارات میں نہیں ڈھال سکتے، چاہے وہ عاشق، طالب، اور اس کے خواہاں ہی کیوں نہ ہوں۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں اور نہ ہی یہ عشق کے لیے کوئی رکاوٹ ہے، بلکہ یہی دل کی اصل، طلب، عشق، اور محبت ہے۔ جیسے ایک بچہ دودھ کا عاشق ہوتا ہے اور اس سے مدد اور قوت حاصل کرتا ہے، لیکن وہ دودھ کے بارے میں نہ تو

وضاحت کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کی حد بیان کر سکتا ہے، اور نہ یہ بتا سکتا ہے کہ دودھ پینے سے اسے کیا لذت ملتی ہے اور نہ پینے سے کیسا دکھ اور کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ اور ایک بالغ، چاہے دودھ کو ہزار طریقوں سے بیان کرے اور اس کی تعریف کرے، لیکن اسے دودھ سے کوئی لذت اور حظ نہیں ملتا۔

صرف چند نادر لوگ ایسے ہوتے ہیں جو عشق کے بے کنار سمندر کو الفاظ کے ظرف میں ڈھال سکتے ہیں اور بے صورت معنی کے لیے ایک موزوں صورت پیدا کر سکتے ہیں۔ مولانا ان افراد میں شامل تھے جنہیں خدا نے یہ نعمت عطا کی تھی کہ وہ معنی اور صورت کو یکجا کر سکیں۔ وہ مستی کے عالم میں بے ہوش نہ تھے، بلکہ ہوشیار رہتے ہوئے اپنی درس گاہ میں دوسروں کو معانی کے گوہر عطا کرتے تھے۔

جمعِ صورت با چنین معنیِّ ژَرف نیست ممکن، جُز ز سُلطانی شگرف

در چنین مستی مُراعاتِ اَدَب خود نباشد، وَر بُوَد باشد عَجَب

(مثنوی دفتر سوم، بخش:52)

ترجمہ:

- ایسے گہرے اور عمیق معنی کے ساتھ صورت (الفاظ) کا جمع ہونا کسی عظیم بادشاہت (عظیم ہستی یا صاحبِ کمال) کے بغیر ممکن نہیں۔
- ایسی مستی (عشق یا وجد) کی حالت میں ادب کا خیال رکھنا ممکن ہی نہیں، اور اگر کبھی ہو جائے تو یہ ایک عجوبہ ہو گا۔

یعنی عشق کی گہرائی اور معنی کو الفاظ میں بیان کرنا آسان نہیں ہے، یہ صرف کسی عظیم ہستی (مثلاً کسی صاحبِ کمال انسان) کے ذریعے ممکن ہو سکتا ہے۔ عشق کی مستی ایک ایسی حالت ہے جہاں انسان خود سے بے خبر ہو جاتا ہے، اور اس حالت میں ادب یا آداب کا خیال رکھنا ممکن نہیں رہتا۔ اگر کوئی شخص ایسی کیفیت میں ادب کا دامن تھام لے تو یہ کسی عجوبے سے

کم نہیں ہو گا۔

مولانا نے اپنی اس غیر معمولی صلاحیت کے ذریعے ایسے بے نظیر ادبی شاہکار تخلیق کیے جو عرفانی ادب میں اپنی مثال آپ ہیں۔ ان کے کام، چاہے وہ معنوی گہرائی کے لحاظ سے ہوں یا الفاظ اور صورت کی خوبصورتی کے اعتبار سے، کمال کی بلندی پر ہیں۔ دیوان شمس اور مثنوی معنوی میں پیش کی جانے والی حیرت انگیز تصاویر ان کی عظمت کی گواہی دیتی ہیں۔

مولانا، جو شمس سے ملاقات سے قبل شاعری کے میدان میں دوسروں کے کام پر توجہ دیتے تھے، عشق کی برکت سے نہ صرف ایک وسیع اور گہری زبان کے مالک بن گئے بلکہ کمیت کے لحاظ سے بھی فارسی ادب کے اول درجے کے شاعروں میں شمار ہونے لگے۔

عارفوں میں ایک مقولہ مشہور ہے: "مَن عَرَفَ اللہَ طالَ لسانُہ." "یعنی جس نے خدا کو پہچان لیا، اس کی زبان دراز ہو گئی۔

اسی اعتبار سے مولانا اور ابن عربی جیسے عارفوں کے کام دنیا کے ہر دور کے مصنفین میں سب سے زیادہ ضخیم شمار کیے جاتے ہیں۔ معانی اس شدت سے ان پر ہجوم کرتے تھے کہ ان کے لیے ان سے منہ موڑنا یا نظر انداز کرنا ممکن نہ تھا۔ معشوق ان کے اندر سے تلقین کرتا اور وہ اس کی خواہشات کو بے اختیار الفاظ اور عبارات کے قالب میں ڈھالتے چلے جاتے تھے۔

مولانا نے اپنی کئی تحریروں میں یہ واضح کیا ہے کہ محبوب انھیں اندر سے شعر تلقین کرتا ہے اور اگر وہ اس تلقین کو رد کرتے ہیں تو معشوق کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ وہ معشوق سے دعا کرتے ہیں کہ اس کی خواہشات کو اپنی عنایات کے ساتھ ملائے اور ان سے وہ طلب نہ کرے جسے وہ مناسب طریقے سے پورا کرنے کے قابل نہ ہوں۔ مثنوی میں فرماتے ہیں:

ای تقاضاگر دَرون ہمچون جنین — چون تقاضا می کنی اِتمامِ این

سہل گردان، رَه نما، توفیق ده — یا تقاضا را بِہِل ، بر ما منه

چون ز مفلس زَر تقاضا می کنی — زَر ببخشش در سِر ای شاہِ غَنی!

بی تو نظم و قافیہ شام و سحر زَہرہ کِی دارد کہ آید در نظر؟
نظم و تجنیس و قوافی ای علیم! بندہ اَمرِ تواَند از تَرس و بیم

(مثنوی دفتر سوم، بخش:56)

ترجمہ:

- اے وہ ذات جو دل کی پوشیدہ خواہشوں سے واقف ہے، جب تو کوئی طلب کرتا ہے تو اس کے پورا ہونے کا انتظام بھی فرما۔
- راہ کو آسان کر، رہنمائی فرما، اور توفیق عطا کر، یا پھر اس طلب کو چھوڑ دے اور ہم پر بوجھ نہ ڈال۔
- اگر کسی مفلس سے دولت کی طلب کرتا ہے، تو اے بے نیاز بادشاہ! اپنی طرف سے اسے دولت عطا فرما۔
- تیرے بغیر دن اور رات کی شاعری اور قافیہ بندی میں کوئی ہمت نہیں کہ وہ تیری بارگاہ میں پیش ہو سکے۔
- اے علیم (جاننے والے)، نظم، تجنیس اور قوافی، یہ سب تیرے حکم کے تابع ہیں، اور تیرے خوف اور ہیبت کے سبب ایسا ممکن ہے۔

مولانا، باوجود اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، زبان کے دائرے کو عشق اور محبوب کے معانی کو منتقل کرنے کے لیے تنگ اور حقیر سمجھتے تھے۔ وہ اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ اپنی تمام تر قابلیت کے باوجود کیوں ناتوانی کا اظہار کرتے ہیں، اور ان کے خیالات کو درج ذیل نکات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

عشق کی لامحدودیت:

مولانا کے مطابق عشق کے بارے میں بات کرنے کی دشواری کی ایک بڑی وجہ اس کی وجودی حیثیت کا لامحدود ہونا ہے۔ ان کے نزدیک عشق وہ بے حساب محبت ہے جو دراصل

صرف اور صرف حق (خدا) کی صفت ہے۔ مثنوی میں فرماتے ہیں۔

عشق وَصفِ ایزَد است، اما کہ خَوف — وَصفِ بَندہ یِ مُبتَلایِ فَرج و جَوف

چون "یحبونَ" بخواندی در نُبی — با "یحِبُّھُم" قَرین در مَطلَبی

پس مَحَبَّت وَصفِ حَق دان، عشق نیز — خَوف نَبوَد وَصفِ یزدان ای عزیز!

وَصفِ حَق کو؟ وَصفِ مُشتی خاک کو؟ — وَصفِ حادِث کو و وَصفِ پاک کو؟

شَرحِ عشق اَر من بگویم بر دَوام — صَد قیامَت بُگذَرَد، وان ناتَمام

زانکہ تاریخِ قیامَت را حَد است — حَد کُجا آنجا کہ وَصفِ ایزَد است

(مثنوی دفتر پنجم، بخش: 87)

یعنی:

- عشق خداوند کا وصف ہے، جب کہ خوف ایک بندے کا وصف ہے جو اپنے جسمانی اور دنیاوی ضروریات میں مبتلا ہے۔
- جب تم قرآن میں "یحبونہ" (وہ خدا سے محبت کرتے ہیں) پڑھتے ہو اور یہ "یحبھم" (خدا ان سے محبت کرتا ہے) کے ساتھ ملتا ہے، تو محبت اور عشق کو خدا کا وصف سمجھو، نہ کہ خوف کو، کیوں کہ خوف خدا کا وصف نہیں ہے۔
- خدا کی صفات اور مخلوق کی صفات میں فرق ہے: خدا کی صفات پاکیزہ اور ابدی ہیں، جب کہ مخلوق کی صفات محدود اور ناپائیدار ہیں۔
- اگر میں عشق کی حقیقت بیان کرنا شروع کروں تو یہ بیان اتنا طویل ہوگا کہ سینکڑوں قیامتیں گزر جائیں گی، پھر بھی یہ بیان مکمل نہیں ہوگا۔
- قیامت کا وقت مقرر ہے، لیکن خدا کی صفات کا بیان کسی حد و قیود میں قید نہیں ہو سکتا۔

یہ وجودیاتی حقیقت مخلوقات سے ہر قسم کی محدود اور مکمل شناخت کے امکانات کو سلب

کر دیتی ہے۔ معرفت شناسی کے اہم مباحث میں سے ایک موضوع شناخت کا متعلق (یعنی وہ چیز جو قابلِ شناخت ہے) ہے۔ یہ کہ کیا چیز اصولاً قابلِ شناخت ہے اور کیا چیز قابلِ شناخت نہیں؟ ان سوالات کے جوابات ہمارے شناخت کے آلے پر منحصر ہوں گے۔ عقل کے بارے میں اور اس کے توسط سے کیا چیز قابلِ شناخت ہے، بہت کم سوچنے والے اس پر شک کرتے ہیں کہ عقل صرف محدود اور مقید چیزوں کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اگرچہ مطلق کی طرف کوئی راستہ ہو سکتا ہے، تو وہ قیدوں کو دور کرنے کے ذریعے ممکن ہے، لیکن عقل اپنے محدود دائرے کے اندر رہتے ہوئے مطلق چیزوں کو کبھی بھی بلاواسطہ نہیں سمجھ سکتی۔ یہ عقل کی مذمت نہیں بلکہ اس کی فعالیت اور اس کے دائرے کی حدود کو ظاہر کرنے کا ایک انداز ہے۔

عَقل چون شِحنہ ست، چون سُلطان رَسید — شِحنہ یِ بیچارہ در کُنجی خَزید
عَقل سایہ یُ حَق بُوَد، حَق آفتاب — سایہ را با آفتابِ او چہ تاب
عقل، چون جِبریل گوید: احمدا! — گر یکی گامی نَہَم سوزَد مَرا
تو مَرا بگذار زین پَس، پیش ران — حَدِّ من این بود، ای سلطانِ جان!

(مثنوی دفتر چہارم، بخش:79)

ترجمہ:

- عقل ایک سپاہی کی مانند ہے، لیکن جب سلطان (خدا کا عشق یا معرفت) آتا ہے تو وہ بیچارہ سپاہی ایک کونے میں چھپ جاتا ہے۔
- عقل خدا کا سایہ ہے، اور خدا خود آفتاب کی مانند ہے؛ سایہ کبھی آفتاب کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔
- عقل جبرائیل کی طرح کہتی ہے: "اے محمد ﷺ! اگر میں ایک قدم بھی آگے بڑھاؤں، تو میں جل جاؤں۔
- جبرائیل مزید کہتا ہے: "مجھے یہاں چھوڑ دو اور خود آگے بڑھو، کیونکہ یہ میری حد ہے،

اے جان کے سلطان!"

عقل، جو کہ محدود اور مقید ہے، مطلق (یعنی لامحدود حقیقت) کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مطلق کی کوئی قید یا حد نہیں، جب کہ عقل کا کام چیزوں کو حدود اور قید کے ساتھ سمجھنا ہے۔ چنانچہ حق متعال، جو کہ اپنے اطلاق (یعنی ہر قید و حد سے ماورا) میں ہے، عقل کے ذریعے مکمل طور پر سمجھا یا پہچانا نہیں جا سکتا۔

یہ نکتہ تصوف اور فلسفہ میں بہت اہم ہے، جہاں کہا جاتا ہے کہ خدا یا مطلق حقیقت کو عقل کے بجائے عشق، دل، یا روحانی تجربے کے ذریعے پہچانا جا سکتا ہے۔ عقل کی محدودیت ہمیں ظاہری حقائق تک پہنچنے دیتی ہے، لیکن حقیقتِ مطلق تک رسائی کے لیے عقل کافی نہیں ہوتی۔

یہ غیر قابلِ شناخت ہونے والی ذاتِ مطلقِ حق، جس طرح کہا گیا ہے، اُس کی لامحدودیت سے پیدا ہوتی ہے، اور چونکہ علم حاصل کرنے کے لیے معلوم پر محیط ہونا ضروری ہے، عالم کو معلوم پر محیط ہونا چاہیے تاکہ وہ اُسے پہچان سکے۔ دوسری جانب، ذاتِ حق بے چون و چرا اور لامحدود ہے، کسی کو یہ نصیب نہیں کہ وہ اُسے احاطہ کر سکے۔ اس لیے کسی کو اس راستے میں خدا کی شناخت کی خواہش کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔

عشق، جو مولانا کے مطابق خدا کی توصیف ہے، اسی اطلاق کے میدان سے متعلق ہے۔ عارفوں اور عاشقوں کی عملی سفر میں بھی اگر کوئی شناخت یا وصال حاصل ہو، تو وہ خیالِ حق ہے، جو حق کے مراتب میں سے ایک مرتبت ہے، اور کوئی خیالی یا غیر حقیقی چیز نہیں ہے۔

سیمرغ سے ملاقات کے لیے مرغان کے سفر کی ایک کہانی بیان کرتے ہیں، یہ کہانی سالکوں اور واصلوں کے مقام کو بیان کرتی ہے، جہاں وہ حقیقتِ ناشناسی کو پہچانتے ہیں، کہتے ہیں:

"وہ تمام پرندے سیمرغ کی خدمت میں گئے۔

سات دریا آئے، جن میں سے کچھ برف کی وجہ سے ہلاک ہو گئے اور کچھ دریا کی بو سے گر پڑے۔ ان سب میں سے دو پرندے بچ گئے۔ انھوں نے خیال کیا کہ ہم سیمرغ تک پہنچیں گے۔ جب انھوں نے سیمرغ کو دیکھا، دو بوندیں خون ان کی چونچ سے گریں اور وہ جان دے بیٹھے۔ سیمرغ وہیں جبلِ قاف کے اس پار ہے۔ لیکن اس کی پرواز وہاں سے کہاں تک جاتی ہے، اللہ بہتر جانتا ہے۔ یہ تمام پرندے اپنی جان دے دیتے ہیں تاکہ جبلِ قاف کی گرد ہی حاصل کر سکیں۔"

یہ اس وجہ سے ہے کہ انسانی وسائل عشقِ سیمرغ کی تلاش میں بہت کمزور ہیں، اور آخر کار یہ صرف ایک تصویری اور خیالی تصور حاصل کرتا ہے۔ مولانا اس بات کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

پیشِ بی‌حَد ہرچہ مَحدود است، لاست | کُلُّ شَیءٍ غیرِ وَجهُ الله، فَناست

(مثنوی دفتر دوم، بخش:95)

یعنی: جو بھی چیز محدود ہے، وہ لامحدود (خدا) کے سامنے بے حقیقت یا غیر حقیقی بن جاتی ہے۔ ہر شے جو خدا کے کے علاوہ ہے، فنا ہونے والی ہے۔

یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ دنیا کی ہر محدود چیز عارضی ہے اور بقا صرف خدا کی ذات کو حاصل ہے۔ تصوف میں یہ تصور بیان کرتا ہے کہ حقیقی وجود صرف خدا کا ہے، اور باقی سب فنا ہونے والا ہے۔ یہ انسان کو دنیاوی چیزوں سے دل لگانے کے بجائے خدا کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب ہے۔

اگر ہم اس نکتے کو اچھی طرح سمجھ لیں کہ عشق، در حقیقت، خود وصفِ حق ہے، تو ہم

جان لیں گے کہ چونکہ حق تعالیٰ لا محدود ہے اور ایسا وجود جو لا محدود ہو، اس کی عقل میں کوئی صورت نہیں ہوتی، لہٰذا نامانوس ہونے کی باعث زبان میں بھی لفظ و بیان کی کمی ہوتی ہے۔ جو کچھ زبان میں بیان ہونا چاہیے، اس کی ابتدا پہلے ذہن کے تصور سے ہوتی ہے، اور جو چیز تصور نہیں کی جاسکتی، وہ زبان میں بھی صحیح بیان نہیں کی جاسکتا۔

دیوان شمس کی ایک مشہور غزل میں مولانا اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ عشق کی مختلف تجلیات کے باوجود، اس کے اوصاف حقیقت میں صرف خدا کے ساتھ منطبق ہوتے ہیں۔ اس غزل میں عشق اس بات کو بیان کرتا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی فرشتہ، بشر یا اور کوئی چیز نہیں، جو عاشق کو برہم کرتا ہے اور عاشق یکدم اس حقیقت کو محسوس کرتا ہے کہ یہ اوصاف خدا کے ہیں۔ وہ عشق سے کہتا ہے کہ میرے ساتھ بطورِ والد سلوک کرو۔ عشق عاشق کے کلام کی تصدیق کرتا ہے اور اس سے پردہ پوشی کی درخواست کرتا ہے، جیسا کہ مولانا کہتے ہیں۔

دوش دیوانہ شدم، عشق مرا دید و بگفت
آمدم، نعرہ مزن، جامہ مدر، ہیچ مگو
گفتم: ای عشق! من از چیز دگر می ترسم
گفت: آن چیز دگر نیست دگر، ہیچ مگو
من بہ گوش تو سخنہای نہان خواہم گفت
سر بجنبان کہ بلی، جز کہ بہ سر ہیچ مگو
قمری، جان صفتی در رہ دل پیدا شد
در رہ دل چہ لطیف است سفر، ہیچ مگو
گفتم: ای دل! چہ مہ است این؟ دل اشارت می کرد
کہ نہ اندازہ توست این، بگذر، ہیچ مگو
گفتم: این روی فرشتہ است عجب یا بشر است؟

گفت: این غیر فرشتہ است و بشر، ہیچ مگو
گفتم: این چیست؟ بگو، زیر و زبر خواہم شد
گفت: می باش چنین زیر و زبر، ہیچ مگو
ای نشستہ تو در این خانہ پر نقش و خیال
خیز از این خانہ برو، رخت ببر، ہیچ مگو
گفتم: ای دل! پدری کن، نہ کہ این وصف خداست؟
گفت: این ہست، ولی جان پدر ہیچ مگو

(دیوان شمس، غزل:2219)

ترجمہ:

- کل رات میں دیوانہ ہو گیا، عشق نے مجھے دیکھا اور کہا: ”میں آیا ہوں، شور مت مچاؤ، کپڑے مت پھاڑو، اور کچھ نہ کہو۔“
- میں نے کہا: ”اے عشق! مجھے کسی اور چیز سے ڈر لگتا ہے۔“. عشق نے کہا: ”وہ اور چیز موجود ہی نہیں، بس کچھ نہ کہو۔“
- میں نے کہا: ”میں تمھارے کان میں کچھ راز کی باتیں کہنا چاہتا ہوں۔“عشق نے کہا: ”بس ہاں میں اپنا سر ہلاؤ، اور زبان سے کچھ نہ کہو۔“
- ایک قمری (جان جیسا پرندہ) دل کے راستے پر ظاہر ہوا۔ عشق نے کہا: ”دل کے راستے میں سفر بہت لطیف ہے، کچھ نہ کہو۔“
- میں نے دل سے پوچھا: ”یہ کیا خوبصورت چاند جیسی چیز ہے؟“ دل نے اشارہ کیا: ”یہ تمھارے اندازے سے باہر ہے، اس پر غور مت کرو، کچھ نہ کہو۔“
- میں نے کہا: ”یہ چہرہ کسی فرشتے کا ہے یا انسان کا؟“ دل نے جواب دیا: ”یہ نہ فرشتہ ہے نہ انسان، کچھ نہ کہو۔“

- میں نے کہا: "یہ کیا ہے؟ مجھے اندر سے الٹ پلٹ کر دیا ہے۔" دل نے کہا: "ایسے ہی رہو، اور کچھ نہ کہو۔"
- اے شخص، جو خیالات اور تصورات سے بھرے اس گھر میں بیٹھا ہے، اٹھ اور اس گھر کو چھوڑ دے، اپنا سامان لے جا، اور کچھ نہ کہہ۔
- میں نے دل سے کہا: "کیا یہ حقیقت خدا کی صفت نہیں؟" دل نے کہا: "یہی ہے، لیکن اے جانِ پدر، کچھ نہ کہو۔"

یہ اشعار عشق الٰہی کے تجربات، راز، اور خاموشی کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں۔ مولانا روم یہاں عشق کو ایک رہنما کے طور پر پیش کرتے ہیں، جو بندے کو ہر دنیاوی خوف، وہم، اور سوال سے آزاد کر کے حقیقتِ مطلق کی طرف لے جاتا ہے۔ عشق کہتا ہے کہ ہر چیز کو سمجھنے کی کوشش نہ کرو، بلکہ خود کو اس کے حوالے کر دو، کیوں کہ خدا کی حقیقت الفاظ اور سوالات سے ماورا ہے۔

عشق وصف خدا ہے، اس کے نتیجے میں وہ اوصافِ الٰہی کی طرح، جہاں وہ ایک جانب شناخت پذیر ہیں، دوسری جانب ناشناختہ بھی رہتے ہیں۔ عشق، باوجود اس کے کہ دل و جان میں رچ بس جاتا ہے، دل و جان کو اس کی حقیقت کی خبر نہیں ہوتی، اور زبان پر جب بیان آتا ہے تو گویا صاحبِ زبان بھی اس سے غافل رہتا ہے۔ عاشق باوجود اس کے کہ اپنی تمام ہستی کو عشق پر قربان کرتا ہے اور اس کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن اس کی بیکرانی اور طوفانِ عظیم کے درمیان ایسا نہیں کر سکتا کہ اسے اس کا مکمل احاطہ حاصل ہو اور پھر اس پر بات کر سکے اور تعریف بیان کرے۔ مختصراً، عشق کی کوئی ایسی گہرائی نہیں جو کسی ایک لفظ میں سما سکے اور نہ ہی کوئی ایسی بات کہ جو عشق کے ہم معنی بیان ہو۔

شیخ احمد جام نے اس نکتے کو اس طرح ادا کیا:

"محققان در عشق سخن گفتن ترک ادب عظیم دانند۔
در عشق چگونگی نباشد و کس را بر عشق چرایی نیست، اما از بہر

دوستان کہ در خواستند، بخیلی نتوانستیم کرد، و اگر نہ چہ جای
آن است کہ از عشق و عاشقان سخن گفتن و سخن ایشان بہ صحرا
نہادن؟

امابدان کہ عشق دریای عظیم است کہ کس بہ کرانہ آن
نرسد و قعری دارد کہ ہر چیزی در قعر آن جای نگیرد و آبی دارد
کہ ہر کس از آن شربتی نتواند خورد و ہر ملاحی در آنجا کشتی نتواند
راند و ہر غواصی از او دُربر نتواند آورد و ہر جانور در آنجا زندگانی
نتواند کرد؛ مگر ہر چہ در دریای عشق باشد، ہم از عشق باشد۔
مثل این دریای عشق و آب او ہمچون مثل آتش است؛ ہر چہ بہ
آتش رسد ہمہ آتش گردد و ہمہ رنگ او گیرد۔"

ترجمہ: محققین عشق کے بارے میں گفتگو کو ترکِ ادب کا عظیم درجہ سمجھتے ہیں۔ عشق میں کوئی کیفیت یا حالت نہیں ہوتی اور کسی کو یہ حق نہیں کہ عشق پر سوال اٹھائے۔ لیکن چونکہ دوستوں نے درخواست کی، ہم بخل نہیں کر سکے۔ ورنہ یہ کہاں مناسب ہے کہ عشق اور عاشقوں کے بارے میں بات کی جائے اور ان کی باتوں کو عام کیا جائے؟

یہ جان لو کہ عشق ایک عظیم سمندر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں اور اس کی گہرائی ایسی ہے کہ ہر چیز اس کی تہ میں جگہ نہیں پا سکتی، اس کا پانی ایسا ہے کہ ہر کوئی اس کا ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتا، ہر ملاح وہاں کشتی نہیں چلا سکتا، ہر غوطہ خور وہاں سے موتی نہیں نکال سکتا، اور ہر جاندار وہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن جو بھی اس عشق کے سمندر میں ہوتا ہے، وہ خود عشق کا حصہ ہوتا ہے۔ اس عشق کے سمندر اور اس کے پانی کی مثال آگ کی سی ہے؛ جو بھی آگ تک پہنچتا ہے، وہ خود آگ بن جاتا ہے اور اس کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

یہ دریای عشق ہے جس کی گہرائیوں میں اوصافِ خداوندی پنہاں ہیں، مگر کوئی بھی شمار

کر کے نہیں لا سکتا۔ خاص طور پر وہ دریا جس کی بات مولانا کرتے ہیں، ہفت دریا اس کے مقابلے میں مانند کاغذ کے پتوں کے ہیں۔ سمندر کی مثال دے کر وہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ عشق کو بیان میں نہیں لایا جا سکتا، اور اس بات کو بھی سمجھنا ضروری ہے کہ وہ جس سمندر میں ڈوبنے کی کوشش کر رہا ہے، وہ سمندر ہے، نہ کہ کوئی ندی یا نالہ۔ مولانا خود بھی اس بات کو بار بار دہراتے ہیں کہ اس عظیم دریا میں داخل ہونے والے کو چاہیے کہ اپنے آپ کو پہچان لے، کیوں کہ یہ سمندر ہے کوئی عام ندی۔ مثنوی میں فرماتے ہیں ؎

هِل سِباحَت را، رہا کُن کِبر و کین
نیست جیحون، نیست جو، دَریاست این

(مثنوی، دفتر چہارم، بخش:52)

یعنی: ”تیراکی کی کوشش چھوڑ دے، غرور اور کینہ کو ترک کر دے؛ یہ نہ کوئی دریا ہے، نہ ندی، بلکہ یہ (تو عظیم الشان) سمندر ہے۔(جہاں انسانی انا اور منفی جذبات کے لیے کوئی جگہ نہیں)۔

غیرتِ عشق:

ایک اہم نکتہ جو مولانا اپنی شاعری اور تصانیف میں بار بار بیان کرتے ہیں، وہ عشق کی غیرت ہے۔ مولانا کے مطابق، عشق کسی بھی صورت میں حقائقِ عشق کو ظاہر ہونے کی اجازت نہیں دیتا۔ عشق ایسی چیز ہے جو عاشق کو اس قدر اپنے سحر میں گرفتار کر لیتا ہے کہ وہ نہ کسی اور کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے اور نہ ہی اپنے راز کو دوسرے لوگوں کے ساتھ شیئر کر سکتا ہے۔ عشق کو یہ گوارا نہیں کہ حقائقِ عشق کو دنیا کے سامنے آشکارا کیا جائے، کیوں کہ عشق ہمیشہ اپنے راز کو پوشیدہ رکھتا ہے اور صرف عاشق کے دل میں رہتا ہے۔ یہ عشق کا اپنا غیرت مند ہونا ہے جو عاشق کو ایسی حالت میں ڈال دیتا ہے کہ وہ اس راز کو جو اسے خود خدا کے قریب کرتا ہے، کسی اور کے ساتھ نہیں بانٹتا۔

مولانا ایک مثال کے طور پر مشہور عرب شاعر متنبّی کے شعر کو نقل کرتے ہیں:

لَبِسنَ الوَشی لا مُتَجَمِّلاتٍ

و لکِن کَی یصُن بِهِ الجَمالا

یعنی: انھوں نے زریں لباس زیب تن کیا، زینت کے طور پر نہیں، بلکہ اس لیے کہ اس کے ذریعے جمال (خوبصورتی) کی حفاظت ہو سکے۔"

غیرت عشق، عاشق کو ایسی گہرائیوں میں لے جاتی ہے جہاں نہ وہ دوسروں کو دیکھ سکتا ہے، نہ دوسروں کو اپنے راز بتا سکتا ہے۔ یعنی، عشق کی غیرت اس قدر شدت رکھتی ہے کہ وہ عاشق کو کسی غیر کو دیکھنے یا اپنے راز کو آشکار کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ عاشق ہمیشہ اپنے محبوب کے قریب رہ کر اس کے عشق کو اپنے دل میں محفوظ رکھتا ہے اور اپنی روحانی دنیا کو دوسروں سے چھپا کر رکھتا ہے۔

ایک اہم وجہ جو مولانا کے نزدیک عشق کے حقائق کو بیان کرنے میں ناکامی کا باعث بنتی ہے، وہ عشق کی غیرت اور عاشق و معشوق کی گہرائی ہے۔ مولانا عشق کو حق تعالیٰ کے صفات میں شمار کرتے ہیں، جن میں سے ایک عظیم صفت غیرت بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی غیرت ایسی ہے کہ وہ کسی کو اپنے راز کے قریب نہیں آنے دیتا اور اپنی محبت کو کسی اور کے ساتھ شریک نہیں ہونے دیتا۔ اسی طرح، عشق کی بھی اپنی غیرت ہے جو عاشق کو اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنے راز کو کسی اور کے ساتھ شیئر کرے۔

مولانا کے مطابق عشق ایک سلطان کی مانند ہے جو اگر کسی عاشق کے دل میں داخل ہو جائے، تو وہ اس کے تمام وجود پر چھا جاتا ہے اور اس کے دل میں کچھ بھی باقی نہیں چھوڑتا۔ یہ عشق کی قہاریّت اور غیرت ہے جو اسے اجازت نہیں دیتی کہ وہ اپنی ملکیت کو کسی اور کے ساتھ تقسیم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ عاشق نہ صرف اپنے محبوب سے مکمل طور پر جُڑ جاتا ہے، بلکہ کسی دوسرے کے ساتھ اپنے عشق کو شیئر کرنے کا تصور بھی اس کے لیے ناقابلِ قبول ہو جاتا ہے۔

عشق کی یہ غیرت خدا کی قہاریّت سے منسلک ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود بھی غیور ہے اور وہ اپنی محبت کو کسی اور کے ساتھ شریک نہیں کرتا۔ مولانا فرماتے ہیں:

غیرت و رشک خدا آتش زند اندر دو کون
گر سر مویی ز حسنش بی حجاب آید بہ ما
از ورای صدہزاران پردہ حسنش تافتہ
نعرہ ہا در جان فتادہ مرحبا شہ مرحبا
(دیوان شمس، غزل:144)

ترجمہ:

- خدا کی غیرت اور رشک دونوں جہانوں کو جلا کر راکھ کر دیں گے، اگر اس کے حسن کا ذرہ برابر بھی پردہ ہٹ جائے اور ہم پر ظاہر ہو جائے۔
- لاکھوں پردوں کے پیچھے سے اس کا حسن جھلک رہا ہے، اور اس کے جلوے کو دیکھ کر روح میں نعرے اٹھتے ہیں: "مرحبا اے بادشاہ! مرحبا"!

یہ اشعار خدا کے حسنِ مطلق اور اس کی جلوہ گری کی ناقابلِ برداشت شدت کو بیان کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ خدا کا حسن ایسا عظیم ہے کہ اگر اس کا معمولی سا بھی پردہ ہٹ جائے تو دونوں جہانوں کے وجود کو فنا کر دے۔ خدا کا حسن پردوں کے پیچھے سے بھی اپنی چمک دکھاتا ہے، اور اس کے جلوے روح کو ایک وجدانی کیفیت میں ڈال دیتے ہیں، جہاں زبان بے اختیار اس کی تعریف میں "مرحبا" کہنے لگتی ہے۔

یہ اشعار انسان کی محدودیت اور خدا کی لامحدودیت کے تعلق کو بیان کرتے ہیں، جہاں انسانی آنکھ اور عقل اس حسن کو براہِ راست برداشت کرنے کے قابل نہیں۔

کہتے ہیں کہ:

"غیرت عشق، عاشق کو ایسی جگہ لے جاتی ہے

جہاں وہ کسی اور کو اپنے محبوب کے قریب نہیں دیکھ سکتا۔ یہ
عشق کا قاہری ہونے کا اثر ہے جو کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ
وہ اس میں مداخلت کرے۔"

یعنی، عشق کی قاہریّت اور غیریت، عاشق کو اتنا مخلص بناتی ہے کہ وہ اپنے محبوب کے علاوہ کسی اور چیز کو برداشت نہیں کرتا اور اس کی پوری زندگی اسی محبت میں ڈوب جاتی ہے۔

مولانا اس بات کی وضاحت کرتے ہیں ہے کہ معشوق، عاشق اور معشوق کے درمیان اتنا غیور ہے کہ وہ عاشق سے کوئی نالہ یا شکایت سننا بھی گوارا نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ معشوق عاشق کے لب پر ہمیشہ خاموشی کی مہر لگا دیتا ہے اور اسے ہر قسم کی حکایت سے روکتا رہتا ہے۔

یہ عشق کی وہ غیرت ہے جو عاشق کو اپنے دل کے رازوں کو دوسرے سے چھپانے پر مجبور کرتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

"معشوق اتنا غیور ہے کہ وہ حتیٰ یہ بھی برداشت
نہیں کرتا کہ عاشق سے کوئی نالہ سننے کو آئے۔ اس لیے وہ
ہمیشہ اس کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگا دیتا ہے اور ہر قسم کی
حکایت سے اسے منع کرتا ہے۔"

یہ غیرت عشق کا وہ پہلو ہے جو عاشق کو اپنی محبت کو دوسروں سے چھپانے پر مجبور کرتا ہے، کیوں کہ عشق کی اصل حقیقت اس کے اندر کی گہرائیوں میں پنہاں ہے اور اس کا اظہار ممکن نہیں۔

فرماتے ہیں:

تا کی شکنی عاشق خود را توز غیرت؟ ہِل تا دو سہ نالہ بکند این دل بیمار
امروز عجب نیست اگر فاش نگردد آن عالم مستور بہ دستوری ستار

(دیوان شمس، غزل:1037)

- کب تک غیرت کے باعث عاشق کو اس کے حال پر توڑتے رہو گے؟ چھوڑ دو، تاکہ یہ بیمار دل دو چار نالے کر لے۔
- آج اگر وہ پوشیدہ دنیا ظاہر نہیں ہو رہی، تو حیرت کی بات نہیں، کیونکہ وہ مستور ہے اور ستّار (پردہ پوش) کی اجازت سے ہی ظاہر ہو سکتی ہے۔

یہ اشعار غیرتِ عشق اور عاشق کی بے بسی کو بیان کرتے ہیں۔ شاعر خدا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ عاشق کو اتنا نہ توڑو، اس کی حالت پر رحم کرو تاکہ وہ اپنے دل کی تکلیف کا اظہار کر سکے۔ دوسری طرف، شاعر اس حقیقت کو قبول کرتا ہے کہ روحانی حقائق اور پوشیدہ دنیا خدا کی مرضی اور حکمت کے تحت ہی ظاہر ہوتی ہے۔ اگر وہ پردے میں ہے، تو یہ ستّار (پردے ڈالنے والے خدا) کی مصلحت کے تحت ہے۔ یہ اشعار عاشق کے صبر، عشق کی شدت، اور خدا کی حکمت کو خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں۔

تمثیل جو مولانا کو اس موضوع میں بہت پسند ہے، مگس اور شکر کی تمثیل ہے۔ اس تمثیل کے مطابق، وہ لوگ جو حقائق سے محروم ہیں، مگس کی طرح ہیں جو شکر کے گرد چکر لگاتی رہتی ہیں، حالاں کہ نہ تو یہ شکر ان کا ہے اور نہ ہی وہ پوری طرح اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔

مولانا اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ جیسے مگس شکر کے گرد پھرتی رہتی ہے لیکن نہ تو اسے شکر حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی اسے اس سے فائدہ ملتا ہے، بالکل اسی طرح محجوب لوگ بھی حقیقت کو نہ تو پا سکتے ہیں اور نہ اس سے مکمل طور پر لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ دیوان میں کہتے ہیں۔

مگس ہا را ز غیرت ای برادر! — از این بزم پر از شکر برون کن
دو چشم خائن نامحرمان را — از آن زیب و جمال فر برون کن

(دیوان شمس، غزل:1906)

ترجمہ:

- اے بھائی! غیرت کے باعث مکھیوں کو اس شکر سے بھرے محفل سے باہر نکال دو۔
- نامحرمان کی خیانت کرنے والی نگاہوں کو اس خوبصورتی اور جمال کے جلوے سے دور کر دو۔

یہ اشعار عشق کی غیرت اور حفاظت کو بیان کرتے ہیں۔ شاعر محبت اور جمال کی محفل کو پاکیزہ رکھنے کی تاکید کرتا ہے، جہاں غیر متعلقہ اور نااہل لوگوں کو شامل نہ ہونے دیا جائے۔ یہاں "مکھیوں" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اس محفل یا عشق کی حقیقت کے لائق نہیں، اور "نامحرم آنکھیں" ان لوگوں کی نمائندگی کرتی ہیں جن کی نیت صاف نہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ ایسی آنکھوں اور روحوں کو اس جمال کی حقیقت سے دور رکھو، کیوں کہ یہ جلوے صرف ان لوگوں کے لیے ہیں جو اس کے اہل ہیں۔ دیوان شمس میں فرماتے ہیں:

خامش کنم از غیرت، زیرا ز نبات تو
ابر شکر افشانم، جز قند نمی بارم
(دیوان شمس، غزل:1458)

ترجمہ: میں غیرت کے باعث خاموش رہتا ہوں، کیوں کہ تیری مٹھاس سے میں ایسا بادل ہوں جو شکر برساتا ہے اور اس سے صرف قند ہی برستا ہے۔

یہ شعر غیرت، عشق، اور اظہار کی لطیف کیفیت کو بیان کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ وہ عشق کی شدت اور غیرت کے سبب خاموش ہے، لیکن اس خاموشی کے باوجود اس کے وجود سے مٹھاس اور لطف برستا ہے۔

"ابر شکر افشاں" (شکر برسانے والا بادل) اور "جز قند نمی بارم" (صرف قند برساتا ہوں) سے مراد یہ ہے کہ عاشق کا وجود اور کلام محض لطف، محبت، اور مٹھاس کا ذریعہ ہے، اور اس کے اثرات ہمیشہ خوشگوار اور محبت سے بھرپور ہوتے ہیں۔

مولانا عشق کی بات چیت کو دلّالی سمجھتے ہیں جو اس کے اور اس کے چاہنے والوں کے درمیان رابطہ قائم کرتا ہے۔ مگر وہ اس بات کی طرف بھی توجہ دلاتے ہیں کہ صرف بات چیت ہی وہ واحد طریقہ نہیں ہے جو عشق اور اس کے چاہنے والوں کو آپس میں جوڑتا ہے، بلکہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملانے کے ہزاروں دیگر راستے بھی موجود ہیں۔ غیور عشق کو اس پر کوئی اعتراض نہیں کہ اظہار کو الفاظ کے قالب میں محدود کر دے، بلکہ وہ اپنے چاہنے والوں سے دیگر طریقوں سے بھی جڑتا ہے۔

دادِ سخن دادمی، سوسنِ آزادمی
لیک ز غیرت گرفت، دل رہِ گفتار من
شُکر کی آن ماہ را ہر طرفی مشتری است
نیست ز دلّالِ گفت، رونقِ بازار من
عربدہ قال نیست، حاجت دلّال نیست
جعفر طرّار نیست، جعفر طیار من
(دیوان شمس، غزل:2064)

ترجمہ:

- میں کلام کی داد دیتا، سوسنِ آزاد کی مانند بولتا، لیکن غیرت نے میرے دل سے گفتار کی راہ چھین لی۔
- شکر ہے کہ وہ چاند ہر طرف خریدار رکھتا ہے، مگر میرے گفتار کا بازار دلّال سے بے رونق ہے۔
- یہ شور و ہنگامہ صرف ظاہر کا کلام نہیں، اور نہ ہی اس میں کسی دلّال کی حاجت ہے، میرا جعفر کوئی دھوکہ باز نہیں، بلکہ جعفر طیار (جیسا وفادار) ہے۔

شاعر ان اشعار میں عشق کی غیرت اور اپنی خاموشی کی حکمت کو بیان کرتا ہے۔ وہ کہتا

ہے کہ وہ کلام کی قدرت رکھتا ہے، لیکن غیرت نے اسے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا ہے، کیوں کہ محبت کے حقیقی اظہار میں گفتار کی ضرورت نہیں ہوتی۔ محبوب حقیقی کا جمال اور کمال ہر طرف خریدار رکھتا ہے، لیکن اس کے عشق کی حقیقت کسی ظاہری اظہار یا دلّال کی محتاج نہیں۔ مولانا نے "جعفر طیار" کی مثال دے کر اپنے عشق کی پاکیزگی اور بلند مقاصد کو واضح کر دیا ہے اور یہ بتا دیا ہے کہ ان کا عشق کسی ظاہری دھوکے یا مکر سے مبرا ہے۔ یہ عشق حقیقی اور روحانی ہے، نہ کہ دنیوی یا فریب پر مبنی۔

مولانا کے آثار میں کئی ایسے مواقع ملتے ہیں جہاں وہ عشق کی بیان نہ ہونے کی بات کو غیرتِ عشق سے جوڑتے ہیں، ان کے مطابق عشق کی وسعت ایسی ہے کہ اس کی پوری حقیقت کو بیان کرنا ممکن نہیں، کیوں کہ اس کی گہرائی اور غیریت ہر قسم کی اظہار کو مسترد کر دیتی ہے۔ یہ تمام نکات اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مولانا کے عشق کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، مگر اس کی بیان کرنے کی کوشش ہمیشہ ناکام رہتی ہے۔

مولانا مثنوی معنوی میں گویا ہیں:

این سخن چون پوست و معنی مغز دان　　　این سُخن چون نقش و معنی ہمچو جان

پوست باشد مَغزِ بد را عیب پوش　　　مَغزِ نیکو را ز غیرت، غَیب پوش

(مثنوی، دفتر اول، بخش: 41)

ترجمہ:

- یہ کلام (الفاظ) پوست کی مانند ہے اور اس کا مطلب مغز کی طرح، یہ کلام ظاہر کی طرح ہے اور اس کا معنی جان کی مانند۔
- برے مغز (باطن) کے عیب کو پوست (ظاہر) ڈھانپ لیتا ہے، لیکن اچھے مغز (باطن) کو غیرت کے سبب پوشیدہ رکھا جاتا ہے۔

مولانا نے مطابق برے لوگوں کے ظاہر (پوست) ان کے عیبوں کو چھپا لیتے ہیں،

لیکن اچھے لوگوں کی حقیقت (مغز) غیرت کی وجہ سے ہمیشہ ظاہر نہیں ہوتی۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ حقیقی خوبصورتی یا حکمت کو ہمیشہ آسانی سے ہر کسی کے لیے عیاں نہیں کیا جاتا، کیونکہ یہ بلند اور نایاب چیزیں صرف اہل لوگوں کے لیے مخصوص ہوتی ہیں۔

دیوان شمس میں فرماتے ہیں:

وز ورای عشق آن کش شرح نیست جز همین گفتن که آن آید همی

بیش ازاین شرحش توان کردن، ولیک از سوی غیرت سنان آید همی

(دیوان شمس، غزل:2897)

ترجمہ:

- عشق کی اُس حقیقت سے آگے، جس کی کوئی شرح ممکن نہیں، صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ خود ہی آتی رہتی ہے۔
- اس کی مزید وضاحت کی جاسکتی ہے، لیکن غیرت کے سبب تیر (خاموشی کی پابندی) آ جاتا ہے۔

مولانا رومی کے مطابق عشق کی ایک ایسی سطح ہے جہاں الفاظ ناکام ہو جاتے ہیں، اور اسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ممکن ہے، لیکن عشق کی غیرت اجازت نہیں دیتی کہ اس راز کو کھولا جائے۔ یہ خاموشی عشق کے ادب اور اس کی عظمت کی علامت ہے، کیونکہ بعض حقائق اور تجربات ایسے ہوتے ہیں جو بیان کی حد سے باہر ہوتے ہیں اور صرف دل یا روح کی سطح پر سمجھے جا سکتے ہیں۔

دیوان شمس میں ہی ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

سینہ شکاف گشتہ، دل عشق باف گشتہ
چون شیشہ صاف گشتہ از جام حق تعالیٰ
اشکوفہ ہا شکفتہ، وز چشم بد نہفتہ

غیرت مرا بگفته : می خور، دہان میالا

(دیوان شمس، غزل:185)

ترجمہ:

- میرا سینہ کھل چکا ہے، اور دل عشق بُننے والا بن چکا ہے، وہ شیشے کی مانند صاف ہو چکا ہے، کیونکہ اسے حق تعالیٰ کے جام سے بھر دیا گیا ہے۔
- دل کے پھول کھل چکے ہیں اور یہ بد نگاہوں سے چھپایا ہوا ہے، عشق کی غیرت نے مجھے کہا: پی لے، لیکن اپنے دہن کو آلودہ نہ کر۔

مولانا کے عشق نے ان کے دل اور روح کو پاکیزگی اور شفافیت عطا کی ہے، جیسے کوئی شیشہ جو ہر دھبے سے پاک ہو۔ یہ پاکیزگی عشق کے جام (روحانی سرور) کا نتیجہ ہے جو براہِ راست خدا سے نصیب ہوا ہے۔ دوسری طرف، عشق کی غیرت دل کے اسرار اور نعمتوں کو عام کرنے سے روکتی ہے۔ غیرت شاعر کو نصیحت کرتی ہے کہ وہ اس الہی سرور کا لطف اٹھائے، لیکن اپنی گفتار یا عمل سے اسے آلودہ نہ کرے۔ یہ ایک لطیف اشارہ ہے کہ حقیقی عشق اپنے جوہر میں پوشیدہ اور مقدس رہتا ہے۔

یہ صرف محبت ہی نہیں ہے جو معشوق کی جمالیاتی ظاہر ہونے پر غیرت کرتا ہے، جب اس کی جمالیات کا کچھ حصہ ظاہر ہوتا ہے، تو آسمانی مخلوقات بھی اللہ تعالیٰ سے "جمیل الستر" کی دعا کرتے ہیں کہ وہ اس کو خوبصورتی سے چھپا دے۔ مولانا مثنوی میں فرماتے ہیں۔

عاشِق و مَستیّ و بُگشاده زَبان   الله الله اُشتُری بَر ناودان

چون ز راز و نازِ او گوید زبان   یا جَمیلَ السَّتر خوانَد آسمان

(مثنوی، دفتر سوم، بخش:226)

ترجمہ:

- عاشق مست ہو کر زبان کھولتا ہے، اللہ اللہ، یہ ایسا ہے جیسے کوئی اونٹ ناودان

(پرنالے) پر چڑھ جائے۔

- جب زبان اس کے راز اور ناز کو بیان کرنے لگتی ہے، تو آسمان "یا جمیل السّتر" پکار اٹھتا ہے۔

شاعر ان اشعار میں عشق کی مستی اور اس کے رازوں کی نزاکت کو بیان کر رہا ہے۔ عاشق جب عشق کی حالت میں ہوتا ہے، تو وہ بے قابو ہو کر اپنے جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن اس اظہار کو شاعر نے ایک غیر معمولی اور عجیب عمل سے تشبیہ دی ہے، جیسے ایک اونٹ کا پرنالے پر چڑھنا۔ اس تشبیہ میں عاشق کے اظہار کی ناموزونیت اور نزاکت کو بیان کیا گیا ہے۔

جب عاشق زبان سے عشق کے رازوں اور لطافتوں کو بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے، تو آسمان گویا اس پر غیرت کرتے ہوئے "یا جمیل السّتر" کہتا ہے، یعنی رازوں کو پردے میں رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ عشق کی کچھ باتیں اور حقیقتیں ایسی ہیں جنھیں افشا کرنا مناسب نہیں، کیوں کہ وہ صرف عاشق اور معشوق کے درمیان رہنے والی چیزیں ہیں۔

لیکن چون "راز جز با رازدان انباز نیست"، عشق کو دیکھتے ہو کہ اس کی تمام ظاہر ہونے کے باوجود، وہ سب لوگوں سے چھپا ہوا ہے۔ اگر چہ کہا جاتا ہے، وہ مختلف صورتوں میں آشکارا ہوتا ہے، لیکن کوئی ناآشنا اس کے دروازے تک نہیں پہنچتا۔ یہ اس لیے ہے کہ عشق چھپنے والا بھی ظاہر ہے اور ظاہر ہونے والا بھی چھپا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ عشق ایک ایسا جذبہ ہے جو پوشیدہ ہونے کے باوجود نظر آتا ہے، اور نظر آنے کے باوجود پوشیدہ ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا گیا کہ عشق حق تعالیٰ کی صفت ہے، اور اللہ تعالیٰ قاہر اور غیرت مند ہے۔ وہ ایک واحد قہار ہے جو تمام وجود کو بھر دیتا ہے، اور کسی بھی ضد یا دوسرے کو اس میں جگہ نہیں دیتا تاکہ قاعدے کے مطابق "اشیاء کو ان کے ضدوں اور مختلف چیزوں کے ذریعے سے پہچانا جائے"۔

اہلِ معرفت اور حکما کے مطابق، عشق وجود کے مساوی اور خارجیت کا عین ہے، اس

لیے عشق قہار تمام کائنات کو بھر دیتا ہے، اور اس کا چھپنا اس کی ظاہر ہونے کا کوئی جواز نہیں ہے۔ صوفیا کے درمیان ایک مشہور قاعدہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنی حد سے باہر نکلتی ہے، تو وہ اپنے ضد میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس قاعدے کے مطابق بے حد ظاہر ہونا چھپنے کا سبب بنتا ہے۔ عشق کی وجودی غیرت کا یہی مطلب ہے، اور اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا باوجود اس کے کہ عشق کو چھپانے کی بات کرتے ہیں، صاف کہتے ہیں کہ عشق کو چھپانا ممکن نہیں ہے۔

سترچہ؟ در پَشم و پَنبہ آذَر است — تا ہمی پوشیش، او پیداترَ است

چون بِکوشَم تا سِرَش پنہان کنم — سَر بَرآرَد چون عَلَم، کاینک مَنَم

رَغمِ اَنفَم گیرَدَم او ہر دو گوش — کای مُدَمَّغ! چونَش می پوشی؟ بپوش

گویَمَش رو، گرچہ بَرجوشیدہ ای — ہمچو جان پیدائیّ و پوشیدہ ای

(مثنوی، دفتر سوم، بخش:226)

ترجمہ:

- پردہ کیا ہے؟ یہ تو پشم اور پنبہ میں آذر (آگ) جیسا ہے، جتنا اسے چھپانے کی کوشش کرو، وہ اتنا ہی ظاہر ہو جاتا ہے۔
- جب میں اس کے راز کو چھپانے کی کوشش کرتا ہوں، وہ علم (پرچم) کی طرح سر اٹھا کر کہتا ہے: "یہ میں ہوں!"
- باوجود میری مرضی کے، وہ میرے دونوں کان پکڑ لیتا ہے، اور کہتا ہے: اے سرگشتہ! جب چھپا نہیں سکتے، تو چھپانے کی کوشش بھی چھوڑ دو!

میں اسے کہتا ہوں: چلا جا، اگرچہ تو میرے اندر جوش مار رہا ہے، تو جان کی طرح ظاہر بھی ہے اور پوشیدہ بھی۔

یہ اشعار اس حقیقت کو بیان کرتے ہیں کہ عشق یا روحانی سچائی کو چھپانے کی کوشش بے سود ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو پردے میں رہنے کے باوجود ظاہر ہو جاتی ہے، جیسے

آگ جو کپڑے کے اندر بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ شاعر بیان کرتا ہے کہ جب وہ عشق کے راز کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے، تو یہ خود کو زیادہ شدت سے ظاہر کرتا ہے۔ یہ راز اتنا طاقتور ہے کہ کسی کی مرضی کے خلاف بھی سامنے آجاتا ہے، جیسے کوئی اپنے وجود کو علم کی طرح بلند کر کے نمایاں کرے۔

آخری مصرع میں شاعر عشق کی دوہری حقیقت کو بیان کرتا ہے: یہ ایک طرف جان کی طرح ہر جگہ موجود ہے، لیکن دوسری طرف اپنی غیرت کے باعث پوشیدہ بھی رہتا ہے۔ یہ اشعار عشق کی ناقابلِ تردید اور غیرت آمیز حقیقت کی گہرائی کو ظاہر کرتے ہیں۔

یہاں ہم ہرگز عشق اور عقل کے تعلق پر بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔ اس موضوع کو آئندہ کسی مقام زیرِ بحث لایا جائے گا۔ اب صرف اس بات کو بیان کرنے کے لیے ہم یہ کہتے ہیں کہ بشری عقل اور فہم، جو مفاہیم اور ذہنی تصورات کے ذرائع ہیں، عشق کی کوئی درست تصویر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ زبان بھی اس عظیم حقیقت کو بیان کرنے میں ناکام رہتی ہے۔ مولانا اس بات کو واضح کرنے کے لیے مرغی کے گھر اور اونٹ کی ضیافت کی تمثیل استعمال کرتے ہیں۔ اس تمثیل کے مطابق انسان کی عقل مرغی کے گھر کی مانند ہے جو جب ایک بڑے جانور، جیسے اونٹ، کو اپنے ہاں ضیافت کے لیے بلاتی ہے تو وہ گھر تباہ ہو جاتا ہے۔ عقل اپنے پاس موجود آلات کے ذریعے عشق کو اپنے اندر رکھنے کا کوئی راستہ نہیں نکال سکتی، اور جب بھی اسے اس ضیافت میں بلایا جاتا ہے، صرف میزبان کو تکلیف پہنچاتی ہے۔ جیسا کہ مولانا رومی مثنوی میں فرماتے ہیں۔

مُرغِ خانہ اُشتُری را بی‌خِرَد   رَسمِ مهمانش بہ خانہ می‌بَرَد

چون بہ خانہ‌یِ مُرغ اُشتُر پا نَہاد   خانہ ویران گشت و سَقف اَندَر فُتاد

خانہ‌یِ مُرغ است ہوش و عَقلِ ما   ہوشِ صالح طالِبِ ناقہ‌یِ خدا

ناقہ چون سَر کَرد در آب و گلش   نہ گِل آنجا ماند، نہ جان و دلش

کَرد فضلِ عشق انسان را فُضول　　　زین فُزون جویی ظَلوم است و جهول

(مثنوی، دفتر سوم، بخش: 225)

ترجمہ:

- گھر کے پرندے نے اونٹ کو بے سوچے سمجھائے اپنا مہمان بنایا، اور رسمِ مہمانی کے طور پر اسے اپنے گھر لے آیا۔
- جب اونٹ نے پرندے کے گھر میں قدم رکھا، تو وہ گھر تباہ ہو گیا، اور اس کی چھت بھی گر گئی۔
- ہمارا ہوش و عقل، پرندے کے گھر کی مانند ہے، لیکن صالح عقل خدا کے اونٹ (ناقہ) کی طالب ہوتی ہے۔
- جب ناقہ (اونٹ) نے اس کے آب و گل (وجود) میں قدم رکھا، تو نہ وہاں مٹی رہی، نہ جان اور دل۔
- عشق کے فضل نے انسان کو فضول (فاضل اور برتر) بنا دیا، لیکن اسی بڑھنے کی خواہش سے وہ "ظالم" اور "نادان" کہلایا۔

یہ اشعار عقل، عشق، اور انسان کی فطرت کا بیانیہ ہیں مولانا نے مرغی اور اونٹ کی مثال کے ذریعے عقل اور عشق کے تعلق کو واضح کیا ہے۔ عقل کی محدودیت اور اس کی ناپختگی کو پرندے کے چھوٹے گھر سے تشبیہ دی گئی ہے، جو عشق کی عظیم طاقت (اونٹ) کے داخل ہونے سے تباہ ہو جاتی ہے۔

عشق جب انسان کے وجود میں داخل ہوتا ہے، تو وہ انسان کی موجودہ حالت کو بدل دیتا ہے اور اسے فنا کر دیتا ہے۔ یہاں عشق کو ایک برتر طاقت کے طور پر پیش کیا گیا ہے، جو انسان کو اس کی ذات سے نکال کر ایک اعلیٰ مقام تک لے جاتا ہے۔ شاعر نے انسان کی خواہش اور بڑھنے کی جستجو کو عشق کے فضل سے منسلک کیا ہے، لیکن ساتھ ہی یہ بھی وضاحت کی ہے کہ

یہی جستجو اگر غیر مہذب اور خود غرض ہو، تو انسان "ظالم" اور "نادان" کہلاتا ہے۔ یہ اشعار انسان کے اندر عشق کی غیرت اور اس کے وجود کی تبدیلی کی گہری حقیقت کو بیان کرتے ہیں۔

اسی مفہوم کو دیوانِ شمس میں فرماتے ہیں؂

از بہر مرغِ خانہ چون خانہ ای بسازی
اُشتُر در او نگنجد با آن ہمہ درازی
آن مرغ خانہ عقل است، وان خانہ این تن تو
اشتر جمال عشق است، با قدّ و سرفرازی
رطل گران شہ را این مرغ برنتابد
بویی کزو بیابی، صد مغز را ببازی
(دیوان شمس، غزل:2937)

ترجمہ:

- اگر تم پرندے کے لیے ایک گھر بناؤ، تو اس گھر میں اونٹ اپنی درازی کے باعث نہیں سما سکتا۔
- وہ پرندہ تمھاری عقل ہے، اور وہ گھر تمھارا جسم ہے، جب کہ اونٹ عشق کا جمال ہے، جس کا قد اور سربلندی بے مثال ہے۔
- یہ عقل، جو پرندے کی طرح محدود ہے، عشق کی عظیم شراب کو برداشت نہیں کر سکتی، اور اگر تم عشق کی خوشبو بھی پالو، تو اس کی خاطر اپنی سو عقلیں قربان کر دو۔

مولانا نے یہاں عقل کی ایک چھوٹے پرندے سے مانند تشبیہ دی ہے، جو اپنی محدودیت کے باعث عشق کی وسیع اور بلند حقیقت کو سمجھنے اور برداشت کرنے سے قاصر ہے۔ جسم کو ایک چھوٹے گھر کی طرح پیش کیا گیا ہے، جو عشق کے عظیم جمال (اونٹ) کو سمانے کے لیے ناکافی ہے۔ یعنی عشق کی حقیقت اتنی عظیم اور بلند ہے کہ عقل، اپنی محدودیت کے باعث،

اسے قبول نہیں کر سکتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں اگر تم عشق کی خوشبو بھی حاصل کر لو، تو اس کی خاطر اپنی عقل کو قربان کرنا ایک قابل قدر سودا ہے۔

عشق، عقل اور حیرت:

عقل، جو مکمل کمال نہیں پا سکی، اور عام لوگوں کا وہم ہے۔ مولانا کے مطابق، جب عشق ظاہر ہوتا ہے تو اندھا اور بہرہ ہو جاتا ہے اور حیرت کا شکار ہو جاتا ہے۔ دانش حاصل کرنے کی شرط یہ ہے کہ وہ عقلی اصول جو عام عقل کی طرف سے قبول کیے گئے ہیں، اور وہ سمجھ جو عرفی فہم کہلاتی ہے، اپنی جگہ پر برقرار رہیں۔ لیکن جہاں سب کچھ الٹ پلٹ ہو جاتا ہے، اور جو کچھ تھا، وہ نہیں رہا، اور جو کچھ نہیں تھا، وہ موجود ہو جاتا ہے، وہاں دانش کی بات کیسے ہو سکتی ہے؟ وہی چیز جسے مولانا نے دل کا تضاد کہا ہے، عقل کو بھی تضاد اور پریشانی میں لے آتا ہے۔ اگر عقل یہ سمجھتی ہے کہ چھ جہتیں حد ہیں اور باہر کوئی راستہ نہیں، تو عشق واضح طور پر ایسی جہتوں سے بات کرتا ہے جہاں سے بار بار سفر کیا جا چکا ہے۔ اگر عقل انسانوں کے لیے غم، خوشی اور کفر و ایمان جیسے متضاد امور کا قائل ہے، تو عشق ایک ایسا مرتبہ دکھاتا ہے جہاں عاشق غم و خوشی سے بلند اور کفر و ایمان سے باہر بیٹھا ہے۔ عشق عقل کے سامنے کئی تضادات پیش کرتا ہے جو عقل اپنے معمول کے قواعد سے انہیں نہیں سمجھ سکتی۔ عقل کا حاصل عشق کے ساتھ مقابلے میں صرف حیرت ہوتی ہے۔ اگرچہ عشق خود حیرت سے غذا پاتا ہے، لیکن عقل جب حیرت میں واقع ہوتی ہے تو اس کی پریشانی ظاہر ہو جاتی ہے، اور یہاں واضح ہو جاتا ہے کہ عقل کبھی بھی عشق کے بارے میں اس کے اطوار و احوال پر منطق کے تحت کوئی بات نہیں کر سکتی، اور اس لیے سکوت اختیار کر لیتی ہے۔

مولانا کہتے ہیں:

عشق بُرَّد بَحث را ای جان و بَس   کاو زِ گُفت و گو شود فَریادرَس

حیرَتی آید زِ عشق آن نُطق را زَہرہ نَبوَد کہ کند او ماجَرا

حیرت آن مُرغ است، خاموشَت کند برنہد سَر دیگ و پُر جوشَت کند

(مثنوی، دفتر پنجم، بخش:137)

ترجمہ:

- عشق بحث و مباحثہ کو ختم کر دیتا ہے، اے جان! کیوں کہ وہ گفتگو کے ذریعہ فریاد کے دروازے کو کھول دیتا ہے۔
- عشق کی حقیقت سے حیرت ہوتی ہے، وہ زبان کو بے زبان کر دیتا ہے، ایسا زہر نہیں جو اس سے کسی داستان کو بیان کرے۔
- حیرت وہ پرندہ ہے، جو تمھیں خاموش کر دیتا ہے، اور تمھارے دل کی گہرائی میں جوش پیدا کر دیتا ہے۔

عشق کی شدت اور اس کی طاقت کو بیان کرتے ہوئے مولانا کہتے ہیں کہ یہ عقل و فہم کے تمام راستوں کو بند کر دیتا ہے اور انسان کو اپنی حقیقت کا ادراک کراتا ہے۔ جب عشق کی حقیقت آشکار ہوتی ہے، تو انسان کی زبان گنگ ہو جاتی ہے، کیونکہ عشق وہ حقیقت ہے جس کو بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس کی تاثیر اتنی گہری اور بے قابو ہوتی ہے کہ انسان اس کے سامنے چپ ہو جاتا ہے۔

عشق کو ایک ایسی قوت کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو انسان کے اندر کی خاموشی اور جوش دونوں پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ "حیرت" ہے جو انسان کو کشش و پیچ کی حالت میں مبتلا کر دیتی ہے، اور دل کی گہرائیوں میں ایک نیا جوش پیدا کرتی ہے۔

مولانا کے مطابق، عشق بے کیف (بی انتہا) چیز ہے، اور اس وجہ سے اس کے بارے میں کچھ اور کیسے کہا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں اگر تھوڑا سا بھی بات کی جائے تو اس کی تعلیم و احوال کی ضرورت ہوتی ہے۔

مولانا نے فرمایا۔

کار بی چون را کہ کیفیت نہد؟ اینکہ گفتم این ضرورت می دہد

(مثنوی، دفتر اول، بخش: 11)

ترجمہ: ایسے کام کو جو بے چون و چرا ہو، کیفیت کیسے مقرر کرے؟ یہ بات جو میں نے کہی، محض ضرورت کی بناء پر کہی۔

یہاں مولانا نے ایک ایسے عمل کی جانب اشارہ کیا ہے جو بے چون و چرا یعنی بلا شرط یا بلا قید ہو، اور سوال کرتا ہے کہ ایسی حالت میں کیفیت (یعنی کوئی شکل یا حالت) کیسے مقرر کی جا سکتی ہے؟ یہ بیان اس حقیقت کی عکاسی کرتا ہے کہ اعلیٰ ترین حقائق (جیسے عشق یا خدا) کسی خاص کیفیت یا محدودیت کے تحت نہیں آتے۔

وہ مزید کہتے ہیں کہ جو بات انھوں نے بیان کی وہ صرف اظہار کی ضرورت کے تحت کہی گئی ہے، ورنہ ان اعلیٰ حقائق کو بیان کرنے کے لیے الفاظ خود ناکافی ہیں۔

عشق راز ہے:

عشق راز ہے۔ اگر راز راز ہے، تو اس کی کبھی قابلیت کشودن نہیں ہوتی۔ در حقیقت، راز زدایی (راز کو کھولنا) اس دنیا میں ممکن نہیں مگر کسی نیچے کی سطح پر، جہاں اس صورت میں وہ اصل راز نہیں رہتا، بلکہ ایک مشتبہ راز بن جاتا ہے۔ بشمول عشق کے ہر راز کو حاصل کرنے کے لیے، حاصل کرنے والے کو راز کے اصل موطن میں جانا پڑتا ہے اور وہاں جاکر اس راز کا ہم راز اور شریک ہونا ہوتا ہے۔ عشق ہزاروں جلوؤں میں خود کو اغیار کے سامنے پیش کرتا ہے، جو خود اس کی تجلی کا عین پردہ بن جاتا ہے۔ عشق کے راز کو حکایت کے ذریعے بیان کرنا، گویا خون کو خون سے دھونا ہے، جو ناممکن اور محال ہے۔ مولانا اگرچہ ہزار زبانوں سے عشق کی بات کرتے ہیں، لیکن وہ ان تمام زبانوں سے صرف یہی ایک بات کہتے ہیں کہ عشق کو بات چیت کے ذریعہ بیان نہیں کیا جاسکتا۔

عاشق کے حالات کی تبدیلی:

مولانا کی نظر میں عشق کو بیان کرنے کی ناگزیری کی ایک اور وجہ عاشق کے وہ حالات اور اطوار ہیں جو اس پر مستقل وارد ہوتے ہیں۔ عاشق جب کسی ایک صورت سے معشوق کے ساتھ مانوس ہوتا ہے، تو اس کے سامنے ایک نئی تجلی آتی ہے جو گذشتہ تجلی سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔ مولانا اس عجیب حال کو بیان کرنے کے لیے ''صورت گر نقاش'' کی تمثیل استعمال کرتے ہیں۔ وہ خود کو ایک نقاش سمجھتے ہیں جو محبوب کی مشاہدہ شدہ صورت کو تخلیق کرنے میں مشغول ہے۔ لیکن وہ ہمیں متنبہ کرتے ہیں کہ جب بھی وہ یہ ارادہ کرتے ہیں کہ اپنے محبوب کی پوشیدہ صورت کو اجاگر کریں، وہ اسے ایک بالکل مختلف شکل میں دیکھتے ہیں اور نقش کو بنانے سے باز رہ جاتے ہیں اور جو کچھ بنایا تھا، اس کو اس نئی صورت کے سامنے قربان کر دیتے ہیں۔

مولانا دیوان شمس میں کہتے ہیں ؎

صورت گر نقاشم، ہر لحظہ بتی سازم
وانگہ ہمہ بتہا در پیش تو اندازم
صد نقش برانگیزم، با روح درآمیزم
چون نقش تو را بینم، در آتشش اندازم
(دیوان شمس، غزل:1462)

ترجمہ:

- میں ایک صورت گر نقاش ہوں، ہر لمحہ ایک نئی مورت بناتا ہوں، اور پھر ان تمام بتوں کو تیرے سامنے پیش کرتا ہوں۔
- سو نقش پیدا کرتا ہوں اور انہیں روح سے ہم آہنگ کرتا ہوں، لیکن جب تیرا نقش دیکھتا ہوں، تو ان سب کو آگ میں جھونک دیتا ہوں۔

یہ ایک عارفانہ کیفیت کی تصویر کشی ہے، جہاں رومی اپنی تخلیقی صلاحیت اور روحانی

جستجو کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ خود کو ایک نقاش یعنی تخلیق کار کے طور پر بیان کرتے ہیں جو مسلسل نئ صورتیں اور نقش تخلیق کرتا ہے۔ یہ صورتیں انسانی خیالات، تصورات، یا دنیاوی چیزوں کی علامت ہو سکتی ہیں، جو انسان اپنی ذات یا زندگی میں بناتا ہے۔ لیکن جب رومی "تیرا نقش" دیکھتے ہیں، یعنی خدا کی حقیقت یا عشق حقیقی کا جلوہ پاتے ہیں، تو وہ ان تمام تخلیق کردہ نقش و تصورات کو بے معنی سمجھ کر فنا کر دیتے ہیں۔ یہ عمل اس بات کی علامت ہے کہ عشق حقیقی یا خدا کی معرفت کے سامنے ہر دوسرا خیال یا چیز بے وقعت ہو جاتی ہے۔

یہ اشعار فنا فی اللہ اور انسانی تصورات کی محدودیت کو بیان کرتے ہیں، جو خدا کی بے پایاں حقیقت کے سامنے مٹ جاتے ہیں۔

عشق طرار ہے اور ہر لمحہ کسی نہ کسی شکل میں عاشق پر ظاہر ہوتا ہے۔ عشق کی اطواری (غیر مستحکم) خصوصیت اس کی شکل کو مکمل طور پر متضاد بناتی ہے، جس سے کسی بھی نہائی صورت بندی کو ممکن نہیں بناتی۔ عاشق حقیقتاً نہیں جانتا کہ اگلی بار اسے عشق کس صورت میں نظر آئے گا۔ عاشق کی مشاہدات اتنے متضاد ہوتے ہیں کہ وہ الجھ کر رہ جاتا ہے کہ عشق درد ہے یا دوا؟ قفل ہے یا کلید؟ غم ہے یا خوشی؟ عزت ہے یا ذلت؟ اور اسی طرح کئی اور متضاد کیفیات۔ ان تمام امور سے ہر قسم کی منظم اور معقولیت کی توصیف ممکن نہیں رہتی، اور ذہن مزید پریشانی میں ڈوب جاتا ہے، اور کبھی خود عاشق بھی حیران ہو جاتا ہے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

دیوان شمس میں کہتے ہیں۔

کرانی ندارد بیابانِ ما — قراری ندارد دل و جانِ ما
جهان در جهان نقش و صورت گرفت — کدام است از این نقشها، آنِ ما؟
چه گویم؟ چه دانم؟ که این داستان — فزون است از حدّ و امکانِ ما
چگونه زنم دم؟ که هر دم به دم — پریشاں تر است این پریشانِ ما
از این داستان بگذر، از من مپرس — که درهم شکست است دستانِ ما

(دیوان شمس، غزل:239)

ترجمہ:

- ہمارے بیابان کی کوئی انتہا نہیں، اور ہمارے دل و جان کو کوئی قرار نہیں۔
- یہ دنیا نقش و صورت سے بھری ہوئی ہے، مگر ان میں سے کون سا نقش ہمارا اپنا ہے؟
- کیا کہوں؟ کیا جانوں؟ کہ یہ داستان ہماری حدِ امکان سے بہت بڑھ کر ہے۔
- کیسے کچھ کہوں؟ کہ ہر لمحہ، ہر دم ہماری پریشانی اور زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔
- اس داستان کو چھوڑو، مجھ سے مت پوچھو، کہ ہماری کہانی تو سراسر شکستہ حال ہے۔

یہ ایک عارفانہ اور وجودی کیفیت کا اظہار ہے، جہاں انسانی زندگی اور حقیقت کے پیچیدہ سوالات پر غور کیا گیا ہے۔ رومی کہتے ہیں کہ زندگی کی وسعت اور لامحدودیت کو سمجھنا ممکن نہیں، کیوں کہ یہ ایک بیابان کی مانند ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

شاعر دنیا کی تمام صورتوں اور نقشوں کو دیکھتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ ان میں ہمارا حقیقی مقام یا حقیقت کیا ہے؟ یہ ایک روحانی جستجو کی عکاسی ہے، جہاں انسان اپنی ذات اور حقیقت کی کھوج میں سرگرداں ہے۔

مزید یہ کہ شاعر اس داستان کو بیان کرنے کی کوشش میں عاجزی کا اظہار کرتا ہے، کیوں کہ حقیقت اتنی پیچیدہ اور گہری ہے کہ انسانی عقل و زبان اس کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ آخر میں شاعر اپنی شکستگی اور بے بسی کو تسلیم کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس داستان کو سمجھنا اور بیان کرنا ممکن نہیں، اس لیے اسے چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔

شدت اور کثرتِ معانی کا ہجوم جو عشق سے پھوٹتا ہے، اگر عاشق کو مفلوج نہ کرے، اسے دائمی خاموشی پر نہ ڈالے، اور اس کے خیالات و کلمات کے گودام کو یکسر جلا نہ دے، تو کم از کم اسے اس بات پر حیران کر دے گا کہ عشق کی کون سی کیفیت کو بیان کرے۔ یہاں پر عاشق، عشق کے حقائق اور معانی سے بھرپور ہونے کے سبب خاموش ہو جاتا ہے، اور اس کی جان کی شیرینی سے اسے چہرہ ترش ہو جاتا ہے۔

مثنوی میں فرماتے ہیں۔

غرقِ عشقی ام کہ غَرق است اَندَرین | عِشقهایِ اَوَّلین و آخِرین
مجملَش گفتم، نکردم زان بَیان | وَرنہ ہَم اَفہام سوزَد، ہم زَبان
من چو لَب گویم، لَبِ دریا بُوَد | من چو لا گویم، مُراد الّا بُوَد
من ز شیرینی نشستم رو تُرُش | من زِ بسیاریِ گُفتارَم خَمُش
تا کہ شیرینیِّ ما از دو جہان | در حجابِ رو تُرُش باشد نَہان
تا کہ در ہر گوش ناید این سَخُن | یک ہمی گویم ز صَد سِرِّ لَدُن

(مثنوی، دفتر اول، بخش:90)

ترجمہ:

- میں عشق میں غرق ہوں، ایسا عشق جو پہلے اور آخری تمام عشقوں میں غرق ہے۔
- میں نے اس کا خلاصہ بیان کیا، تفصیل نہیں کی، ورنہ نہ صرف عقلیں جل جاتیں بلکہ زبانیں بھی۔
- جب میں لب (ہونٹ) کہتا ہوں، وہ دریا کے لب کی مانند ہے، جب میں "لا" کہتا ہوں، اس کا مقصد "الا" ہوتا ہے۔
- میں نے اپنی مٹھاس کے باوجود چہرے کو تُرش رکھا، اور اپنی بہت سی باتوں کے باوجود خاموشی اختیار کی۔
- تاکہ ہماری مٹھاس دو جہانوں سے رو ترشی کے حجاب میں چھپی رہے۔
- تاکہ ہر کان تک یہ بات نہ پہنچے، میں سو رازوں میں سے صرف ایک راز بیان کرتا ہوں۔

مولانا عشقِ حقیقی کی وسعت اور گہرائی میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ عشق کو ایسا سمندر قرار دیتے ہیں جو تمام ابتدائی اور آخری عشقوں کو اپنی گہرائی میں شامل کر لیتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر

وہ اس عشق کی تفصیل بیان کریں تو اس کی شدت کو برداشت کرنا ممکن نہیں ہوگا، کیونکہ عشق کی حقیقت انسانی عقل اور زبان کی حدود سے باہر ہے۔ انھوں نے اپنی مٹھاس کو دانستہ طور پر چھپایا ہے اور خاموشی اختیار کی ہے تاکہ عشق کی حقیقت ہر ایک پر ظاہر نہ ہو۔ وہ اشارہ دیتے ہیں کہ یہ راز صرف ان کے لیے ہے جو اس کے اہل ہیں، اور وہ اپنے عشق کے رازوں کو پردے میں رکھنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

مزید دیوان شمس میں کہا۔

رو ترش و گران کنی، تا سِرِ خود نهان کنی
بار دگر گرفتمت، بار دگر همان مکن
(دیوان شمس، غزل: 1843)

ترجمہ: تم اپنے چہرے کو تُرش اور بھاری بناتے ہو تاکہ اپنے راز کو پوشیدہ رکھ سکو۔ لیکن جب دوبارہ تمھاری گرفت کرے، تو دوبارہ وہی نہ کرو۔

عشق میں عاجزی:

جب کبھی عاشق کو موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی عاشقی کے تجربات پر بات کرے، تو الفاظ کی تنگی اس کے دل کو تنگ کر دیتی ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ سے وسیع اور کشادہ فضا مانگتا ہے۔ عاشق، اگرچہ عشق کے حالات اور اطوار کو بیان کرنے کے لیے آسمان کی وسعت جیسی زبان طلب کرتا ہے، لیکن جلد ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ یہ بھی عشق کی عظمت کو بیان کرنے کے لیے ناکافی ہوگا۔ عاشق اپنے عجز کو دیکھ کر مایوس نہیں ہوتا، بلکہ عاجزی سے اپنے شوق کو بیان کرتا ہے اور بے تاب ہو کر اپنے عجز پر بات کرتا ہے، جیسا کہ مثنوی معنوی میں مولانا نے فرمایا۔

یک دَہان خواہَم بہ پَہنایِ فلَک   تا بگویم وَصفِ آن رَشکِ مَلَک
وَر دَہان یابَم چنین و صَد چنین   تنگ آید در فَغانِ این حنین

این قَدَر گر هم نگویم ای سَنَد!　　شیشه‌یِ دل از ضَعیفی بشکند
شیشه‌یِ دل را چو نازُک دیده ام　　بَهرِ تسکیں بَس قَبا بِدْریده ام

(مثنوی، دفتر پنجم، بخش:74)

ترجمہ:

- میں ایک ایسا دہان چاہتا ہوں جو فلک کی وسعتوں کے برابر ہوتا کہ اس کی تعریف بیان کر سکوں، جو فرشتوں کے لیے بھی رشک ہے۔
- اور اگر مجھے ایسا ایک دہن یا سو ایسے دہن مل بھی جائیں، تو بھی اس کی تعریف اور میری پکار کے لیے تنگ پڑ جائیں گے۔
- لیکن اگر میں اتنا بھی نہ کہوں، اے سہارا دینے والے، تو دل کا نازک شیشہ کمزوری کے باعث ٹوٹ جائے گا۔
- چونکہ میں دل کے شیشے کو بہت نازک دیکھتا ہوں، اسے تسلی دینے کے لیے میں نے کئی بار اپنے قبائیں پھاڑ دی ہیں۔

عاشق ایک مرحلے پر یہ خیال اپنے دل میں باندھتا ہے کہ کاش دنیا اس رازِ پوشیدہ کو ظاہر کر سکتی۔ لیکن کیا کیا جا سکتا ہے کہ دنیا بھی ایسی عظیم بات کو ظاہر کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔ مثنوی میں ہے۔

پس چه باشد عشق؟ دریای عَدَم　　در شکسته عَقل را آنجا قَدَم
بندگی و سلطنت معلوم شد　　زین دو پَرده عاشقی مکتوم شد
کاشکی هستی زَبانی داشتی　　تا ز هَستان پَرده‌ها بَرداشتی
هرچه گویی ای دَمِ هَستی از آن　　پَرده‌یِ دیگر بر او بَستی بِدان
آفَتِ اِدراکِ آن قال است و حال　　خون بہ خون شُستن مُحال است و مُحال

(مثنوی، دفتر سوم، بخش:226)

ترجمہ:

- توعشق کیا ہے؟ عدم کا ایک سمندر جہاں عقل شکست کھا جاتی ہے اور قدم رکھنے کی طاقت کھودیتی ہے۔
- بندگی اور سلطنت کی حقیقت واضح ہو چکی ہے، لیکن ان دو پردوں کے درمیان، عاشق کا راز چھپا ہوا ہے۔
- کاش وجود کو کوئی زبان ملتی تاکہ وہ ہستی کے اسرار کے پردے اٹھا دیتا۔
- لیکن اے ہستی کے اظہار کے دم! جو کچھ بھی تم کہو گے، وہ محض ایک اور پردہ ڈال دے گا۔
- اس کے ادراک کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ "قال" (ظاہری بیان) اور "حال" (باطنی کیفیت) ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے خون کو خون سے دھونا، جو کہ ناممکن ہے۔

رومی نے عشق کو ایک ایسے عدم کے سمندر سے تشبیہ دی ہے جہاں عقل بے بس ہو جاتی ہے۔ بندگی اور سلطنت کی حقیقت کو سمجھنے کے باوجود عشق کا راز انسانی فہم سے ماورا ہے۔ شاعر یہ کہتا ہے کہ ہر لفظ یا اظہار عشق کے حقیقی مفہوم پر ایک اور پردہ ڈال دیتا ہے۔ عشق کے ادراک کے لیے ظاہری الفاظ اور باطنی کیفیت کی حدود کو عبور کرنا ضروری ہے، لیکن ان کے ذریعے اس کی اصل تک پہنچنا ناممکن ہے۔

جب عاشق تمام ان راہوں سے تھک جاتا ہے، اور زیادہ تر لوگ ان حقائق کو سمجھنے سے دور دکھائی دیتے ہیں، تو وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ اسے ایسا مقام عطا کرے جہاں بغیر الفاظ کے بھی کلام اظہار ہو۔ مثنوی میں فرماتے ہیں:

ای خدا! جان را تو بنما آن مُقام	کاندر او بی حَرف می روید کَلام
تا کہ سازد جانِ پاک از سَر قَدَم	سویِ عرصہ ی دور پہنایِ عَدَم

عرصہ ای بَس باگُ و شاد و بافَضا   وین خیال و ہَست یابد زو نَوا

(مثنوی، دفتر اول، بخش:144)

ترجمہ:

- اے خدا! جان کو وہ مقام دکھا جہاں بغیر الفاظ کے کلام پیدا ہوتا ہے۔
- تاکہ پاکیزہ جان سر سے قدم تک عدم کے وسیع اور بے کنار میدان کی طرف روانہ ہو۔
- ایسا میدان جو نہایت سرسبز، خوش و خرم اور کشادہ ہے، جہاں خیال اور وجود دونوں اپنی اصل نغمگی کو پا لیتے ہیں۔

رومی وہ مقام چاہتے ہیں جہاں انسانی جان کسی لفظ یا اظہار کی محتاج نہ رہے، اور اس کی حقیقت بغیر کسی حرف کے آشکار ہو۔ یہ مقام عدم (وجود سے ماورا حقیقت) کی وسیع دنیا ہے، جو ہر قسم کی حد اور قید سے آزاد ہے۔ یہ ایک ایسا عالم ہے جہاں خیالات اور موجودات اپنے حقیقی سکون اور نغمگی کو پاتے ہیں، یعنی اپنی اصل حقیقت سے منسلک ہو جاتے ہیں۔

لفظ و صوت اور قواعد زبان سے بے گانگی:

اسی لیے وہ چاہتے ہیں کہ الفاظ اور صوت کو باہم بگاڑ دیں، اور قافیہ بندی اور عروضی بحر کی پَروا سے آزاد ہو جائیں جیسا کہ مثنوی میں فرماتے ہیں:

شعر می گویم بہ از قند و نبات
من نہ دانم فاعلاتن فاعلات

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں:

قافیہ اندیشم و دِلدارِ مَن   گویدَم مَندیش جُز دیدارِ من
خوش نِشین ای قافیہ اَندیشِ من   قافیہ یِ دولت تویی در پیشِ من
حَرف چِبوَد تا تو اَندیشی از آن؟   حَرف چِبوَد؟ خارِ دیوارِ رَزان

حَرف و صوت و گُفت را بَر ہَم زَنَم تا کہ بی این ہَر سہ با تو دَم زَنَم

(مثنوی، دفتر اول، بخش:90)

ترجمہ:

- میں قافیہ سوچ رہا ہوں، لیکن میرا دلدار کہتا ہے: میرے دیدار کے سوا کسی اور چیز کی فکر نہ کرو۔
- اے میرے قافیہ اندیش! آرام سے بیٹھ، کیونکہ تیری دولت خود میرے سامنے ہے۔
- یہ الفاظ کیا ہیں کہ تم ان کے بارے میں فکر کرو؟ الفاظ کیا ہیں؟ وہ کانٹے ہیں جو دیوارِ گلزار میں چبھتے ہیں۔
- میں الفاظ، آواز، اور گفتگو کو چھوڑ دیتا ہوں، تا کہ ان سب کے بغیر فقط تم سے بات کر سکوں۔

مولانا رومی کو فاعلاتن فاعلات یا قواعد عروض و شعر کی کوئی پروانہیں، کبھی اگر وہ قافیہ بندی اور الفاظ کے بارے میں فکر مند ہوتے بھی ہیں تو محبوب حقیقی نصیحت کرتا ہے کہ ان باتوں کی پروا مت کرو اور صرف دیدار کی جستجو میں محو رہو، چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ الفاظ اور قافیہ بندیاں محض رکاوٹیں ہیں، جو انسان کو محبوب سے حقیقی تعلق قائم کرنے میں روکتی ہیں۔ اس لیے وہ الفاظ اور تمام ظاہری وسیلوں کو چھوڑ کر محبوب سے بے واسطہ اور خالص محبت کے ساتھ گفتگو کرنے کے خواہش مند ہیں۔

دیوان شمس میں فرماتے ہیں:

بس کن آخر چہ بر این گفتِ زبان چفسیدی؟
عشق را چند بیانہاست کہ فوق سخن است

(دیوان شمس، غزل:410)

ترجمہ: آخر کار بس کرو! کیوں گفتگو اور الفاظ کے پیچھے پڑے ہو؟ عشق کے کئی ایسے

اظہار ہیں جو الفاظ سے بالاتر ہیں۔

یہ اشعار عشق کی عظمت کو بیان کرتے ہیں جو الفاظ اور زبان کی حدود سے ماورا ہے۔ شاعر مخاطب سے کہتا ہے کہ الفاظ کی قید کو چھوڑ کر عشق کی ان کیفیات کو سمجھنے کی کوشش کرو جو بیان سے باہر ہیں۔ عشق کو سمجھنے اور محسوس کرنے کے لیے صرف دل اور روح کی گہرائیوں میں جھانکنا ضروری ہے، نہ کہ لفظوں پر زور دینا۔

سطحِ فہم کے مطابق گفتگو:

مولانا کے مطابق، عشق کے اطوار کو بیان کرنے میں خاموشی اختیار کرنے کی سب سے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ وہ لوگ جو اس کے مخاطب بنتے ہیں، ناآشنا اور نامحرم ہیں۔ عام لوگوں کی کم فہمی اور پردے میں ہونا، ان کو اہل محبت کے ساتھ ہمراز ہونے سے روکتا ہے۔ ہر زبان کی ساخت کسی خاص تجربے سے پیدا ہوتی ہے جو فردی اور اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتا ہے، اور جو شخص اس مخصوص تجربے سے آشنا نہیں ہے، وہ اس زبان کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھے گا۔ وہ باتیں جو عاشق کے لبوں سے جاری ہوتی ہیں، اس کے قریب ترین تجربے سے نکلتی ہیں، اور ان کی زبان کو عام فہم میں سمجھنے کی کوشش ہمیشہ غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہے۔ یہ ایک عام سامعین سے بات کرنے کی آفت ہے۔ اسی لیے مولانا بار بار کہتے ہیں کہ وہ اپنے مخاطب کی سطحِ فہم کے مطابق بات کرتے ہے۔

این چه می گویم به قَدرِ فہمِ توست　　　　مُردَم اَندَر حَسرَتِ فہمِ دُرُست

(مثنوی، دفتر سوم، بخش:96)

ترجمہ: یہ جو میں کہہ رہا ہوں، یہ تمھاری سمجھ کے مطابق ہے۔ میں درست سمجھ کی حسرت میں مر رہا ہوں۔

ان کا کہنا ہے کہ جو کچھ وہ بیان کر رہے ہیں، وہ سامع کی عقل اور فہم کے دائرے کے اندر ہے۔ لیکن حقیقت میں جو اصل مفہوم یا حقیقت ہے، وہ اس سے بہت بلند ہے۔ وہ اپنی

بے بسی اور حسرت کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ حقیقت کو مکمل طور پر بیان کرنے یا سمجھانے سے قاصر ہیں، کیوں کہ وہ ایک محدود فہم کے سامع کے ساتھ مخاطب ہیں۔

مولانا ایک اور اہم نکتہ اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنے مخاطبین کی لغزش کا خطرہ محسوس کرتے ہیں۔

من بگویم شرحِ این از صد طَریق　　　لیک خاطِر لَغزَد از گُفتِ دَقیق

(مثنوی، دفتر اول، بخش: 1)

ترجمہ: میں اس کی وضاحت سو طریقوں سے بیان کروں، لیکن نازک باتوں کے کہنے سے میرا دل لڑکھڑا جاتا ہے۔

رومیؒ حقیقت یا عشق کے موضوع کو کئی انداز سے بیان کرسکتے ہیں، لیکن جب وہ اس کے گہرے اور لطیف پہلوؤں پر بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو الفاظ ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور دل لرزنے لگتا ہے۔ یہ ایک ایسی کیفیت ہے جہاں بیان کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے اور حقیقت کی گہرائی کو سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے۔

کہتے ہیں ؎

شَرحِ این را گُفتَمی مَن از مِری　　　لیک تَرسَم تا نَلَغزَد خاطِری
نکتہ‌ہا چون تیغِ پولاد است، تیز　　　گر نداری تو سِپَر، واپَس گُریز
پیشِ این اَلماس، بی‌اِسپَر مَیا　　　کَز بُریدن، تیغ را نَبُود حَیا
زین سَبَب مَن تیغ کَردَم در غِلاف　　　تا کہ کژخوانی نَخوانَد بَر خِلاف

(مثنوی، دفتر اول، بخش: 33)

ترجمہ:

- میں اس کی وضاحت کرتا، جیسا کہ ضروری تھا، لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں کسی دل کو لغزش نہ ہو جائے۔

- نکتے ایسے ہیں جیسے فولادی تلوار، تیز اور کاٹ دار، اگر تمھارے پاس سپر نہیں، تو پیچھے ہٹ جاؤ۔
- اس الماس کے سامنے بغیر سپر کے مت آؤ، کیونکہ تلوار کاٹنے میں حیا نہیں کرتی۔
- اسی لیے میں نے تلوار کو غلاف میں رکھا، تاکہ کوئی کج فکر اسے غلط نہ سمجھے۔

یہ اشعار ان حقائق یا اسرار کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو نہایت باریک اور گہرے ہیں۔ رومیؒ کہتے ہیں کہ وہ ان حقائق کو بیان کر سکتے ہیں، لیکن ان کے بیان سے عام لوگوں کے دل یا فکر کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ چوں کہ یہ باتیں نہایت باریک اور خطرناک ہیں، ان کا سامنا بغیر تیاری کے کرنا نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اسی لیے وہ ان باتوں کو کھول کر بیان نہیں کرتے، تاکہ کوئی انہیں غلط نہ سمجھے یا ان کی حقیقت کو توڑ مروڑ نہ دے۔

مولانا اپنے مخاطبین کے ساتھ تین طریقوں سے نمٹنے کا فن جانتے۔ پہلی راہ یہ تھی کہ خاموشی اختیار کریں اور حقائق بیان نہ کریں۔ مگر یہ راستہ کئی وجوہات کی بنا پر، جیسے عشق کا شوق، دل کی نرمی، اور معشوق کا بعض معانی کو بیان کرنے کا حکم، بالکل اختیار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسری راہ یہ تھی کہ صاف طور پر حقائق بیان کریں، مگر مولانا اس جانب مائل نہیں ہوئے، کیوں کہ ان کا ماننا تھا کہ اس سے عوام کو نقصان پہنچے گا، اور عشق کی غیرت بھی ایسی پردہ داریوں کو قبول نہیں کرتی تھی۔ تیسری راہ وہ تھی جو بیان اور عدم بیان کے درمیان تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ عشق کی بات کریں، مگر پردہ دری نہ کرے، اور لوگوں کو اس کی نعمت سے بے نصیب نہ چھوڑیں۔ اس مقام پر وہ دوسروں کے اقوال میں گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ یہاں تک کہ حسام الدین چلبی نے جب فرمائش کی کہ وہ عشق کے حقائق کو بے غل و غش بیان کریں تو مولانا نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اور تمثیلات اور تشبیہات کے پردوں کے پیچھے سے بات کرتے رہے۔ مولانا اس حالت کی آفت سمجھتا تھے کہ ناآزمودہ سامع تمثیلات اور کہانیوں پر چمٹ جاتا ہے اور ان کے حقیقی مفہوم کو نہیں سمجھ پاتا، اور صورت پر چمٹنے کی وجہ سے گمراہ ہو جاتا ہے۔

مثنوی میں فرماتے ہیں۔

این سخن ہم ناقص است و ابتر است
آن سخن کہ نیست ناقص، آن سَر است

گر بگوید، زان بلغزد پایِ تو
وَر نگوید ہیچ از آن، ای وایِ تو

وَر بگوید در مثالِ صورتی
بر ہمان صورت بچفسی ای فتی!

(مثنوی، دفتر سوم، بخش:49)

ترجمہ:

- یہ بات بھی ناقص اور ادھوری ہے، وہ بات جو ناقص نہ ہو، وہی اصل اور کامل ہے۔
- اگر اس کو بیان کرے، تو تیرے قدم ڈگمگا جائیں، اور اگر کچھ بھی نہ کہے، تو افسوس ہے تیرے حال پر۔
- اور اگر اسے کسی صورت میں بیان کرے، تو اے جوان! تُو اسی صورت پر چمٹ جائے گا۔

رومی نے کہا کہ کچھ اسرار ایسے ہیں جو زبان اور الفاظ میں مکمل بیان نہیں ہو سکتے۔ اگر کوئی ان حقیقتوں کو مکمل طور پر بیان کرنے کی کوشش کرے تو سننے والا شاید اس کی گہرائی کو برداشت نہ کر سکے اور راہ سے بھٹک جائے۔ اور اگر کچھ بھی نہ کہا جائے، تو یہ انسانی شعور کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ان باتوں کو کسی مثال یا صورت میں بیان کیا جائے، تو لوگ اصل حقیقت کو چھوڑ کر اسی صورت میں اٹک جاتے ہیں اور گہرائی تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔

وہ اپنے مخاطبین کو تنبیہ کرتے ہیں کہ وہ تمثیلات کے حقیقی کام کو سمجھیں اور ان سے عالمِ معنا کی طرف چڑھنے کا زینہ پائیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ تمثیل و تشبیہ استعمال کرنے کا معاملہ وقتی ہے، اور کچھ وقت کے بعد انہیں فکری سطح کی معصومیت سے دور ہو جانا چاہیے، تاکہ ان کے ساتھ معنویت پر بات کی جا سکے، نہ کہ صرف صورت پر۔

مزید فرماتے ہیں:

این تصور، وین تخیل لُعبَت است — تا تو طفلی پس بِدانت حاجَت است

چون زطفلی رَست جان، شد در وِصال — فارِغ از حِس است و تصویر و خیال

نیست محرم تا بگویم بی نفاق — تَن زَدَم، واللہ اعلم بالوفاق

(مثنوی، دفتر سوم، بخش: 197)

ترجمہ:

- یہ تصور اور تخیل ایک کھلونا ہے، جب تک تو بچہ ہے، تجھے اس کی ضرورت ہے۔
- جب جان بچپنے سے نکل کر وصال کی منزل پر پہنچتی ہے، تو وہ حس، تصویر اور خیال سے آزاد ہو جاتی ہے۔
- محرمِ راز نہیں ہے کہ بے ریا بیان کروں، میں خاموش ہو گیا، واللہ بہتر جانتا ہے موافقت کا حال۔

یعنی ابتدائی مراحل میں تصور اور تخیل کی ضرورت ہوتی ہے، جیسے بچے کو کھلونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ سب اس وقت تک اہم ہیں جب تک انسان وصالِ حقیقت تک نہ پہنچے۔ جب روح وصال کی حقیقت سے آشنا ہوتی ہے تو یہ تمام تصورات، خیالات اور احساسات بے معنی ہو جاتے ہیں۔ آخر میں کہتے ہیں کہ چونکہ کوئی محرمِ راز نہیں ہے جو اس حقیقت کو سمجھ سکے، اس لیے وہ خاموش رہنا بہتر سمجھتا ہے۔ اصل حقیقت اللہ بہتر جانتا ہے، جو ہر چیز کے باطن سے واقف ہے۔

مولانا کا ماننا ہے کہ ہر لفظ و گفتار کی پوشاک، عاشق کے گہرے تجربات کے لیے تنگ ہے۔ اور چونکہ سب کو عشق کے معانی سے محروم نہیں رکھا جا سکتا، اس لیے وہ ان تمثیلات کا استعمال کرتے ہے جو عام انسانی تجربات سے اخذ کی جاتی ہیں، تاکہ پردہ دار لوگوں کو عشق کی طرف نزدیک کیا جا سکے۔ مثال کے طور پر، جب وہ اپنے تجربات میں عشق کو قہار اور مہیب

دیکھتے ہیں، تو وہ اپنے مخاطبین کے ذہن کو قریب کرنے کے لیے تمثیل ''شیر'' اور ''ہرن'' کا استعمال کرتے ہیں۔

پیشِ شیری آهویی بی‌هوش شد — هستی‌اَش در هَستِ او روپوش شد
این قیاسِ ناقصان بر کارِ رَب — جوششِ عشق است، نَز ترکِ اَدَب

(مثنوی، دفتر سوم، بخش:177)

ترجمہ:

- شیر کے سامنے ہرن بے ہوش ہو گیا، اس کی ہستی اس کی ہستی کی حقیقی میں چھپ گئی۔
- یہ ناقص انسانوں کا قیاس ہے، جو رب کے کام میں دخل دیتے ہیں، یہ جوشِ عشق ہے، ادب کے ترک کرنے سے نہیں۔

جیسے شیر کے سامنے ہرن کی حالت بے ہوشی کی ہوتی ہے اور وہ اپنی حقیقت میں محو ہو جاتا ہے، ویسے ہی انسان اپنی اصل حقیقت میں کھو جاتا ہے جب وہ اللہ کے رازوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ قیاس اور گمان محض انسانوں کا ہے جو اللہ کے کاموں میں مداخلت کرتے ہیں۔ دراصل، یہ عشق کی شدت اور جذبہ ہے جو انسان کو اس حالت میں لے آتا ہے، نہ کہ ادب سے غفلت۔

مولانا کے کلام میں جو گزارشات سامنے آتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہم روزگار سامعین ان کی کہانیوں اور تمثیلات میں اتنے گم ہو جاتے تھے کہ معنوی حقائق بیان کرنے سے باز رکھتے تھے۔ مولانا کے سامعین بعض اوقات اتنے مایوس ہو جاتے تھے کہ ان پر بوریت طاری ہو جاتی اور وہ بیان سننے کے بجائے، سو جاتے تھے۔

یک زَمان بُگذار ای همره! مَلال — تا بگویم وصفِ خالی زان جَمال
همچو موری اندر این خَرمَن خوشم — تا فزون از خویش، باری می‌کشم

(مثنوی، دفتر دوم، بخش:6)

ترجمہ:

- ایک مدت کے لیے صبر کر، اے ساتھی! ملال کو چھوڑ دے، تاکہ میں اس جمال کی حقیقت کو بیان کر سکوں۔
- جیسے چیونٹی خوشی میں اپنے بل میں رہتی ہے، ویسے ہی میں اپنے آپ سے زیادہ بوجھ اٹھا رہا ہوں۔

ایسے لوگوں سے رومی کہتے ہیں کہ کچھ وقت کے لیے ملال کو چھوڑ دو تاکہ وہ اس عظیم جمال کا صحیح طور پر بیان کر سکیں۔ وہ اپنے آپ کو چیونٹی کی طرح محسوس کرتے ہیں جو خوشی کے ساتھ اپنے بل میں رہتی ہے، لیکن اس کے اندر ایک مسلسل بوجھ ہے جس کا وزن اس سے زیادہ ہے اور وہ اسے اٹھا رہی ہے۔ اس میں رومی کی حالتِ عشق کا اظہار ہے، جہاں وہ اپنے اندر ایک شدید محبت اور جذبہ محسوس کرتے ہیں جو اسے اپنی حقیقت سے پرے لے جاتا ہے۔

مولانا اپنی باتوں کو پانی کی وہ دھار سمجھتے ہیں جو سامعین کے خیالات و احساسات کی آسیای فکری میں رواں ہو کر ان کے لیے ایک نئی زندگی عطا کرے۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ سامعین اس گراں قدر تحفے کو نہیں لیتے، تو اس پر تنگ دل ہو کر اور ناراض ہو کر ان پر فریاد بلند کرتے ہیں کہ:

رفتنِ این آب، فوقِ آسیاست — رفتنش در آسیا بهرِ شُماست

چون شما را حاجتِ طاحون نَماند — آب را در جویِ اصلی باز راند

ناطقه سویِ دهان، تعلیم راست — وَرنه خود آن نُطق را جویی جُداست

(مثنوی، دفتر اول، بخش:144)

ترجمہ:

- یہ پانی کا بہاؤ، آسیا سے اوپر ہے، اس کا بہنا آپ کے لیے ہے۔
- جب آپ کو طاحون (پانی کا گھماؤ) کی ضرورت نہ ہو، تو اس پانی کو اصل ندی میں واپس کر دو۔
- زبان کا کام صرف بات کرنے کا ہے، ورنہ خود وہ بات کرنے والا بھی الگ ہو جائے گا۔

مولانا کہتے ہیں کہ جیسے پانی کا بہاؤ اور آسیا کا مقصد انسانوں کی ضروریات کے لیے ہے، ویسے ہی زبان کا مقصد بھی صحیح باتوں کو کہنا ہے۔ لیکن جب انسان کی اپنی ضرورت پوری ہو جائے، تو اسے ہر چیز کو اس کی اصل جگہ پر واپس کرنا چاہیے۔ اس میں زبان کی حقیقت کو بھی بیان کیا گیا ہے، کہ زبان صرف بات کرنے کے لیے ہے، اگر اس کا مقصد پورا نہ ہو، تو وہ اپنی اصلیت سے جدا ہو جاتی ہے۔

مولانا محرمانِ حقیقت کو مستوران و شاہدانِ معنا سے باہر نکالنے کا موجب سمجھتے ہیں۔ ان کے مطابق، خوبصورتی صرف خوبصورتی دیکھنے والوں کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ مولانا کی افسوس کی اصل بات یہ ہے کہ زیادہ تر لوگ اتنی گنجائش نہیں رکھتے کہ وہ اس خزانے کو سمجھ سکیں جو ان کے اندر ہے اور وہ ان کے ساتھ بیان کر سکیں۔ وہ ایسے سننے والے کی تلاش میں ہوتے ہیں جو پورے وجود کے ساتھ سننے والے ہوں اور محبت کے راز سننے کے خواہاں ہوں، کیوں کہ اگر ایسا شخص مل جائے تو، اس کے بقول، وہ لوگ بھی جو پیدائشی طور پر گونگے ہیں، بات کرنے لگیں گے۔ اس کے برعکس، اگر ناسمجھ لوگ اس کے مخاطب ہوں، تو سب سے بہترین مقرر بھی خاموش ہو جاتے ہیں۔ ناسمجھ کے لیے اس کے لغت میں وہ شخص ہوتا ہے جو اس کے ساتھ ایک اجنبی دنیا میں رہتا ہو۔ جو اس فاصلے کے ساتھ اس پر نظر ڈالے گا، وہ صرف ایک دھندلی اور تاریک تصویر ہی حاصل کرے گا۔ جب کبھی ناسمجھ لوگ ان کی محفلِ انس میں داخل ہوتے، وہ عشق و معشوق کے راز بیان کرنے سے انکار کر دیتے اور صاف طور پر ان کی موجودگی کو حقائق و معانی بیان کرنے میں رکاوٹ سمجھتے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر دنیا کو جواہر و مرجان سے بھر دیں، مگر اس کا کوئی راز دار نہ ہو، تو وہ ان جواہر میں سے کچھ حاصل نہیں کرے گا۔ اس لیے وہ ان سے کہتے کہ سب سے پہلے راز دار بنیں اور ایک ایسا زبان سیکھیں جو محبت کی زبان ہے، جہاں تُرک اور کُرد، فارسی بولنے والے اور عربی بولنے والے، بلکہ حتیٰ کہ چوب اور پتھر بھی آپس میں بغیر کسی غلط فہمی کے بات چیت کریں گے۔

ای دَریغا مر تو را گُنجا بُدی
تا ز جانَم شَرحِ دل، پیدا شُدی

این سُخَن شیراست در پِستانِ جان
بی کَشَندہ خوش نمی گَردَد رَوان

مستَمِع چون تشنہ و جویندہ شُد
واعظ ار مُردہ بُوَد، گویندہ شُد

مستَمِع چون تازہ آمد بی مَلال
صَد زبان گَردَد بہ گفتن گُنگ و لال

چونکہ نامَحرَم درآید از دَرَم
پَردہ در، پنہان شوند اہلِ حَرَم

وَر درآید مَحرَمی دور از گَزَند
بَرگُشایند آن سَتیران، روی بند

ہرچہ را خوب و خوش و زیبا کنند
از برایِ دیدہ‌یِ بینا کنند

کِی بُوَد آوازِ چَنگ و زیر و بَم
از برایِ گوشِ بی حِسِّ اَصَم

مُشک را بیہودہ، حق خوش دَم نکرد
بہرِ حِس کَرد او پِیِ اَخشَم نکرد

حق زمین و آسمان برساختہ ست
در میان بَس نار و نور افراختہ ست

این زمین را از برایِ خاکیان
آسمان را مَسکَنِ افلاکیان

مَردِ سُفلی دُشمنِ بالا بُوَد
مُشتَرِیِّ ہر مَکان پیدا بود

ای سَتیرہ! ہیچ تو برخاستی
خویشتَن را بہرِ کور آراستی؟

گر جہان را پُر دُرِ مَکنون کُنَم
روزیِ تو چون نباشد چون کُنَم؟

(مثنوی، دفتر اول، بخش:117)

ترجمہ:

- افسوس کہ تمھارے لیے کوئی گنجائش ہوتی، کہ میرے دل کا حال میری جان سے ظاہر ہوجاتا۔
- یہ بات شیر کی مانند ہے جو جان کے سینے میں ہے، جب تک اسے کوئی نہ دوہے، وہ رواں نہیں ہوتا۔

- جب سامع پیاسا اور طلب گار بن جائے، تو واعظ، چاہے مردہ ہو، گویا ہو جاتا ہے۔
- جب سامع تازگی سے، بغیر کسی اکتاہٹ کے آتا ہے، تو گونگا اور خاموش بھی سو زبانیں بولنے لگتا ہے۔
- لیکن اگر نامحرم میرے دروازے میں آجائے، تو اہلِ حرم پردہ ڈال کر چھپ جاتے ہیں۔
- اور اگر کوئی بے گزند محرم آجائے، تو وہ پردہ نشین اپنے چہرے سے نقاب ہٹا دیتے ہیں۔
- ہر وہ چیز جو خوبصورت، خوشنما اور زیبا ہے، وہ بینا آنکھوں کے لیے ہی ہوتی ہے۔
- کیا چنگ کا نغمہ اور زیر و بم کی آواز کسی بے حس بہرے کے لیے ہوتی ہے؟
- خدا نے مشک کو خوشبو کے لیے پیدا کیا، اور اسے کسی بے سونگھ ناک کے لیے نہیں بنایا۔
- خدا نے زمین و آسمان کو تخلیق کیا، اور ان کے درمیان نار (آگ) اور نور (روشنی) کو بلند کیا۔
- یہ زمین خاکیوں کے لیے ہے، اور آسمان افلاکیوں کا مسکن ہے۔
- نیچے والے لوگ اوپر والوں کے دشمن ہیں، لیکن ہر مقام کا ایک مشتری (طالب) موجود ہوتا ہے۔
- اے ستارہ! کیا تم کبھی طلوع ہوئے ہو اور اپنے آپ کو کسی اندھے کے لیے آراستہ کیا ہے؟
- اگر میں دنیا کو مکنون موتیوں سے بھر دوں، لیکن وہ تمھارا رزق نہ ہو، تو میں کیا کروں؟

مولانا کہتے ہیں کہ کہ ہر چیز کا جمال اور کمال اس کے مخاطب کی اہلیت پر منحصر ہے۔ وہ خوبصورتی، نغمے، اور علم کو صرف ان لوگوں کے لیے قابلِ قدر سمجھتے ہیں جو انہیں دیکھنے، سننے اور سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ خدا نے ہر مخلوق کو اس کی ضرورت کے مطابق رزق دیا ہے اور ہر چیز کی حقیقت اس کی اپنی طلب پر منحصر ہے۔

ناآشنا مخاطب کو عشق سے واقف کرنے کا طریقہ:

مولانا کا ماننا ہے کہ ناآشنا مخاطبان کو عشق سے واقف کرنے کا سب سے اطمینان بخش

طریقہ یہ ہے کہ یا تو وہ خود عاشق بن جائیں، یا پھر عاشقوں کو عاشقوں کی نظر سے دیکھیں۔ یہ دعوت دراصل ایک اداکاری کی دعوت ہے، اور عشق میں تماشاگرانہ نظروں سے پرہیز کرنے کی تلقین ہے۔ تماشاگرانہ نظر ہمیشہ یہ آفت رکھتی ہے کہ شخص نرمی سے اپنی معلومات کے ساتھ نظر ڈالے گا، اور اس طرح وہ حقیقت کے صرف سطحی پہلو کو ہی سمجھ پائے گا، اور اکثر اس کمی کے سبب انکار کے طریقے کو اختیار کرے گا۔ مولانا اس نرمی والی نظر کے لیے لیلیٰ و مجنون کی کہانی کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں، جہاں مجنون کے خاندان والے اس عشق کا انکار کرتے ہیں۔ ایک مشہور تصویر میں، خلیفہ لیلیٰ سے پوچھتا ہے کہ تم جمال و زیبائی میں تو کچھ خاص نہیں رکھتیں، پھر مجنون کی محبت میں کیوں اس قدر جاذب نظر ہو؟ اس پر لیلیٰ اسے دعوت دیتی ہے کہ وہ اس تماشاگرانہ اور غیر جذباتی نظر سے دور ہو جائے اور مجنون کی نظر سے لیلیٰ کو دیکھے، تاکہ وہ بھی مجنون کی طرح اس کے حسن و ملائمت کو سمجھ سکے۔

گفت لیلیٰ را خلیفہ: کان توی کز تو مجنون شُد پَریشان و غَوی؟

اَز دِگر خوبان تو اَفزون نیستی گفت: خامُش، چون تو مجنون نیستی

(مثنوی، دفتر اول، بخش:17)

ترجمہ:

- خلیفہ نے لیلیٰ سے کہا: کیا تم وہی ہو؟ جس کی وجہ سے مجنون پریشان اور گمراہ ہوا؟
- (کہا:) تم تو دوسرے خوبصورتوں سے زیادہ نہیں ہو! لیلیٰ نے جواب دیا: خاموش رہو، کیونکہ تم مجنون نہیں ہو!

لیلیٰ خلیفہ کو جواب دیتی ہے کہ ظاہری خوبصورتی کو سمجھنے کے لیے مجنون جیسا عشق ضروری ہے۔ مجنون کے عشق نے لیلیٰ کو وہ مقام دیا ہے جو عام آنکھوں سے نہیں دیکھا جا سکتا۔ اس میں یہ پیغام چھپا ہے کہ عشق ظاہری نہیں بلکہ ایک باطنی کیفیت اور روحانی تجربہ ہے، جسے سمجھنے کے لیے دل کا رشتہ ضروری ہے۔

مولانا ان لوگوں سے جو عاشقوں کے احوال و اطوار کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں، یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ دوراندیشی اور احتیاط کا دامن نہ چھوڑیں۔ ”دیدن بہ چشم عشق“ کا مطلب عاشق کی جگہ لینا ہے۔ انہیں دیکھنا چاہیے کہ عاشق کیا مقام رکھتے ہیں اور عشق ان کے ساتھ کیا کہانیاں سناتا ہے کہ وہ ایسے بے دل و بے دستار ہو گئے ہیں۔ عاشق کیا سوچتا ہے؟ جو شخص روزمرہ کی عادتوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے، وہ عاشق کے خیالات کو بیان کرتے وقت وہی چیزیں پیش کرتا ہے جو اس کے سامنے ہیں، اس لیے اس کی وارفتگی کو حماقت اور سفاہت سمجھتا ہے، اس کی سادگی کو بے ادبی تصور کرتا ہے۔ اور عشق کو عرف اور عادت کے ترازو میں ناپنا ایسا نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ وہ عاشق کو سفاہت اور پاگل پن کی نسبت دے کر انکار کرتا ہے اور اس کے طریقے کو مسترد کر دیتا ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

زین گذر کن، پَندِ من بپذیر هین — عاشقان را تو بہ چشمِ عشق بین
وَقت نازُک باشد و جان در رَصَد — با تو نتْوان گفت آن دَم عُذرِ خَود
فهم کن، موقوفِ آن گفتن مَباش — سینہ هایِ عاشقان را کَم خَراش
نہ گمُانی بُردہ‌ای تو زین نشاط — حَزم را مگذار، می کُن احتیاط

(مثنوی، دفتر پنجم، بخش: 116)

ترجمہ:

- اس راہ سے گزر جا، میرا یہ مشورہ قبول کر، عاشقوں کو ہمیشہ عشق کی نگاہ سے دیکھ!
- وقت نازک ہے اور جان گھات میں ہے، اس لمحے تجھ سے اپنی معذرت نہیں کہی جا سکتی۔
- سمجھنے کی کوشش کر، اس بات کے کہے جانے پر نہ رہ، عاشقوں کے دلوں کو زیادہ نہ زخمی کر۔

یہ نہ سمجھ کہ تو نے اس سرور کو پا لیا، احتیاط کو نہ چھوڑ، ہمیشہ ہوشیاری سے کام لے۔

عشق کو سمجھنے کے لیے خود عاشق ہونا ضروری ہے۔ دیکھنا اور سمجھنا ہر چیز کا یہی شرط ہے کہ جو عاشق کی جگہ پر آ کر اس کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے، تاکہ معلوم ہو کہ عاشق کیا محسوس

کرتا ہے، کیا سوچتا ہے، اور اس کے ساتھ عشق کیا حکایتیں کر رہا ہے۔ کسی چیز کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے عاشق کی نظروں سے دیکھا جائے، کیونکہ صرف اسی صورت میں حقیقت پوری طرح کھل سکتی ہے۔ دیگر صورت میں، اگر کوئی شخص غیر عاشقانہ انداز سے عاشقوں کے حالات و اطوار پر نظر ڈالے گا، تو اس کی باتیں صرف سطحی اور محدود ہوں گی، جو عشق کی حقیقی گہرائی کو سمجھنے سے قاصر ہوں گی۔ کہتے ہیں۔

پرسید یکی کہ عاشقی چیست؟ گفتم کہ مپرس از این معانی

آنگہ کہ چو من شوی ببینی آنگہ کہ بخواندت، بخوانی

(دیوان شمس، غزل:2733)

ترجمہ:

- کسی نے پوچھا کہ عشق کیا ہے؟ میں نے کہا کہ ان معانی کو نہ پوچھ۔
- جب تو میری طرح ہو گا، تب دیکھے گا، جب تجھے پکارا جائے گا، تب تو جواب دے گا۔

جو شخص اس راہ میں قدم نہیں رکھتا، وہ عشق کی حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا۔ رومی کا قول ہے کہ عشق ایک ایسی چیز ہے جسے تجربہ کرنے کے بعد ہی سمجھا جا سکتا ہے، اور اس کا گہرا راز صرف عاشق ہی جان سکتا ہے۔

دیوان شمس میں فرماتے ہیں:

ای آنکہ شنیدی سخن عشق، ببین عشق

کو حالت بشنیدہ و کو حالت دیدہ؟

(دیوان شمس، غزل:2332)

ترجمہ: اے وہ شخص جس نے عشق کی بات سنی، اب عشق کو دیکھ، وہ جو حالت سنی تھی، اور وہ جو حالت دیکھی تھی، کہاں ہیں؟

جو شخص صرف عشق کے بارے میں سنتا ہے، وہ حقیقت میں عشق کا مکمل ادراک

نہیں کر سکتا۔ عشق کا تجربہ سننے جاننے سے مختلف ہوتا ہے۔ جو شخص عشق کو واقعی سمجھنا چاہتا ہے، وہ اس کی حقیقت کو دیکھنے اور جھیلنے کے لیے خود اسے محسوس کرے۔

عشق میں نارسائیِ زبان:

زبان ایک اجتماعی مظہر ہے جو مختلف انسانی گروہوں کی مشترکہ تجربات کو محفوظ اور منتقل کرتی ہے۔ در حقیقت، انسان الفاظ اور نشانات کے ذریعے اپنے علم کے دائرے میں ہونے والی چیزوں کا اظہار کرتا ہے۔ انسانی علم اور زبان، دونوں، عوامی دائرے میں تشکیل پاتے ہیں اور کسی ایک شخص کے ذاتی تجربات کا نتیجہ نہیں ہوتے۔ جب کسی شخص کو اس دائرے سے باہر کوئی تجربہ ہوتا ہے، تو اسے اپنے تجربے کو ظاہر کرنے کے دو طریقے ملتے ہیں: یا تو وہ شخص انسانی معاہدوں پر قائم رہ کر اپنے تجربے کو بیان کرے گا، لیکن چوں کہ یہ تجربہ عوام کی رسائی سے باہر ہے، اس طرح کا معاہدہ صحیح معنی نہیں دے سکتا؛ یا وہ شخص اپنے تجربے کے لیے نئے الفاظ اور علامات تخلیق کرے گا، جو نہ صرف اس کے تجربے کو عمومی دائرے سے باہر رکھے گا بلکہ عوام کو اس کا مطلب بھی واضح نہیں کرے گا۔ اس انتخاب کے نتیجے میں ایک "ذاتی زبان" کا قیام ہوتا ہے، جس پر بعض فلسفی جیسے وٹگینسٹائن نے عمل کے عدم امکان کا حکم دیا ہے۔

پہلی صورت میں، اگر واقعی وہ شخص کا تجربہ "بالکل دوسرا" ہے، تو اس کے بیان کے لیے وہی چیزیں استعمال نہیں کی جاسکتیں جو عمومی طور پر متعارف ہیں۔ ایک تجربہ جو "دوسرا" ہے، اس کا بیان کرتے وقت بھی اس کی انفرادیت برقرار رکھنی ہوگی، اور ظاہر ہے کہ متعارف زبان کے الفاظ اور ترکیبات کے ذریعے اس کا بیان ممکن نہیں ہوگا۔ دوسری صورت میں، ذاتی زبان کے تحقق کی امتناعیت کا نظریہ شواہد کی بنیاد پر دفاعی نہیں ہے۔ اس موقف کے خلاف سب سے سادہ دلیل یہ ہے کہ اگر ہم ذاتی زبان کے تحقق کو مسترد کریں، تو اس کا مطلب ہوگا کہ ہر وہ چیز جو بیان کی جاسکے، اسے سمجھا جاسکتا ہے، حالاں کہ ایسا کوئی لازمہ موجود

نہیں ہے۔ حقیقت میں، انسانی تجربات کی مختلف رپورٹیں پیش کی جا سکتی ہیں جو مختلف وجوہات جیسے کہ الفاظ اور ترکیبوں کی غیر معمولیت کی بنا پر بحث وگمان میں مبتلا ہو سکتی ہیں۔

اصل میں، ذاتی زبان زیادہ تر وہ زبان نہیں ہوتی جو عمومی زبان سے باہر کسی نے تخلیق کی ہو، بلکہ وہ عمومی زبان کا ہی حصہ ہوتی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے خاص حالات میں، جیسے عاشق کے جذبات کی بات ہو، جس میں تجربات یقینی طور پر "بالکل دوسری" یا کم از کم "کسی حد تک دوسری" نوعیت کے ہوتے ہیں، اسے کس زبان میں بیان کرنا چاہیے؟ ایسا لگتا ہے کہ اگر عاشق اپنے تجربات کو عمومی الفاظ اور جملوں میں بیان کرے گا، تو بھی ان کی مدلولیت اتنی خاص ہوگی کہ وہ ہمیں وہی مطلب نہ دے سکیں جو عام حالات میں ایسے ہی الفاظ سے سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ "سورج" اور "دریا" جیسے الفاظ عاشق کے لیے ہمارے لیے شناسا ہیں، اور ہم ان کے مراد کو درست طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ شاید اگر عاشق اپنی پسند کے مطابق مکمل طور پر ذاتی زبان استعمال کرتا جس میں دونوں الفاظ اور ان کے معانی اس کی اپنی مرضی و معاہدے پر مبنی ہوتے، تو اس کی باتوں کو سمجھنے میں مشکلات کم ہوتیں۔ لیکن عمومی زبان کے استعمال سے اس کے تجربات کی خصوصیات کو بیان کرنا ہمیشہ سوال پیدا کرے گا کہ اس نے جو الفاظ استعمال کیے، وہ عام استعمال کے قریب تھے یا نہیں؟ یہ واضح ہے کہ ایسے لوگوں کی زبان عمومی میں استعمال کرتے وقت ذاتی زبان پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگ جو خاص تجربات رکھتے ہیں، وہ کسی زبان کے الفاظ کو نئے معانی سے بوجھل کرتے ہیں اور کبھی کبھار اپنی مراد کے اظہار کے لیے نئے الفاظ بھی تخلیق کرتے ہیں۔

ان نئے معانی کو سمجھنے میں سامعین کو مشکلات کا سامنا ہوتا ہے، اور جو شخص عمومی زبان استعمال کرتا ہے اسے بھی مسائل پیش آتے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرے جو سب سے زیادہ نئے معانی کو منتقل کر سکیں۔ الفاظ عام طور پر پہلے سے ہی خاص مقاصد کے لیے ہدایت یافتہ ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے انہیں نئے معانی کے

اظہار کے لیے استعمال کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اگر تجربے کے مالک کے پاس اپنے تجربے کے لیے مناسب الفاظ ہوں، وہ دوسروں کو ان نئے معانی کے بارے میں بتانے پر مجبور ہوتا ہے۔ یہ بتانے کا عمل بھی زبان کے ذریعے ہی ہوتا ہے، اور یہ وہی پرانی مشکل ہے جو کبھی حل نہیں ہو سکتی۔ اس طرح، لفظ کے ذریعے معنی کی منتقلی باوجود تمام کوششوں کے کبھی بھی ان شخص کے لیے مکمل طور پر اطمینان بخش نہیں ہوگی جو خاص حالات کا تجربہ کرتا ہے۔

لفظ در معنی ہمیشہ نارَسان — زان پیمبر گفت: "قَد کَلَّ لِسان"

نُطق اُصْطُرلاب باشد در حِساب — چہ قَدَر داند ز چَرخ و آفتاب؟

خاصہ چَرخی کاین فلک زو پَرّہ‌ای است — آفتاب از آفتابَش ذَرّہ‌ای است

(مثنوی، دفتر دوم، بخش: 83)

ترجمہ:

- لفظ ہمیشہ اپنے معنی کو مکمل طور پر نہیں پہنچاتا، اس لیے پیغمبر نے فرمایا: "زبان تھک چکی ہے"۔
- بولنا حساب میں اُصطرلاب کی طرح ہے، وہ کیا جانے گا چرخ اور آفتاب کی حقیقت کو؟
- خاص طور پر اس چرخ کا جو آسمان کا ایک پرہ ہے، اور آفتاب کا جو خود اس کے آفتاب سے ایک ذرہ ہے۔

یعنی لفظ اپنے مکمل معنی کو ظاہر کرنے میں ناکام رہتا ہے، جیسے زبان تھک چکی ہو۔ رومی یہاں بولنے کی کوشش کا موازنہ اُصطرلاب سے کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ کوئی بھی چیز اپنی مکمل طور پر سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہے، یہاں رومی کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی سمجھ ہمیشہ محدود ہوتی ہے، اور وہ اپنی حقیقت کو مکمل طور پر نہیں جان سکتا۔

یہ تمام مشکلات اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ معنویت کا دائرہ بہت وسیع ہے جب کہ زبان اور الفاظ کا دائرہ بہت محدود۔ وہ علم جو عالمِ غیب پر ایک جھلک دیکھ کر حاصل ہوتا ہے،

اسے ہزاروں کتابوں کے ذریعے دوسرے تک منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ عالمِ معنا کی وسعت ایسی ہے جو صرف عالمِ معنا میں، دل و جان کی صفائی کے ذریعے ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ فرماتے ہیں۔

آنکہ یک دیدن کند اِدراکِ آن سالہا نتوان نمودن از زبان

آنکہ یک دَم بینَدَش اِدراکِ ہوش سالہا نتواں شنودن آن بہ گوش

(مثنوی، دفتر سوم، بخش:90)

ترجمہ:

- جو کچھ ایک بار دیکھتا ہے، اس کا ادراک، سالوں تک زبان سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔
- جو کچھ ایک پل میں محسوس کرتا ہے، سالوں تک اسے کانوں سے نہیں سنا جا سکتا۔

انسان کی حسیات اور تجربات کو الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جو تجربہ انسان ایک لمحے میں محسوس کرتا ہے، اسے برسوں تک بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح، جو کچھ وہ ایک لمحے میں دیکھتا ہے، اسے بھی زبان سے مکمل طور پر ادا نہیں کیا جا سکتا۔

وہ علم جو عاشق اپنے تجربات میں پاتا ہے، خطی علم نہیں ہے تاکہ اسے زبان کے ذریعے بیان کیا جا سکے۔ وہ علم، ایک حجمی علم ہے جسے بیان کرنے کے لیے ہزاروں خطوط کی مدد درکار ہوتی ہے۔ ایک عمیق عاشقانہ تجربے کو بیان کرنے کے لیے ہزاروں زبانیں اور ہزاروں راستے ناکافی ہیں کیوں کہ ایسے تجربات میں معانی صاحبِ تجربہ پر ایسے دھاوا بولتے ہیں جو کہ بصورتِ حجمی ہوتے ہیں اور ان کے آغاز و انجام واضح نہیں ہوتے۔ ایسے تجربات میں ہم آغاز اور اختتام کے ساتھ روبرو ہوتے ہیں، جہاں ہر آغاز ایک اختتام ہو سکتا ہے اور ہر اختتام ایک آغاز۔ الفاظ کے ذریعے گفتگو کرتے وقت ہمیں ایک ایسا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو ہزاروں متبادل رکھتا ہو۔ مولانا کی مثال دینے میں کہ وہ الفاظ کے ذریعے گفتگو کو نیزے بازی سے تشبیہ دیتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو مجبور محسوس کرتے ہیں کہ وہ صدہا معنی کو ایک بوتل میں محدود کریں۔

ہمیشہ معانی اس کے گرد گھومتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ نوبت آتی ہے کہ وہ الفاظ کا لباس پہن لیں، اور وہ معانی جو ابھی تک ایسی مہلت نہ پا سکے ہوں کہ اپنا ظاہر کھول سکیں، وہ ان پر حملہ آور ہوتے ہیں اور خود کو آشکارا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ عجیب و غریب لگنے والے تجربات مولانا کی روزمرہ کی زندگی کے تجربات ہیں اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ کہتے ہیں کہ ان تمام گفتار کے باوجود عاشقوں کے بیانات سے ایک جملہ بھی ایسا نہیں ہے جو دوسرے کو سمجھایا جا سکے۔

زان نیامد یک عبارت در جهان — کہ نہان است و نہان است و نہان
زانکه این اَسما و اَلفاظِ حَمید — از گِلابۀ آدمی آمد پَدید
"عَلَّمَ الاَسما" بُد آدم را امام — لیک نه اندر لِباسِ عین و لام
چون نہاد از آب و گِل بر سَر کلاه — گشت آن اَسمایِ جانی روسیاه
که نقابِ حَرف و دَم در خود کَشید — تا شود بر آب و گِل معنی پَدید
گرچه از یک وَجه مَنطِق کاشِف است — لیک از دَه وَجه پَرده و مُکتنِف است

(مثنوی، دفتر چہارم، بخش:113)

ترجمہ:

- اس جہاں میں کوئی عبارت نہیں آئی، جو نہاں ہے، اور پھر بھی چھپائی ہوئی ہے۔
- کیونکہ یہ اسما اور خوش آئند الفاظ، انسان کی گلابی تقدیر سے نمودار ہوئے۔
- "عَلَّمَ الاَسما" تھا آدم کا امام، لیکن نہ عین اور نہ لام کی شکل میں۔
- جبکہ آدم نے پانی اور مٹی سے پوشاک لی، تو اسما کا جوہر بھی اس پوشاک میں چھپ گیا۔
- جو الفاظ اور جملے میں چھپ کر آیا، تاکہ پانی اور مٹی میں معنی ظاہر ہو سکے۔
- اگرچہ ایک لحاظ سے منطق آشکار کرتی ہے، مگر دس وجوہات سے پردہ اور پوشیدہ رہتا ہے۔

حقیقت اور معنی چھپے ہوئے ہوتے ہیں، اور یہ جو ہمیں نظر آتے ہیں وہ صرف ظاہر

ہیں۔ انسان کی زبان اور الفاظ ایک ظاہری شکل ہیں جو گہری حقیقت کو چھپاتی ہیں۔ "عَلَّمَ الاَسما" یعنی اللہ نے آدم کو نام سکھائے، لیکن اس کا اصل مقصد اور حقیقت اس سے بھی زیادہ گہری ہے۔ انسان کا وجود، جو کہ مٹی اور پانی سے آیا ہے، اس میں چھپے ہوئے معانی ہیں جو ظاہر نہیں ہوتے۔ حقیقت کو سمجھنا صرف ظاہری الفاظ سے ممکن نہیں ہوتا، بلکہ اس کے پیچھے چھپی حقیقتوں کو بھی جاننا ضروری ہے۔

قابلِ توجہ نکتہ جو مولانا زبان کے کردار کے بارے میں عشق کی توصیف میں بیان کرتے ہیں، یہ ہے کہ زبان اس کے مشہور کردار کے برعکس، جو کہ ناشنا ختگیوں اور مبہمات کو روشن کرنے اور واضح کرنے میں مدد دیتی ہے، عشق کے معاملے میں جہالت اور ابہام کی آگ پر تیل کا کام کرتی ہے۔

گرچہ تفسیرِ زبان روشَن گر است لیک عشقِ بی زَبان، روشن تر است

ترجمہ: اگرچہ زبان کی تفسیر روشنی دینے والی ہوتی ہے، لیکن بے زبان عشق، اُس سے زیادہ روشن ہے۔

یعنی زبان کے ذریعے بیان کردہ تفصیلات اور وضاحتیں روشنی دیتی ہیں، لیکن جو عشق دل سے ہوتا ہے، وہ زبان سے بیان کرنے سے کہیں زیادہ گہرا اور روشن ہوتا ہے۔ زبان اور الفاظ کچھ وقتوں کے لیے رہنمائی فراہم کرسکتے ہیں، لیکن حقیقی محبت اور جذبہ بغیر کسی الفاظ کے بھی اپنی طاقت اور روشنی کو ظاہر کرتا ہے۔

مولانا کے مطابق عشق ہر لحہ فیضان اور فوران میں ہے، اور اس کا پانی اس دنیا کے در و دیوار سے بہتا ہے۔ اصل عشق خود معانی ہے، اور معانی وہ شے ہے جو چھپنے کی تاب نہیں رکھتی بلکہ ہر روپ میں ظاہر ہونا چاہتی ہے۔ خوشبو، خوش روی، خوش خُلقی، وغیرہ یہ سب عشق کے جلوے ہیں۔ عاشق کے رویے، خوشبو، اور اس کے خُلق سے عشق اور اس کے انداز کو دیکھا جا سکتا ہے۔ بس یہ کافی ہے کہ عاشق کی نبض پر ہتھ رکھا جائے اور اس کے سینے پر ضربان (دھڑکن

سننے کا آلہ) تاکہ معلوم ہو کہ اس کا کیا حال ہے۔ حتیٰ کہ خود عاشق بھی دوسروں سے کہتا ہے کہ وہ اس کے احوال کو سمجھنے کے لیے اس کے دل پر ہاتھ رکھیں، اور عشق و معشوق کے بارے میں نہ پوچھیں۔ عشق عاشق کی ہر حالت اور ہر عمل سے ظاہر ہوتا ہے، اور تھوڑی سی توجہ ہی کافی ہوتی ہے کہ ایک ناظر پردے کے پیچھے چھپے ہوئے راز کو دیکھ لے۔ عشق کا سب سے کم ترین ظاہر زبان میں دیکھا جا سکتا ہے، اس لیے یہ بڑا خسارہ ہوگا اگر اس باغ سے صرف الفاظ کے پیچھے کی خوشبو دل تک نہ پہنچے۔ مولانا صرف ناظرین کی خسارہ پر ہی زور نہیں دیتے بلکہ ایک اور اہم نکتہ پر بھی زور دیتے ہیں، اور وہ عشق کی غیرت ہے جس پر ہم پہلے بھی بات کر چکے ہیں۔ یہ کہ ناظرین صرف بات سننے کے خواہش مند ہیں، لیکن یہ عشق کی غیرت ہے جو اپنی خوبی پر فخر کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ یہ بات پردہ بن جائے تاکہ وہ اس کی بے شمار جلوؤں کو نہ دیکھ سکیں۔

پاک سبحانی کہ سیبستان کند　　　در غمامِ حَرفشان پنہان کند

زین غَمام بانگ و حَرف و گُفت و گوی　　　پَردہ‌ای کز سیب ناید غیرِ بوی

باری، اَفزون کَش تو این بو را بہ ہوش　　　تا سویِ اَصلَت بَرَد، بگرِفتہ گوش

(مثنوی، دفتر ششم، بخش:1)

ترجمہ:

- پاک ہے وہ ذات جو سیب کے باغوں کو پیدا کرتی ہے، اور غم و رنج کی آوازوں کو چھپاتی ہے۔
- یہ جو بانگ، حرف، اور گفت و شنید کی آوازیں ہیں، یہ پردہ بناتی ہیں جو سیب کے درخت سے صرف خوشبو آتی ہے۔
- آخر کار، تم اس خوشبو کو ذہن میں مزید بڑھاؤ، تاکہ یہ تمھارے اصل کی طرف لے جائے، جب تم نے کان لگا رکھا ہو۔

یہ اشعار اس بات کو بیان کرتے ہیں کہ خدا کی ذات بہت پاک ہے، جو سب کچھ تخلیق کرتی ہے اور اس کے رازوں کو چھپاتی ہے۔ یہاں لفظ "سیبستان" کا استعمال علامتی ہے جو

حقیقت یا روح کی صفائی اور خوشبو کی نمائندگی کرتا ہے۔ آوازیں، الفاظ، اور گفتگو ایک پردہ بناتی ہیں جو اصل حقیقت تک پہنچنے میں رکاوٹ ڈالتی ہیں۔ اس لیے اس خوشبو یا سچائی کو مزید محسوس کرنے کی کوشش کرو تاکہ تمھاری روح اپنے اصل اور حقیقت تک پہنچ سکے۔

مولانا، عشق کے بارے میں گفتگو کو پوشیدہ اور مخفی رکھنے کو عشق کی حقیقت کی مزید تہوں کو چھپانے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ جیسے بلبل گاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کو مشغول کرے اور پھول کی خوشبو سے دور کر دے۔ عشق کے بارے میں خاموشی یہ موقع فراہم کرتی ہے کہ عشق کے دیگر جلوے خود کو ظاہر کریں، اور اس سے عشق کا راز آشکار ہوتا ہے۔ تمثیلات اور تشبیہات چاہے ہمیں حقیقت کے ایک مختصر حصے کو سمجھنے میں مدد دیں، لیکن حقیقت میں یہ خوبصورتیوں کو چھپانے کا ایک طریقہ ہیں۔ مولانا ہمیں متنبہ کرتے ہیں کہ ان کا عشق کے بارے میں بات کرنا اس لیے نہیں کہ وہ عشق کو آشکار کریں بلکہ اس لیے ہے کہ وہ عشق کو چھپائیں۔ عشق کے بارے میں بات کرنا درحقیقت اسے پوشیدہ کرنا ہے۔ اگر عاشق زبان کے میدان میں خاموش رہتا ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ ذہن اور ارادہ کے میدان میں بھی خاموش ہے۔ کہتے ہیں:

تَرسَم اَر خامُش کُنم، آن آفتاب   از سوی دیگر بِدَرّانَد حجاب
در خَموشی گُفتِ ما اَظهر شود   که زِ مَنع آن میل اَفزون تَر شود
گر بِغُرَّد بَحر، غُرّه‌ش کف شود   جوشِ "اَحبَبتُ بِاَن اُعرَف" شود
حَرف گفتن بَستَنِ آن روزَن است   عینِ اِظهارِ سخن پوشیدن است
بُلبُلانه نَعره زَن در رویِ گُل   تا کُنی مَشغولِشان از بویِ گُل

(مثنوی، دفتر ششم، بخش:20)

ترجمہ:

- ڈر ہے کہ اگر میں خاموش ہو جاؤں تو، وہ آفتاب کسی اور طرف سے پردہ چاک کر دے گا۔

- خاموشی میں بھی ہماری بات زیادہ ظاہر ہو جاتی ہے، کیونکہ روکنے سے شوق اور زیادہ بڑھ جاتا ہے۔
- اگر سمندر گرجے، اس کا غرور جھاگ بن جاتا ہے، یہ جوش دراصل "أحببتُ بأن أُعرف" کی حقیقت کا اظہار ہے۔
- الفاظ کہنا اس روزن کو بند کرنا ہے، لیکن حقیقت میں یہ باتوں کو چھپانے کا اظہار کرنا ہے۔ بلبل کی طرح گُل کے سامنے نعرہ زن ہو، تاکہ ان کو گُل کی خوشبو سے غافل کر سکے۔

مولانا حقیقت کے اظہار اور چھپانے کے درمیان باریک فرق کو بیان کرتے ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ خاموشی کے باوجود، حقیقت کی روشنی کسی اور ذریعے سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ انسانی کوششوں اور گفتگو میں بعض اوقات سچائی کو چھپانے کا ارادہ ہوتا ہے، لیکن حقیقت کی اپنی روشنی ہوتی ہے جو کسی نہ کسی طور پر عیاں ہو جاتی ہے۔ بلبل اور گُل کا استعارہ یہ بتاتا ہے کہ خوشبو (حقیقت) اپنے آپ میں کافی ہے، لیکن بلبل کی آواز لوگوں کو اس خوشبو کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

عشق میں خاموشی-مصلحت نظام ہستی:

مولانا ایک اور وجہ جو عشق کے بارے میں نہ کہنے کے لیے بیان کرتے ہیں، وہ نظامِ ہستی کا غفلت پر استوار ہونا ہے۔ زیادہ تر نوعیت اور کسی بھی شعبے میں حد سے زیادہ دانائی نظامِ ہستی کو بگاڑ سکتی ہے۔ اس لیے خداوند انسانوں کو اس قدر علم فراہم کرتا ہے جو ان کے لیے ضروری ہوتا ہے، نہ تو انھیں مکمل جاہل بناتا ہے اور نہ ہی مکمل علم عطا کرتا ہے۔ اس دنیا کی آبادکاری اس پر ہے کہ خلقِ خدا پردہ کے پیچھے کی باتوں سے بے خبر ہوں:

مولانا ایک مقام پر کہتے ہیں کہ خدا تعالیٰ بعض لوگوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیتا ہے تاکہ یہ دنیا آباد رہے، کیونکہ اگر کچھ لوگ اس عالم سے غافل نہ ہوں تو دنیا کبھی آباد نہیں ہوگی۔ غفلت ہی عمارتوں اور آبادکاریوں کا باعث بنتی ہے۔ آخر کار یہ بچہ غفلت کی حالت میں بڑا

ہوتا ہے اور جب اس کی عقل مکمل ہوتی ہے تو وہ بڑھتا نہیں۔ لہٰذا عمارت کا سبب غفلت ہے اور ویرانی کا سبب ہشیاری ہے۔"

عاشق جب دوسرے عالم میں سکونت پذیر ہوتے ہیں، تو انہیں عالمِ غیب کی کچھ ایسی معرفت حاصل ہوتی ہے جو انسانی زندگی کے معمولات کو بگاڑ سکتی ہے۔ اس لیے ان کے لبوں پر خاموشی کی مہر لگا دی گئی ہے، اور وہ صرف نادر مواقع پر اسرار کو بیان کرنے کا جواز رکھتے ہیں۔

ما چو واقِف گشتہ ایم از چون و چَند　　　مُہر بر لَب ہایِ ما بنہادہ اَند

تا نگردد رازہایِ غیب فاش　　　تا نگردد منہدم عیش و مَعاش

تا نَدَرَّد پَردہیِ غَفلَت تَمام　　　تا نَمانَد دیگِ محنَت نیم خام

(مثنوی، دفتر ششم، بخش:101)

ترجمہ:

- ہم جو "چوں" اور "چند" کے رازوں سے واقف ہو گئے ہیں، ہمارے لبوں پر مہر لگا دی گئی ہے۔
- تاکہ غیب کے راز فاش نہ ہوں، اور نہ دنیاوی زندگی کی عیش و معاش درہم برہم ہو۔
- تاکہ غفلت کا پردہ مکمل طور پر نہ چاک ہو، اور مصیبت کا دیگ آدھا پکا نہ رہ جائے۔

جو لوگ حقیقت کے گہرے اسرار سے آگاہ ہو جاتے ہیں، ان پر لازم ہے کہ وہ ان رازوں کو ظاہر نہ کریں، تاکہ دنیا کا نظام اور زندگی کی روانی متاثر نہ ہو۔ اگر ان اسرار کو فاش کر دیا جائے تو غفلت کا پردہ مکمل طور پر ہٹ جائے گا، اور دنیاوی معاملات میں توازن بگڑ سکتا ہے۔ یہ ایک حکیمانہ خاموشی کی طرف اشارہ ہے، جو فطرت اور حقیقت کے تحفظ کے لیے ضروری ہے۔

مزید فرماتے ہیں:

بر لبش قفل است و دَر دل رازہا　　　لَب خَموش و دل پُر از آوازھا

عارِفان کہ جامِ حَق نوشیدہ اند　　　رازہا دانِستہ و پوشیدہ اند
ہرکہ را اَسرارِ کار آموختَند　　　مُہر کَردَند و دَہانَش دوختَند

(مثنوی، دفتر پنجم، بخش: 87)

ترجمہ:

- اس کے لبوں پر قفل ہے، مگر دل میں راز ہیں، لب خاموش ہیں، لیکن دل اندر سے آوازوں سے بھرا ہوا ہے۔
- عارفین، جنہوں نے حقیقت کے جام نوش کیے ہیں، راز جانتے ہیں، لیکن انہیں چھپائے رکھتے ہیں۔
- جسے بھی اسرارِ حقیقت سکھائے گئے، اس کے لبوں پر مہر لگائی گئی اور زبان بند کر دی گئی۔

عارفین وہ لوگ ہیں جو روحانی سفر کے دوران حقیقت کے گہرے اسرار جان لیتے ہیں، لیکن ان پر لازم ہوتا ہے کہ وہ ان رازوں کو فاش نہ کریں۔ ان کی خاموشی ان کے علم کا اظہار ہے، اور یہ خاموشی ایک قسم کی ذمہ داری ہے جو انہیں حقیقت کے قریب لے جاتی ہے۔ لبوں پر قفل اور دل میں آوازوں کا ذکر ایک گہرے تصوف کی علامت ہے، جو اندرونی معرفت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

اگر کسی کی روح، اسے عشق کے راز بیان کرنے پر مجبور کرتی، تو سو شخص بھی موقع کی مناسبت سے اسے خاموش رہنے کا کہہ دیتے۔ اس وقت دل میں اضطراب بڑھ جاتا، اور وہ دریائے خاموشی کو اختیار کر لیتا۔

بُگذَر از زَر کاین سخن شد مُحتَجِب　　　ہمچو سیماب این دِلَم شد مُضطَرِب
ز اندرونم صَد خَموشِ خوش نفا　　　دست بر لَب می زند، یعنی کہ بَس
خامُشی بَحر است و گفتن ہمچو جو　　　بَحر می جوید تو را، جو را مَجو

از اِشارَتہایِ دریا سَر مَتاب   خَتم کن، واللہ اعلم بالصواب

(مثنوی، دفتر چہارم، بخش: 77)

ترجمہ:

- زر (ظاہر کے دلائل) سے گزر جا، کہ یہ کلام پوشیدہ ہو گیا، میرے دل کی حالت مثلِ سیماب (پارہ) مضطرب ہو گئی۔
- میرے اندر سے صد خاموشی کی خوشبو آتی ہے، گویا یہ خاموشی ہاتھ سے لبوں کو چھپانے کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ بس کرو۔
- خاموشی سمندر ہے، اور بات کرنا اس کے مقابلے میں ندی جیسا ہے، سمندر تمہیں اپنی طرف کھینچ رہا ہے، ندی کی تلاش نہ کرو۔
- دریا کی اشارتوں سے منہ نہ موڑو، ختم کرو کلام، اور اللہ بہتر علم رکھنے والا ہے۔

یہ اشعار خاموشی کی عظمت اور اس کی گہرائی کو بیان کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ گفتار کے مقابلے میں خاموشی زیادہ معنی خیز ہے اور حقیقت تک پہنچنے کا راستہ ہے۔ وہ اپنے اندر کی بے قراری اور کشمکش کو بھی بیان کرتا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ زیادہ بات کرنا حقیقت کے سمندر سے دوری کا سبب بن سکتا ہے۔ خاموشی کو اختیار کرنا اور اندرونی اشارات کو سمجھنا اصل حکمت ہے۔ آخر میں شاعر تواضع کے ساتھ کہتا ہے کہ صحیح بات کا علم صرف اللہ کو ہے۔

اگر ہم مولانا کے کلام میں عاشق اور معشوق کی نسبت پر غور کریں، تو یہ بات ہمیں واضح ہو جائے گی کہ عاشق معشوق کے سامنے عشق کے میدان میں کوئی حیثیت یا مرتبہ نہیں رکھتا، بلکہ وہ معشوق کے حضور محض سکونت پذیر ہے۔ مولانا کے مطابق، جو عشق کہا جاتا ہے، وہ کچھ بھی نہیں چھوڑتا سوائے معشوق کے، اور اگر عاشق میں کوئی حرکت ہوتی ہے تو درحقیقت وہ معشوق کی حرکت ہی ہوتی ہے۔

ایسا عاشق جو اپنی کوئی حیثیت نہیں جانتا، ثناخوانی کو بھی غلط سمجھتا ہے، کیونکہ حمد و ثنا میں

حامد اور مادح دونوں کی خبر ہوتی ہے، جبکہ عشق میں کوئی دوسرا نہیں ہوتا، صرف ممدوح اور محمود کافی ہے۔ مادح اور حامد کو اپنے کمالات کا اظہار کرنے کا حق نہیں، کیونکہ سایہ کبھی بھی سورج سے نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس کے بارے میں بات کرے۔

حتیٰ کہ اگر عاشق عشق کو بیان کرنے لگے، در حقیقت وہ خود نہیں بولتا، بلکہ یہ عشق کی سرود ہے جو عاشق کے ذریعے ظاہر ہوتا ہے۔ مولانا نے اپنے تجربات میں دریافت کیا تھا کہ عشق، عاشق کی تمام ہستی کو تسخیر کر لیتا ہے اور اس میں سے کچھ نہیں چھوڑتا۔ عشق انسان کی ذات کو اس طرح سے خالی کر دیتا ہے اور اپنے قبضے میں لے لیتا ہے جیسے مطرب نای اور چنگ کو۔ نای کی آواز اور چنگ کے زخمہ سے وہی گونج پیدا ہوتی ہے جو ساز سے نکلتی ہے، اور سب یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ نای کی آواز ہے یا وہی چنگ کا نغمہ۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

ما چو چنگیم و تو زخمہ می زَنی ‏ ‏ ‏ زاری از ما نی، تو زاری می کُنی

ما چو نائیم و نَوا در ما ز توست ‏ ‏ ‏ ما چو کوہیم و صَدا در ما ز توست

(مثنوی، دفتر اول، بخش:29)

ترجمہ:

- ہم چنگ (بربط) کی طرح ہیں اور تم ہمیں ساز کی مانند بجاتے ہو، ہم سے کوئی گلہ نہیں، تم ہی ہماری درد بھری آواز بناتے ہو۔
- ہم بیدل (بانسری) کی مانند ہیں اور ہماری دھن تمھاری پھونک سے آتی ہے، ہم پہاڑ کی طرح ہیں اور ہماری آواز تمھاری قوت سے آتی ہے۔

یہ شعر عشق اور اس کے اثرات کی گہرائی کو بیان کرتا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ ہم خام ہیں، جیسے چنگ یا نای، اور ہمارا سچ اور درد تمھارے اثرات سے ظاہر ہوتا ہے۔ جیسے ساز کی آواز اور نای کی دھن، جو مکمل طور پر سازندہ (عشق) کی حکمت اور توانائی سے نکلتی ہے، ویسے ہی ہم بھی تمھاری محبت اور اثرات سے جیتے ہیں۔

مولانا تمثیل میں بتاتے ہیں کہ کس طرح پری عاشق پر غالب آتی ہے، اور یہی سبب ہے کہ ہم عشق کے کلام کو عاشق کی زبان سے سنتے ہیں۔ پری کے جوہر کا تسلط عاشق پر ایسا ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت میں کمی آجاتی ہے، اور وہ اپنے آپ کو خالی پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ معشوق کے کلام کو ہم عاشق کے ذریعے سنتے ہیں، کیونکہ حقیقتاً وہ عاشق نہیں بولتا بلکہ عشق خود اس کے ذریعے سرود پیدا کرتا ہے۔ عاشق صرف ایک آلہ بن جاتا ہے، جیسے نای یا چنگ کا ساز، جو عشق کی آواز کو پہنچاتا ہے۔

چون پَرِی غالِب شود بر آدَمی — گُم شود از مَرد وَصفِ مَردُمی
هرچه گوید، آن پری گفته بُوَد — زین سَری، زان آن سَری گفته بُوَد
چون پَرِی را این دَم و قانون بُوَد — کِردگارِ آن پَرِی خود چون بُوَد؟
اوِی او رَفته، پَرِی خود او شده — تُرکِ بی‌الهام تازی گو شده
چون به خود آید نداند یک لُغَت — چون پَرِی را هَست این ذات و صِفَت
پس خداوندِ پَرِیّ و آدَمی — از پَرِی کِی باشَدَش آخِر کَمی؟
شیرگیر اَر خونِ نَرّه شیر خَورد — تو بگویی او نکرد آن، باده کَرد
وَر سخن پَردازَد از زَرِ کُهن — تو بگویی باده گُفتَست آن سَخُن
باده‌ای را می بُوَد این شَرّ و شور — نورِ حَق را نیست آن فرهَنگ و زور؟
که تو را از تو به کُل خالی کند — تو شوی پَست، او سخن عالی کند

(مثنوی، دفتر اول، بخش:24)

ترجمہ:

- جب پری انسان پر غالب آجاتی ہے، تو انسان کی انسانی صفات غائب ہو جاتی ہیں۔
- جو کچھ بھی وہ کہے، وہ پری کی زبان ہوتی ہے، یہاں سے وہاں تک ہر بات وہی پری

کہتی ہے۔

- جب پری کے لیے یہ وقت اور قانون ہوتا ہے، تو اس پری کا خالق خود کس طرح کا ہوگا؟
- وہ جو کچھ کرتا ہے، وہ پری ہی کر رہی ہوتی ہے، اور نئ ہدایت کے بغیر وہ ترک کر چکا ہوتا ہے۔
- جب وہ خود میں واپس آتا ہے، تو وہ ایک لفظ بھی نہیں جانتا، کیونکہ پری کی حقیقت اور صفات یہی ہوتی ہیں۔
- پس انسان اور پری کے مالک، آخر کار پری کی حقیقت سے کیسا فرق باقی رہتا ہے؟
- اگر شیر کی خون پینے والی مادہ شیر نے کھایا، تو تم کہو گے کہ وہ نہیں کرتا، بلکہ شراب بناتا ہے؟
- اور اگر وہ پرانی سونے کی چیز سے بات کرتا ہے، تو تم کہو گے کہ وہ شراب سے ہی وہ بات کرتا ہے؟
- یہ شراب ہے جس میں فساد اور ہلچل ہوتی ہے، کیا حق کا نور اس میں نہیں ہوتا، وہ زبان اور قوت سے آزاد ہوتا ہے؟
- جو تمہیں تم سے پوری طرح خالی کر دے، تمہیں پست کر دے، اور وہ عالی درجے کی بات کرتا ہو۔

یہ دلیل نہیں ہے کہ عاشق خود دیوانگی تھا اور اپنے عقل کو بیزار سمجھتا تھا، کیونکہ عقل کا لازمہ اپنے آپ میں ہونا، خود پر قابو پانا ہوتا ہے، جب کہ دیوانگی بے خودی اور بے خویشی کو شامل ہوتی ہے۔ اگر ہم ”دیوانہ“ اور ”مجنون“ کے معانی پر غور کریں، تو اس میں ایک دوسرے کے دخول اور داخل ہونے کا انداز موجود ہے جیسے مولانا بیان کرتے ہیں کہ عاشق اپنے جھوٹی انا کو کھو دیتا ہے اور دل و جان کی زمین پر محبوب کا قبضہ ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ جو دیوانہ نہیں ہے، ان پر طنز کرتا ہے اور انہیں دیوانہ (عرفی معنوں میں) کہتا ہے۔

اس وضاحت سے واضح ہوتا ہے کہ اولاً، حقیقی گوینده عشق اور معشوق ہے، اور عاشق

اس کے مظاہر کو ظاہر کرنے کا آئینہ ہے۔ ثانیاً، چونکہ نے کی آواز نے کے لیے ہے، نہ کہ آدمی کے لیے، عشق کے مظاہر، بشمول الفاظ و گفتار میں بھی، عاشق کی گنجائش کے مطابق ظاہر ہوتے ہیں، اور نہ اس طرح جیسے کہ عشق کا حق اور عاشقی ہے۔

دم کہ مَردِ نایي اَندَر نای کَرد　　　در خورِ نای است، نہ در خوردِ مَرد

هان و هان گر حَمد گویي گر سِپاس　　　همچو نافَرجامِ آن چوپان شِناس

حَمدِ تو نسبت بِدان گر بهتر است　　　لیک آن نسبت بہ حَق هم اَبتَر است

(مثنوی، دفتر دوم، بخش:37)

ترجمہ:

- جب کوئی مرد بانسری میں اپنی سانس ڈال دے، تو وہ بانسری کے لائق ہوتی ہے، مرد کی حقیقت کے نہیں۔
- دیکھو اور خبردار! چاہے تم حمد کرو یا شکر، ایسا نہ ہو کہ تمھاری حالت اس چرواہے کی طرح بے نتیجہ ہو جائے۔
- تمھاری حمد اس نسبت سے بہتر ہو سکتی ہے، لیکن خدا کے مقام کے لحاظ سے وہ پھر بھی ناقص ہے۔

مولانا اور سخنِ عشق:

باب علل اور عوامل بیان ناپذیری عشق کے حوالے سے مولانا کے نقطۂ نظر پر صفحاتِ قبل میں تفصیل سے بات ہوئی، لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی کہ وہ بحرِ ناپیدا کنار عشق میں غواصی کرنے والوں میں سے ہیں جو سب سے زیادہ عشق پر گفتگو کرتے رہے ہیں۔ مولانا عشق میں بے باک تھے اور اس سے نہ ڈرتے تھے کہ ایسی باتیں کرے جو اس کی ویرانی کا باعث بن جائیں۔ ان کے عاشقانہ کلمات اتنے گہرے اور خالص تھے کہ وہ الفاظ کے ذریعے مکمل

طور پر بیان نہیں ہو سکتے تھے، لیکن پھر بھی وہ بغیر کسی خوف و ہراس کے حقیقتِ عشق کو بیان کرتے رہا، حتیٰ کہ ان کا یہ بیان انھیں دوسروں سے دور کرتا یا تنہا کرتا رہا۔ مولانا کے نزدیک عشق صرف کلمات سے کہیں زیادہ تھا؛ انھوں نے سمجھا کہ حقیقی عشق صرف دل و جان میں ہی خود کو ظاہر کرتا ہے۔

بَند کُن چون سیل سیلانی کُنَد ورنہ رُسوایی و ویرانی کُنَد
من چہ غم دارَم کہ ویرانی بُوَد زیرِ ویران، گنجِ سُلطانی بُوَد
غرقِ حَق خواہَد کہ باشَد غَرق تَر ہَمچو موجِ بَحرِ جان، زیر و زبَر

(مثنوی، دفتر اول، بخش:90)

ترجمہ:

- سیلاب کی طرح بہنے والے کو روک لو ورنہ یہ رسوائی اور تباہی لائے گا۔
- مجھے کوئی غم نہیں اگر ویرانی ہو، کیونکہ ویرانی کے نیچے شاہی خزانہ چھپا ہوتا ہے۔
- جو حق میں غرق ہونا چاہے، اسے مزید گہرائی میں ڈوبنا ہو گا، جیسے سمندر کی موجیں اوپر نیچے ہوتی ہیں۔

وہ بار بار عشق کی بات کرنے سے بیزار نہیں ہوتے تھے، بلکہ اسے ہمیشہ نیا اور جاندار سمجھتے تھے۔ مولانا کے نزدیک عشق جیسے زندگی کا تازہ وجود تھا، جس کی بار بار یاد دہانی دل کو زندہ کرتی تھی۔ فرماتے ہیں ؎

بر ملولان این مکرر کردن است نزدِ من عُمرِ مکرر بُردَن است
شمع از بَرقِ مکرر بَر شود خاک از تابِ مکرر زَر شود

(مثنوی، دفتر سوم، بخش:173)

ترجمہ:

- ملول دل لوگوں کے لیے یہ بات بار بار دہرانا ملال کا سبب ہے، لیکن میرے نزدیک

زندگی کو بار بار دہرانا اصل حیات کا راز ہے۔

- شمع مسلسل بجلی کی چمک سے روشن تر ہو جاتی ہے، اور مٹی مسلسل تپش سے سونا بن جاتی ہے۔

یہ اشعار عشق میں استقامت کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں۔ رومی کا قول ہے کہ جو لوگ دل گرفتہ یا بے صبر ہیں، وہ بار بار کی مشق سے اکتا جاتے ہیں، لیکن حقیقت میں یہی عمل زندگی کی گہرائی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے کا ذریعہ ہے۔ جس طرح شمع روشنی کو مزید جلادیتی ہے اور مٹی گرمی سے خالص سونا بن جاتی ہے، اسی طرح مسلسل کوشش انسان کو نکھار اور کمال تک لے جاتی ہے۔

مولانا خود کو آفتاب کا پیغامبر سمجھتے تھے، اور اس وجہ سے، باوجود کم ظرفی کے، وہ اپنے مخاطبان کی حالات کا خیال رکھتا تھا۔ ان کے مخاطبان مختلف سطحوں پر موجود تھے: فرشتے، انسان، حیوان، بلکہ نباتات بھی۔ ان کے کلام میں کبھی کبھار ہم اس بات کا ذکر پاتے ہیں کہ فرشتے بھی ان کی محفل میں حاضر ہوتے ہیں اور ان سے چاہتے ہیں کہ ان کے لیے بات کریں۔ جیسا کہ دیوان شمس میں کہتے ہیں ؎

سخنم خور فرشته است، من اگر سخن نگویم
مَلَکِ گرسنه گوید که بگو، خمش چرایی؟

(دیوان شمس، غزل:2838)

ترجمہ: میری بات کو فرشتہ خوراک سمجھتا ہے، اگر میں کچھ نہ کہوں، تو بھوکا فرشتہ کہتا ہے: کیوں خاموش ہو؟ کچھ کیوں نہیں کہتے؟

رومی اپنے کلام کی روحانی اہمیت اور اثر کو بیان کرتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کی بات، جب دل کی گہرائی اور سچائی کے ساتھ نکلتی ہے، تو وہ فرشتوں کے لیے روحانی غذا کی مانند ہوتی ہے۔ خاموشی، جو بسا اوقات ضروری ہو سکتی ہے، یہاں پر فرشتوں کے لیے ایک تشنگی پیدا کرتی ہے، اور وہ اصرار کرتے ہیں کہ انسان اپنے الفاظ کے ذریعے حقیقت کا

اظہار کرے۔ یہ مولانا کے کلام کی قوت اور زورِ بیان کا اظہار یہ ہے۔

جیسا کہ ماسبق میں ذکر کیا گیا کہ جمادات بھی ان کے عاشقانہ کلام کو سمجھتے ہیں۔ مثنوی کے پہلی دفتر میں "استن حنانہ" کی داستان واضح گواہی دیتی ہے کہ مولانا جمادات کے لیے بھی عشق کی بات کرنے کو درست سمجھتے ہے، جو کہ جاندار مخلوقات، خاص طور پر انسانوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ مثنوی میں فرماتے ہیں۔

آن نِدایی کاصل ہر بانگ و نَواست　　خود نِدا آن است و این باقی، صَداست

تُرک و کُرد و پارسی گو و عَرَب　　فہم کردہ آن نِدا، بی گوش و لَب

خود چہ جایِ تُرک و تاجیک است و زَنگ　　فہم کَردَست آن نِدا را چوب و سَنگ

(مثنوی، دفتر اول، بخش:104)

ترجمہ:

- وہ ندا (آواز) جو ہر آواز اور نغمے کی اصل ہے، وہی حقیقی ندا ہے، باقی سب صرف گونج یا صدا ہے۔
- ترک، کرد، فارسی، اور عرب سب نے وہ ندا بغیر کان اور زبان کے سمجھ لی۔
- ترک، تاجیک، اور زنگ کی کیا حیثیت ہے؟ یہاں تک کہ چوب (لکڑی) اور سنگ (پتھر) نے بھی اس ندا کو سمجھ لیا۔

رومی کے مطابق حقیقی ندا وہ ندائے عشق ہے جو روحوں کو براہ راست مخاطب کرتی ہے اور مخلوق کے ہر ذرے میں موجود ہے۔ یہ ندا کسی زبان یا قوم کی محتاج نہیں، کیونکہ یہ ہر ایک کے دل تک براہ راست پہنچتی ہے۔ یہاں تک کہ بے جان اشیا، جیسے لکڑی اور پتھر، بھی اس ندا کو محسوس کر لیتے ہیں۔ یہ کائنات میں وحدت عشق اور خدا کی موجودگی کی علامت ہے، جو ہر شے کو حیات اور شعور بخشتی ہے۔

مولانا اپنے کلام کے ذریعے عشق کا پیغام عالمگیر کرنا چاہتے تھے اور تمام انسانوں کو

اس شریفی ہدایت کی دعوت دیتے تھے۔ وہ کہے تھے کہ اگر کبھی اپنے لب کو عشق کی بات نہ کہنے کے لیے کاٹتا ہے، تو در حقیقت یہ ایک چال ہے تاکہ عشق کی بات کو زیادہ دلچسپ انداز میں بیان کیا جاسکے۔ جیساکہ دیوان شمس میں کہتے ہیں۔

چہ لب رامی گزی پنہان، کہ خامش باش و کمتر گو

نہ فعل و مکر تست این ہم، کہ بر گفتار می گردم

(دیوان شمس، غزل:1422)

ترجمہ: لب کیوں کاٹ رہے ہو اور کیوں چھپانے کی کوشش کر رہے ہو؟ کہ خاموش رہو اور کم بولو۔ یہ بھی تمھارا ایک عمل اور چال ہے، کیونکہ میں تمھارے کہے ہوئے الفاظ کے گرد گھوم رہا ہوں۔

خاموشی اور سکون مولانا کے لیے یقیناً برکات لاتی تھی اور اسے عشق کی بارگاہ میں معطر کر دیتی تھی، مگر ان کے کلام کا عطر عالم بھر میں پھیلتا تھا، زمین اور آسمان کے تمام موجودات کو اس کے کلام سے فیض حاصل ہوتا تھا۔ دیوان شمس میں کہتے ہیں۔

تا خموشم من ز گلزار تو ریحان می برم

چون بنالم عطر گیرد عالم از ریحان من

(دیوان شمس، غزل:1946)

ترجمہ: جب میں خاموش رہتا ہوں، میں تیرے گلزار سے ریحان (خوشبو دار پودے) چن لیتا ہوں، اور جب میں نالہ کرتا ہوں، تو میرے ریحان سے دنیا مہک اٹھتی ہے۔

یہ شعر خاموشی اور اظہار کے درمیان ایک خوبصورت توازن کو بیان کرتا ہے۔ رومی کہتے ہیں کہ خاموشی میں وہ معانی، خوشبو اور سکون پاتے ہے، گویا گلزار سے بیش قیمت تحفے حاصل کر رہے ہوں۔ لیکن جب وہ اپنے جذبات یا درد کو بیان کرتے ہیں اور نالہ کرتے ہیں تو اس کا اثر اتنا گہرا اور وسیع ہوتا ہے کہ پوری دنیا اس کی خوشبو سے معطر ہو جاتی ہے۔

رومی جانتے تھے کہ صدیوں سے دنیا کی آنکھیں وہ حقائق تلاش کر رہی ہیں جو انھوں نے عالمِ عشق سے سے صید کیے ہیں۔ اس لیے وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اپنے معشوق کے ساتھ تنہا قید لذت میں زندگی بسر کریں، جب کہ بہت سے نفوس خشک لب اور قناعت کی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنے معشوق کو سب کے سامنے جلوہ گر کریں، اس لیے کبھی کبھار اس بلند قلعے سے نیچے آتے اور ان لوگوں سے بات کرتے جو پہاڑ کی چوٹی تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ جیسا کہ انھوں نے کہا:

"وہ نردبان آسمان بار بار چڑھتا اور اترتا رہا، تاکہ راستے میں الجھے ہوئے یا گمراہ ہو جانے والے لوگوں کو عشق کی بے شمار جلوات اور منزل تک پہنچنے کے صحیح طریقے سے آگاہ کر سکے"۔

اس عمل کے لیے تعلیم کی مشقت مول لینا ان کے لیے معمول تھا، اور باوجود عشق کی بے پناہی کے، وہ صرف چند معانی کی شاخیں اپنے ساتھ ان لوگوں تک پہنچاتے جو صحرا میں بے معنویت کے بیابان میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہ تعلیم کے مقام پر ہر قسم کی مشقت برداشت کرتے تھے تاکہ کسی کو راہِ راست پر لا سکیں۔

وہ شعر کہنے کو بھی پسند نہیں کرتے تھے، لیکن اپنی مخاطبان کی حالت کا خیال رکھتے ہوئے اور ان کی رہنمائی کے لیے مجبوراً اس پر عمل کرتا تھا، جیسا کہ ایک مقام پر کہتے ہیں

"میں کہاں سے، شعر کہاں سے! واللہ کہ میں شعر سے بیزار ہوں مگر میرے نزدیک شعر سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں۔ یہ اس طرح ہے جیسے کوئی شخص مٹی سے ہاتھ دھو رہا ہو، میرا یہ عمل صرف مہمان کی آرزو کے لیے ہے، کیونکہ مہمان کی اشتہا مٹی کی ہوتی ہے، اس لیے مجھ پر لازم ہوا۔ آخر انسان کو دیکھنا چاہیے کہ فلاں شہر میں لوگوں کو کیا چیز چاہیے اور کون سی چیز خرید رہے ہیں، وہ اپنی عقل سے وہ چیز خرید لے، اگرچہ وہ معمولی اشیا ہوں۔ میں نے علم حاصل کیا اور مشقتیں اٹھائیں تاکہ میرے پاس فضلا، محققین، زیرک لوگ اور ذہین دانشور آئیں اور میں ان کے سامنے عجیب، نایاب اور دقیق چیزیں پیش کروں۔ حق تعالیٰ نے خود ایسا

چاہا۔ اس نے تمام علم یہاں جمع کیا اور ان مشقتوں کو اس جگہ لے آیا تاکہ میں اس کام میں مشغول ہو سکوں، میں کیا کر سکتا ہوں؟ ہمارے ولایت اور قبیلے میں شاعری سے زیادہ ننگا کام کچھ نہ تھا۔ لیکن اگر ہم اس ولایت میں رہتے تو ہم طبعًا ان کے مطابق زندگی گزارتے اور وہی کرتے جو وہ چاہتے تھے، جیسے درس دینا، کتابیں تصنیف کرنا، وعظ کہنا، زہد وعمل کرنا۔"

اگرچہ تعلیم دینا مولانا کے عشق پر بات کرنے کی ایک بڑی وجہ تھی، لیکن اندرونی کشمکش اور شدید شوق، انھیں دائمًا نئے پردے ہٹانے پر مجبور کرتا تھا، تاکہ عشقِ نوعروس کے پردے مزید چاک کریں۔ دیوان شمس میں فرمایا:

یک نفس در پردہ عشقش چو جانت غسل کرد
ہمچو مریم از دمی بینی تو عیسی زاییی
خون ببین در نظم شعرم، شعر منگر بہر آنک
دیدہ و دل را بہ عشقش ہست خون پالاییی
خون چو می جوشد، منش از شعر رنگی می دہم
تا نہ خون آلود گردد جامہ خون آلاییی

(دیوان شمس، غزل: 2807)

ترجمہ:

- اگر ایک لمحے کے لیے بھی تیرے عشق کے پردے میں جان کو غسل ملے، تو تُو مریم کی طرح ایک دم میں عیسیٰ کو جنم دیتا دیکھے گا۔
- میرے اشعار میں خون دیکھ، اشعار کو ظاہری الفاظ کی خاطر نہ دیکھ، کیونکہ میری آنکھ اور دل عشق کے سبب خون سے پاکیزہ ہو چکے ہیں۔
- جب خون جوش مارتا ہے، تو میں اپنے اشعار کو رنگین بنا دیتا ہوں، تاکہ میرا لباس خون آلود نہ ہو جائے اور خون کے دھبے نہ لگیں۔

لیکن اگر مولانا کا حرفِ آخر تلاش کریں، تو بلا شبہ وہ اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ جو بھی عشق کے بارے میں کہا جائے، وہ صرف دریا پر ایک تھوکا ہوا پانی ہے اور صرف کھال کا ایک چھلکا ہے۔

ہرچہ گفتی یا شنیدی پوست بود لیسَ لُبُّ العشقِ سِرًّا قد فَشا

کی بہ قشرِ پوستہا قانع شود ذولُبابٍ فی التّجلّی قد نشا؟

(دیوان شمس، غزل:264)

ترجمہ:

- جو کچھ تم نے کہا یا سنا، وہ محض چھلکا (یعنی سطحی اور ظاہری) باتیں تھیں، عشق کا مغزوہ نہیں جو راز افشا ہو چکا ہو۔
- جو لوگ جوہر کی حقیقت کو سمجھنے والے ہیں، وہ ظاہری باتوں پر کیسے قناعت کر سکتے ہیں، جب کہ ان کی اصل حقیقت تجلی میں پروان چڑھی ہو؟

اسی بات کو بیدلؔ دہلوی نے دوہرایا ہے۔

در درسگاہ عشق دلایل جہالت است

طبعی بہ ہم رسان کہ نباید کتاب دی

(دیوان شمس، غزل:109)

ترجمہ: عشق کے مدرسے میں دلائل پیش کرنا جہالت کے برابر ہے، اپنی طبیعت کو اس مقام تک لے جاؤ جہاں کتاب کی ضرورت نہ ہو۔

یہ اشعار عشق کی فطری اور وجدانی نوعیت کو بیان کرتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ عشق وہ میدان ہے جہاں منطق، دلائل، اور کتابی علم کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ یہ ایک ایسا راستہ ہے جو دل کی گہرائیوں سے گزرتا ہے، اور اسے سمجھنے کے لیے عقل کی نہیں بلکہ دل کی ضرورت ہوتی ہے۔ شاعر اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کو اپنی فطرت کو اس مقام تک بلند کرنا

چاہیے جہاں علم و حکمت کا ذریعہ براہِ راست وجدان اور تجربہ بن جائے، اور کتابوں کی محتاجی باقی نہ رہے۔

اب تک ہم نے مولانا کے عشق اور نظریۂ عشق پر تفصیلی گفتگو کہ حالاں کہ ابھی تشنگی باقی ہے، مگر ہم اس ذکر کو مزید وسعت آئندہ کی جلد میں دیں گے۔ ابھی کچھ دیر قبل ہم نے خاموشی کا ذکر کیا اور ماقبل میں بھی اس کا ذکر کر سکے ہیں، یہ ایک ایسا لفظ ہے جسے مولانا نے دیوانِ شمس میں تواتر کے ساتھ استعمال کیا ہے، اکثر کلام کے آخری شعر میں جس سے لوگوں کو یہ گمان ہوا کہ مولانا نے خاموش تخلص اختیار کر لیا ہے۔ جب کہ ایسا نہیں۔ اب ہم ذیل میں لفظ "خاموش" اور خاموشی" پر کچھ بحث کریں گے۔

مولانا کی خاموشی کا جذباتی کردار:

جیسا کہ ہم جانتے ہیں جذباتی کردار میں پیغام کا رجحان بولنے والے کی طرف ہوتا ہے، یعنی گوینده اس کردار کے مرکز میں ہوتا ہے اور اس کے ذریعے اپنے جذبات کو مخاطب تک پہنچاتا ہے۔ اس کردار میں زبان گوینده کے جذبات پر خاص اثر ڈالتی ہے، یہاں زبانی رابطہ گوینده پر انحصار کرتا ہے، اور "میں" کا مقصد گوینده کے موقف، جذبات، اور احساسات کو براہ راست بیان کرنا ہوتا ہے۔

مولانا رومی کی شاعری پر غور کریں تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی ادب اور شاید عالمی ادب کی کسی بھی شاعر کے کلام میں مولانا کی طرح جذباتی وسعت، روحانی جذبات، اور اندرونی بے قراری کی اتنی گہرائی اور حرکت نظر نہیں آتی۔

خاموشی مختلف طریقوں سے کلام کے جذباتی کردار کو منتقل کر سکتی ہے، کیونکہ گوینده جذباتی کردار کے مرکز میں ہوتا ہے۔ وہ اپنے کلام یا خاموشی کے ذریعے اپنے احساسات اور اندرونی تجربات کا اظہار کرتا ہے، جس کے نتیجے میں سامع خاموش مفاہیم کے ساتھ گہری ہم آہنگی اور تعلق محسوس کرتا ہے۔

مولانا رومی کی زبان میں جذباتی کردارِ خاموشی کی کارکردگی کو درج ذیل صورتوں میں تحلیل اور جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے:

حیرت اور فنا کی حالت میں خاموشی:

تصوف کے لحاظ سے فنا ایک ایسی حالت ہے، جس میں بندہ خود سے بے خود ہو جاتا ہے اور اپنی ذات کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ اس حالت میں بندہ مکمل طور پر خدا کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور اس کے رسوم و آثار اس کے مشاہدہ میں فنا ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ اس کی زبان بھی خاموش ہو جاتی ہے۔

مولانا رومی کے اشعار میں اس حالت کا ذکر کچھ یوں کیا گیا ہے:

بیتی دو بماند اما بردند مرا جانا
جایی کہ جہان آنجا بس مختصرم آمد

(دیوان شمس، غزل:633)

اس کیفیت کی وضاحت میں کہا گیا ہے کہ جب بندے پر راستہ کھل جاتا ہے، تو وہ کلام کی ضرورت محسوس نہیں کرتا، کیونکہ کلام کا مقصد دوسروں کو اظہار دینا ہوتا ہے، جب کہ خدا کو اپنے بندے کے احوال کے اظہار کی ضرورت نہیں۔ جیسا کہ جنید بغدادی نے کہا:

"جس نے دل سے خدا کو پہچانا، اس کی زبان خاموش ہو گئی۔"

اس لیے کہ مشاہدہ کی حالت میں بیان حجاب بن جاتا ہے۔

مولانا رومی اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

بی خودم و مست و پراکندہ مغز
ورنہ نکو گویم افسانہ را

(دیوان شمس، غزل:259)

ترجمہ: میں بے خود، مست اور منتشر دماغ ہوں، ورنہ میں کہانی کو بہت اچھے سے

بیان کرتا۔

سکوتِ حیرت:

اس مقام پر، عارف حق کے مشاہدے سے جو حیرت اس پر طاری ہوتی ہے، اس کے باعث خاموشی اور سکوت اختیار کرتا ہے، اور کلام و نطق اس سے ساقط ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی کے الفاظ میں، "جب تیرا سورج طلوع ہوا، تو کلام مٹ گیا۔" یہ حالت سالک پر سرگشتگی اور حیرت طاری کر دیتی ہے، اور یوں سکوت حیرت کلام پر غالب آتا ہے، اور مقصود کے اظہار میں زیادہ مؤثر ہوتا ہے:

خامش کن و خامش کن زیرا کہ از امر کن
آن سکتہ حیرانی بر گفت مزید آمد

(دیوان شمس، غزل:631)

ترجمہ: خاموش رہو اور خاموش رہو، کیونکہ "کن" کے حکم سے یہ حیرت انگیز سکتہ (خاموشی) بھی کلام پر مزید بھاری ثابت ہوئی۔

خدا کے حکم "کن" (ہوجا) سے پیدا ہونے والی خاموشی اور حیرت خود ایک عظیم حقیقت ہے۔ یہ خاموشی، جو کسی عظیم راز یا حقیقت کو سمجھنے کی حالت میں پیدا ہوتی ہے، ہر طرح کی گفتگو اور بیان سے بڑھ کر ہے۔

مولانا رومی کو خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کرنے والی وجوہات میں سے ایک ایسے نامحرمان کی موجودگی ہے جو ان کے ساتھ ہمدمی اور ہم آہنگی کے لائق نہیں ہیں۔ ایسے مخاطبین کے سامنے، جو ان کے عرفانی تجربات سے ناواقف ہیں اور عشق کے درد کو نہیں چکھ سکے، مولانا سکوت اختیار کرتے ہیں، جیسا کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں ذکر کیا۔

تسلیمی (اجباری) خاموشی:

عارف جب وصال کے اس مقام پر پہنچتا ہے کہ "کالمیت فی یدی الغسال" (غسال

کے ہاتھ میں مردے کی مانند) بن جاتا ہے، تو وہ اپنی ذات میں کسی بھی ارادہ یا اختیار کو محسوس نہیں کرتا۔ وہ مکمل طور پر اپنے محبوب اور معشوق کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔ مولانا رومی کی شاعری، جو ان کے بیخودی اور بی خویشتنی کا اظہار ہے، میں یہ کیفیت واضح طور پر نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی شاعری اور شعری الہام میں بھی معشوق کی مرضی کے سامنے تسلیم ہوتے ہیں۔ مولانا اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

ای کہ میان جان من تلقین شعرم می کنی
گر تن زنم خامش کنم ترسم کہ فرمان بشکنم

(دیوان شمس، غزل:1375)

ترجمہ: اے وہ ذات جو میری جان کے اندر مجھے شعر کی تلقین کرتی ہے، اگر میں انکار کروں اور خاموش رہوں، تو ڈرتا ہوں کہ کہیں تیرے حکم کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھوں۔

اس لیے مولانا یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا ارادہ اور اختیار ان سے چھین لیا گیا ہے۔ وہ خود کو ایک برتر طاقت اور ارادہ کے حوالے کرتے ہیں، جس کے حکم پر ان کا خاموش رہنا یا بولنا منحصر ہے۔ چنانچہ جب انہیں بولنے کا موقع دیا جاتا ہے، تو وہ کلام کے جواہر بکھیرتے ہیں، اور جب روکا جاتا ہے، تو خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ کہتے ہیں ؎

گر مجال گفت بودی گفتنی ھا گفتمی
تا کہ ارواح و ملایک از آسمان تحسین کنند

(دیوان شمس، غزل:730)

ترجمہ: اگر مجھے کہنے کی پوری اجازت ہوتی، تو میں وہ سب کچھ کہہ ڈالتا جو کہنے کے لائق ہے، اور ایسا کہتا کہ ارواح اور فرشتے آسمان سے میری تحسین کرتے۔

سکوتِ استغنا:

یہ قسم کی خاموشی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب عاشق اپنے معشوق کی آواز سننے سے

لطف اندوز ہوتا ہے اور اس لذت کو ضائع ہونے سے بچانے کے لیے خاموشی اختیار کرتا ہے۔ اس صورت میں خاموشی کا مقصد معشوق کی توجہ حاصل کرنا، اس سے دل جوئی کرنا، اور اس کے ذوق ولذت سے فیض یاب ہونا ہے۔ مولانا رومی اپنی شاعری میں اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

خمش باشم ترش باشم بہ قاصد تا بگوید او
خمش چونی؟ ترش چونی؟ تو را چون من صنم باشم

(دیوان شمس، غزل:1432)

ترجمہ: میں خاموش رہوں یا ناراضگی دکھاؤں قاصد کے سامنے، تاکہ وہ اسے جا کر کہے، (وہ مجھ سے پوچھے) تم خاموش کیوں ہو؟ ناراض کیوں ہو؟ جبکہ میں تمھارا صنم ہوں۔

اس خاموشی میں عاشق اپنی تمام تر توجہ معشوق کے کلام پر مرکوز رکھتا ہے اور اس لمحے کو ضائع کرنے سے گریز کرتا ہے۔ خاموش رہنا یہاں ایک طرح کی رضا، شوق، اور معشوق کے ساتھ مکمل ہم آہنگی کی علامت بن جاتا ہے۔

سکوتِ غیرت:

غیرت مندی ان عوامل میں سے ایک ہے جو خاموشی کے جذباتی کردار کو ظاہر کرتی ہے۔ مولانا رومی معشوق کے رازوں کو فاش ہونے سے بچانے کے لیے، حتیٰ کہ شدید جذباتی ہیجان اور اندرونی شورش کے عالم میں بھی خاموشی اختیار کرتے ہیں اور اپنی بے قابو زبان کو لگام دیتے ہیں۔ وہ اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

خمش کردم کہ غیرت بر دہانم
لگام است و لگام است و لگام است

(دیوان شمس، غزل:356)

ترجمہ: میں نے اپنے لبوں کو خاموش کر لیا، کیونکہ میرے دہن پر غیرت کی لگام

ہے، لگام ہے، لگام ہے۔

مولانا اپنی خاموشی کو غیرت (عزت، وقار یا حیا) کی وجہ سے لازم قرار دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ خاموشی محض ایک انتخاب نہیں، بلکہ ایک ضروری پابندی ہے جو ان کے جذبات یا خیالات پر قابو پانے کے لیے ہے۔

اسی طرح:

داد سخن دادمی سوسن آزادمی
لیک از غیرت گرفت دل رہ گفتار من

(دیوان شمس، غزل:2064)

ترجمہ: میں کلام کو ایسی روانی سے بیان کرتا جیسے آزاد سوسن (ایک خوشبو دار پھول)، لیکن غیرت نے میرے دل سے میری گفتار کا راستہ روک لیا۔

یہ خاموشی معشوق کی عزت اور وقار کو محفوظ رکھنے کے لیے گوینده کی عمیق وفاداری اور جذباتی گہرائی کی علامت ہے۔

سکوتِ شانی:

سکوتِ شانی کی کارکردگی یہ ہے کہ کلام کو کسی ایسے معشوق یا شخصیت کے سپرد کر دیا جائے جو عاشق سے زیادہ علم اور آگاہی رکھتا ہو۔ اس خاموشی کو علمی اور آگاہی پر مبنی خاموشی بھی کہا جا سکتا ہے، کیونکہ سالک اپنے مرشد یا پیرِ طریقت کے سامنے خاموش رہتا ہے۔ معشوق یا مرشد کی شان و عظمت تقاضا کرتی ہے کہ ان کی موجودگی میں خاموشی اختیار کی جائے، ادب کا لحاظ رکھا جائے، اور ان کے کلام کو سننے کے لیے دل و دماغ کو یکجا کیا جائے۔ مولانا رومی کے مطابق، بات کرنے سے انتشار اور تفرقہ پیدا ہوتا ہے، جب کہ خاموشی ادب اور یکجہتی کی علامت ہے۔ مولانا اس کیفیت کو یوں بیان کرتے ہیں:

پیش بینا شد خموشی نفع تو

بہر این آمد خطاب أنصتوا

(مثنوی، دفتر:4)

ترجمہ: بینا (صاحبِ بصیرت) کے سامنے خاموشی ہی تمھارے لیے نفع بخش ہے، اسی لیے یہ فرمان آیا کہ: "خاموش رہو"۔

رومی کہتے ہیں کہ جب تم ایک صاحبِ بصیرت یا حقیقت کے عارف کے سامنے ہو، تو خاموش رہنا بہتر ہے، کیونکہ خاموشی خود ایک حکمت ہے اور سننے سے علم اور بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ "أنصتوا" کا اشارہ قرآن کے حکم کی طرف ہے، جو سکون، ادب، اور سننے کی تاکید کرتا ہے۔ یہ خاموشی، مخاطب کے علم و حکمت کو تسلیم کرنے، اس سے فیض حاصل کرنے، اور ادب واحترام کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھنے کا اظہار ہے۔

ترغیبی خاموشی اور اس کا کردار:

ترغیبی کردار میں کلام کی توجہ اور زور مخاطب کی جانب ہوتا ہے۔ اس کا اظہار ندائی اور امری جملوں میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ رومن یاکوبسن کے مطابق، مخاطب پر توجہ مرکوز کرنے سے کلام میں ترغیبی کردار پیدا ہوتا ہے۔ یہ بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ مولانا رومی کے دیوان شمس میں جتنے "خطاب" اور "ندائی جملے" موجود ہیں، وہ کسی بھی اور شاعر کے کلام میں اس کثرت سے نہیں ملتے۔

جس طرح کلام ترغیبی کردار ادا کر سکتا ہے، اسی طرح خاموشی بھی مخاطب کے لیے ترغیبی کردار کی حامل ہو سکتی ہے۔ خاموشی کا ترغیبی کردار مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے، جن میں سے ایک ترغیبی خاموشی کا مفہوم ہے، جو خود تین طریقوں سے نمودار ہوتا ہے۔

مولانا رومی نے اسی تناظر میں یوں کہا:

من نیم کاره گفتم باقیش تو بگو

تو عقل عقل عقلی و من سخت کودنم

(دیوان شمس، غزل:1708)

ترجمہ: میں نے بات آدھی کہہ دی، باقی تم کہو، تم سراپا عقل و دانش ہو، اور میں انتہائی نادان۔

یہاں رومی اپنی ناتوانی کا اعتراف کرتے ہوئے مخاطب (معشوق) کی حکمت اور کمال پر زور دیتے ہیں، اور خاموشی کے ذریعے معشوق کو اپنی بات مکمل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ یہ خاموشی مخاطب کے لیے ایک ترغیب بن جاتی ہے کہ وہ گفتگو کو اپنے علم و فضل سے آگے بڑھائے۔

سکوت ترغیبی مفہومی:

سکوت ترغیبی مفہومی ایک ایسی خاموشی ہے جو خود تین طریقوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی ایک شکل جایگزینی سکوت ہے، جس میں ابتدا میں کلام کا کردار ارجاعی (اشارتی) ہوتا ہے، یعنی وہ مخاطب کی طرف ہوتا ہے تاکہ اسے برانگیز دے۔ اس قسم کی خاموشی میں، ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے تبدیل کیا جاتا ہے، اور اس تبدیلی کے نتیجے میں، پہلے لفظ پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ یعنی پہلے لفظ کے بجائے دوسرا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اور اس پر خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ اس تبدیلی میں اسم کو ضمیر یا کسی اور نشانی سے تبدیل کرنا بھی ایک سکوت کے زمرے میں آتا ہے۔

مثال کے طور پر، جب کسی خط میں ابتدا میں اللہ یا خدا کا نام استعمال کرنے کی بجائے ضمیر "او" استعمال کیا جاتا ہے، تو یہ سکوت ترغیبی مفہومی کی مثال ہے۔ مولانا رومی کی غزل میں بھی ضمیر سوم شخص "او" کا استعمال معشوق کی جگہ پر اشارہ دینے والا ہوتا ہے، جو سکوت کی اس قسم کو فعال کرتا ہے۔ جیسے:

خاموش کہ گر بگویم من نکتہ ھای او را
از خویشتن برآیی نی در بود نہ بامت

(دیوان شمس، غزل:436)

ترجمہ: خاموش رہو، کیونکہ اگر میں اس (محبوب) کے نکات بیان کروں، تو تم خود سے باہر ہو جاؤ گے، نہ دروازے میں رہو گے، نہ چھت پر۔

یہاں، رومی کہتے ہیں کہ اگر وہ معشوق کی باتیں بیان کریں، تو وہ اپنے اصل ذات سے دور ہو جائے گا، اور نتیجتاً اس پر خاموشی اختیار کرتے ہیں۔

سکوت ترغیبی مفہومی طلبی:

یہ سکوت، ایک غیر طبیعی معنی یا مفاہیم کو غیر مستقیم طور پر مخاطب تک پہنچانے کا ذریعہ ہے۔ اس قسم کا سکوت زبان کا ایک ایسا حصہ ہے جو غیر مستقیم طور پر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ جب کسی عبارت کو اس کے اصل معنی میں استعمال نہیں کیا جاتا، تو وہ گوینده کی خواست کا ایک حصہ بن جاتا ہے، جہاں گوینده کسی چیز کو براہ راست بیان نہیں کرتا بلکہ اشارہ یا تمثیل کے ذریعے اپنے مطلب کو سمجھاتا ہے۔ مثلاً، جب مولانا رومی کہتے ہیں:

شراب صافی و سلطان ندیم و دولت یار
دگر نیارم بہ گفتن کہ در میانہ چہ بود

(دیوان شمس، غزل: 923)

ترجمہ: شرابِ صافی، سلطان کا قرب، اور دولت کا ساتھ، مزید یہ کہنے کی جرأت نہیں کہ ان کے درمیان اور کیا تھا۔

یہ شعر ایک بلند اور پُرسرار تجربے کو بیان کرتا ہے۔ یہ تین عناصر: پاکیزہ شراب (الہام یا عرفان کی علامت)، سلطان کا قرب (رب یا محبوب کا قرب)، اور دولت کا ساتھ (روحانی یا معنوی دولت) کو ایک اعلیٰ کیفیت کے طور پر ذکر کرتا ہے، لیکن مزید تفصیل بیان کرنے سے مانع ہے۔ یہ رک جانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان تجربات اور کیفیات کو بیان کرنا یا سمجھانا انسانی الفاظ سے ماورا ہے۔ یہ شعر عرفانی تجربے کی لطافت اور اس کی ناقابلِ بیان گہرائی کو خوبصورتی سے ظاہر کرتا ہے

یہاں رومی براہ راست نہیں بتاتے کہ کیا معاملہ ہے، بلکہ ان کا سکوت طلبی نوعیت کا سکوت ہے، جہاں وہ غیر مستقیم طور پر مخاطب کو ترغیب دیتے ہیں کہ وہ خود سمجھنے کی کوشش کرے کہ درمیان میں کیا بات ہے۔ اسی طرح، یہ سکوت گوینده کے دل کی خواہش یا مطلب کو براہ راست بیان کرنے کی بجائے، اسے اشارہ کرکے منتقل کرتا ہے۔ یہ سکوت، مخاطب کو ایسا سوچنے پر مجبور کرتا ہے جو براہ راست بات نہیں بتاتا بلکہ اس پر غور و فکر کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

جیسے حافظ شیرازی کہتے ہیں:

خمش کردم کہ آن ہوشی کہ در یابد نداری تو
مجنبان گوش و مفریبان کہ چشمی ہوش بین دارم

(دیوان شمس، غزل:1426)

ترجمہ: میں خاموش ہو گیا کیونکہ وہ ہوش جو تم میں نہیں ہے، میں اسے سمجھتا ہوں، اپنے کانوں کو مت ہلاؤ اور اپنی آنکھوں کو مت پھیرنا، کیونکہ میں وہ بصیرت رکھتا ہوں جو تم نہیں رکھتے۔

یہاں حافظ شیرازی علیہ الرحمہ کہتے ہیں کہ میں خاموشی اختیار کر رہا ہوں کیونکہ جو چیز تمہیں سمجھنے کی ہے، وہ تمھارے پاس نہیں۔ گوینده مخاطب کو تنبیہ کرتا ہے کہ وہ غور کرے، لیکن چونکہ مخاطب کے اندر ظرفیّت اور معرفت نہیں، اس لیے خاموشی واجب ہو جاتی ہے۔

سکوت تعلیمی، تأدیبی:

یہ سکوت زیادہ تر تعلیمی اور تربیتی نوعیت کا ہوتا ہے، یعنی مریدوں یا عوام کو تعلیم دینے اور نصیحت کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس میں شاعر یا گوینده کسی اخلاقی یا تعلیمی بات پر زور دینے کے لیے خاموشی اختیار کرتا ہے۔ مثلاً، مولانا رومی کہتے ہیں:

انصتوا را گوش کن خاموش باش
چون زبان حق نگشتی گوش باش

(مثنوی، دفتر:2)

یہ سکوت اس بات پر زور دیتا ہے کہ سنو اور خاموش رہو، کیونکہ حق کی بات ابھی تک ادا نہیں ہوئی۔ اسی طرح مولانا رومی کی غزلوں میں بھی سکوت کو مخاطب پر اثر ڈالنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

سکوت تعاملی:

یہ قسم کا سکوت گوینده اور مخاطب کے درمیان ایک تعامل کو ظاہر کرتا ہے، جہاں نوبت دینے کا سلسلہ ہوتا ہے۔ اس قسم کا سکوت صرف ایک گوینده کو بولنے کا موقع دیتا ہے جبکہ دوسرا خاموش رہتا ہے۔ مثلاً:

من خمشم خستہ گلو عارف گوینده بگو
زان کہ تو داوود دمی من چہ کنم رفتہ ز جا

(دیوان شمس، غزل:38)

ترجمہ: میں خاموش ہوں، میری آواز تھکی ہوئی ہے، اے عارفِ گوینده تم کہو، کیونکہ تم توداؤد کی طرح ہو، میں کیا کروں، میری حالت بے خود ہو چکی ہے۔

یہاں سکوت ایک تعاملی انداز پیدا کرتا ہے، جہاں گوینده ایک دوسرے کے ساتھ اپنے کلام کا تبادلہ کرتے ہیں، اور یہ سلسلہ صرف ایک گوینده کے بولنے اور دوسرے کے خاموش رہنے تک محدود رہتا ہے۔

معلوم ہوا کہ مولانا جلال الدین رومی کی غزلیات میں خاموشی ایک اہم موضوع ہے جو عشق، روحانیت اور انسانی تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔ رومی کی شاعری میں خاموشی کا مفہوم صرف عدم گفتگو نہیں بلکہ ایک گہرے داخلی سکوت کی علامت ہے، جو عشق الٰہی کی شدت اور روحانی تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔

رومی کی شاعری میں خاموشی کا تصور اس وقت ابھرتا ہے جب وہ عشق کی شدت کو بیان کرتے ہیں۔ خاموشی، جو کہ اکثر درد اور جدائی کی علامت سمجھی جاتی ہے، دراصل ایک

روحانی حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے جہاں انسان اپنے اندر کی گہرائیوں میں جا کر خدا کی محبت کو محسوس کرتا ہے۔ رومی کی غزلیات میں یہ خاموشی ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کو اپنے آپ سے ملاتی ہے اور اسے خدا کی قربت کا احساس دلاتی ہے۔

ان کے یہاں خاموشی کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ یہ الفاظ کی قید سے آزاد ہونے کی کوشش ہے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ بعض اوقات خاموشی ہی سب سے بڑی زبان ہوتی ہے، جو دل کی گہرائیوں میں چھپے جذبات کو بیان کرتی ہے۔ اس طرح، رومی کی غزلیات میں خاموشی ایک روحانی سفر کی علامت ہے، جو عشق کی راہ میں انسان کو خودی کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے۔

رومی کی خاموشی یہ دنیاوی شور و غل سے دوری کا احساس دلاتی ہے۔ جب انسان خاموشی میں بیٹھتا ہے تو وہ اپنے اندر کی آوازوں کو سن سکتا ہے، جو اسے اپنی حقیقی شناخت کی طرف لے جاتی ہیں۔ یہ خاموشی ایک طرح کی مراقبہ کی حالت ہے، جہاں انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں جا کر خدا کی محبت کو محسوس کرتا ہے۔

خاموشی ایک گہرے روحانی تجربے کی علامت:

رومی کی غزلیات میں خاموشی ایک گہرے روحانی تجربے کی علامت ہے، جو عشق، خودی اور خدا کی قربت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ خاموشی نہ صرف ایک داخلی سکوت ہے بلکہ ایک ایسی حالت ہے جو انسان کو اپنی حقیقی شناخت کی طرف لے جاتی ہے۔ رومی کی شاعری میں یہ خاموشی ایک گہرے معنی کی حامل ہے، جو عشق کی راہ میں انسان کو خودی کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے ان کی غزلیات میں خاموشی کا موضوع ایک منفرد اور عمیق پہلو پیش کرتا ہے۔

خاموشی کے روحانی پہلو:

رومی کی شاعری میں خاموشی عشق الٰہی کی شدت کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ ایک ایسی حالت ہے جہاں انسان اپنے اندر کی گہرائیوں میں جا کر خدا کی محبت کو محسوس کرتا ہے۔

خاموشی، درد اور جدائی کی علامت ہونے کے باوجود، ایک روحانی سکون کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

خاموشی اور عشق کی کیفیات:

رومی کی شاعری میں خاموشی عشق کی مختلف کیفیات کو بھی اجاگر کرتی ہے۔

یہ خاموشی کبھی خوشی کی علامت ہوتی ہے، کبھی درد کی، اور کبھی ایک گہرے سکوت کی جو عشق کی شدت کو بیان کرتی ہے۔

عشق کی راہ میں خاموشی ایک ایسی کیفیت ہے جو انسان کو اپنے محبوب کی قربت کا احساس دلاتی ہے۔

کلامِ رومی میں خاموشی کی علامتیں:

رومی کی غزلیات میں خاموشی کی مختلف علامتیں ملتی ہیں، جیسے چاند کی روشنی، رات کی خاموشی، اور ہوا کی سرگوشیاں۔

یہ علامتیں خاموشی کی گہرائیوں میں چھپے معانی کو اجاگر کرتی ہیں، جو عشق اور روحانیت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ رومی کی شاعری میں یہ علامتیں ایک خاص جمالیاتی احساس پیدا کرتی ہیں، جو قاری کو خاموشی کی خوبصورتی میں غرق کر دیتی ہیں۔

خاموشی کا فلسفہ:

رومی کی شاعری میں خاموشی کا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی داخلی دنیا کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ یہ خاموشی ایک دعوت ہے کہ انسان اپنے دل کی سنیں اور اپنے اندر کی آوازوں کو سمجھیں۔ رومی کی شاعری میں خاموشی کو محبت کی زبان سمجھا جا سکتا ہے، جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی ہے۔ یہ خاموشی کبھی کبھی محبت کی شدت کو بیان کرنے کا سب سے مؤثر طریقہ ہوتی ہے، جہاں الفاظ ناکام ہو جاتے ہیں۔ ان کے کلام میں خاموش زبان ایک خاص جاذبیت رکھتی

ہے، جو قاری کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے۔

خاموشی کی جمالیات:

رومی کی شاعری میں خاموشی کی جمالیات بھی اہم ہیں، جو قاری کو ایک خاص تجربے میں لے جاتی ہیں۔

یہ خاموشی کبھی کبھی قدرت کی خوبصورتی کے ساتھ جڑی ہوتی ہے، جیسے چاند کی روشنی یارات کی خاموشی، جو عشق کی گہرائیوں میں ایک خاص احساس پیدا کرتی ہیں۔ رومی کی غزلیات میں یہ جمالیاتی پہلو خاموشی کی خوبصورتی کو اجاگر کرتا ہے، جو قاری کے دل میں ایک خاص اثر چھوڑتا ہے۔ علاوہ ازیں رومی کی غزلیات میں خاموشی کی عکاسی انسانی جذبات کی پیچیدگیوں کو بھی ظاہر کرتی ہے۔ یہ خاموشی کبھی کبھی ایک گہرے درد کی علامت ہوتی ہے، جو عشق کی جدائی کے لمحات میں محسوس کی جاتی ہے۔ رومی کی شاعری میں یہ درد کی خاموشی ایک خاص گہرائی رکھتی ہے، جو قاری کو اپنے اندر کی دنیا کی طرف متوجہ کرتی ہے۔

خاموشی کی قوت:

رومی کی شاعری میں خاموشی کی قوت کو بھی تسلیم کیا گیا ہے، جو انسان کو اپنے اندر کی آوازوں کو سننے کی دعوت دیتی ہے۔ یہ خاموشی ایک طاقتور احساس پیدا کرتی ہے، جو انسان کو اپنی روح کی گہرائیوں میں لے جاتی ہے۔ رومی کی غزلیات میں یہ خاموشی ایک خاص قوت کی علامت ہے، جو عشق کی راہ میں انسان کو خودی کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے۔

خاموشی کی گہرائیوں میں سفر:

رومی کی شاعری میں خاموشی کا سفر ایک روحانی تجربے کی طرف اشارہ کرتا ہے، جہاں انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں جا کر خدا کی محبت کو محسوس کرتا ہے۔ یہ سفر کبھی کبھی ایک چیلنج کی صورت میں بھی آتا ہے، جہاں انسان کو اپنی داخلی دنیا کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ رومی کی

غزلیات میں یہ سفر ایک خاص روحانی بیداری کی طرف لے جاتا ہے، جو انسان کو اپنی حقیقی شناخت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔

غرض رومی کی غزلیات میں خاموشی ایک عمیق اور متنوع موضوع ہے، جو عشق، روحانیت اور انسانی تجربات کی عکاسی کرتا ہے۔ یہ خاموشی نہ صرف ایک داخلی سکوت ہے بلکہ ایک ایسی حالت ہے جو انسان کو اپنی حقیقی شناخت کی طرف لے جاتی ہے۔ رومی کی شاعری میں یہ خاموشی ایک گہرے معنیٰ کی حامل ہے، جو عشق کی راہ میں انسان کو خودی کی حقیقت سے آشنا کرتی ہے۔

ہم نے یہاں مولانا جلال الدین رومی کی شاعرانہ عظمتوں کے حوالے سے چند نکات بیان کیے، ابھی ہماری بات مکمل نہیں ہوئی، مولانا کی دیگر خصوصیات پر ہم اگلی جلد میں بحث کریں گے۔ ان شاء اللہ عزوجل۔

یہ قصۂ لطیف ابھی ناتمام ہے
جو کچھ بیاں ہوا ابھی آغاز باب تھا

مصادر و مراجع:

- انس التائبین، شیخ احمد جام، تصحیح علی فاضل، تہران، توس، 1368
- حیات معنوی مولوی، مہدی کمپانی زارع، تہران، نگاہ معاصر، 1390
- عرفان و فلسفہ، ولتر ترنس استیس، ترجمہ بہاء الدین خرمشاہی، تہران، سروش، 1373.
- فیہ مافیہ، جلال الدین مولوی، تصحیح توفیق سبحانی، تہران، پارسہ، 1388.
- مقالات شمس تبریزی، شمس الدین تبریزی، تصحیح محمد علی موحد، تہران، خوارزمی، 1377.
- مولانا و مسائل وجودی انسان، مہدی کمپانی زارع، تہران، نگاہ معاصر، 1390.
- مناقب العارفین، احمد افلاکی، تصحیح تحسین یازیجی، تہران، دنیای کتاب، 1375.
- پورنامداریان، تقی (1375)، رمز و داستانہای رمزی در ادب فارسی، تہران: علمی فرہنگی، چاپ پنجم۔
- حافظ شیرازی، شمس الدین محمد (1387)، دیوان، بر اساس نسخہ غنی و قزوینی، تہران: زرین و سیمین۔
- داور پناہ، امیر، ”شخصیت بخشی بہ مفاہیم انتزاعی در غزلیات شمس“، مجلۂ پژوہشگاہ علوم انسانی و

مطالعات فرہنگی، شمارہ: 13، 14، ص. 323-295

- زرقانی، سید مہدی؛ مہدوی، محمد جواد؛ آیاد، مریم (1392)، "تحلیل شناختی استعارہ ہای عشق در غزلیات سنایی" جستار ہای نوین ادبی، دورہ 14، شمارہ 183، ص. 1-30
- مہدوی، محمد جواد؛ آیاد، مریم (1393)، "تطور استعارۂ عشق از سنائی تا مولانا"، ادبیات عرفانی دانشگاہ الزہرا، دورہ 1، شمارہ: 11، ص. 43-79
- سنایی، مجدود بن آدم (1388)، دیوان، بہ سعی و اہتمام مدرس رضوی، تہران: سنائی، چاپ ہفتم.
- شفیعی کدکنی، محمد رضا (1375)، صور خیال در شعر فارسی، تہران: آگاہ، چاپ ششم.
- شمس قیس، محمد بن قیس (1381)، المعجم فی معاییر اشعار العجم، بہ تصحیح محمد قزوینی، تہران: دانشگاہ تہران.
- عطار، محمد بن ابراہیم (1359)، دیوان، حواشی و تعلیقات از م. درویش، تہران: جاویدان، چاپ دوم.
- (1391)، تذکرہ الاولیاء، بررسی، تصحیح متن، توضیحات و فہارس از محمد استعلامی، تہران: زوار، چاپ بیست و یکم
- مقدادی، بہرام (1378)، فرہنگ اصطلاحات نقد ادبی از افلاطون تا عصر حاضر. تہران: فکر روز.
- مولوی، جلال الدین محمد بن محمد کلیات شمس تبریزی، گنجور ڈاٹ کام۔
- مثنوی معنوی، گنجور ڈاٹ کام۔
- ولیزادہ پاشا، لیلا (1397)، بازتاب مفہوم عشق در غزلیات شمس و قرآن کریم با رویکرد استعارۃ شناختی، رسالہ دکتری۔
- Cuddon, J.A. (1370) A Dictionary Literary Terms. Tabriz: Chehr.
- Gray, Martin. (1986) A Dictionary of Literary Terms. England: Longman.
- The Encyclopedia of Poetry and Poetics. (1969) Edited by Alex Preminger and Others.USA: Princeton.

28/ جنوری 2025

اہل سنت کی آواز کا خصوصی شمارہ حمد و نعت

سلسلۂ برکاتیہ کا شمار ہندوستان کے اہم سلسلوں میں ہوتا ہے۔ خانقاہ برکاتیہ کے اکابر میں دسویں صدی ہجری کا ایک اہم نام میر سید عبدالواحد بلگرامی ہے۔ انھوں نے اپنے عہد میں بدعات و منکرات سے اسلام کی حفاظت فرمائی۔ اس باب میں ان کی کتاب سبع سنابل شریف آج بھی رہ بر و رہ نما کی حیثیت رکھتی ہے۔ خانقاہ مارہرہ کے پہلے بزرگ سید میر عبدالجلیل بلگرامی قدس سرہ ہیں، آپ نے بلگرام سے ہجرت کرکے قصبہ مارہرہ میں سکونت اختیار کی، آپ کے صاحب زادے حضرت سید شاہ برکت اللہ عشقی مارہروی کی ذات علوم شریعت و معرفت کا مرجع البحرین تھی، عشقی مارہروی عربی، فارسی، ہندی اور برج بھاشا کے زبردست شاعر تھے دیوان کے علاوہ کئی تصانیف عقائد و سلوک کے عنوانات پر بھی ہیں۔

یہ حقیقت کسی سے پوشیدہ نہیں کہ ہر دور میں خانقاہ برکاتیہ نے ایسے ایسے لعل و گہر پیدا کیے جن سے اشاعت اسلام کے ساتھ ہی سلسلۂ قادریہ میں توسیع ہوئی۔ وابستگان سلسلہ نے ہر دور میں طالبانِ حق کی رہنمائی فرمائی۔ تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کا سلسلہ تو آج تک جاری و ساری ہے۔

آج کے اس پر آشوب دور میں خانقاہ برکاتیہ سے شائع ہونے والا مستقل کتابی سلسلہ ''اہل سنت کی آواز'' زبان و ادب کی جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس وقت ہمارے مطالعہ کی میز پر اس کا خصوصی شمارہ ''حمد و نعت موجود ہے جو 29 ویں جلد کی اشاعتِ جدید ہے اور جمادی الاولیٰ 1446ھ/نومبر 2024ء میں شائع ہوکر منظرِ عام پر آئی ہے۔ اس کے ناشر ہیں: خانقاہ برکاتیہ بڑی سرکار، مارہرہ

شریف، ضلع ایٹہ، اتر پردیش۔

یہ خصوصی شمارہ تاج العلما سراج العرفا حضرت سید شاہ اولاد رسول محمد میاں قدس سرہ ، سید العلما سراج الاولیا حضرت سید شاہ آل مصطفیٰ سید میاں قدس سرہ، احسن العلما سراج الاصفیا حضرت سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن میاں قدس سرہ، شفیق ملت حضرت سید حسین میاں زیدی قادری برکاتی قدس سرہ، فضل ملت حضرت سید محمد افضل میاں قادری برکاتی قدس سرہ کی یادگار اور حضور احسن العلما سراج الاصفیا سید شاہ مصطفیٰ حیدر حسن میاں قدس سرہ سے منسوب ہے اور حضرت قدس سرہ کے ہی اشارۂ باطنی پر اس شمارے کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔

مدیر اعلیٰ ہیں حضرت سید نجیب حیدر نوری میاں مدظلہ العالی اور مدیر کی حیثیت سے ڈاکٹر سید محمد عثمان قادری برکاتی ا اسمِ گرامی نمایاں ہے۔ مجلسِ ادارت میں سید محمد امان میاں قادری برکاتی، ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی قادری برکاتی اور سید حسن حیدر برکاتی بھی شامل ہیں جب کہ مجلسِ مشاورت کے شرکا حضرت امین ملت پروفیسر سید شاہ محمد امین میاں قادری برکاتی اور شرفِ ملت حضرت سید محمد اشرف میاں قادری برکاتی ہیں۔

632 صفحات پر مشتمل یہ اس کتاب کو 6 ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے:

1-گوشہ مضامین: اس میں ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، سید صبیح رحمانی، ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی، علامہ محمد عبد المبین نعمانی، مولانا توفیق احسن برکاتی، مفتی محمد ممتاز مصباحی، مولانا نفیس احمد مصباحی، پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید، پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی، ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی، مولانا ارشاد عالم نعمانی، پروفیسر سید سراج الدین اجملی، مفتی محمد سلیم بریلوی، ڈاکٹر حامد رضا صدیقی اور حافظ افتخار احمد قادری کے تنقیدی، تحقیقی اور تجزیاتی مضامین شاملِ اشاعت ہیں۔ یہ گوشہ ابتدا سے ص:468 تک وسعت رکھتا ہے۔ اس میں ص:106 تک حمدیہ ادب سے متعلق مضامین اور اس کے بعد نعتیہ ادب کا احاطہ کرتی ہوئی عمدہ ترین تحریریں شامل ہیں۔

2-گوشۂ حمد میں حضرت نوری میاں علیہ الرحمہ، اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ، سید علی حسین اشرفی میاں علیہ الرحمہ، احسن مارہروی علیہ الرحمہ، علامہ حسن رضا خاں علیہ الرحمہ، حضرت نظمی میاں علیہ الرحمہ، حضرت شرف ملت مد ظلہ، اسید الحق محمد عاصم القادری، مفتی احمد یار خاں نعیمی، عرفان صدیقی، امیر مینائی، بیدم وارثی، ڈاکٹر اقبال، اسماعیل میرٹھی، بیکل اتساہی، مظفر وارثی، نشتر خانقاہی، جگن ناتھ آزاد، راہی فدائی، شہزاد مجددی، صبیح رحمانی قتیل شفائی، کرشن بہاری نور، ابرار کرت پوری، مضطر خیر آبادی کے حمدیہ کلام پیش کیے گئے ہیں۔

3-گوشۂ نعت کے تحت عربی میں حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ، امام زین العابدین بن حسین رضی اللہ عنہما، امام شرف الدین محمد بن سعید بوصیری رحمہ اللہ، حضور صاحب البرکات سید شاہ برکت اللہ اور حضرت سید شاہ ابوالحسین احمد نوری قدس سرہما کے نعتیہ قصائد کی شمولیت ہے۔

4-فارسی نعتیں: اس عنوان کے تحت حضرت خواجہ نظام الدین اولیا، ملا عبد الرحمٰن جامی، حضرت امیر خسرو اور مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نعتیہ افکار آنکھوں کو نور اور دل وجاں کو سرور عطا کر رہے ہیں۔

5-اردو نعتیں کے دامن میں غالب، شاہ فضل رسول بدایونی، حضرت نوری میاں، مولانا شاہ عبد القادر بدایونی، امام احمد رضا فاضل بریلوی، سید شاہ علی حسین اشرفی میاں، حضور تاج العلما، سید العلما، احسن العلما حضرت حجۃ الاسلام، مفتی اعظم ہند نظمی مارہروی، شاہ عبد الحمید سالم القادری، حضور تاج الشریعہ، مولانا اسید الحق قادری، حضرت شرف ملت، ڈاکٹر اقبال، مولانا کافی، بہادر شاہ ظفر، آسی غازی پوری، مولانا احمد یار خاں نعیمی، علامہ ارشد القادری، مظفر وارثی وغیرہ جواہر پارے بھرے ہوئے ہیں۔

6-گوشۂ کوائف میں جامعہ احسن البرکات کے کوائف، امین ملت کے سفر بغداد، دیگر دینی وتبلیغی اسفار، کوائف خانقاہ برکاتیہ اور مشاعرہ عرس نوری کی روداد شاملِ اشاعت ہے۔

دیکھا جائے تو یہ پورا مجموعۂ مضامین و اشعار قابلِ مطالعہ اور ادبی و تاریخی مرقع ہے۔ اس کی اشاعت کے پس منظر و پیش منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے مدیر محترم حضرت سید نجیب حیدر نوری میاں قبلہ صفحہ 12 پر لکھتے ہیں:

> "یہ بات ہمارے لیے باعث سعادت ہے کہ اراکین خانقاہ برکاتیہ اس مرتبہ حمد و نعت پر مبنی خصوصی شمارہ منظر عام پر لا رہے ہیں اور یہ سعادت آثار کام والد ماجد حضور احسن العلماقدس سرہ کے اشارہ باطنی کے سبب ہو رہا ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ حضور والد ماجد نے برادر مکرم حضرت شرف ملت کو خواب میں ارشاد فرمایا کہ حمد و نعت پر "اہل سنت کی آواز" کا "حمد ونعت" شمارہ نکالو۔ لہٰذا انھوں نے اس خواب کا اظہار حضرت امین ملت مدظلہ العالی سے فرمایا، لہذا برکاتیوں کے ذوق مطالعہ کی نذر یہ شمارہ کیا جا رہا ہے۔ حالاں کہ اس موضوع پر انواع واقسام کے خصوصی شمارے پہلے بھی منظر عام پر آچکے ہیں لیکن ہم نے کوشش کی ہے کہ اس حوالے سے مضامین میں تنوع پیدا کریں۔ لہذا عربی فارسی اور اردو نعتیہ ادب سے متعلق نئے مضامین بہت ہی مفید ہاتھوں سے لکھائے جانے کی کوشش ہم خادمان خاندان برکات نے کی ہے۔ ساتھ ہی کچھ منتخب اور معروف شعرا کے نعتیہ کلام بھی احباب کے ذوق مطالعہ کی نذر کرنے کی کوشش کی ہے، امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔"

گوشۂ مضامین میں پہلا مضمون "اردو میں حمدیہ شاعری: تاریخ و ارتقا" ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط صدر اردو لسانی کمیٹی، بال بھارتی، پونہ کی تحقیقی فکر کا مرقعِ دلنواز ہے، یہ اصل مضمون کی تلخیص ہے جسے ڈاکٹر عامل رحمانی نے قلم بند کیا ہے۔

ڈاکٹر نشیط نے اردو شاعری کی مختصر تاریخ پیش کردی ہے اور اسی تاریخ بیانی کی ضمن میں حمدیہ شاعری کی مبسوط تاریخ بھی بیان فرمائی ہے، تحقیقی اسلوب کی حامل اس تحریر میں ڈاکٹر نشیط اردو کے شعری ادب کی سات سو سالہ تاریخ کے دورانیے کا بڑی خوبی سے بیان کرتے ہیں، انتہائی سلیس اور دل آویز انداز میں انھوں نے اس خشک موضوع میں چاشنی انڈیل کر رکھ دی ہے۔

اس کے معًا بعد دوسرا مضمون جو شاملِ اشاعت ہے وہ سید صبیح رحمانی مدیر نعت رنگ کراچی کا ہے، اس مضمون کی تلخیص بھی ڈاکٹر عامل رحمانی نے ہی فرمائی ہے۔

سید صبیح رحمانی اس وقت نعتیہ ادب میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پاکستان تعلق رکھتے ہیں، مشہور و معروف نعت گو شاعر اور محقق و نقاد کی حیثیت سے دنیا بھر میں اپنی ایک الگ شناخت انھوں نے قائم کی ہے۔ نعتیہ ادب کے تحقیقی، تنقیدی اور علمی جریدہ "نعت رنگ" مدیر اور نعت کی تحقیق کے لیے قائم کیے گئے ادارے "نعت ریسرچ سینٹر" کے بانی و سیکریٹری ہیں۔ اس کے علاوہ "ادارہ یادگار غالب" پاکستان کے صدرِ اعلیٰ بھی ہیں۔ نعتیہ ادب میں گراں قدر خدمات کے پیشِ نظر حکومتِ پاکستان انھیں "تمغۂ امتیاز" سے بھی نواز چکی ہے۔

آپ کی علمی و قلمی خدمات کا دائرہ انتہائی وسیع و عریض ہے، آپ نے مذہبی اصنافِ سخن کی تحقیق و تنقید کے حوالے سے اب تک جو کچھ بھی لکھا ہے وہ سب اکیڈمک حیثیت کا حامل ہے۔

زیرِ تبصرہ خصوصی شمارہ "حمد و نعت" میں آپ کے مقالے کا عنوان ہے: "اردو کا حمدیہ ادب - ایک اجمالی جائزہ" اس مضمون میں انھوں نے انتہائی حساس سوال اٹھایا ہے اور کما حقہ اس کا جواب بھی دینے کی کوشش کی ہے اور جہاں تک ہم سمجھتے ہیں ان کا یہ انداز فکر بالکل

درست ہے۔ ''اردو کے حمدیہ ادب کا ذخیرہ فکری وفنی لحاظ سے لائق افتخار ہے یا نہیں؟ ایسے پر آشوب دور میں یہ سوال قائم کرنا جب ہر شخص بزعمِ خود میر و غالب بنا پھرتا ہو، بڑا جرأت کی بات ہے۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ سید صبیح رحمانی نے کیا فرمایا:

''یہاں ایک سوال ہماری توجہ چاہتا ہے، وہ یہ کہ اردو کے حمدیہ سرمایۂ شعری کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فکری وفنی ہر دو لحاظ سے یہ ذخیرۂ ادب و شعر لائق افتخار ہے؟ یہ ایک بے حد سنجیدہ اور اہم سوال ہے۔ اس پر غور کرنا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ حمد بحیثیت صنف ادب حمد باری تعالیٰ کے بارے میں کسی رورعایت کے بغیر ہم یہ طے کر سکیں کہ ہمارے یہاں اس حوالے سے کیا کام ہوا ہے، یہ کام کتنا اور کس درجے کا ہے۔ تاہم اس سوال پر غور کرتے ہوئے پہلے ہمیں یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ عالمی ادب میں حمدیہ کلام کی صورت حال کیا رہی ہے؟ یوں تو یہ ایک نہایت تفصیل طلب کام ہے، لیکن سردست ہمیں پورے پورے دفتر کھنگالنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اجمالی نگاہ بھی اس سلسلے میں ایک تاثر اخذ کرنے میں ممد و معاون ہوگی۔ دنیا کے قدیم ترین ادب کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی معاشرہ اور تہذیب ایسی نہیں، جس میں معتد بہ ذخیرہ حمدیہ ادب کا نہ ملتا ہو۔ چین، یونان، ہندوستان اور مصر سے لے کر ایران اور عرب تک حمد نگاری کی ایک دیرینہ روایت ہمارے

سامنے آتی ہے۔ ظاہر ہے اس میں موضوعات، مضامین، اسلوب اور آہنگ کا فرق تہذیبوں کے اپنے اپنے مزاج کے مطابق ملتا ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ عہد قدیم سے عصر حاضر تک کسی زبان و ادب میں حمد کو نظر انداز نہیں کیا گیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ نظر انداز کرنے کا تو سوال ہی کیا، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ پہلے زمانے کے شعرا کے پاس سب سے اہم موضوع ہی وہ تھا جس میں وہ اپنے خالق ورازق کی ثنا کرتے، اس سے ہم کلام ہوتے یا مناجات کرتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے پروردگار کو پہچاننا اور اس سے اپنے ربط و تعلق کا اظہار کرنا دراصل ازل سے اس عہد تک انسانی فطرت کی طلب اور اس کی روح کا تقاضا رہا ہے۔ جہاں تک بات ہے کلام کے معیار کی تو اس حوالے سے کہا جائے گا کہ بلند فکری سطح کا سرمایۂ شعر، عام طور سے کم ہی ملتا ہے۔ زیادہ مقدار میں وہی کلام ملتا ہے جس میں اوسط درجے کے جذبات واحساسات سے کام لیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس میں عوامی سطح کی ترجمانی کی گئی ہے۔"(ص:50-51)

عصر حاضر میں نعت گو شعرا کی حمدیہ خدمات کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"جہاں تک عصر حاضر کا تعلق ہے، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے عہد کے جن شعرا نے نعت گوئی کو

اختیار کیا ان کی توجہ حمد نگاری کی طرف بھی مبذول ہوئی۔ علاوہ ازیں نعت گوئی کے فروغ کے لیے قائم اداروں نے بالخصوص نعتیہ مشاعروں کے ساتھ ساتھ حمدیہ مشاعروں کا اہتمام بھی کیا جس کے نتیجے میں شعرا کے ایک بڑے طبقے نے ان مشاعروں میں مسلسل شرکت کے باعث حمد کا قابل قدر تخلیقی سرمایہ جمع کر لیا اور اسی سرمایے کو مجموعہ ہاے حمد کی شکل میں پیش کرنے کے رجحان نے زور پکڑا ہے۔ ان اداروں میں مجلس احباب ملت کراچی، حمد و نعت ریسرچ سینٹر کراچی، دبستان وارثیہ کراچی اور حمد و نعت اکیڈمی نئی دہلی، محفل نعت اور بزم حمد و نعت اسلام آباد جیسے کئی ادبی اداروں کی کاوشیں لائق ستائش ہیں۔ شعر و ادب کے جو خزینے ہمیں اپنے متقدمین کی میراث کے طور پر ملے ہیں حمد کا رنگ و آہنگ تو اس میں بھی بہت نمایاں تھا۔ عربی و فارسی کے تناظر میں دیکھا جائے تو حمد کی ایک توانا روایت شعر و ادب کا حصہ رہی ہے۔ اردو میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائی دور سے تا حال بیشتر شعرا نے اپنے دواوین کا آغاز حمد ہی سے کیا ہے، یہی نہیں، بلکہ اردو زبان و ادب پر مسلم تہذیب کے گہرے اثرات کے باعث غیر مسلم شعرا کے ہاں بھی حمد نگاری کا ایک توانا رجحان دیکھا جا سکتا ہے۔"(ص:53-54)

حمد کے شعبے میں اب تک ہونے والے کاموں کا ایک اشاریہ اور کوائف بھی صبیح

رحمانی صاحب نے اپنے مقالہ میں پیش کیا ہے، انھوں نے مختلف رسالوں کے خصوصی شماروں اور مجموعہ ہائے کلام کے مختصر مختصر تعارفات پیش کیے ہیں، ہم یہاں صرف ان رسالوں اور کتب کے اسما درج کریں گے تاکہ ہمارے قارئین کو بھی کچھ اندازہ ہو سکے کہ حمد نگاری کی دنیا میں اب تک کیا کیا ہو چکا ہے اور یہ بھی سمجھ میں آسکے کہ آئندہ کیا کچھ ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔

رسائل و جرائد کا جو تعارف صبیح رحمانی نے پیش فرمایا ہے ان کا اجمالی تذکرہ حسب ذیل ہے:

- ماہ نامہ نعت لاہور، حمد باری تعالیٰ نمبر (جنوری 1988)
- سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ، پہلا شمارہ (1990)
- ماہ نامہ "تحریریں" لاہور، حمد باری تعالیٰ نمبر (1991)
- سہ ماہی "مفیض" گوجرانوالہ، حمد نمبر (1997، 2003)
- کتابی سلسلہ "جہانِ حمد" کراچی (1988)
- "خیال و فن" لاہور، حمد باری تعالیٰ نمبر (1999)
- کتابی سلسلہ "نعت رنگ" کراچی، حمد نمبر (1999)
- "نقوشِ" قرآن نمبر، جلد چہارم میں گوشۂ حمد (2001)
- ماہ نامہ "نعت" لاہور، حمد خالق (2003)
- ماہ نامہ "ارمغانِ حمد" کراچی۔
- سہ ماہی "عقیدت" سرگودھا (2004)
- ماہ نامہ "قرطاس" ناگ پور، حمد و مناجات نمبر (2006)
- "جہانِ نعت" حمد و مناجات نمبر (2013)
- ہفت روزہ "دھوم" گوجرانوالہ، حمد نمبر (2018)

رسائل و جرائد کے حمد نمبر کی تفصیلات کے بعد حمد یہ ادب پر شائع ہونے والی چند کتابوں کا ذکراور ان پر مختصر تبصرے بھی شاملِ مقالہ ہیں۔ان کی فہرست حسب ذیل ہے۔

- اردو میں حمد و مناجات: ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط
- اردو میں حمد گوئی، چند گوشے: پروفیسر شفقت رضوی
- اردو حمد کی شعری روایت: صبیح رحمانی
- تحمید و تحسین: پروفیسر محمد اقبا جاوید
- خوشبوے حمد: ڈاکٹر احسان اللہ طاہر
- اردو غزل میں نعتیہ و حمدیہ عناصر: محمد کاشف ضیا
- حمدیہ شاعری کی متنی وسعتیں: ڈاکٹر عزیز احسن
- حمدیہ تذکرہ نگاری –اذانِ دیر: طاہر سلطانی
- حریم ناز میں صداے اللہ اکبر: طاہر سلطانی
- اردو حمد کا ارتقا: طاہر سلطانی
- گلشن احمد: طاہر سلطانی
- گلبانگ وحدت: نور احمد میرٹھی

ان کے علاوہ کچھ تحقیقی مقالات کی فہرست بھی صبیح رحمانی نے پیش کی ہے۔اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ مختصر میں انھوں نے گذشتہ چار پانچ دہائیوں کے حمدیہ ادب کی تاریخ کا خلاصہ انتہائی ادیبانہ انداز میں پیش فرمادیا ہے۔

یہ فہرستیں اور مختصر تبصرے جو انھوں نے پیش کیے وہ اگرچہ مکمل تو نہیں کہے جا سکتے لیکن یہ ضرور ہے کہ نصف صدی کی ادبیاتِ حمد کا احاطہ ضرور کرتی ہیں۔ہم مبارک باد پیش کرتے ہیں اس کامیاب مقالے کے لیے سید صبیح رحمانی کو۔

تیسرا مقالہ ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی کے قلمِ گوہر قم کا شاہکار ہے۔ عنوان ہے:

”اردو حمدیہ شاعری میں صنائع بدائع“۔

جیسا کہ ہم اور آپ جانتے ہیں علمِ بدیع میں صنائع معنوی اور لفظی بیان کیے جاتے ہیں اگرچہ یہ صرف آرائش سخن کے لیے ہوتے ہیں، باوجود اس کے برمحل استعمال سے کلام میں معنی خیزی اور لطافت پیدا ہو جاتی ہے، اگر بے تکلفی کے ساتھ یہ صنائع کلام میں در آئیں تو حسن کلام کا سبب بن جاتے ہیں۔

صنائع کی دو اقسام ہیں: صنائع معنوی اور صنائع لفظی، ان دونوں کی کئی ذیلی اقسام بھی ہیں جن کا تذکرہ کتبِ علمِ بدیع میں تفصیل سے مل جائے گا۔ اس بارے میں ڈاکٹر محمد حسین مُشاہدؔ رضوی لکھتے ہیں:

> ”صنائع و بدائع شاعری کے حسن و زیور ہیں۔ اس سے کلام میں حُسن اور لطف کی کیفیت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو لوازم شاعری میں شمار کیا جاتا ہے۔ البتہ صنائع و بدائع کا استعمال بڑی سلیقہ مندی کا متقاضی ہے۔ حد اعتدال سے زیادہ اس کا استعمال کلام میں حُسن و خوبی کے بجاے بے کیفی اور عیب جوئی کی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ حضرت مولوی نجم الغنی رام پوری نے اپنی تصنیف ”بحر الفصاحت میں ستاون صنائع لفظی اور چون صنائع معنوی یعنی کُل ایک سو گیارہ صنعتیں شمار کی ہیں۔ عصر جدید کے شعرا ان صنعتوں کا استعمال شاذ و نادر ہی کر رہے ہیں۔ راقم نے 2005 میں ”اردو کی دل چسپ اور غیر معروف صنعتیں“ نامی ایک رسالہ مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ جسے اہل علم نے کافی سراہا؛ مذکورہ رسالہ میں اردو کی غیر معروف بلکہ ناپید

اور متروک صنعتوں سے کل چالیس صنعتیں مع تمثیلات و
توضیحات پیش کی گئی تھیں۔"(ص:71)

اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انھوں نے لکھا:

"اصناف غزل و قصیدے میں صنائع و بدائع کے استعمال کی بڑی گنجائش ہے کیوں کہ اس میدان میں مبالغہ اور غلو پر کوئی پابندی یا قدغن نہیں ہے۔ لہذا شعرا صنائع و بدائع کے استعمال کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ غزل اور قصیدہ میں صنائع بدائع کا استعمال آسان ہے۔ جب کہ حمد و نعت کے تنگ نائے میں اس کا استعمال بے حد دشوار اور مشکل ترین امر ہے۔ اس لیے کہ یہاں غلو اور مبالغہ کا ہرگز گزر نہیں۔ البتہ حمد میں صنعت تاریخ، صنعت تلمیح، لف و نشر مرتب و غیر مرتب، مراعاۃ النظیر، صنعت اقتباس (قرآن و حدیث کے حوالے یا اشارے وغیرہ) خاص طور سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ لیکن ان کے استعمال کے لیے بھی شعری تجربہ اور سلیقہ درکار ہے۔

در اصل عصر موجودہ کی شاعری میں بیان و بدیع نیز بہت سے فنی اور عروضی اصولوں اور نزاکتوں پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی اور نہ ہی شعرا ان فنون اور آدابِ شاعری سے واقفیت کو ضروری اور لازمی سمجھتے ہیں لیکن بیسویں صدی کے کم سے کم نصفِ اول تک ان باریکیوں اور فنی قیود و آداب پو توجہ ضروری سمجھی جاتی تھی۔"(ص:71-72)

آگے انھوں نے صنائع کا ذکر و تعارف اور ان کے بر محل استعمال کی مثالیں حمدیہ ادب سے پیش کی ہیں۔ مجموعی اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ لائق مطالعہ اور عام قارئین کی معلومات میں اضافے کا بہترین ذریعہ بھی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور مقالہ ”نعت کا ہیئتی اور صنفی تنوع“ کے عنوان سے ڈاکٹر مشاہد صاحب نے تحریر فرمایا ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے ارباب علم و ادب کی گراں قدر آرا پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف اصناف سخن میں نعتیہ افکار کا انتہائی حسن و خوبی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔

مولانا توفیق احسن برکاتی جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے قابلِ ذکر استاذ، بہترین قلم کار اور عمدہ ترین نعت نگار ہیں۔ آپ کی تحریریں ہند و پاک میں قدر کی نگاہوں سے دیکھی جاتی ہے۔ خصوصی شمارہ ”حمد و نعت“ کے لیے انھوں نے ”نعت خوانی کے اقدار و آداب“ تحریر فرمائے ہیں۔ آج ہمارے اسٹیجوں سے کس انداز میں نعت خوانی کی جارہی ہے اور ضرورت کس بات کی ہے؟ ان تمام باتوں کو انھوں نے انتہائی سنجیدہ لب و لہجے میں سپردِ قرطاس فرمایا ہے۔ حالاتِ حاضرہ کے پیشِ نظر یہ مضمون کافی اہم ہے اور بلا مبالغہ آج اس قسم کی تحریروں کی کافی ضرورت بھی ہے۔ اہمیت کے پیشِ نظر ہی آپ کا یہ مضمون ماہ نامہ اشرفیہ مارچ 2025ء میں بھی شائع کیا گیا ہے۔ انھوں نے آداب و اقدار کا تذکرہ فرمایا آج ہر ذی ہوش اس کی تائید ہی کرے گا، علاوہ ازیں انھوں نے جو یہ فرمایا کہ:

> ”منتظمین جلسہ پر لازم ہے کہ وہ شریعت کا پابند خطیب مدعو کریں اور باشرع نعت خواں بھی، فقط شہرت یافتہ اور خوش آواز نعت خواں یا شاعر نہ بلائے جائیں، یہ مذہبی جلسوں کے تقدس کو پامال کرنا ہے جس کی قطعہ طور پر اجازت نہیں دی جاسکتی ہے۔“

ہم آپ کے اس قولِ فیصل پر سرِ تسلیم خم کرتے ہیں اور پر زور الفاظ میں اس کی تائید کرتے ہیں۔

عام طور پر ادب کو سماج کا آئینہ قرار دیا جاتا ہے۔ ادب صرف وہی بیان نہیں کرتا ہے جو سماج میں ہوتا ہے، بلکہ وہ سماج پر اثرانداز بھی ہوتا ہے، سماج کی کمزوریاں، اور خرابیاں بھی اجاگر کرتا ہے اور اسے ارتقا کی طرف بھی لے جاتا ہے۔ جس طرح موضوعات غزل و نظم سماج پر اثرانداز ہوتے ہیں اسی طرح حمد و نعت کے مضامین کا بھی معاشرے اور سماج کے فکر و شعور پر گہرا اثر پڑتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم مبارک پور کا ذکر کرنا چاہیں گے جہاں نعت و حمد کا دیرپا اثر دیکھنے کو مل سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں کوئی شب ایسی نہیں گزرتی جب کہیں نہ کہیں حمد و نعت کی محفل نہ آراستہ نہ ہوتی ہو، لوگ ذوق و شوق سے ان محفلوں میں شریک ہوتے ہیں، اپنی معلومات میں اضافہ بھی کرتے ہیں اور حمدیہ و نعتیہ ادب کے اثرات کو دل میں جما کر رکھتے ہیں۔

ابو الحسنات مفتی محمد ممتاز عالم مصباحی کی ایسے ہی اثرات کا تذکرہ کرتی ہوئی ایک تحریر ”حمد و نعت کا سماج پر اثر“ اس خصوصی شمارے میں شاملِ اشاعت ہے۔ آپ اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

> ” انسان اپنی فطرت اور طبع کے اعتبار سے ترنم، پسند واقع ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ سے دونوں کے جب کوئی بات نثر میں کہی جاتی ہے خواہ وہ کتنی اہم کیوں نہ ہو، لیکن لوگ اس کو سننے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لیتے اور نہ اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس جب یہی بات نظم و ترنم میں کہی جاتی ہے تو لوگ اس کو سننے میں دلچسپی لیتے ہیں اور اس سے اثر بھی قبول کیا کرتے ہیں۔ نثر کے مقابلے میں

نظم کی اسی اثر انگیزی کے تناظر میں سماج پر مرتب ہونے والے حمد و نعت کے اثرات کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

جی ہاں! سماج اور معاشرہ پر حمد و نعت کے بہت ہی گہرے اور دیرپا اثرات مرتب ہوتے ہیں، کیوں کہ ان کے ذریعے لوگوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح کر کے انھیں سچا پکا سنی اور صالح مسلمان بنانے کا فریضہ انجام دیا جاتا ہے اور معاشرے سے برائیوں کو دور کر کے اسے ایک صالح اور مثالی معاشرہ بنانے کا کام کیا جاتا ہے۔

حمد و نعت کے ذریعے فرد اور سماج کی اصلاح کا گراں قدر فریضہ انجام دینا اس لیے ممکن ہوتا ہے کہ ان میں خالق کائنات و مالک ہفت آسمان و زمین اللہ جل شانہ و عز اسمہ اور اس کے محبوب دانائے غیوب خاتم پیغمبراں، سرور جن و انسان، محسنِ انسانیت، شمس الضحیٰ، بدر الدجیٰ، طٰہٰ و یٰسین ارواحنا فداہ جناب احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعریف و توصیف کرنے اور ان کی عظمت و بزرگی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سواد اعظم اہل سنت و جماعت کے عقائد و معمولات پر بھی اچھی روشنی ڈالی جاتی ہے۔" (ص:157-158)

حق اور سچ تو یہ ہے کہ حمد نعت پڑھنے یا سننے سے انسان کی روحانی حالت میں بہتری پیدا ہوتی ہے، اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا جذبۂ فرواں دلوں کو منور و مجلیٰ کرتا ہے اور انسان کو یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اللہ تعلیٰ کے احکام اور رسولِ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اپنی زندگی کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں، یقیناً ایک طرح کی عبادت

ہے، جو دل کو سکون اور اطمینان عطا کرتی ہے۔

حمد و نعت ذہنی انتشار سے نجات کا ذریعہ بھی ہیں اور انسانی فکر و مثبت رخ پر رکھنے میں ہمیشہ مدد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مخصوص لب و لہجے اور الفاظ کی دل آویز ردم کے ساتھ کہے گئے اشعار انسان کے اندر خوشی اور محبت کی ایک نئی لہر پیدا کرتے ہیں اور خوشی کا یہ دورانیہ انسان کو اپنے ارد گرد کے لوگوں کے ساتھ محبت اور ہمدردی سے پیش آنے کی تحریک دیتا ہے۔

ایسا نہیں کہ نعت کا اثر شخصی اور انفرادی ہی ہو، بلکہ یہ معاشرتی سطح پر بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جب لوگ حمد و نعت پڑھتے ہیں یا سنتے ہیں تو یہ ان کے درمیان محبت، بھائی چارے، اور اتحاد کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اس قسم کی تقدیسی محفلیں لوگوں کو ایک مقام پر جمع اور اتحاد و یگانگت کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔

اس کے علاوہ ان تقدیسی اصناف میں پوشیدہ پیغام اخلاقی تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے، قرآن و سنت کے احکام اور نبی کی تعلیمات کو ان اصناف کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے، جس کے سبب انسان کو سچائی، انصاف، اور محبت کی راہ پر چلنے کی ترغیب ملتی ہے۔

حمد و نعت یہ دونوں اسلامی تاریخ و تہذیب اور تمدن و ثقافت کا اہم حصہ ہیں، مختلف زبانوں اور لہجوں میں لکھی اور پڑھی جاتی ہیں جن کے سبب اسلام کی عالمگیریت کا احساس نمایاں ہوتا ہے اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد اور بھائی چارے کو فروغ ملتا ہے۔

زیرِ تبصرہ کتاب کے ص:205 پر ایک انتہائی تحقیقی مقالہ پیش کیا گیا ہے، مقالہ نگار ہیں: حضرت مولانا نفیس احمد مصباحی، جامعہ اشرفیہ کے مقبول و معروف استاذ اور صاحبِ طرز ادیب کی حیثیت سے جانے اور پہچانے جاتے ہیں، عربی ادب کے حوالے سے ان کی خدمات کا دائرۂ کار انتہائی وسیع ہے۔ ہند و پاک کے علاوہ عرب ممالک میں بھی آپ کی عربی دانی کے چرچے اور قلمی خوبیوں کے تذکرے ہوتے رہتے ہیں۔ آپ نے اپنے اس مضمون میں جن

اولین عربی نعت گویاں کا تذکرہ کیا ہے، ہم ان کے اسما ذیل میں نقل کر دے رہے ہیں:

○ جناب ابوطالب بن عبد المطلب
○ حضرت حسان بن ثابت انصاری خزرجی
○ حضرت عبد اللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ
○ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ
○ حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ
○ حضرت صفیہ بنت عبد المطلب رضی اللہ عنہا
○ حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا
○ حضرت عباس بن مرداس رضی اللہ عنہ
○ حضرت عبد اللہ بن زبعریٰ رضی اللہ عنہ
○ حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ عنہ
○ حضرت سفیان بن حارث رضی اللہ عنہ
○ حضرات خلفاے راشدین رضی اللہ عنہم۔

آپ نے مذکورہ اصحابِ سخن کے کلام کا چیدہ چیدہ حصہ بلیغ ترجمہ کے ساتھ پیش فرمایا ہے اور اپنے مخصوص انداز میں انتہائی اہم تبصرے بھی تحریر فرمائے ہیں۔ پورا مضمون ہی لائقِ مطالعہ ہے۔

اسی سلسلے کی دوسری کڑی پروفیسر سید محمد اسد علی خورشید قادری کا مقالہ ہے، جو مولانا نفیس صاحب کے مقالے کے معًا بعد شاملِ اشاعت ہے۔ عنوان ہے: فارسی ادب کے چند معروف متقدم نعت گو شعرا۔

پروفیسر صاحب نے ہماری معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے جن فارسی شعرا کے تذکرے اور ان کے کلام پیش فرمائے ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

○ فردوسی ○ حکیم سنائی ○ عطار نیشاپوری ○ نظامی گنجوی ○ شیخ سعدی شیرازی ○ امیر خسرو، ○ مولانا جلال الدین رومی ○ مولانا نور الدین جامی ○ عرفی شیرازی۔

اور تیسری کڑی کے طور پر اردو کے کلاسیکی شعرا کا تذکرہ پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے فرمایا ہے۔

اس مضمون میں انھوں یہ دیکھنے کی کوشش کی ہے کہ اردو کے کلاسیکی شعرا نے کن اصناف میں اور کن جہتوں سے بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنی حاضری درج کرائی ہے۔ انھوں نے تحریر کیا کہ:

> "ابتدائی کاوشوں میں دکنی شعرا اور صوفیا کے ولادت نامے، معراج نامے، وفات نامے، چکی نامے وغیرہ کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ ذرا اور آگے بڑھتے ہیں تو مثنویوں، قصیدوں اور غزلوں میں نعتیہ اشعار چمکتے نظر آتے ہیں۔ حصولِ برکت یا عوام کو اسوۂ حسنہ کے مختلف پہلوؤں سے آگاہی بخشنے یا مذہبی جذبات کو مستحکم کرنے کے لیے لکھے گئے ان اشعار میں بالعموم سیدھا سادہ انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اور حضور کی سیرت، شخصیت اور عظمت پر زور دیا گیا ہے۔"

پروفیسر قمر الہدیٰ فریدی نے اردو ادب کے جن کلاسیکی شعرا کی نعت گوئی کو موضوعِ سخن بنایا ہے ہم صرف ان کے ناموں کی فہرست اپنے قارئین کی معلومات کے لیے درج کر رہے ہیں:

○ خواجہ بندہ نواز گیسو دراز ○ مومن خاں مومن ○ امیر مینائی ○ محسن کاکوروی ○ مرزا محمد رفیع سودا ○ میر حسن۔

مضمون مختصر مگر معلوماتی ہے، اس موضوع کو اور وسعت دینے کی ضرورت تھی، ہمیں امید ہے کہ پروفیسر صاحب دیگر متقدمین کی نعتیہ نگارشات کا تذکرہ بھی آئندہ اپنے کسی مضمون میں تفصیل کے ساتھ ضرور کریں گے۔

ڈاکٹر احمد مجتبیٰ صدیقی نے خانوادۂ برکاتیہ کی شعری رایات کا تذکرہ انتہائی دل نشین پیرایے میں کیا ہے۔ حضرت صاحب البرکات کی شعر گوئی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ” حضرت صاحب البرکات عربی اور فارسی میں عشقی اور ہندی میں پیمی تخلص فرماتے تھے، اور تینوں زبانوں میں ایسی شاعری فرماتے کہ یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ کس زبان میں حضرت عشقیؔ کو زیادہ دسترس حاصل ہے۔ آپ کا کلام سلوک و معرفت، کلام الٰہی اور محبت رسول او اور صاحبان معرفت کی مدحت سے مستعار ہے بلکہ ایک سرمایۂ ادب ہے۔ حضور صاحب البرکات کا بارگاہ رسالت میں ” یاشفیع الوری سلام علیک “ کے عنوان سے صلاۃ و سلام پوری دنیا میں عشق و محبت کا ایک ممتاز نغمہ تصور کیا جاتا ہے۔ اور زبان زد خاص وعام ہے۔“(ص:324)

صاحب البرکات کے ادبی مقام و مرتبے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے پروفیسر مسعود حسن خاں صاحب مقدمۂ تاریخ زبان اردو کا ایک اقتباس مذکورہ کتاب کے ص:188 کے حوالے سے درج کیا ہے جس سے ان کی ادبی اہمیت کا خوب اندازہ ہو جاتا ہے۔

مضمون انتہائی وقیع ہے اور خانوادہ کے دیگر تمام ارباب سخن کے ذکرِ دل پذیر کی رعنائیاں بکھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔

مولانا ارشاد عالم نعمانی نے ”نعتیہ شاعری میں خانوادۂ قادریہ بدایوں کا امتیاز“ بیان

فرمایا ہے، اکابر خانوادۂ قادریہ کی نظر میں نعت نگاری کے اصول و آداب کے بیان کے بعد انھوں نے جن اکابر خانوادۂ قادریہ بدایوں کی نعت نگاری پر اظہارِ خیال کیا ہے ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

- ○ حضرت مولانا شاہ فضل رسول قادری بدایونی
- ○ حضرت مولانا فیض احمد بدایونی
- ○ حضرت مولانا شاہ عبد القادر قادری بدایونی
- ○ حضرت شاہ مطیع الرسول محمد عبد المقتدر قادری بدایونی
- ○ حضرت مولانا شاہ عاشق الرسول محمد عبد القدیر قادری
- ○ حضرت شیخ عبد الحمید محمد سالم قادری بدایونی
- ○ حضرت مولانا حکیم عبد الماجد قادری بدایونی
- ○ حضرت مولانا عبد الحامد قادری بدایونی
- ○ حضرت مولانا عبد الہادی قادری بدایونی
- ○ حضرت شیخ اسید الحق محمد عاصم قادری بدایونی
- ○ حضرت شیخ عبد الغنی محمد عطیف میاں قادری بدایونی
- ○ حضرت مولانا فضل رسول بدایونی

آخر میں مولانا ارشاد احمد نعمانی نے ”نعتیہ شاعری کے فروغ میں اکابر خانوادۂ قادریہ کا حصہ“ اور ”درگاہ قادری کی محفل و نعت میں احتساب کی روایت“ کو جامعیت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

پروفیسر سید سراج الدین اجملی نے ”امام احمد رضا کی شاعری کی ادبی خصوصیات کا جائزہ“ لیا ہے اور مفتی محمد سلیم بریلوی نے ”گلستانِ شعر و سخن میں خانوادۂ رضویہ کی گل کاری“ کو اجاگر کیا ہے، جب کہ ”اردو میں غیر مسلم نعت گو شعرا“ کا ذکرِ جمیل ڈاکٹر حامد رضا صدیقی نے

فرمایا ہے۔

ڈاکٹر حامد رضا صدیقی کا یہ مضمون بھی کافی اہم ہے۔ البتہ ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ”یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید“۔ انھوں نے جو نام گنوائے ہیں وہ یقیناً بڑے نام ہیں، مگر ابھی گنجائش تھی کہ اس موضوع کو اور وسعت دی جاتی۔

یقیناً اہلِ سنت کی آواز کا یہ خصوصی شمارہ حمد و نعت ادب کی تقدیسی انتقادیات کی ایک اہم کڑی کے طور یاد رکھا اور محفوظ کیا جائے گا، ان شاء اللہ عزوجل۔ طباعت و سرورق انتہائی عمدہ ہے البتہ پروف کی غلطیاں جا بہ جا در آئی ہیں، اس پر مزید توجہ ہو جاتی تو بہتر ہوتا۔ ہمیں امید قوی ہے کہ خانقاہِ برکاتیہ مارہرہ آئندہ بھی اس قسم کے علمی و ادبی کاموں کی سرپرستی فرماتی رہے گی اور علم و ادب کے تقدیسی گوشوں کی رونمائی کا حق ادا کرتی رہے گی۔ اس عظیم الشان اشاعت کے لیے ذمہ دارانِ خانقاہ، سرپرستان، مدیران اور جملہ معاونین کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

(ماہ نامہ اشرفیہ اپریل 2025ء میں شائع)

(تحریر: 10/مارچ 2025ء)

جہانِ حافظ ملت (جلد اول)

حضور حافظ ملت حضرت علامہ شاہ عبد العزیز محدث مراد آبادی علیہ الرحمۃ والرضوان برصغیر کے جلیل القدر عالم دین، بلند پایہ محدث، عظیم مصلح اور اسلامی علوم کے فروغ میں بے مثال خدمات انجام دینے والے بزرگ کے طور پر عالمِ اسلام میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو ایک روشن چراغ ہے جو اہل علم اور طالبان حق کے لیے مشعل راہ ہے۔

بھوج پور مراد آباد سے لے کر مبارک پور کی آخری آرام گاہ تک حضور حافظِ ملت کی حیاتِ دل نواز کا ہر گوشہ لائقِ تقلید ہے، حافظِ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ قوم و ملت کے سچے محافظ و پاسبان بھی تھے اسی لیے لوگ عقیدت و محبت سے لبریز لہجے میں "حافظِ ملت" پکارا کرتے تھے۔ علم حدیث کی خصوصی معرفت حاصل تھی اس وجہ سے "محدث مراد آبادی" بھی کہے جاتے تھے۔ تدریسی انداز میں اخلاص، تحقیق، اور طلبہ کی علمی تربیت کا خاص پہلو نمایاں تھا، آپ نے ہزاروں طلبہ کو علم دین سے آراستہ کیا جنھوں نے آفاقِ عالم کے ہر طاق میں اسلام و سنیت کے چراغ روشن کیے۔

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی دینی خدمات بے شمار ہیں، برصغیر میں اہل سنت و جماعت کی تقویت کے لیے انتھک محنت کی، بدعات و خرافات کے خلاف آواز بلند کی اور اہل حق کو صحیح عقائد کی طرف متوجہ کیا۔ آپ کی سیرت و شخصیت پر گزشتہ پچاس برسوں سے اہلِ قلم خامہ فرسائی کر رہے ہیں لیکن ذات و صفات کے بہت سارے گوشے ہنوزہ پردۂ راز میں ہیں۔

حافظ ملت علیہ الرحمہ اعلیٰ اخلاق و کردار کا پیکر تھے، آپ کی زندگی سراپا اخلاص اور للّٰہیت کا نمونہ تھی، آپ نے ہمیشہ حسن اخلاق، نرمی، عفو و درگزر اور خیر خواہی کو اپنا شعار

بنایا۔ طلبہ کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آتے اور ان کی علمی و روحانی ترقی کے لیے خصوصی توجہ دیتے۔ آپ کی مجلس میں عاجزی اور انکساری کا ماحول ہوتا، جہاں ہر شخص کو عزت و محبت ملتی, تدریسی انداز محبت اور شفقت سے بھرپور ہوتا، جس کی وجہ سے طلبہ نہ صرف علمی لحاظ سے ترقی کرتے بلکہ روحانی عروج کی منزلوں پر بھی فائز ہوتے۔ اگر کوئی طالب علم غلطی کرتا تو آپ سختی کے بجائے نرمی سے سمجھاتے اور حوصلہ افزائی کرتے تاکہ وہ اپنی اصلاح کر سکے۔ طلبہ کو آزادانہ سوالات کرنے کی اجازت ہوتی اور آپ نہایت شفقت کے ساتھ ان کے سوالات کے جوابات دیتے, انھیں خود اعتمادی سکھاتے اور ہمیشہ ان کی ذہنی و فکری ترقی پر زور دیتے۔ اگر کوئی طالب علم مالی پریشانی میں مبتلا ہوتا تو خاموشی سے اس کی مدد کرتے اور کسی کو اس کی خبر بھی نہ ہونے دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے فیض یافتگان نہ صرف اعلیٰ پائے کے علما و فقہا ہوئے بلکہ مثالی انسان بھی ثابت ہوئے۔

حضور حافظِ ملت نے ہمیشہ شریعتِ مطہرہ کی سختی سے پیروی کی اور دوسروں کو بھی اسی کا درس دیا۔ وہ اپنی حیات کے ہر گوشے میں سنتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک پہلو پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، احتیاط کا یہ عالم تھا کہ اگر کسی چیز میں ذرا بھی شک و شبہہ ہوا، تو اس سے مکمل اجتناب فرمایا۔ ان کی پوری زندگی عبادت و ریاضت کا عملی نمونہ تھی، تہجد، نوافل، ذکر و اذکار اور تلاوتِ قرآن روزمرہ زندگی کا لازمی حصہ تھے۔

جہاں تک ہم نے ان کی زندگی کا مطالعہ کیا ہمیں یہی احساس ہوا کہ شہرت اور دنیاوی مفاد سے بالکل ہی بے نیاز تھے اور ہر کام خالص لوجہ اللہ کیا کرتے تھے۔ دنیاوی جاہ و حشم سے کنارہ کشی اختیار فرما کر سادہ طرزِ حیات اور انکساری کو اپنایا۔ بڑے قناعت پسند اور صابر و شاکر تھے، معاملات میں مکمل دیانت داری اور عدل کا پہلو اختیار کرتے، کبھی بھی کسی کے ساتھ ناانصافی نہ فرماتے اور ہر فیصلے میں شریعت کو مدنظر رکھتے۔

جلالۃ العلم حضور حافظِ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان بلند پایہ محدث تھے، علمِ حدیث

میں گہری بصیرت اور مہارت کے حامل تھے، ان کی حدیث دانی کا اندازہ ان کے علمی کارناموں، تدریسی خدمات اور طلبہ کی تربیت سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ وہ احادیثِ مبارکہ کو سمجھنے، ان کی تشریح کرنے اور ان سے استنباط کرنے میں مہارت تامہ رکھتے تھے۔

جیسا کہ ہم اور آپ جانتے ہیں حدیث کے علم میں سند (Chain of Narrators) اور رجال (Biographies of Narrators) کی تحقیق بنیادی حیثیت رکھتی ہے، تلامذہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد میں اس فن کے ماہر تھے۔ وہ اپنے درس میں شارحین کے اقوال اور فقہی اختلافات کو واضح طور پر بیان فرمایا کرتے تھے۔، ساتھ ہی ساتھ احادیث کے ظاہری الفاظ کے ساتھ ساتھ ان کے باطنی معانی اور عملی تطبیق پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے اور محدثین کے ساتھ ساتھ فقہا کی تشریحات اور ان کے اقوال کو بھی بیان فرمایا کرتے تھے، تاکہ حدیث اور فقہ کے درمیان ہم آہنگی کی فضا برقرار رہ سکے۔

سنتِ پر عمل کا یہ عالم ہوتا کہ عبادات مکمل طور پر سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ادا کرتے، پنج وقتہ نماز باجماعت ادا کرتے اور سنتوں کا خاص اہتمام فرماتے، خود کہا کرتے کہ "نماز تو جماعت ہی کی ہے ورنہ تو صرف فرض کی ادائیگی"۔ رات کے پچھلے پہر تہجد پڑھنا ان کا معمول تھا، وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت شدہ اذکار و دعاؤں کو روزمرہ زندگی میں اپناتے اور دوسروں کو بھی ان کی تلقین کرتے تھے۔ ظاہری وضع قطع میں بھی سنت کی جھلک نظر آتی تھی، لباس سادگی اور سنت کے مطابق زیب تن فرماتے، ہمیشہ نرمی، خوش اخلاقی اور انکساری سے پیش آتے، سنت کے مطابق مہمانوں کی عزت و تکریم کرتے خود اپنے ہاتھوں سے مہمانوں کی خدمت فرمایا کرتے۔ اس قدر سچے اور دیانت دار کہ ہمیشہ سچ بولتے اور امانت داری کا مظاہرہ کرتے، حتیٰ کہ چھوٹے سے چھوٹے معاملے میں بھی دیانت کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے، ہر وقت معاشرتی اصلاح اور دین کی خدمت کی فکر دامن گیر رہتی، ہمیشہ لوگوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ پر عمل کرنے کی تلقین فرمایا کرتے۔ خواہ کیسا بھی

مشکل وقت ہو صبر و استقامت کا دامن کبھی نہ چھوڑا۔ کسی بھی پریشانی میں ان کی زبان پر شکوہ نہ دیکھا گیا بس اللہ کی رضا میں راضی رہتے اور دشواریوں میں پیارے آقا کی سنت کو حرزِ جاں بناتے اور اللہ سے مدد مانگتے۔

حضور حافظ ملت نے نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کا بھلا چاہا،ان کا بنیادی مقصد دینِ اسلام کی ترویج و اشاعت تھا، اور اسی کے تحت ان کے سیاسی نظریات بھی اسلامی تعلیمات سے گہرے طور پر جڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے ہمیشہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کو مد نظر رکھا اور اپنے زمانے کے سیاسی حالات کو بھی بغور دیکھا۔ وہ بنیادی طور پر ایک عالمِ دین تھے لیکن سیاست سے لاتعلق نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ دین کو سیاست سے جدا نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی"

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے، جس میں دین اور سیاست دونوں شامل ہیں؛ تاہم، وہ سیاست میں براہِ راست عملی طور پر شریک نہیں رہے بلکہ علم و تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کی فکری و نظریاتی رہنمائی فرماتے رہے۔آپ کا دور برطانوی استعمار اور تحریکِ آزادی کے عروج کا دور تھا۔ وہ مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے حامی تھے ان کا مطمحِ نظر یہ تھا کہ ہر حال میں مسلمان اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں۔ وہ اسلامی خلافت اور شریعت پر مبنی نظام کے زبر دست داعی تھے، ان کا ماننا تھا کہ مسلمانوں کو ایسا سیاسی نظام اپنانا چاہیے جو قرآن و سنت کے مطابق ہو، جس میں عدل، مساوات اور اسلامی قوانین کی حکمرانی ہو۔

حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ مغربی استعمار، سیکولرزم اور الحاد جیسے نظریات کے شدید ناقد تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ مسلمانوں کو اپنی دینی اور ثقافتی شناخت کو برقرار رکھنا چاہیے اور مغربی افکار سے متاثر ہو کر اپنے مذہبی اصولوں سے غافل نہیں ہونا چاہیے۔ ان کا اصل زور دینی و تعلیمی محاذوں پر تھا، ان کا نظریہ تھا کہ اگر مسلمان دینی اور عصری تعلیم میں مضبوط ہو جائیں، تو وہ خود بخود سیاسی اور سماجی طور پر بھی مضبوط ہو جائیں گے، اسی مقصد کے تحت

انھوں نے الجامعۃ الاشرفیہ کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمانوں کو علمی اور دینی طور پر مستحکم کیا جا سکے۔ ان کے سیاسی نظریات دینِ اسلام کے اصولوں پر مبنی تھے۔ وہ براہِ راست کسی خاص سیاسی جماعت کا حصہ نہیں بنے، مگر ہمیشہ مسلمانوں کو ایک صالح اور اسلامی بنیادوں پر استوار سیاسی و سماجی نظام اختیار کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ ان کے نظریات آج بھی مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں، خصوصًا ایسے عالم میں جب کہ جب امت کو دینی بیداری اور سیاسی شعور کی اشد ضرورت ہے۔

یہ جو کچھ ہم نے قلم بند کیا وہ تلخیص ہے "جہانِ حافظ ملت" (جلد اول) کی۔ دو جلدوں پر مشتمل اس عظیم الشان کتاب کے مرتب و مدون ہیں مولانا اختر حسین فیضی مصباحی۔ اور ناشر ہیں مجلسِ برکات، دار العلوم اہلِ سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم مبارک پور۔ 1446ھ/2024ء میں پچاسویں عرسِ حافظ ملت کے موقع پر اس کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔

حضرت مولانا اختر حسین فیضی الجامعۃ الاشرفیہ کے قابلِ ذکر اساتذہ میں شمار ہوتے ہیں نامور ادیب، محقق اور مترجم ہیں، اردو زبان و ادب میں آپ کی کاوشیں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ فیضی صاحب اردو کے ان ادبا میں شمار ہوتے ہیں جنھوں نے ادب کو نہ صرف فکری گہرائی دی بلکہ اسلامی علوم کے فروغ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ تحقیق، تنقید، انشا پردازی اور صحافت کے مختلف میدانوں میں یکساں مہارت رکھتے ہیں، اشرفیہ میں تدریس کے دوران زبان و ادب کے فروغ کے لیے انتھک محنت کی اور عربی، فارسی اور اردو کے کلاسیکی و جدید متون کو طلبہ کے لیے آسان اور دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اسلامی علوم کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی لطافتوں اور باریکیوں کو بھی اجاگر کیا، علمی، ادبی اور دینی موضوعات پر کئی کتابیں اور مضامین تحریر کیے جو اعلیٰ فکری و تحقیقی ذوق کا مظہر ہیں۔ سادہ مگر بلیغ اسلوب اختیار کر کے قاری کو باندھنے کا ہنر خوب جانتے ہیں، مشکل علمی موضوعات کو

عام فہم زبان میں بیان کرنے کا ہنر انھیں خاص بناتا ہے۔ ان کی تحریریں محض سطحی نہیں ہوتیں بلکہ گہرے تجزیے اور نکتہ رسی پر مبنی ہوتی ہیں، وہ موضوع کے ہر پہلو کو تحقیقی انداز میں پرکھتے اور پھر مدلل انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ادبِ اردو اور اسلامی علوم کی باریکیوں پر گہری نگاہ رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کی نگارشات فکری پختگی کا مظہر ہوتی ہیں۔ "جہانِ حافظ ملت" کی ترتیب وتدوین ان کا وہ کارنامہ ہے جو انھیں دنیاے ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔

جیسا کہ ہم نے بیان کیا؛ "جہانِ حافظ ملت" 2 جلدوں میں شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئی۔ پہلی جلد 672 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ابتدائیہ کے تحت 6 مضامین شامل ہیں، اس باب کے تین مضامین کافی اہمیت کے حامل ہیں:

(1) مبارک پور تاریخ کے آئینے میں، از: مرتب۔

(2) عہدِ حافظِ ملت کا سیاسی منظر نامہ - از: مرتب۔

(3) مسلمانانِ مبارک پور کا جذبۂ سخاوت - از: علامہ ارشد القادری علیہ الرحمہ

مولانا کا تحریر کردہ مضمون "مبارک پور تاریخ کے آئینے میں" اس لحاظ سے کافی اہم ہے کہ اس میں مبارک پور کی جو اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے وہ کئی گوشوں کا احاطہ کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس میں جہاں سیاسی اور سماجی تاریخ کی رنگ آمیزی ہے وہیں علمی ادبی اور ثقافتی تاریخ کے اہم ترین واقعات بھی اختصار سے بیان کیے گئے ہیں۔ مبارک پور کی ثقافتی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ کی مختصر تاریخ بھی قلم بند فرمائی ہے۔ یہ مبارک پور کی ایک اہم مرکزی ثقافتی انجمن ہے جس کی بنیاد 1936ء میں ڈالی گئی۔

مولانا لکھتے ہیں:

> "جناب الحاج محمد یونس چیرمین مرحوم اس انجمن
> کے سکریٹری تھے، اخیر عمر تک ان کی قیادت میں جلسہ و
> جلوس کا اہتمام ہوتا رہا۔ ان کے دنیا سے چلے جانے کے

بعد بہی خواہان اہل سنت نے ان کے بھائی جناب محمد مظہر
انصاری صاحب کو سکریٹری نام زد کیا۔ ان کی قیادت میں
برسوں جلسہ و جلوس کا اہتمام ہوتا رہا۔ 2022ء میں وہ
اس ذمہ داری سے بر طرف ہو گئے، اس کے بعد کسی وجہ
سے سکریٹری کا انتخاب نہ ہو سکا اور عارضی طور پر ایک پنج
رکنی کمیٹی تشکیل دی جو 1445ھ/2023ء سے ذمہ داری
سنبھال رہی ہے۔" (ص:41)

جہاں تک ہماری معلومات ساتھ دے رہی ہیں، الحاج محمد یونس مرحوم انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ کے پہلے باضابطہ جنرل سکریٹری تھے، ان سے قبل کچھ دنوں تک عارضی سکریٹری کی ذمہ داریاں مشہور خوش نویس اور شاعر مولانا محمد اسلم نظامی مصباحی نے انجام دی تھیں۔ مولانا اسلم صاحب میں وہ قائدانہ صلاحیت نہیں تھے جو الحاج محمد یونس انصاری میں تھی، غالباً یہی وجہ تھی کہ جب انجمن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے ان کا باضابطہ انتخاب ہوا تو پھر اس کے بعد نہ کسی انتخاب کی ضرورت محسوس ہوئی نہ کبھی کسی کے دل میں خیال آیا کہ سکریٹری کسی اور کو بنایا جائے۔ یونس صاحب کا انتقال 2 اگست 2016/28 شوال 1437ھ کو ہوا۔

غالباً دسمبر 2016 میں انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ کی انتخابی میٹنگ منعقد ہوئی جس میں دار العلوم اہل سنت مدرسہ اشرفیہ مصباح العلوم کے اہم ذمہ داران کے علاوہ اس مرکزی انجمن سے وابستہ 21 انجمن کے ذمہ داران شریک ہوئے اور اتفاق رائے سے حاجی محمد یونس انصاری مرحوم کے برادرِ گرامی الحاج محمد مظہر انصاری کو انجمن اہل سنت کا جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا۔ مولانا اختر حسین فیضی نے لکھا کہ 2023ء میں پنج رکنی کمیٹی تشکیل دی گئی۔ یہ درست نہیں۔ ہوا یہ کہ جب الحاج محمد مظہر انصاری صاحب کو بطور جنرل سکریٹری

منتخب کیا گیا تو اسی میٹنگ میں حضرت سربراہِ اعلیٰ صاحب کی رائے سے یہ پنج رکنی کمیٹی ترتیب دی گئی، یہ کمیٹی 2023 سے نہیں بلکہ 2016 کے آخر سے کام کر رہی ہے۔ اور اس کمیٹی کا یہ انتخاب حضور سربراہِ اعلیٰ صاحب اور میٹنگ میں شامل دیگر شرکا کی اتفاق رائے سے ہوا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ کمیٹی صرف پانچ سال کے لیے منتخب ہوئی تھی۔

اس پنج رکنی کمیٹی کے ارکان حاجی محمود اختر نعمانی، حاجی سلیمان اختر شمسی، حاجی اسرار الحسن، حاجی محمود اختر ایڈوکیٹ اور محمد سلیمان انصاری ہیں۔

مولانا اختر حسین مصباحی کے مطابق 2022ء میں جب کہ جہاں تک میری یادداشت ساتھ رہی ہے، 2023ء میں حاجی مظہر صاحب نے استعفیٰ پیش کر دیا۔ ان کے استعفیٰ پیش کرنے کے بعد، آنے والے میلاد النبی کے جلسہ و جلوس کے انتظامی امور کے سلسلے میں جو میٹنگ ہوئی اس میں مذکورہ 21 انجمنوں کے ذمہ داران اور بعض دیگر حضرات نے نئے انتخاب کی بات کی اور کہا کہ کمیٹی پانچ سال کے لیے قائم کی گئی، اس کی مدتِ کار بھی ختم ہو چکی ہے اور حاجی مظہر صاحب نے استعفیٰ بھی دے دیا ہے، ایسی صورت میں نیا انتخاب انتہائی ضروری ہے۔ لیکن چوں کہ عید میلاد النبی کے جلسہ و جلوس میں وقت کافی کم رہ گیا تھا، اس لیے نئے انتخاب کو ملتوی کر کے پرانے بورڈ (پانچ ممبران) کو ہی جلسہ و جلوس کی عارضی ذمہ داری تفویض کی گئی۔ پھر بعض ذمہ داران کی رائے سے 2024 میں بھی انتخاب کو ملتوی کر دیا گیا البتہ اس میں اتنا ضرور ہوا کہ پرانے پانچ ممبران کے ساتھ تین مزید عارضی ممبران (1) حافظ اخلاق احمد (2) ضمیر احمد (3) حاجی منصور ممبر کا عارضی طور پر بورڈ میں اضافہ کیا گیا۔

جیسا کہ مولانا اختر حسین فیضی نے لکھا کہ 2023 سے یہ ممبران عارضی طور پر کام کر رہے ہیں، تو ان کی یہ بات صد فی صد درست ہے۔ کیوں کہ بہر حال کمیٹی کا انتخاب صرف پانچ ہی سال کے لیے ہوا تھا، ہمیشہ کے لیے نہیں، انتخاب اگر کسی وجہ سے ملتوی ہو گیا تو یہ ممبران بہر حال مستقل نہیں ہوئے بلکہ جب تک نیا انتخاب نہیں ہو جاتا تب تک یہ لوگ

عارضی ہی ہیں۔

مولانا اختر حسین فیضی نے اس گوشے کی طرف مجھے خاص طور پر اشارہ کیا تھا اور یہ کہا تھا کہ جو کچھ آپ کی جانکاری میں ہو اسے لکھ دیجیے گا، چنانچہ اتنی باتیں میں نے تحریر کر دیں۔اب آئیے پھر چلتے ہیں ”جہانِ حافظ ملت“ کی طرف، مولانا نے ص: 18 پر ”حرفِ ابتدا“ رقم کیا ہے۔ابتدائیہ میں کتاب کی غرض وغایت اور ترتیب وتدوین کے مختلف مراحل کا جو دل آویز تذکرہ تحریر فرمایا ہے ہم اسے یہاں من وعن نقل کرتے ہیں تاکہ ہمارے قارئین کو اس کتاب کی اہمیت اور فیضی صاحب کی محنت ومشقت کا اندازہ ہو سکے۔لکھتے ہیں:

”حافظ ملت کے پنجاہ سالہ عرس کے زریں موقع پر ان کی حیات و خدمات اور افکار و نظریات پر مشتمل اہم اور تاریخی دستاویز بنام ”جہانِ حافظ ملت“ پیش کی جا رہی ہے، امید ہے کہ اس میں اہلِ ذوق کے لیے سامانِ تسکین فراہم ہو گا۔ان شاء اللہ۔

اس مجموعے میں حیات و خدمات کے جن گوشوں پر مضامین شامل کیے گئے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(1) تبرکات، (2) حیات و خدمات، (3) شیوخ و اساتذہ ، رفقا و تلانذہ، (4) علمی کمالات، (5) اخلاق و اوصاف، (6) نظریۂ تعلیم، (7) اسلوب تعلیم و تربیت، (8) سیاسی افکار، (9) تصوف و روحانیت، (10) قلمی اثاثے (11) مکتوبات حافظ ملت، (12) تاثرات ارباب علم و فضل، (13) تعزیت نامے بر رحلت حافظ ملت، (14) الجامعۃ الاشرفیہ، (15) جانشین حافظ ملت۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ان گوشوں کا اجمالی تعارف
پیش کیا جائے اور ان پر اختصار کے ساتھ تبصرہ بھی لکھا
جائے، لیکن صفحات کی قلت اس کی اجازت نہیں دیتی؟ اس
لیے یہ حق میں قارئین کے حوالے کرتا ہوں۔(ص:21)

اس کے بعد اختر حسین فیضی صاحب نے حافظ ملت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے فضل و کمال اور حیات و خدمات پر جو کچھ لکھا گیا اس کی دست یاب فہرست نوٹ کی ہے۔ اس فہرست کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ عزیزیات کے باب میں اب تو جو کام ہو چکا، اس کا علم تو ہوتا ہی ہے ساتھ ہی لکھنے پڑھنے والوں کو یہ اندازہ بھی آسانی سے ہو سکتا ہے کہ حضور حافظ ملت کی حیات کے کن گوشوں پر ابھی مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

فہرست حسب ذیل ہے:

(1) حافظ ملت - ابن بحر العلوم مولانا محمد احمد مصباحی (2) فیضان حافظ ملت - مولانا غلام مصطفی کوثر امجدی (3) حافظ ملت میری نظر میں - الحاج محمد حسین (4) حافظ ملت کا سفر حج - مولانا محمد اسلم بستوی مصباحی (5) حافظ ملت اور ان کی خدمات - مولانا محمد عبد السمیع صدیقی مصباحی (6) حیات حافظ ملت - مولانا بدر القادری مصباحی (7) معارف حافظ ملت - مولانا محمد اسلم مصباحی گورکھ پوری (8) آئینہ حافظ ملت - مولانا سید رکن الدین اصدق مصباحی (9) ملفوظات حافظ ملت - اختر حسین فیضی مصباحی (10) مختصر سوانح حافظ ملت - اختر حسین فیضی مصباحی (11) جلوہ حافظ ملت (مجموعۂ مضامین) - مولانا ایاز احمد مصباحی (12) تجلیات حافظ ملت (سال نامہ) - مولانا ایاز احمد مصباحی (13) حافظ ملت نمبر (ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور) - مولانا بدر القادری مصباحی (14) حافظ ملت افکار اور کارنامے - مولانا مبارک حسین مصباحی (15) انوار حافظ ملت (ماہ نامہ اشرفیہ مبارک پور) - از مولانا مبارک حسین مصباحی (16) حافظ ملت نمبر (ماہ نامہ فیض الرسول براؤں شریف) (17)

حافظ ملت نمبر (ماہ نامہ اعلیٰ حضرت بریلی شریف) (18) حافظ ملت نمبر بزبان عربی (المشاھد لکھنو) (ص:22)

اس کے بعد کتاب کی ترتیب و تدوین کے حوالے سے جو معلوماتی گفتگو انھوں نے تحریر کی ہے، وہ درج ذیل ہے:

"ان کے علاوہ بہت سے اہم اور معلوماتی مضامین ماہ ناموں اور رسالوں میں چھپے ہوئے ہیں، جو کبھی چھپے اور طاق نسیاں ہو گئے، اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ حافظ ملت کے سلسلے میں بہت سی قیمتی معلومات جو ہمارے سامنے ہونی چاہیے تھیں، ڈھیروں اوراق کے نیچے دبی ہوئی ہیں، اس صورت حال کے پیش نظر ذہن میں یہ بات آئی کہ ان قیمتی جواہر پاروں کو نکال کر اہل ذوق کی خدمت میں پیش کیا جائے، تاکہ حیات حافظ ملت کے وہ گوشے بھی سامنے آجائیں جو اب تک نظروں سے اوجھل ہیں، کرم ہے رب کریم کا کہ اس کی توفیق سے میں نے مختلف رسالوں اور کتابوں سے مواد اکٹھا کرنا شروع کیے تو اتنے مضامین مجمع ہو گئے کہ ان کی ضخامت قریب دو ہزار صفحات کو پہنچ گئی، پھر چھنٹائی شروع کی تو اس مرحلے میں جو مضامین انتخاب میں آئے وہ دو ضخیم جلدوں میں بنام "جہانِ حافظ ملت" آپ کے ہاتھوں میں ہے، اس کے سب سے بڑے مآخذ "ماہ نامہ اشرفیہ" کے مختلف شمارے، اس کا خصوصی شمارہ انوار حافظ ملت نمبر اور حافظ ملت افکار اور کارنامے ہیں۔ حافظ ملت

نمبر مولانا بدر القادری سے حافظ ملت بحیثیت مفسر از شارح
بخاری مفتی محمد شریف الحق امجدی رحم اللہ تعالیٰ علیہ اور چند
مکتوبات حافظ ملت لیے گئے، جو مضمون جہاں سے لیا گیا ہے
اس کا باضابطہ حوالہ دیا گیا ہے۔کچھ مضامین بغیر حوالے کے
ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مضمون یا تو نیا لکھا گیا ہے یا
مضمون تو مطبوعہ ہے لیکن مضمون نگار نے اس میں کچھ ترمیم
و تنسیخ کردی ہے۔"(ص:22،23)

حرفِ ابتدائی سے قبل ایک انتہائی بیش قیمت تحریر "تقدیم" کے عنوان سے ہے، جسے قلم بند کیا ہے مصلحِ قوم و ملت حضرت مولانا محمد عبد المبین نعمانی نے۔اس سے پہلے "کلماتِ عزیز" کے عنوان سے حضور عزیز ملت نے کتاب اور صاحبِ کتاب کے بارے میں گراں قدر ارشادات نوٹ فرمائے ہیں۔

تقدیم کا عنوان ہے "حافظِ ملت حافظِ ملت کیوں؟" اس عنوان کے تحت حضرت علامہ عبدالمبین نعمانی نے کنزالعمال کی ایک عبارت نقل کرنے کے بعد تحریر فرمایا ہے:

"جب اسلام کی زندگی علم سے ہے، تو اسلام کی بقا
اور فروغ کے لیے علمی و دینی مراکز کی تعمیر ضروری ہوئی، اس
لیے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے علم ہی کو فروغ دینے
کے لیے ایک تعلیمی قلعے کی تعمیر پر بطور خاص توجہ دی تاکہ
اسلام کی حفاظت ہو، دین مضبوط ہو، عقائد حقہ اہل سنت کو
فروغ ملے، باطل کا قلعہ قمع ہو، اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ
حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ واقعی حافظ ملت تھے اور آپ
کے لیے یہ لقب بالکل درست اور واقعے کے مطابق ہے،

ہمارے یہاں مدارس بہت تھے اور آج بھی ہیں، لیکن اہل سنت کی کثرت کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ابھی ہمارے یہاں مدارس کی بہت کمی ہے ، چوں کہ حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان نے یہ کام بہت بڑے پیمانے پر کیا، اس لیے "حافظ ملت" کا لقب اور تاج واقعی آپ ہی کے سر سجتا ہے، یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب سے الجامعۃ الاشرفیہ کی تعمیر ہوئی ہے اس کے اثرات دور دور تک پہنچے ہیں، اسے دیکھ کر اہل سنت کے کئی اور مدارس بھی قائم ہو گئے ہیں یا جو مختصر تھے ان کی توسیع بھی ہوئی ہے اور ایک خاص بات یہ بھی قابل توجہ ہے کہ حافظ ملت علیہ الرحمہ نے یہ سوچا بھی نہیں اور نہ زبان سے ظاہر کیا کہ یہ بڑا کام ہے لہٰذا یہ فلاں بڑے مولانا صاحب کریں یا فلاں خانقاہ والے کریں، ان کے بڑے وسائل ہیں جیسا کہ آج کل ہم لوگوں کا طریقہ ہو گیا ہے کہ بالعموم خود کام کرتے نہیں، دوسروں پر ٹالتے رہتے ہیں، حافظ ملت قدس سرہ کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ انھوں نے کبھی وسائل کی کمی کا شکوہ نہیں کیا بلکہ "ہمتِ مرداں مددِ خدا" پر بھروسا کرتے ہوئے میدان عمل میں کود پڑے اور زندگی کے آخری لمحات تک بے مثال قربانی دی۔" (جہانِ حافظ ملت جلد اول، ص:14،15)

ہم علامہ نعمانی کے اس اقتباس سے صد فی صد متفق ہیں۔ بے شک و شبہہ اسلام کی زندگی اور بقا کا انحصار علم پر ہے، علم وہ شے ہے جس کے ذریعے نہ صرف انسانوں کی ہدایت

ممکن ہے بلکہ اس علم سے ہی دین کی حفاظت، فروغ اور استحکام بھی ہے۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے اپنے پیش رووں کی طرح اپنے کردار و عمل سے اس حقیقت کو ثابت کیا کہ علم ہی اسلام کی بقا اور فروغ کا واحد ذریعہ ہے۔

حضور حافظ ملت کا لقب اور آپ کا علمی مقام اس حقیقت کا غماز ہے کہ آپ نے علم دین کی اشاعت اور اس کی حفاظت کے لیے بے شمار قربانیاں دی۔ آپ نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ دینی مدارس کی تعمیر اور علما کی تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کی فکر اور عمل نے اہل سنت و جماعت کو مختلف بلاد و امصار میں پائیداری عطا کی اور باطل کے اثرات کو کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ آپ نے اپنی زندگی میں سب سے اہم کام جو کیا وہ ہے علم کی بقا کے لیے ایک اہم تعلیمی اداری کی بنیاد گزاری۔ آپ کا سب سے اہم کارنامہ جامعہ اشرفیہ کی تعمیر ہے۔ اس ادارے نے نہ صرف اہل سنت کو جہانِ علم و دانش میں استحکام بخشا بلکہ اس کے اثرات دنیا بھر میں آج بھی محسوس کیے جا رہے ہیں۔ حافظ ملت کی اس مردانہ کاوش کے بعد جب اس قسم کے اور دوسرے ادارے بھی قائم ہونے لگے تو ثابت ہوا کہ آپ کا یہ کام ایک تحریک کی شکل اختیار کر چکا ہے، آپ کی اس مجاہدانہ کاوش کے بعد تعلیمی میدان میں قابلِ ذکر انقلابی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے اس عظیم کام کو شروع کرنے سے پہلے کبھی وسائل کی کمی کا شکوہ نہیں کیا، جو آج کل کا عمومی رویہ بن چکا ہے۔ عموماً لوگ بڑے کاموں کے لیے وسائل کی کمی کا بہانہ بنا کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے رہ جاتے ہیں، لیکن حضرت حافظ ملت نے کبھی اس طرح کے بہانے نہیں بنائے۔ آپ نے ہمیشہ ”ہمتِ مرداں، مددِ خدا“ کے اصول کو اپنایا اور اللہ کی مدد پر بھروسا رکھتے ہوئے میدان عمل میں قدم رکھا۔ آپ نے مدارس کے قیام اور ان کے لیے وسائل فراہم کرنے کے لیے بھرپور جدوجہد کی، آپ کا یہ عمل اس بات کا غماز ہے کہ آپ کی نظر میں دین کا کام کرنے کے لیے صرف صاف نیت اور اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت پر بھروسا ہونا ضروری ہے۔ حضور حافظ ملت کی ایک اور بڑی

خصوصیت یہ تھی کہ آپ نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ یہ بڑا کام کوئی اور کرے گا، بلکہ آپ نے خود اس ذمہ داری کو قبول کیا۔ آپ نے اپنے عہد میں جب علمی اور دینی اداروں کی کمی محسوس کی، تو اس کا حل نکالنے کے لیے خود میدان میں آئے۔ اس کے برعکس آج کل کا عمومی طرز عمل یہ ہو گیا ہے کہ لوگ بڑی باتوں کو دوسروں پر ڈال کر خود آرام سے سو جاتے ہیں، لیکن حافظ ملت نے کبھی اس طرح کا طرز عمل اختیار نہیں کیا۔

علامہ نعمانی مزید فرماتے ہیں:

> ”حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ اس لیے بھی حافظ ملت تھے کہ آپ نے دین کا ایک عظیم قلعہ تعمیر کر کے قوم کے ہاتھوں میں علم کا چراغ اور ایمان ویقین کا ہتھیار دے دیا، جس سے وہ اپنے ایمان کی حفاظت کریں گے، جو سب سے قیمتی دولت ہے، اور علم کی روشنی میں شاہ راہ حیات بھی طے کریں گے، تحفظ ایمان و عقیدے کا یہ کارنامہ حافظ ملت کا سب سے بڑا اور اہم کارنامہ ہے، چناں چہ اس جامعہ سے فارغ ہونے والے علما، مفتیان کرام اور مناظرین عملی میدان میں شرعی معاملات سے متعلق فتاویٰ بھی دیتے ہیں اور احقاق حق و باطل کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں اور دیگر قابل اور ذی استعداد علما مسند تدریس کو سنبھال کر دین کے محافظین کی کھیپ تیار کر رہے ہیں۔“(ص:15)

جہانِ حافظ ملت جلد اول کی ترتیب مشمولات میں ابتدائیہ کے بعد ”تبرکات“ شامل ہیں۔ اس کے تحت حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی چند نایاب اور یادگار تحریروں اور خطبات کو شامل کیا گیا ہے۔

اس کے بعد چار ابواب میں آپ کی حیات و خدمات، شیوخ و اساتذہ رفقا و تلامذہ، علمی کمالات اور اخلاق و اوصاف کے مختلف گوشوں کا احاطہ کرتے ہوئے مضامین جمع کیے گئے ہیں، ہم ذیل میں صرف ان مضامین کی فہرست پیش کریں گے:

حیات و خدمات:

- حافظ ملت ایک نظر میں - مولانا عبد المبین نعمانی
- حافظ ملت احوال اور کارنامے - اختر حسین فیضی مصباحی
- حافظ ملت کے عشق مبین کی فتح - علامہ ارشد القادری
- حافظ ملت میرے محسن، میرے مہربان - مولانا بدر القادری مصباحی
- حافظ ملت اور تعمیر انسانیت - مولانا نصر اللہ رضوی
- حافظ ملت خدمات واثرات کا مختصر جائزہ - مفتی محمد توفیق احسن برکاتی مصباحی
- حافظ ملت ملی قیادت اور شیرازہ بندی - مولانا نفیس احمد مصباحی
- حافظ ملت اور بلرام پور - ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی
- حافظ ملت اور جمشید پور - محمد قاسم عزیزی
- حافظ ملت اور نیپال - مفتی محمد رضا قادری مصباحی
- حافظ ملت کی بے قرار زندگی، پر سکون موت - حضرت عزیز ملت
- علالت سے آغوش لحد تک - مولانا محمد شفیع اعظمی
- وصال کے بعد آنکھوں دیکھا حال - مولانا محمد احمد مصباحی
- تقریبات عرس چہلم - مولانا بدر القادری مصباحی
- حافظ ملت مناقب جلیلہ کے آئینے میں - ڈاکٹر عبد النعیم عزیزی

شیوخ و اساتذہ، رفقا و تلامذہ:

- حافظ ملت کے مرشد گرامی - مولانا محمد فیصل رضا مصباحی

- حافظ ملت کے اساتذۂ کرام - مولانا نفیس احمد مصباحی
- حافظ ملت اور صدر الشریعہ - اختر حسین فیضی مصباحی
- حافظ ملت کے رفقاے درس - مولانا محمد قاسم مصباحی
- تلامذہ حافظ ملت: اجمالی تعارف - مولانا محمد مجاہد اختر مصباحی

علمی کمالات:

- حافظ ملت بحیثیت مفسر - مفتی محمد شریف الحق امجدی
- حافظ ملت کا محدثانہ مقام - مولانا محمد ناظم علی مصباحی
- حافظ ملت کی فقہی بصیرت کے چند شواہد - مفتی محمد معراج القادری
- حافظ ملت کی فقہی بصیرت - مولانا عبد الوحید مصباحی
- حافظ ملت اور علوم عقلیہ - مفتی محمد معراج القادری
- حافظ ملت اپنے خطبات کے آئینے میں - مولانا مبارک حسین مصباحی

اخلاق واوصاف:

- حافظ ملت اور خدمت خلق - سید رکن الدین اصدق مصباحی
- حافظ ملت ایک تاریخی شخصیت - مولانا یٰسین اختر مصباحی
- حافظ ملت کا ایفائے عہد - مولانا عبد السلام رضوی
- حافظ ملت عظیم تاریخ ساز شخصیت - محمد صابر القادری نسیم بستوی
- حافظ ملت: کچھ یادیں کچھ باتیں - حکیم محمد یوسف عزیزی بستوی
- حافظ ملت اہل مبارک پور کے ہم درد وغم خوار - شرر مصباحی
- اخلاق عالیہ کی جھلکیاں - قاری عبد الحکیم عزیزی مصباحی
- حافظ ملت کی اخلاقی تعلیمات - مولانا محمد عبد المبین نعمانی
- حافظ ملت: ایک پیکر استقامت - مولانا محمد عبد المبین نعمانی

- چند خاطر نواز پہلو- مولانا مبارک حسین مصباحی
- حافظ ملت: شفقت و مروت کا مہر تاباں- مولانا وصال احمد اعظمی

فہرست سے اندازہ ہوتا ہے کہ ”جہانِ حافظ ملت“ ایک نادر و نایاب علمی و ادبی سرمایہ ہے، جو نہ صرف حافظِ ملت حضرت مولانا عبد العزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمہ کی حیات و سیرت کو اجاگر کرتا ہے بلکہ ان کی علمی، دینی، اور روحانی خدمات کو بھی دلنشین انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ کتاب ایک ایسا آئینہ ہے جس میں حافظِ ملت کی زندگی کے مختلف گوشے جھلملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ارباب قلم کی کی نثر کا حسن، زبان کی شگفتگی اور بیان کی روانی کتاب کے ہر صفحے کو ایک تخلیقی شاہکار بناتی ہے۔ ان کے قلم سے نکلے ہوئے الفاظ خوشبو کی طرح قاری کے ذہن و دل میں بس جاتے ہیں اور تاریخ کے جھروکوں سے ایک ایسی شخصیت کا عکس ابھرتا ہے جو علم و عمل، زہد و تقویٰ، اور فہم و فراست کا پیکر تھی۔

کتاب میں شامل مضامین و مقالات کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ روایتی سوانحی اسلوب سے ہٹ کر محققانہ اور فکری انداز اپنایا گیا ہے۔ ان میں محض واقعات کی ترتیب ہی نہیں نہیں بلکہ حافظِ ملت کے کردار و اخلاق، ان کی تعلیمی و تدریسی مساعی، اور ملت کے لیے ان کی بے پناہ خدمات کو گہرائی سے کھنگالا گیا ہے۔ مقالہ نگاروں نے جہاں علمی اسلوب کا التزام رکھا ہے، وہیں ان کی نثر میں ایک جذباتی چاشنی بھی ہے جو قاری کو باندھے رکھتی ہے۔

مضامین نہ صرف تحقیق و تدقیق کے اعلیٰ معیار پر پورے اترتے ہیں بلکہ ادبی لطافت اور فکری بالیدگی سے بھی معمور ہیں۔ مختلف اہلِ قلم کی تحریریں کتاب کو ایک متنوع رنگ عطا کرتی ہیں، اور یوں یہ محض ایک سوانحی دستاویز نہیں بلکہ ایک فکری و ادبی گلشن بن جاتی ہے، جہاں ہر مضمون ایک خوشبودار پھول کی مانند مہک رہا ہے۔ یہ ایک ایسا علمی و ادبی شاہکار ہے جو نہ صرف محققین علما کے لیے اہمیت رکھتا ہے بلکہ عام قارئین کے لیے بھی دلچسپی کا باعث ہے۔

(ماہ نامہ اشرفیہ مئی 2025ء میں شائع۔۔۔ تحریر: 2/ اپریل 2025ء)

جہانِ حافظ ملت (جلد دوم)

اہلِ سنت وجماعت کی علمی وروحانی روایت کا زندہ استعارہ

جہانِ حافظ ملت (جلد اول و دوم) کے مرتب حضرت مولانا اختر حسین فیضی مصباحی استاذ الجامعۃ الاشرفیہ کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، ہم نے جہانِ حافظ ملت جلد اول کے تبصرے میں حضرت کی شخصیت اور ان کی دینی وعلمی خدمات کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا تھا، سر دست ہم آپ کی شخصیت پر کچھ لکھنے کی بجاے سیدھے مقصدِ تحریر کی طرف آتے ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے جہانِ حافظ ملت کی دوسری جلد موجود ہے۔ 680 صفحات پر مشتمل یہ گراں قدر ضخیم مجموعہ حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی حیات و خدمات کے ان گوشوں کا احاطہ کرتا ہے جو جلد اول میں نہ آسکے تھے۔

اس میں نظریۂ تعلیم، اسلوبِ تعلیم و تربیت، سیاسی افکار، تصوف و روحانیت، قلمی اثاثے، مکتوبات، تاثرات علما و مشائخ، تعزیت نامے وغیرہ عناوین کے تحت، دانش وران اور علماے اہل سنت کے بیش قیمت مضامین کو یکجا کیا گیا ہے۔

حافظِ ملت علامہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی کا نظریۂ تعلیم دراصل ایک جامع اسلامی تصور ہے جس میں دینی روح، اخلاقی تربیت اور عصری شعور کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا مقصد محض معلومات کا حصول نہیں بلکہ انسان کی فکری، روحانی اور عملی تشکیل ہے، وہ اس تعلیم کو پسند کرتے تھے جو انسان کے اندر ایمان کی روشنی، کردار کی پختگی اور خدمتِ خلق کا جذبہ پیدا کرے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر علم کے ساتھ تزکیۂ نفس نہ ہو تو وہ علم نہیں بلکہ وبالِ علم ہے۔ اسی لیے انھوں نے تعلیم کے ساتھ تربیت کو لازم قرار دیا۔ ان کے

نزدیک استاد محض معلّم نہیں بلکہ مربی اور داعی ہے، اور شاگرد کا ہدف صرف امتحان پاس کرنا نہیں بلکہ اپنی زندگی کو مقصدِ الٰہی کے تابع کرنا ہے۔

الجامعۃ الاشرفیہ، جو ان کی علمی و روحانی بصیرت کا مظہر ہے، ان کے اسی نظریۂ تعلیم کی عملی تعبیر ہے، جہاں درسِ نظامی کے ساتھ عقائد، فقہ، حدیث، منطق اور تفسیر کی گہرائی پر زور دیا جاتا ہے، اور ساتھ ہی جدید زمانے کے تقاضوں کو اسلامی اقدار کے دائرے میں سمجھنے اور برتنے کی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ حافظ ملت علیہ الرحمہ کا مطمحِ نظر بالکل واضح ہے کہ دین و دنیا الگ نہیں، بلکہ علم کی اصل روح ان دونوں کو ایک مقصد میں جوڑنا ہے، ان کا نظریۂ تعلیم یہی تھا کہ انسان کا دل نورِ علم سے منور ہو کر سماج، معاشرے اور دین کے لیے کارآمد ثابت ہو اور خشیتِ الٰہی کے ساتھ امن، اخلاق اور شعور و فکر کی ایک نئی دنیا آباد ہو سکے۔

حافظ ملت کے نظریۂ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے علمائے کرام نے جن خصوصیات کا اظہار فرمایا ہے ہم ان باتوں کو اختصار کے ساتھ درج کیا۔ اس باب کے تحت جو مضامین شاملِ اشاعت ہیں ان کی فہرست حسب ذیل ہے:

- فروغ تعلیم حیاتِ حافظ ملت کا درخشاں باب- مفتی محمد شریف الحق امجدی
- حافظ ملت کا افادی نظریۂ تعلیم- مولانا عبداللہ خان عزیزی مصباحی
- حافظ ملت تعلیمی ماحول میں- مولانا محمد احمد مصباحی
- حافظ ملت اور ان کا نظریۂ تعلیم- مولانا محمد عبدالمبین نعمانی
- حافظ ملت اور تعلیمی حسنِ انتظام- مولانا محمد علی قاضی مصباحی
- حافظ ملت اور مفید طریقۂ تعلیم- مفتی محمد معراج القادری مصباحی
- حافظ ملت کا نظریۂ تعلیم- حکیم محمد یوسف عزیزی

"نظریۂ تعلیم کے بعد" مرتب نے "اسلوب تعلیم و تربیت" کے عنوان سے دوسرا باب قائم کیا ہے۔ اس باب میں بھی قاری کی معلومات میں اضافی کرنے اور حضور حافظ ملت علیہ

الرحمہ کے منہجِ تعلیم و تربیت کی توضیح کرنے والے مضامین شامل ہیں۔ فہرست حسب ذیل ہے:

- حافظ ملت کا انداز تدریس - مفتی محمد شریف الحق امجدی
- حافظ ملت کا طریقۂ درس - مولانا محمد اسلم عزیزی مصباحی
- حافظ ملت کا شخصیت ساز اسلوب تعلیم و تربیت - مولانا یٰسین اختر مصباحی
- حافظ ملت کا معلمانہ و مصلحانہ کردا- ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی
- حافظ ملت کا انداز تربیت - مولانا علاء المصطفیٰ قادری
- حافظ ملت کی موثر تربیت اور فیضانِ نظر - مولانا محمد امام الدین نوری مصباحی
- حافظ ملت اور دورِ حاضر کے مصلحین و مبلغین - مفتی بدر عالم مصباحی
- حافظ ملت کا انداز تبلیغ - مولانا محمد علی فاروقی

جہانِ حافظ ملت کا تیسرا باب ''سیاسی افکار'' کے عنوان سے پیش کیا گیا ہے۔ اس باب کے تحت صرف تین مضامین پیش کیے گئے ہیں۔

چوتھے باب میں ''تصوف و روحانیت'' پر گفتگو کی گئی ہے۔ اس میں کل 8 مضامین شامل ہیں، فہرست ملاحظہ فرمائیں:

- حافظ ملت کا تقویٰ - مولانا غلام محمد مصباحی بھیروی
- حافظ ملت ایک ولی باکرامت ... - مولانا سید رکن الدین اصدق مصباحی
- حافظ ملت ایک درویش کامل - مولانا محمد قمر الحسن قمر بستوی مصباحی
- حافظ ملت مقبول بارگاہ رسول - مفتی عبدالمنان کلیمی مصباحی
- حافظ ملت کا تصور عشق رسول - ڈاکٹر عبدالنعیم عزیزی
- حافظ ملت اور تصوف - مولانا مبارک حسین مصباحی
- حافظ ملت ایک تقویٰ شعار شخصیت - مولانا ایاز احمد مصباحی
- حافظ ملت کی تقویٰ شعر زندگی - مفتی عابد حسین مصباحی

اس باب کے تحت حافظ ملت علیہ الرحمہ کی متصوفانہ حیات کی جن خصوصیات و امتیازات کا احاطہ کیا گیا ہے، ان باتوں کو اگر ہم اپنے الفاظ میں پیش کریں تو کچھ یوں کہیں گے کہ:

حافظِ ملت علامہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی رحمہ اللہ کا باطن سراپا تصوف و روحانیت سے منور تھا۔ وہ صرف محدث و فقیہ نہیں بلکہ ایک حقیقی صوفی باصفا، باطنی رہنما اور سلوک و معرفت کے امین تھے۔ ان کے نزدیک تصوف، شریعت کا باطنی پہلو ہے جو ایمان کو یقین میں، اور علم کو حال میں بدل دیتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ بغیر شریعت کے طریقت محض سراب ہے۔ ان کی پوری زندگی اس حقیقت کی زندہ مثال تھی۔

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی مجلس علم کے ساتھ ذکر و فکر، محبت و ادب اور روحانی سکون کی آماجگاہ ہوا کرتی تھی، ان کا تصوف خانقاہی رسم و رواج سے الگ، باطن کی اصلاح اور عمل کی پاکیزگی پر مبنی تھا۔ ان کی تعلیم یہی تھی کہ سالکِ راہِ حق پہلے اپنے نفس کو شکست دے، پھر خدمتِ خلق اور محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ قربِ الٰہی حاصل کرے۔ انھوں نے اولیاے کرام کی سیرت کو نقشِ قدمِ مصطفیٰ ﷺ قرار دیا اور عمر بھر اسی راہ پر گامزن رہ۔ ان کی نگاہ میں روحانیت، عبادت سے زیادہ اخلاق و کردار کی اصلاح میں جلوہ گر تھی۔ ان کے فیض یافتہ علما و مشائخ نے اس توازن کو آگے بڑھایا جس میں علمِ شریعت اور نورِ طریقت ایک ہی چراغ کی دو لہریں بن کر دنیا میں روشنی بکھیر رہی ہیں۔

"قلمی اثاثے" کے عنوان سے جس بات کی شیرازہ بندی کی گئی ہے اس میں حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی قلمی آثار کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ "مکتوبات" میں مختلف علما و تلامذہ اور دیگر حضرات کے نام حافظ ملت علیہ الرحمہ کے لکھے گئے مکاتیب کو جمع کیا گیا ہے۔ یہ باب بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے بعد علما و مشائخ کے تاثرات اور تعزیت نامے شاملِ کتاب ہیں۔ اخیر میں جانشینِ حافظ ملت کے حوالے سے مفید باتیں بھی شاملِ کتاب ہیں۔

بلاشبہ "جہانِ حافظ ملت جلد دوم" اپنی نوعیت کی ایک منفرد، جامع اور علمی و روحانی

اہمیت کی حامل دستاویز ہے، اس میں حافظ ملت علیہ الرحمہ کی شخصیت کے وہ تمام پہلو نہایت خوش اسلوبی سے اجاگر کیے گئے ہیں جو کسی مردِ مومن، مصلحِ ملت، اور مربیِ امت کے جوہرِ کامل کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس کتاب کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ ہر باب نہ صرف حافظ ملت کے علمی و فکری سرمایہ پر روشنی ڈالتا ہے بلکہ ان کی روحانی گہرائی، عملی بصیرت اور اصلاحی حکمتِ نظر کو بھی دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کرتا ہے۔

مرتبِ کتاب حضرت مولانا اختر حسین فیضی مصباحی نے ادبی شائستگی کے ساتھ مختلف قلم کاروں کے مضامین کو یکجا کر کے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف گوشوں کا ایسا دل آویز نقشہ کھینچا ہے جس میں قاری کو صرف سوانح نہیں بلکہ ایک پورا نظامِ فکر و حیات نظر آتا ہے۔ تعلیمی و تربیتی پہلو سے لے کر تصوف و روحانیت، سیاسی شعور اور قلمی خدمات تک ہر گوشہ اس مردِ کامل کی ہمہ جہت بصیرت کا مظہر ہے۔

''جہانِ حافظ ملت'' کا مطالعہ دراصل ایک ایسی روحانی و فکری سیر ہے جس میں قاری کے دل میں علم کے ساتھ عشق، عقل کے ساتھ یقین اور ظاہر کے ساتھ باطن کی طلب بیدار ہوتی ہے۔ اس کتاب کی سطریں محض تاریخ نہیں بلکہ تحریک ہیں، وہ تحریک جو ایک ایسے نظامِ تعلیم، ایک ایسے طرزِ فکر اور ایک ایسے معاشرتی رویّے کی دعوت دیتی ہے جس کی بنیاد دین، اخلاق اور انسان دوستی پر قائم ہو۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ ''جہانِ حافظ ملت'' نہ صرف حافظ ملت علیہ الرحمہ کی حیات و خدمات کا مرقع ہے بلکہ اہلِ سنت و جماعت کی علمی و روحانی روایت کا زندہ استعارہ بھی ہے۔ یہ کتاب ہر عالم، محقق، مدرس اور طالبِ علم کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ حضور حافظِ ملت علامہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمۃ والرضوان کے فیوض و برکات کو تاقیامت جاری و ساری رکھے، حضور جلالۃ العلم کے افکار و تعلیمات کو نسلِ نو کے لیے مشعلِ راہ بنائے، اور مرتبِ گرامی حضرت مولانا اختر حسین

فیضی مصباحی کی اس گراں قدر علمی و تحقیقی خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ مقبولیت عطا فرمائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم حافظِ ملت کی تعلیم و تربیت کے فیضان سے اپنی حیات بے ثبات کو دنیا و آخرت میں کامیاب و کامران بنا سکیں۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم۔

(ماہ نامہ اشرفیہ نومبر 2025ء میں شائع)

(تحریر ستمبر 2025ء)

سلسبیل

عشق و عقیدت کا چھلکتا ہوا جام

سید محمد نور الحسن نور نوابی کی کتاب ”سلسبیل“ پر تبصرہ

ہمارے مطالعے کی میز پر موجود ہے ”سلسبیل“، یہ نعتیہ مجموعہ سید محمد نور الحسن نور نوابی کے نعتیہ افکار کا حسین گل دستہ ہے۔ اس کے ناشر ہیں دبستان نوابیہ عزیزیہ پبلی کیشنز فتح پور اور تقسیم کار ہیں آستانہ عالیہ نوابیہ قاضی پور شریف پوسٹ منڈوہ ضلع فتح پور یوپی، انڈیا۔ 144 صفحات پر مشتمل اس کتاب کی قیمت ہے 300/ روپئے۔

سید محمد نور الحسن نور نوابی عزیزی عصرِ حاضر کے ممتاز نعت گو شاعر ہیں، انھوں نے اردو تقدیسی شاعری کو ایک نئے وقار کی منزل سے روشناس کرایا ہے۔ ان کا زیر نظر مجموعہ نہ صرف فنی و فکری اعتبار سے ممتاز ہے بلکہ روحانی ذوق کے حامل قاری کے لیے بھی تسکینِ قلب کا بہترین ذریعہ ہے۔ کتاب کے عنوان پر غور کیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ ”سلسبیل“ عنوان خود قرآنی لطافتوں کا حامل ہے — جنت کی ایک نہر کا نام، جو پاکیزگی، نورانیت اور ابدی لطافت کی علامت ہے۔ شاعر نے اسی علامتی جنتی کیفیت کو اپنے نعتیہ کلام میں سمونے کی سعی بلیغ کی ہے۔ اس میں شامل نعتیں کلاسیکی ادب، اسلامی فکر اور عرفانی شعور کا حسین امتزاج ہیں۔ شاعر کا اسلوب روایتی احترام و محبت کے ساتھ ساتھ فکری گہرائی کا بھی مظہر ہے۔ ان نعتوں میں صرف جذباتی اظہار ہی نہیں بلکہ ایک علمی، قرآنی، اور صوفیانہ طرزِ فکر بھی نمایاں ہے۔

باضابطہ عروضی نظام کے تحت کہی گئی نعتوں میں، الفاظ کی سادگی کے ساتھ معنیٰ آفرینی

کا سمندر موجیں مارتا نظر آتا ہے، اندازِ بیان کی ندرت اور پُر کاری نے ایک ایسی فضا تشکیل دی ہے جس کے سحر سے دلوں کو آزاد نہیں کیا جا سکتا۔ عربی اور فارسی الفاظ کے امتزاج، سے فضائے نعت کو روحانیت کے آسمانوں تک وسیع کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ تشبیہات و استعارات میں احتیاط کے ساتھ بلند خیالات کو شامل کیا گیا ہے تاکہ ادب کے دائرے میں رہ کر دامنِ تقدیس کو محفوظ رکھا جا سکے۔

"سلسبیل" کا مطالعہ واضح کرتا ہے کہ شاعر محض حمد و ثنا کے روایتی سانچے میں محصور نہیں بلکہ روحانی حقیقتوں کا شائق ہے۔ ان نعتوں میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی وہ شعوری کیفیت جھلکتی ہے جو قاری کو سلوک و عرفان کے مراحل کی طرف مائل کرتی ہے۔ زیرِ نظر مجموعے کے اشعار سیرتِ طیبہ کا شعری بیان، مقامِ رفیع و شفیع، معجزاتِ نبوی کی نظم نگاری، مدینہ منورہ کی جمالیاتی تصویریں، اُمت کے لیے فکری درد و دعا جیسے اہم ترین موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اصل میں "سلسبیل" صرف نعتیہ کلام کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک روحانی سفرنامہ ہے، جو ادب کے قاری کو محبتِ رسول ﷺ کے آفاقی ذائقے سے آشنا کرتا ہے۔ محمد نور الحسن نور نوابی نے اس مجموعے کے ذریعے نعتیہ ادب کو نئی جہتیں بخشی ہیں، جس میں جمال بھی ہے، کمال بھی، اور وصال کا اشارہ بھی۔

ہم یہاں چند منتخب اشعار اور ان کا تجزیہ پیش کریں گے:

ہر ایک آنکھ کا ہے یہ ہی فیصلہ اب تک
مرے نبی کوئی تجھ سا نہیں ہوا اب تک
مرے چراغ ہیں لیکن لویں تمھاری ہیں
تمھارے نام سے روشن ہے گھر مرا اب تک

نورؔ صاحب کے ان اشعار میں جذبۂ عقیدت اور فکری لطافت کا حسین سنگم ہے، ان

اشعار کو اگر ”سلسبیل“ کے اسلوب و فضا میں رکھ کر دیکھا جائے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر روایتی نعت گوئی کو جمالیاتی اور عرفانی رفعت عطا کر رہا ہے۔ غور کیا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ مذکورہ پہلے شعر میں اجماعِ امت اور عالمی شہادت کو بیان کیا گیا ہے۔ ”ہر ایک آنکھ کا فیصلہ“ صرف انسانی گواہی نہیں بلکہ کلیاتی عرفانی احساس ہے، جب کہ دوسرے شعر میں انتہائی عارفانہ انداز میں شاعر اپنے ہونے کو تسلیم کرتا ہے لیکن اپنے وجود کی روشنی کا ماخذ آقاے دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو قرار دیتا ہے اور بہ بانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ یہ میری ہستی تو محض ایک ظرف ہے، میں اصل میں نورِ نبوت کی رحیمانہ تجلیات سے روشن ہوں۔ یہ اسلوب صوفیانہ فکر کے اس مقام سے منسلک ہے جسے اصطلاح تصوف میں ”فنافی الرسول“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

پھر آخری مصرع میں روحانی نسبت کی وہ گواہی موجود ہے جو شاعر کی نعتیہ شاعری کا جوہر ہے — یعنی نسبتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستگی ہی زندگی کا اصل مقصد ہے۔ یہاں لفظ ”نام“ محض چند حروف کا مجموعہ نہیں بلکہ وجودِ معنوی، نسبتِ قدسیہ، اور نُورِ رسالت کی علامت ہے اور ”گھر“ صرف مکان نہیں بلکہ دل، حیات، نسل، بقا، اور ہستی کی تمثیل، گویا شاعر یہ کہتا ہے کہ، میرے آقا! یہ جو کچھ روشنی ہے، وہ تمھاری نسبت سے ہی ہے، اگر یہ نسبت میسر نہ ہوتی تو میں (ہی نہیں بلکہ پورا عالم) اندھیروں میں گم ہو جاتا۔

ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے۔

مصطفیٰ یا مصطفیٰ! وہ حبس کا عالم ہوا
آمد و شد سانس کی الجھی ہے، گھبراتے ہیں ہم

یہ شعر بھی نہایت بصیرت آمیز اور وجدانی کیفیت کا حامل ہے۔ سچ پوچھیے تو یہ محض ایک نعتیہ شعر نہیں، بلکہ عصرِ حاضر کی روحانی گھٹن اور اجتماعی بے چینی کا ایک علامتی اظہار ہے۔ شعر کا آغاز شاعر کی ”ندائے نیاز“ اور ”حالتِ اضطراب“ میں اس کے دل کی فطری

صدا ہے، پھر اس کے ساتھ ساتت لفظ ”مصطفیٰ“ کا مکرر استعمال زبان کی تھرتھراہٹ کا مظہر اور دل کی مکرر بے قراری کا اشارہ۔ اصل میں یہ ندا محض فریاد نہیں، ایک روحانی استعانت کی جستجو ہے، گویا شاعر کہتا ہے: یارسول اللہ! ہم پر یہ وقت سخت ہے، اور آپ ہی ہماری پناہ ہیں۔ آگے شاعر نے ”وہ حبس کا عالم“ کہہ کر صرف فزیکل اور جسمانی گھٹن نہیں بلکہ سیاسی، سماجی، فکری اور روحانی گھٹن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ شاعر ایسے ماحول اور ایسی فضا کا ذکر کر رہا ہے جہاں سانس تک لینا دشوار ہو گیا ہے، یعنی اپنی اصل میں یہ مصرع معاشرتی جبر، دینی زوال، اور انسان کی تنہائی کا ایک گہرا عکس ہے۔

دوسرے مصرع میں ”آمد و شد سانس کی الجھی ہے“ کہہ کر، فطری حیات کی روانی میں رکاوٹ، حیاتِ قلبی و روحانی کے بگاڑ، اضطراب، گھٹن، اور سکونِ قلب کے فقدان کی جو درد ناک صورت منظرکشی کی ہے وہ بے مثال ہے۔ عام طور پر یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب انسان اپنے ”مرکزِ سکون“ سے کٹ جائے، اور وہ مرکز ہے رحمۃ للعالمین راحۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی۔

آگے انھوں نے کہا: ”گھبراتے ہیں ہم“ اصل میں یہ گھبراہٹ انفرادی نہیں، پوری امت، اور پورے زمانے کی گھبراہٹ ہے، یہ روحانی صیغۂ جمع ہے، یعنی شاعر تنہا نہیں، اس کی گھبراہٹ، اس کی پکار، پوری انسانیت کی نمائندگی کرتی ہے۔

مذکورہ شعر بظاہر انتہائی آسان ہے لیکن اس کے مفہوم میں جو گہرائی اور گیرائی ہے اسے محض چند الفاظ یا کسی تجزیاتی نوٹ کے ذریعہ نہیں ناپا جا سکتا۔ یہ شعر کسی مخصوص واقعے، قوم یا فرد کی بات نہیں کرتا، بلکہ زمانے کی اجتماعی فریاد ہے۔ شاعر کی پکار میں محبت بھی ہے، حاجت بھی، اضطراب بھی اور استغاثہ بھی۔ یہ ایک ایسا نعتیہ شعر ہے جو محض تعریف نہیں، بلکہ استغاثۂ محبت بن جاتا ہے۔

اب ایک اور شعر دیکھیے۔

سر میرا پاؤں بن گیا ان کے دیار میں
دل نے مرے درِ شہِ والا اٹھا لیا

میرے خیال میں یہ شعر نعتیہ ادب کے اعلیٰ ترین عرفانی اشعار میں شمار کیا جانا چاہیے کیوں کہ اس میں عشق، ادب، فنا، اور روحانی جذب کی وہ کیفیات شامل ہیں جنھیں صرف محسوس کیا جا سکتا ہے، بیان کرنا آسان نہیں۔

شعر کا پہلا مصرع "تسلیم" کا اظہار ہے کہ شاعر جب دیارِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں داخل ہوتا ہے، تو اس کا سر، جو دنیا میں عزت، سربلندی اور انا کی علامت ہے، پاؤں کی جگہ لے لیتا ہے۔ یعنی دیارِ اقدس میں قدم رکھتے ہی، عقل، غرور، مرتبہ، سب کچھ جھک جاتا ہے۔ "میں" کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور باقی بچتا ہے صرف ادب۔ "سر کا پاؤں بن جانا" وہی مقام ہے جسے اقبال نے کہا:

عقل کو تنقید سے فرصت نہیں
عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

اصطلاحِ تصوف میں "سر" کو نفسِ اعلیٰ یا مرکزِ وجود کا درجہ حاصل ہے، جب یہ پاؤں ہو جاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا پورا وجود تواضع، ادب، اور تسلیم میں ڈھل گیا۔

دوسرا مصرع "دل نے مرے درِ شہِ والا اٹھا لیا" کا ظاہری مفہوم یہ ہے کہ شاعر کے دل نے اُس دروازے کو "اٹھا لیا" جو شہنشاہِ بلند مرتبہ صلی اللہ علیہ وسلم کا در ہے۔ جب کہ اس کا عرفانی تاثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ عشقِ رسول کی وہ انتہائی کیفیت طاری ہے جہاں دل درِ نبی کو اپنے اندر سمو چکا ہے، خارج کی جستجو تمام ہو چکی ہے اور دل خود دروازۂ طیبہ بن چکا ہے۔

یہ عشق کی وہ معراج ہے جہاں دل اس قدر نورانی ہو گیا ہے کہ اس میں درِ حبیب کا عکس نظر آتا ہے۔ یہ شعر قاری کو صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نہیں سکھاتا، بلکہ ایک منہجِ عشق عطا کرتا ہے؛ کہ پہلے سر کو پاؤں بناؤ یعنی اپنی انا کے سر کو خم کر دو پھر دل کو اس قدر پاک

کرو کہ وہ درِ حبیب کا ظرف بن جائے۔

مزید ملاحظہ ہوں۔

فکر کرتی ہے درِ ساقیِ کوثر کا طواف
اس لیے کرتا ہے مہتاب مرے گھر کا طواف
میرا دل چومنے نکلا جو درِ شاہِ امم
میری آنکھوں نے کیا طیبہ کے پتھر کا طواف

یہ اشعار محض توصیفی بیانات نہیں بلکہ تصوف، فکر و فن، عشقِ محمدی، اور روحانیت کی ایک مکمل تشریح ہیں۔ یہ وہ نعتیہ تخیل ہے جو زمان و مکان سے ماورا ہو کر قاری کو طوافِ محبت کا شعور عطا کرتا ہے۔

یہاں "فکر" محض سوچ کا عمل نہیں بلکہ روح کی جستجو، عقل کی عاجزی، اور شعور کی معراج ہے وہ فکر درِ ساقیِ کوثر کا طواف کرتی ہے، یہ تو لازمی ہے؛ "فکر" جب بھی عشق کی حد میں داخل ہوگی، تو اسے درِ مصطفیٰ ﷺ کے گرد طواف کرنا ہی پڑے گا۔ اس میں شاعر نے اس علامتی زبان کا استعمال کیا ہے جو اقبالؔ، جگرؔ، اور وارثؔ شاہ کے روحانی تخیلات کی یاد دلاتی ہے۔

پھر شاعر نے "اس لیے کرتا ہے مہتاب مرے گھر کا طواف" کہہ کر ایک روحانی تمثیل پیش کی ہے۔ اس ترکیب سے شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ: جب فکر درِ مصطفیٰ ﷺ کے گرد طواف کرنے لگے، تو کائنات کی ہر روشنی (بشمول مہتاب) خود بخود اس وجود کی طرف کھنچ آتی ہے جس میں یہ طواف جاری ہے۔ اور اس عظیم الشان عرفانی منطق کا خلاصہ کیا ہے کہ محبت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہی مرکزِ کائنات ہے۔

دوسرے شعر میں شاعر نے دل کو ایک زائر بنایا ہے، جو مدینہ کی گلیوں میں، ادب کے ساتھ، درِ اقدس کو چومنے نکلتا ہے۔ یہ در اصل فنا فی الرسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صورت

ہے جسے الفاظ نہیں بلکہ صرف آنسو ہی بیان کر سکتے ہیں۔ دوسرے مصرع میں شاعر کا روحانی عشق اپنی معراج پر پہنچتا ہوا نظر آتا ہے جب وہ یہ کہتا ہے "میری آنکھوں نے کیا طیبہ کے پتھر کا طواف"۔۔۔ "کعبہ کا طواف کرنا" وہ کیفیت ہے جو حاجی کعبۃ اللہ کا دیدار کر کے محسوس کرتا ہے۔ لیکن یہاں "پتھروں کا طواف" ہے، جو اس بات کی علامت ہے کہ: جب عشق سچا ہو، تو طیبہ کی خاک، دیواریں، پتھر، سب مقدس بن جاتے ہیں۔

سنگ و خشت و خار و خاکِ شہرِ طیبہ دیکھیے
مثلِ کعبہ ہیں مقدس پائے رحمت کے طفیل

حقیقتاً شاعر کے یہ اشعار محض جمالیاتی یا نعتیہ اظہار نہیں، بلکہ عاشقانہ عرفان کا ایسا مکمل مرقع ہیں جو قاری کو روح کی گہرائیوں میں اتار دیتا ہے۔ ان اشعار میں فکر کا ہدف بھی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، کائنات کا محور بھی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، دل کی حرکت بھی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آنکھوں کی بندگی بھی مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

ما سوائے مصطفیٰ کچھ بھی نظر آتا نہیں
بولو کیا کچھ اور بھی ہے ما سوائے مصطفیٰ

شاعر کے یہ اشعار دراصل عشقِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کا طواف نامہ ہیں — جہاں دل، آنکھ، فکر، اور کائنات سب درِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد گردش میں ہیں۔ یہ وہ ادب ہے جو نعت کے ذریعے کائناتی مرکزیت کو بیان کرتا ہے۔ یہاں "طواف" ایک جسمانی حرکت نہیں بلکہ باطنی حیات کی سب سے اعلیٰ حرکت ہے، جو ہمیں طیبہ کے پتھروں سے عشق سکھاتی ہے۔

مجموعۂ کلام "سلسبیل" میں اس قبیل کے بے شمار اشعار ہیں، یہ صرف ایک نعتیہ مجموعہ نہیں، بلکہ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ جمالیاتی تفسیر ہے، جس میں لفظ عبادت بن گئے ہیں، احساسات عبادت گاہ، اور شعر نعتیہ سر خمیدگی کا علامت۔ محمد نور الحسن نور نوابی

عزیزی نے جمالِ ایمان، فنِ ادب، اور روحِ عشق کو یکجا کر کے ایک ایسا فن پارہ تخلیق کیا ہے جو حسّی، فکری، اور روحانی جمالیات کی تکمیل کرتا ہے۔ نعتیہ ادب کے شائقین کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔کتاب کی طباعت انتہائی عمدہ کاغذ پر کی گئی ہے اور پروف کی غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہے۔ ہمیں امید ہے کہ نور صاحب آئندہ بھی عشق و عرفان کے سورجوں سے کائنات فکر وفن کو منور کرتے رہیں گے۔نسأل اللہ القبول والإخلاص۔

(ماہنامہ اشرفیہ ستمبر2025ءمیں شائع)

(تحریر:جولائی2025ء)

فکری مقالات

بصیرت وبصارت کا آئینہ

(حافظ افتخار احمد قادری کے مجموعہ مقالات پر تاثراتی تحریر)

ہر عہد میں کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کے الفاظ محض رسمی نہیں ہوتے بلکہ دلوں کی دھڑکن اور زمانے کی سانسوں کا استعارہ ہوا کرتے ہیں۔ ”حافظ افتخار احمد قادری“ انہی میں سے ایک ہیں، ان کی شخصیت میں حافظِ قرآن کی روحانی متانت، عالمِ دین کی دینی دعوت، محقق کی فکری گہرائی، اور مصلحِ معاشرہ کا درد؛ یہ سب یکجا ہیں، اور ان کی یکجائی نے ایک ایسا اسلوب پیدا کیا ہے جو نہ صرف قاری کے ذہن کو منور کرتا ہے بلکہ اس کے دل کو بھی بدل دیتا ہے۔

زیرِ نظر ”فکری مقالات“ حافظ افتخار احمد قادری کے ان مضامین و مقالات کا مجموعہ ہے جو وقتاً فوقتاً ماہ نامہ اشرفیہ میں شائع ہوتے رہے۔ یہ مجموعہ مضامین اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ قلم جب اخلاص اور بصیرت کے ساتھ چلتا ہے تو الفاظ محض کاغذ پر نہیں ٹھہرتے بلکہ زندگیوں میں اتر جاتے ہیں۔ حافظ افتخار صاحب کی یہ تحریریں محض معلوماتی یا ناصحانہ نہیں، بلکہ فکری مکاشفات کی منزل پر فائز ہیں، کتاب کا ہر مضمون ایک ایسا آئینہ ہے جس میں قاری نہ صرف دین و دنیا کی حقیقت دیکھتا ہے بلکہ اس میں اسے اپنے باطن کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔

حافظ افتخار احمد قادری کی بنیادِ فکر و نظر دین و شریعت کی روح پر ہے، جہاں ظاہری اعمال اور باطنی کیفیت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں شریعت اور طریقت، عقل اور عشق، علم اور عمل؛ یہ سب ایک ہی زنجیر کے مختلف حلقے ہیں۔ وہ نہ تو واعظ محض ہیں اور نہ خشک محقق، بلکہ ان کی تہ دار زات میں ان دونوں خصوصیات کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان

کا مطالعہ وسیع ہے اور حافظہ قوی، اس لیے حوالہ جات کے انتخاب میں قرآنی آیات، احادیثِ مبارکہ، فقہی اقوال اور صوفیانہ حکایات یکساں روانی سے شامل کرتے چلے جاتے ہیں۔

ان کی فکر میں ایک خاص اصلاحی شدت پائی جاتی ہے، مگر یہ شدت سخت لہجے کی نہیں بلکہ دل میں اتر جانے والی نرمی کی شدت ہے۔ وہ قاری پر حکم نہیں لگاتے بلکہ اس کو قائل کرتے ہیں، اور قائل کرنے کے لیے حسین وجمیل دلائل کا انبار بھی لگا دیتے ہیں۔

ان کا اسلوب کلاسیکی اردو کی شیرینی اور عربی وفارسی کی علمی وجاہت سے مزین ہے۔ جملوں میں خطابت کا جلال بھی ہے اور صوفیانہ نثر کی لَے بھی۔ الفاظ کبھی محراب سے اٹھنے والی دعا کی طرح سنجیدہ ہوتے ہیں، تو کبھی مکتب کے استاد کی طرح سادہ اور راست گو۔ تشبیہات واستعارات ان کی تحریر میں نہ بطور زینت بلکہ بطور دلیل آتے ہیں۔ وہ کسی قرآنی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے روزمرہ کی ایک چھوٹی سی مثال سے بھی کام لے سکتے ہیں، اور کسی صوفیانہ نکتہ کو سمجھانے کے لیے تاریخ کے اوراق سے ایک پراثر واقعہ بھی نکال سکتے ہیں۔

کتاب کا مرکزی دھاگا روحانی تربیت اور اخلاقی اصلاح ہے جس میں مختلف عنوانات کے موتی پروئے گئے ہیں۔ مصنف نے تزکیۂ نفس، تواضع، قناعت، صبر اور زہد جیسے باطنی اوصاف کو گوہر کی مانند چن کر عبارت کے ریشمی دھاگے میں پرویا ہے۔ ہر صفحہ قاری کو یاد دلاتا ہے کہ انسان کی اصل قدر اس کے کردار اور اس کے دل کی پاکیزگی میں ہے، نہ کہ عارضی دنیاوی زینت میں۔

یہ کتاب حافظ افتخار احمد قادری کے قلمی سفر کا ایک ایسا پڑاؤ ہے جس میں ان کے فکری خدوخال اور روحانی رجحانات دونوں جھلکتے ہیں۔ یہ محض ایک شخص کی تحریروں کا انتخاب نہیں بلکہ ایک عہد کی فکری وروحانی دھڑکن ہے۔ اس میں ہمیں وہی توازن، اخلاص اور جامعیت ملتی ہے جو کسی حقیقی مربی اور رہنما کا کاوشات میں ہونی چاہیے۔ یہ کتاب ہمارے علمی وروحانی ذخیرے کا قیمتی حصہ ہے۔ اگر اس کی زبان کو قدرے سادہ اور حوالہ جاتی ترتیب کو جدید تحقیق

کے معیار کے مطابق ڈھال دیا جائے تو یہ نہ صرف علما و طلبا کے لیے بلکہ عام قارئین کے لیے بھی ایک روشنی کا مینار بن سکتی ہے۔

ہم دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت حافظ افتخار احمد قادری کی تحریروں کو قبولیت و برکت عطا فرمائے، ان کے قلم کو ہمیشہ اخلاص، بصیرت اور نورِ ہدایت آراستہ رکھے، ان کے افکار کو دلوں کی اصلاح، روحوں کی طہارت اور معاشرے کی فلاح کا ذریعہ بنائے۔ ربِ کریم انھیں صحت و عافیت، عمر میں برکت اور خدمتِ دین کے مزید مواقع عطا فرمائے، اور ان کے ہر لفظ کو قاری کے لیے علم، محبت اور عملِ صالح کا تابناک ذریعہ بنائے۔ آمین یارب العالمین

10/ اگست 2025ء

نوٹ: حافظ افتخار احمد صاحب بضد ہو کر یہ مضمون اپنی کتاب کے لیے لکھوایا مگر افسوس کا مقام ہے کہ شامل اشاعت نہ فرمایا۔ کم سے کم انھیں دوسروں کے وقت اور محنت کی قدر کرنی چاہیے۔ اس طرح کی حرکت بہر حال کسی قلم کار کو زیب نہیں دیتی۔

عرض و معروض

(انیسؔ مبارک پوری کے مجموعۂ نعت و مناقب کے لیے تاثراتی تحریر)

نعت وہ مقدس بستی ہے جس کے در و دیوار خوشبو کے ہیں، اور جس کے باشندہ الفاظ گلاب کی پنکھڑی، اس بستی کے مصرع نما گلیاروں میں ہمہ دم روحانیت اور عشقِ محمدی ﷺ کے سرد جھونکے روحوں کو تازگی عطا کرتے ہیں۔ انیسؔ مبارک پوری کا زیرِ نظر مجموعہ اسی نعتیہ بستی کا ایک روشن مینار ہے، جو دلوں کو منور اور روحوں کو مسرور کرتا ہے۔

انیسؔ کے یہاں نعت صرف مدح نہیں، بلکہ عاشقانہ معراج ہے۔ ان کے اشعار میں عقیدت کا رنگ اتنا گہرا ہے کہ قاری محسوس کرتا ہے جیسے ہر مصرع کے پیچھے آنکھوں کی نمی اور دل کی دھڑکن شامل ہو۔ استعارے اور تشبیہیں ان کے ہاں صرف فنی آرائش نہیں بلکہ روحانی علامتیں ہیں۔ کبھی وہ حضور ﷺ کی رحمت کو بارش کے اُس بادل سے تشبیہ دیتے ہیں جو بنجر دلوں کو سرسبز کر دیتا ہے، کبھی آپ ﷺ کے اخلاق کو اُس چاند سے ملا دیتے ہیں جس کی چاندنی اندھیروں کو شکست دے دیتی ہے۔

انیسؔ مبارک پوری کے ہاں الفاظ عود و عنبر کی خوشبوؤں کی طرح فضا میں رچے بسے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کی نعتوں میں عروض کی پابندیاں بھی ہیں اور دل کی بے ساختگیاں بھی، گویا شریعت کی حد بندی اور عشق کی سرشاری ایک ہی صف میں کھڑی ہیں۔ حقیقتاً یہ مجموعہ محض پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ محسوس کرنے کے لیے ہے۔ قاری ہر صفحے کے بعد توقف کرتا ہے، جیسے کوئی خانقاہ میں ذکر کی مجلس میں بیٹھا ہوا ہو اور ہر لفظ اس کے دل پر ایک نوری لمس چھوڑ رہا ہو۔

انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ نعت کو ماضی کی عظیم روایت سے جوڑتے ہوئے بھی اسے عصری حساسیت دیتے ہیں۔ ان کے کلام میں کلاسیکی شعری حسن بھی ہے اور جدید قاری کے دل تک پہنچنے کا فن بھی۔ اس طرح دیکھا جائے تو انیسؔ کی شاعری ایک نورانی آئنہ ہے، جس میں محبتِ رسول ﷺ کی تصویر ہر زاویے سے چمکتی دمکتی نظر آتی ہے۔ ان کے کلام میں عشق، ادب، اور فن کا ایسا حسین امتزاج ملتا ہے جو اردو نعتیہ روایت کے بڑے ناموں کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

اس مجموعے کی انفرادیت یہ ہے کہ اس میں عشقِ رسول ﷺ کی تپش، فن کی نزاکت، اور ایمان کی روشنی تینوں جمع ہیں۔ شاعر نے کہیں صوفیانہ وجد، کہیں حسی پیکر، اور کہیں کلاسیکی استعارات کے ذریعے اپنے جذبات کو اس قدر دل نشیں انداز میں پیش کیا ہے کہ قاری محض پڑھتا نہیں بلکہ محسوس کرتا ہے۔ ان کا ہر شعر عقیدت کے درخت کا ایک خوشبو دار پھول اور ہر صفحہ ایک روحانیت کا عظیم الشان کینوس ہے۔ انھوں نے نعت کو محض فن کی مشق کے طور پر نہیں بلکہ دل کی عبادت کے طور پر پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مجموعہ محض ادبی نہیں، روحانی دستاویز بھی ہے۔

ذیل کی سطور میں ہم ان کے چند اشعار اور ان کا تجزیاتی مطالعہ پیش کریں گے۔ ملاحظہ کیجیے۔

ہماری کیا بساط ہے کہ سمجھیں ان کا مرتبہ
حبیب کردگار پر ہر اک نبی کو ناز ہے
نگاہ کائنات کی ٹھہر سکی نہ آج تک
حضور کے جمال کی یہ شانِ امتیاز ہے
رؤف بھی رحیم بھی کریم بھی عظیم بھی
ہر اک لقب میں آپ کے پیام دل نواز ہے

یہ اشعار نعتیہ شاعری کے اس روشن قافلے میں شامل ہیں جہاں لفظ، عقیدت کی خوشبو سے مہک کر روح کو معطر کرتے ہیں۔ یہ تینوں اشعار جہاں ایک طرف عقیدتِ رسول ﷺ کا آئینہ ہیں تو وہیں دوسری طرف اس شاعرانہ فنکاری کے مظہر ہیں جو نعت کو محض تعریف کے دائرے سے نکال کر ایک فکری اور روحانی تجربہ بنا دیتی ہے۔

مذکورہ پہلے شعر میں شاعر نے اپنی بے بسی اور انکسار کو محور بنایا:

ہماری کیا بساط ہے کہ سمجھیں ان کا مرتبہ
حبیب کردگار پر ہر اک نبی کو ناز ہے

یہاں ''ہماری کیا بساط''محض ایک جملہ نہیں بلکہ انسانی فہم کی محدودیت کا اقرار ہے۔ شاعر اپنی ذات کو پیچھے ہٹا کر یہ اعلان کرتا ہے کہ حضور ﷺ کا مقام کسی ایک فرد، امت یا زمانے کا فہم نہیں، بلکہ ہر نبی کو بھی اس پر رشک ہے۔ ''حبیبِ کردگار'' کی ترکیب نہ صرف قرآنی و حدیثی اسناد رکھتی ہے بلکہ مدحیہ ادب میں ایک قدیم اور معتبر علامت بھی ہے۔

دوسرے شعر میں شاعر نے ایک خوبصورت استعارہ تراشا ہے:

نگاہ کائنات کی ٹھہر سکی نہ آج تک
حضور کے جمال کی یہ شان امتیاز ہے

یہاں ''نگاہ کائنات کی'' گویا تمام عالمِ مخلوقات کی مجموعی بینائی ہے، جو حضور ﷺ کے جمال کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکی۔ ''شانِ امتیاز'' اس حسن کی وہ انفرادیت بیان کرتی ہے جو کسی اور ہستی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ مصرع اس بات کا اعلان ہے کہ آپ ﷺ کا جمال نہ صرف ظاہری حُسن بلکہ باطنی نورانیت کا بھی مرکز ہے۔

تیسرے شعر میں شاعر نے اوصافِ نبوی ﷺ کا ایک گلدستہ پیش کیا ہے:

رؤف بھی، رحیم بھی، کریم بھی، عظیم بھی
ہر اک لقب میں آپ کے پیامِ دل نواز ہے

یہاں لفظوں کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔ رؤف، رحیم، کریم، عظیم — یہ سب الفاظ قرآنی متون اور سنت کے عکاس ہیں، اور ان کا سلسلہ ایک تدریجی چڑھاؤ رکھتا ہے، جو قاری کو عظمت اور شفقت کے احساس میں ڈبو دیتا ہے۔ ''پیامِ دل نواز'' کے ذریعے شاعر یہ حقیقت اجاگر کرتا ہے کہ آپ ﷺ کے ہر لقب میں انسانیت کے لیے محبت، امید اور رہنمائی پوشیدہ ہے۔

مجموعی طور پر یہ اشعار نعتیہ شاعری کی کلاسیکی روایت سے جڑے ہونے کے باوجود ایک تازہ لہجے کے حامل ہیں۔ ان میں جذبے کی شدت، فکر کی گہرائی، اور بیان کی شائستگی ایک ساتھ موجود ہے۔ شاعر نے نہ مبالغے کی سطحیت اختیار کی ہے نہ محض رسمی عقیدت کا سہارا لیا ہے، بلکہ عقیدت کو فکری وقار اور اسلوبی نزاکت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اشعار قاری کو صرف مدحتِ رسول ﷺ میں محو نہیں کرتے، بلکہ اسے کائناتی پیمانے پر اس نور کی عظمت کا احساس بھی دلاتے ہیں جو محمد مصطفی ﷺ کی ذاتِ اقدس سے پھوٹتا ہے۔

یہ اشعار بھی دیکھیے؎

مجھ عاشق شاہ بطحا کا جب چیر کے سینہ دیکھو گے
قیمت نہ ادا کر پاؤ گے جس کی، وہ نگینہ نکلے گا
ہیں غیب کے عالم شاہ ہدی اسرار زمیں سے واقف ہیں
ماریں گے جو قدموں سے ٹھوکر گیتی سے دفینہ نکلے گا
جب حسن عقیدت کے لب سے چومیں گے نبی کے نقش قدم
پیغمبر اعظم کے در سے فردوس کا زینہ نکلے گا

انیسؔ کے یہ اشعار نعتیہ شاعری کی اس صنف سے تعلق رکھتے ہیں جو صرف مدح و عقیدت کا اظہار نہیں کرتی بلکہ تخیل، استعارات اور داخلی معنویت کے ذریعے ایک روحانی فضا پیدا کرتی ہے۔ ان اشعار میں شاعر نے عشقِ رسول ﷺ کو نہ صرف قلبی واردات کی شکل

میں بیان کیا ہے بلکہ کائناتی و غیبی حقائق کے ساتھ جوڑ کر ایک ماورائی تاثر قائم کیا ہے۔

مذکورہ پہلے شعر میں شاعر نے اپنے قلبی عشق کو "نگینہ" سے تشبیہ دی ہے۔ "شاہ بطحا" حضور ﷺ کے مکی پس منظر کی طرف اشارہ ہے، اور "چیر کے سینہ دیکھو گے" میں عاشق کے دل کی تہہ داری اور اخلاص کو ظاہر کرنے والا ایک صوفیانہ پیکر نظر آتا ہے۔ یہ مضمون اگرچہ قدیم نعتیہ اور منقبتی ادب میں بہ تکرار استعمال ہوا ہے (مثلاً قلبِ مومن کو عرش کا آئینہ یا نور کا مرکز کہنا)، لیکن یہاں شاعر نے اس کو ایک قیمتی جواہر کی علامت کے ساتھ باندھ کر محبت کی بیش قیمتی کو واضح کیا ہے۔

شعر میں استعمال کی گئی ترکیب "چیر کے سینہ" ایک پراثر مگر قدرے سخت ترکیب ہے۔ صوفیانہ ادب میں یہ تصویر زیادہ لطیف انداز میں آتی ہے، جیسے "کھول کے دل کا ورق" یا "آئینۂ دل میں دیکھو" وغیرہ۔ موجودہ انداز جذباتی شدت تو پیدا کرتا ہے مگر نعتیہ ادب کی لطافت سے "کچھ" باہر نکل جاتا ہے۔

مذکورہ دوسرا شعر معجزاتی اور روحانی تاثر کا حامل ہے۔ "غیب کے عالم" اور "اسرارِ زمیں" دو مختلف جہات: ماورائی اور ارضی کو جوڑتے ہیں، جس سے حضور ﷺ کی جامعیت نمایاں ہوتی ہے۔ "ٹھوکر" کا استعارہ یہاں محض جسمانی حرکت نہیں بلکہ ارادے اور توجہ کی علامت ہے، اور "گیتی سے دفینہ نکلے گا" میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضور ﷺ کی نظرِ عنایت مادی اور معنوی دونوں طرح کے خزانوں کا سرچشمہ ہے۔ اس طرز کا مضمون ہمیں فارسی مناقب اور اردو قصائد میں بے شمار ملتا ہے، خاص طور پر معجزات و تصرفات کے بیان میں اس مضمون کی بہتات ہے۔

یہاں لفظ "ٹھوکر" اور "دفینہ نکلے گا" کے درمیان عمل و اثر کی وضاحت کم ہے۔ اگر شاعر اس معجزے کو کسی مخصوص موقع یا علامت سے جوڑتا تو معنوی قوت میں خاصہ اضافہ ہو جاتا۔

تیسرا شعر صوفیانہ واردات کو جسمانی عمل کی تمثیل میں پیش کرتا ہے۔ "حسنِ عقیدت

کے لب" ایک بلیغ ترکیب ہے، جو صرف جسمانی بوسہ نہیں بلکہ عقیدت و محبت کی انتہا کا نشان ہے۔ "نبی کے نقشِ قدم" کا استعارہ قرآن و حدیث میں موجود اتباعِ رسول ﷺ کی تعلیمات کا عکس ہے۔ "فردوس کا زینہ" ایک غیر معمولی تصور ہے جو یہ باور کراتا ہے کہ اتباع اور عشق ہی جنت کی سیڑھی ہے۔ اس مضمون میں عشق، عمل، اور نجات تینوں کا رشتہ باندھ دیا گیا ہے۔

اس طرح کے اور بھی بہترین اشعار سے کتاب مزین ہے اور قاری کو دعوتِ مطالعہ پیش کرتی ہے۔

انیسؔ مبارک پوری کا کلام مجموعی طور پر جذبۂ عشقِ رسول ﷺ، صوفیانہ والہانہ پن اور عقیدت کی صداقت سے لبریز ہے۔ ان کے اشعار میں روایتی نعتیہ مضامین کو بلیغ تراکیب، استعاروں اور صوتی ہم آہنگی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، جس سے فکری وقار اور جذباتی اثر دونوں پیدا ہوتے ہیں۔ اگرچہ کہیں کہیں بیان میں شدت یا موضوعی یکسانیت نظر آتی ہے، مگر مجموعی تاثر ایک ایسی روحانی سرشاری کا ہے جو قاری کو محبت و تعظیم کی فضا میں لے جاتی ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں شامل مناقب ایک الگ روحانی گہرائی اور حُسنِ عقیدت کی جوت جگاتے ہیں۔ شاعر نے مدحت نگاری کو محض تاریخی حوالوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ ولایت، عصمت اور ایثار کے ایسے نورانی پہلو اجاگر کیے ہیں جو دل و دماغ کو منور کر دیتے ہیں۔ حضرت علی کے شجاعت آمیز وقار، حضرت فاطمہ کی طہارت و عفت، اور امام حسین کی قربانی اور صبر کو شعری قالب میں یوں ڈھالا گیا ہے کہ قاری نہ صرف متاثر ہوتا ہے بلکہ ان پاک ہستیوں کی معنوی بلندی کے احساس میں ڈوب جاتا ہے۔ یہ مناقب کتاب کو ایک متبرک اختتام اور فکری تکملہ عطا کرتے ہیں۔

یہ کتاب اردو تقدیسی ادب کے سنہری سلسلے میں ایک قیمتی اضافہ ہے، جو آنے والے وقت میں بھی اپنی خوشبو اور روشنی سے دلوں کو منور کرتی رہے گی۔

11/ اگست 2025ء

سخن بولنے لگے

مجموعۂ کلام "خاکِ بے نمود" پر ایک تاثراتی تحریر

غزل ایک انفرادی فنکارانہ عمل ہے لیکن اس کے جذبات کی عمومیت مسلّم ہے، اس کی یہ عمومیت ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو محیط ہے۔ غزل جہاں ماضی کی شان و شوکت کا احاطہ کرتی ہے وہیں مستقبل کے لیے راہِ عمل طے کرتی ہے، اور حال کی باتیں کرنی تو کوئی غزل ہی سے سیکھے۔ غزل کے فن سے متعلق اختر سعید خاں لکھتے ہیں:

"غزل کا فن نرم آنچ سے جلا پاتا ہے، بھڑکتے ہوئے شعلوں سے نہیں۔ قدیم غزل ہو یا جدید اس کی اپنی ایک تہذیب ہے۔ وہ اشاروں اور کنایوں میں بات کرتی ہے، اونچی آواز میں نہیں بولتی، اس کا کمال گویائی برہنہ حرفی نہیں، پیام زیرلبی ہے۔ غزل کا فن نہ سینہ کوبی ہے نہ قہقہہ لگانا، وہ ایک آنسو ہے پلکوں پر ٹھہرا ہوا، ایک تبسم ہونٹوں پر پھیلا ہوا، کبھی اس کے تبسم میں اشکوں کی نمی ہوتی ہے اور کبھی اشکوں میں تبسم کی جھلک۔"

(بحوالہ ڈاکٹر خالد محمود، ادب کی تعبیر، 'غزل کے مزاج داں۔ اختر سعید خاں'، ص 83)

ڈاکٹر ثریا خانم جوش ملیح آبادی کے فکروفن پر گفتگو کرتے ہوئے غزل کے فن سے متعلق لکھتے ہیں:

”غزل کا فن دراصل رمزیت اور ایمائیت کا فن ہے۔ دیگر اصنافِ سخن کے مقابلے میں غزل اپنے فن کی اسی جاذبیت کی وجہ سے ممتاز رہی ہے۔“

(ڈاکٹر ثریّا خانم، جوش ملیح آبادی فکر وفن، ص43، انیس کتاب گھر، رجستھان، 2010ء)

غزل کی تبدیلیوں سے متعلق حامد کاشمیری نے اپنی تصنیف ”اردو تنقید“ میں سب سے پہلے تخیل کا ذکر کیا ہے، دوسری شرط کائنات کا مطالعہ، اور تیسری شرط تلفظ الفاظ کی بیان کی ہے۔ لکھتے ہیں:

”شعر کے وقت ضروری ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اوّل خیالات کو صبر و تحمل کے ساتھ الفاظ کا لباس پہنانا پھر ان کو جانچنا اور تولنا اور ادائے معنی کے لحاظ سے ان میں جو قصور رہ جائے اس کو رفع کرنا۔ الفاظ کو ایسی ترتیب سے منظم کرنا کہ صورت اگرچہ نثر سے متمیز ہو مگر معنی اسی قدر ادا کرے جیسے کہ نثر میں ادا ہو سکتے۔ شاعر بشرطے کہ شاعر ہو اول تو وہ ان باتوں کا لحاظ وقت پر ضرور کرتا ہے اور اگر کسی وجہ سے بالفعل اس کو زیادہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا تو پھر جب کبھی وہ اپنے کلام کو اطمینان کے وقت دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اکثر بڑے بڑے شاعروں کا کلام مختلف نسخوں میں مختلف الفاظ کے ساتھ پایا جاتا ہے۔“

(حامد کاشمیری، اردو تنقید (منتخب مقالات)، ص38-39، ساہتیہ اکادمی، نئی دہلی، 1997ء)

اب آئیے سلاؔم فیضی کی طرف، ہمارے بڑے خیر خواہ ہیں، گورکھ پور کی ادبی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں، ان کی آنے والی کتاب ''خاکِ بے نمود'' اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ مذکورہ شرائط اور تعریفات جو ماقبل میں ہم نے بیان کیں وہ سب کی سب بدرجۂ اتم سلاؔم فیضی کی شاعری میں موجود ہیں۔ سنیں تو سنتے چلے جائیں، پڑھیں تو پڑھتے چلے جائیں۔ ہم نے ان کے اشعار پڑھے تب یہ عقدہ کھلا کہ ''شاعری'' وہ چیز ہے جس کی طرف اس وقت رجوع کرنا چاہیے جب سب کچھ بے معنیٰ ہو جائے۔ ان کی شاعری ہم سے اس طرح مخاطب ہوتی ہے کہ معجزاتی طور پر ہم وہی سنتے ہیں جو ان کے اشعار ہمیں سنانا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس مناسب الفاظ نہیں کہ ہم ان کی تعبیرات کو اپنے الفاظ میں ادا کر کے کچھ اپنی جذباتیت کا اظہار کر سکیں۔ پھر بھی ہم یہ ضرور لکھنے کی کوشش کریں گے کہ ان کی شاعری میں کیا ہے!

سلاؔم فیضی کی شاعری میں جذبات کے جال میں الجھ کر سنبھلنے کی کوشش بھی ہے اور کسی ممکنہ آفت کے ذرا سے اشارے پر پیدا ہونے والی بے چینی اور بے بسی بھی، علاقائی اور بین الاقوامی حالات کی ناقابلِ فہم تاریکی کا سینہ چیرتی ہوئی روشنی کی شعاع بھی ہے اور ہمارے ارد گرد بڑھتی ہوئی ناانصافیوں، مایوسیوں اور تشدد کے خلاف جوہرِ جہاد بھی۔ ان کی شاعری میں خود اپنی حدود کے شعور سے پیدا ہونے والی کمزوری کا بیان بھی ہے اور مستقبل کی ایک سکون بخش قوت کا اظہار یہ بھی۔

سلاؔم کی غزلیں وہ مخلص ساتھی ہیں جو ہمیں الجھن اور پیچیدگیوں بھرے بے رحم دنوں سے نکال کر جذباتی تحفظ کے ایک پر سکون گوشے تک پہنچاتی ہیں۔ ان کے اشعار ان بے خواب راتوں میں ہمارے ساتھ جاگتے ہیں جب ہم ماضی کی مجبوریوں اور حال کی ذمہ داریوں کے درمیان کروٹیں بدلتے رہتے ہیں۔

سلام فیضی کی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں گورکھ پور کی علمی و ادبی فضا کا زبردست رول رہا ہے، مشاعروں میں پڑھتے ہیں لیکن کم کم۔ طبیعت موج میں ہوتی ہے تو شعر کہتے

ہیں زبردستی کچھ کہنے کی کبھی کوشش نہیں کی شاید یہی وجہ ہے کہ "خاکِ بے نمود" کے اکثر اشعار "آمد" کی کٹیگری میں شامل ہیں۔ تحت اللفظ میں قرأت کا انوکھا انداز ان کے ہم عصروں میں انھیں ممتاز کرتا ہے۔ ان کی شاعری سادگی، جملوں کی ساخت، الفاظ کی صوتیات، غیر ضروری الفاظ یعنی فضولیات سے گریز، ایجاز اور اعلیٰ معیار کی پاسداری کی مظہر ہے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ان کا مجموعۂ کلام "خاکِ بے نمود" ایک زندہ کلاسیک کی حیثیت اختیار کرے گا۔ ان کی پوری ادبی زندگی کا یہ دوسرا مجموعۂ کلام ہے لیکن پہلے مجموعۂ کلام نے جو دیرپا تاثر قائم کیا اس کی روایت ان شاء اللہ برقرار رہے گی۔

سلاؔم فیضی کی شاعری کا اسلوب اور تکنیک بظاہر گفتگو کے انداز میں سادہ، غیر رسمی اور رواں معلوم ہوتے ہیں، لیکن جب قاری ذرا ٹھہرتا ہے اور ان بظاہر سادہ اشعار، پر غور کرتا ہے، تو ان کی معنویت، گہرائی اور اثرانگیزی حیران کن طور پر آشکار ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر؎

کسی سے یوں ہی الجھنے کا میں نہیں قائل
مرے عیوب نہ گن طرزِ ناقدین بھی گن
اٹھا کے رکھ دیں بزرگوں پہ تہمتیں ساری
یہ نسلِ نو ہے مری کس قدر ذہین بھی دیکھ

یا یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں؎

ڈوبتی کشتی کا منظر، اور ہم
مطمئن دونوں، سمندر اور ہم
بوڑھے سورج تیرے مر جانے کے بعد
رقص میں آتے ہیں ساغر اور ہم

سلاؔم فیضی کی شاعری ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے وہ محبت کا اظہار کرتے ہیں، ایک ایسی محبت جو حدود و قیود سے ماورا ہے، ان کی شاعری کسی نظریاتی ایجنڈے کی پابند نہیں

البتہ ہم یہ کہیں تو بے جا نہ ہو گا کہ انھوں نے جدت اور روایت کے درمیان اپنے لیے ایک الگ ہی راستہ نکالا ہے اور مستقل مزاجی سے اس راستے پر محوِ سفر ہیں۔

فطری انداز کے ساتھ کائناتی حساسیت ان کی فکر کے مرکز میں موجود ہے، اپنے کے عہد کے سماجی اور سیاسی مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں لیکن کسی مخصوص نظریے یا ازم کو دوسرے پر فوقیت دینے کی بجائے وسیع تر انسانی تجربے کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

آنے والا ہے کوئی اور مسیحائی کو
چارہ گر آج نہیں ہے ترے بیمار کی خیر
شہر میں خوف اگاتا ہوا منظر نامہ
اور کچھ لوگ مناتے ہوئے گھربار کی خیر
میری آنکھوں میں اترتے ہوئے خونی منظر
میری گردن سے الجھتی ہوئی تلوار کی خیر

اور کہتے ہیں۔

صحرا صحرا سیرابی ہے، مانوگے
دریا دریا آگ لگی ہے مانوگے
بستی بستی ویرانی کا منظر ہے
چہروں کی اک بھیڑ لگی ہے مانو گے
آئینوں کے ہاتھ میں پتھر دیکھا ہے
اور حیرت خاموش کھڑی ہے مانوگے

سلاؔم فیضی کے یہاں موضوعاتی تنوع بھی حیرت انگیز ہے، ان کے شعری افق پر بے شمار موضوعات کی وسعت نظر آتی ہے۔ ان کے یہاں جابرانہ دورِ حکومت کی مذمت بھی ہے اور عوامی سطح پر ہونے والی تباہیوں، مظالم اور جرائم کی دنیا میں جرأت مندانہ مداخلت بھی۔

یہی وجہ ہے کہ سلاؔم کی شاعری قاری کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑتی ہے۔ وہ یہ سب کچھ لطیف پیرایۂ اظہار، روزمرہ کی تصویروں اور سادہ مگر ہرگز سطحی نہ لگنے والے جملوں کے ذریعے بیان کرتے ہیں۔ ان کے اندازِ بیان میں دانستہ پیچیدگی کا دور دور تک کوئی شائبہ نہیں ہوتا۔ وہ مشکل سے مشکل صورتِ حال کو غیر ضروری اصطلاحات اور الفاظ کی بھرمار کے بغیر، ناپ تول کر برتی گئی معصومیت اور ایک روحانی لطافت کے امتزاج کے ساتھ بیان کرتے ہیں، یہی ان کا کمال ہے۔ بظاہر پُرسکون اور خوش مزاجی کا تاثر دینے والے اشعار در حقیقت قاری کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ اس خوشنما سطح کے نیچے چھپے انسان کی جدوجہد اور تلخ حقیقتوں کو آشکار کرے۔

امید کی جا سکتی ہے کہ سلاؔم فیضی کی بے لوث تخلیقی روح موجودہ اور آئندہ نسلوں کے شاعروں، ادیبوں، قارئین اور فنکاروں کے لیے مشعلِ راہ ثابت ہوگی —ایسی نسلیں جو اسی ایمانداری، وضاحت، گہرائی اور سادگی کو اپنی تحریروں اور خیالات میں جگہ دیں گی، جن کی علامت سلام فیضی ہیں۔

8/ فروری 2025ء

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کا پچاسواں عرس
عشق و عقیدت کی داستان

آج اسلامی دنیا میں حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کا اسمِ گرامی کسی تعارف کا محتاج نہیں، آپ کی پوری حیات اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضلِ بریلوی قدس سرہ کے مشن ’’عشق رسول‘‘ کی ترویج و اشاعت سے عبارت ہے۔ سادگی، اخلاص، قناعت، تقویٰ اور قربانی کے پیکرِ جمیل حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کی مبارک پور آمد نے صرف علمی انقلاب ہی نہیں پیدا کیا بلکہ یہاں کے معاشی حالات بہتر بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا، انھوں نے اپنی مساعیِ جمیلہ سے شعور و فکر کے ایسے ایسے در وا کیے کہ کج کلاہانِ علم و دانش کی عقلیں آج تک حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن ہیں۔ الجامعۃ الاشرفیہ کی تعمیر کے لیے آپ نے جس مشقت سے کام کیا وہ اپنی مثال آپ ہے، یقیناً الجامعۃ الاشرفیہ کی بنیادوں میں آپ کے خون کا گارا شامل ہے۔ الجامعۃ الاشرفیہ کی تعمیر کے لیے جب آپ نے آواز دی تو دیوانوں کا ایک ہجوم تھا آپ کی حمایت کرتا ہوا نظر آیا۔ اس موقع پر اہل مبارک پور نے جس ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا، انھوں نے خود توفاقے کیے لیکن الجامعۃ الاشرفیہ کے لیے اپنے گھروں اور دلوں کے دروازے کھول کر رکھ دیے اور اب تک اشرفیہ کی حمایت و نصرت میں سیسہ پلائی دیوار بن کر حافظ ملت کے مشن کو تقویت پہنچا رہے ہیں۔

حافظ ملت نے آج سے 50 سال پہلے جہاں اپنا مشن چھوڑا تھا حضرت عزیز ملت سربراہ اعلیٰ صاحب قبلہ نے پورے عزم و ہمت کے ساتھ امید سے کہیں زیادہ کامیابی کے ساتھ اس مشن کو آگے بڑھایا۔ آج الجامعۃ الاشرفیہ پوری دنیا میں ایک عظیم دانش گاہ کے طور پر

متعارف ہے اور اس کے فارغین علم و دانش کے مختلف میدانوں میں سرگرمِ عمل ہیں۔ عزیز ملت کی پچاس سالہ کامیاب سربراہی نے ثابت کردیا ہے کہ وہ واقعی جانشین حافظ ملت ہیں۔

امسال 2، 3 دسمبر 2024 کو پچاسویں عرس حضور حافظ ملت کی تقریبات منعقد ہوئیں عرس کی پہلی تقریب میں قصبہ مبارک پور کے عوام، معززین علما، مشائخ اور زائرین موجود تھے، یہ روحانی تقریب قیام گاہ حافظ ملت پر بعد نماز فجر قران خوانی سے شروع ہوئی، تلاوت قرآن مجید اور نعت و منقبت کے بعد مولانا مسعود احمد برکاتی استاد جامعہ اشرفیہ کا چشم کشا خطاب ہوا پھر صلاۃ و سلام اور حضرت عزیز ملت کی خصوصی دعا پر یہ روحانی تقریب اختتام پذیر ہوئی۔ نبیرۂ حافظ ملت حضرت مولانا نعیم الدین عزیزی اور ان کے رفقا کے حسن انتظام نے اس نورانی مجلس کو کامیابیوں سے ہمکنار کیا۔ انجمن غوثیہ نے حسبِ سابق اس موقع پر خصوصی نذر کا اہتمام کیا تھا۔ بعد نماز ظہر قیام گاہ حافظ ملت سے جلوس چادر برآمد ہوا، جس میں عوام و خواص نے شرکت کی، مزار حافظ ملت پر چادر پوشی اور گل پوشی کا سلسلہ مختلف انجمنوں کے ذریعے شام تک جاری رہا۔

2 دسمبر بہ وقت شب پہلا اجلاس بعد نماز عشا قاری محمد تنویر رضا مصباحی جمشید پور کی تلاوت سے شروع ہوا، ہندوستان بھر سے تشریف لائے ہوئے علماے اہل سنت کے بیانات ہوئے اور حضور حافظِ ملت علیہ الرحمہ کی جہد مسلسل کے نورانی تذکروں سے سامعین کے قلوب و اذہان منور ہو گئے۔ جہاں مولانا ایذان عزیز مراد آبادی نے حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے اخلاق و کردار کی عظمتوں پر روشنی ڈالی، وہیں ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی اسسٹنٹ پروفیسر مولانا مظہر الحق یونیورسٹی پٹنہ نے جامعہ اشرفیہ کے علمی عظمتوں کا خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے بڑے واشگاف لفظوں میں فرمایا کہ آج برصغیر ہندو پاک میں جب کوئی شخص ”اشرفیہ“ بولتا ہے تو اس سے الجامعۃ الاشرفیہ سمجھا جاتا ہے ورنہ تو اشرفیہ کا نام ایک اشرفی بزرگ کے نام پر رکھا گیا تھا یہ اس کی امتیازی شان ہے۔ مولانا فاروق حسین مصباحی جموں و

کشمیر نے تاریخی حقائق کی روشنی میں ہند و پاک کے علما و مشائخ کی قربانیوں کا تذکرہ بڑے خوب صورت انداز میں کیا ، انھوں نے کہا کہ حافظ ملت کے تین عظیم الشام کارنامے ہیں، پہلا: الجامعۃ الاشرفیہ کی تعمیر، دوسرا: افراد سازی اور تیسرا: عزیز ملت جیسا قائد و سربراہ تیار کرنا۔ مولانا توصیف رضا مصباحی سنبھلی نے موجودہ حالات کے تناظر میں ایجوکیشن اور حافظ ملت کے مشن کو عام کرنے کی تلقین کی ۔ مولانا قاری شرف الدین مصباحی ممبئی ، مولانا وقار احمد عزیزی بھیونڈی ، مولانا محمد نورانی اشرف لکھنو، مولانا جنید احمد مصباحی البرکات علی گڑھ کے بھی مفید خطابات ہوئے، مولانا حامد رضا متعلم جامعہ اشرفیہ نے بھی انگریزی میں تقریر کی۔ یکے بعد دیگرے کثیر تعداد میں مداحان نے نعت و منقبت کے نذرانے بھی پیش کیے۔اس موقع پر نبیرۂ حضور حافظ ملت مولانا محمد نعیم الدین عزیزی نے 50 سالوں سے زائرین عرس کی مہمان نوازی کے لیے اپنی خدمات پیش کرنے والے قصبے کے احباب کو سرٹیفکیٹ اور شال دے کر حوصلہ افزائی کی۔

ہر سال کثیر تعداد میں فارغین اشرفیہ اپنی دستار بندی کے موقع پر اپنی تالیفات اور بزرگوں کی تصنیفات کی اشاعت کرتے ہیں، امسال عرس کی پہلی شب فارغین اشرفیہ اور دیگر مصنفین کی 32 کتابوں کا اجرا حضرت مفتی بدر عالم مصباحی صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ اور مولانا ساجد علی مصباحی استاذ جامعہ نے مشترکہ طور پر کیا۔ اجلاس کے اخیر میں حضرت سربراہ اعلیٰ نے ناصحانہ کلمات ارشاد فرمائے، تقریباً ایک بجے شب میں صلوۃ و سلام پر یہ مجلس اختتام پذیر ہوئی۔

پہلے اجلاس کے اہم شرکا میں مذکورہ شخصیات کے علاوہ حضرت مولانا عبد المبین نعمانی چریا کوٹ، مفتی محمد نظام الدین رضوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ، مفتی محمد عثمان رضوی نیپال، مولانا مسعود احمد برکاتی، مولانا نفیس احمد مصباحی، مولانا اختر کمال قادری، مولانا محمد صدر الوری قادری، مفتی نسیم احمد مصباحی، مفتی زاہد علی سلامی، ڈاکٹر محمد ابراہیم مصباحی، مولانا

محمد ہارون مصباحی، مولانا حبیب اللہ بیگ ازہری، مفتی سید صابر علی مصباحی، مولانا غلام نبی مصباحی، قاری نور الہدیٰ مصباحی، مولانا محمد اسلم مصباحی، مولانا ارشاد احمد مصباحی، مولانا توفیق احسن برکاتی، مولانا جنید احمد مصباحی، مولانا قاری ضیا نور مصباحی، مولانا محمد رضا قادری، قاری نور الحق قادری، قاری محمد ابوذر قادری، قاری عبدالرحمن مصباحی، قاری اشہر عزیزی، مولانا جمیل اختر مبارک پوری و دیگر علما و مشائخ موجود تھے۔

پچاسویں عرس عزیزی کا آخری جلسہ تین دسمبر بروز منگل بعد نماز عشا قاری محمد غفران اعظمی جمشید پور کی تلاوت قران سے شروع ہوا جس میں ملک اور بیرون ملک سے آئے ہوئے علما اور خطبا نے حافظ ملت، جامعہ اشرفیہ، حالات حاضرہ اور امت مسلمہ کے مسائل پر انتہائی کارآمد گفتگو کی، یہ اجلاس شہزادہ حافظ ملت علامہ شاہ عبد الحفیظ عزیزی سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ کی سرپرستی اور نبیرۂ حافظ ملت مولانا محمد نعیم الدین عزیزی اور مفتی بدر عالم مصباحی پرنسپل اشرفیہ اور مولانا مسعود احمد برکاتی کی نگرانی میں منعقد ہوا۔ مولانا عطاء المصطفیٰ قادری، مولانا احمد رضا کلکتہ، مولانا ڈاکٹر مصور رضا پورنیہ، مولانا خالد ایوب مصباحی راجستھان، مولانا علاؤالدین خنجر گیاوی، مفتی منظور احمد عزیزی، مولانا ضیاء الحسنین خیر آبادی، مولانا محمد شمیم رضا ساؤتھ افریقہ، مولانا شاہنواز مصباحی ازہری، پرتاپ گڑھ، مفتی شفیق الرحمان عزیزی، اور مولانا عبید اللہ خان اعظمی کی گراں قدر خطابات ہوئے۔ قاری نسیم اعظمی، خورشید ساحل مدن پوری، قاسم ندیمی بھدوہی اور مولانا فیروز دیناج پوری وغیرہم نے نعت و منقبت کے نذرانے پیش کیے۔ قل شریف سے قبل نبیرۂ حافظ ملت مولانا محمد نعیم الدین عزیزی نے اپنے خطاب میں جامعہ اشرفیہ کے لیے حافظ ملت، عزیز ملت اور اہل مبارک پور کی قربانیوں اور انتھک کوششوں کا والہانہ تذکرہ کیا اور لوگوں سے اپیل کی کہ اپنے مدارس کو مضبوط کریں۔ انھوں نے تنظیم ابنائے اشرفیہ کی جانب سے دو ممتاز علما کو حافظ ملت ایوارڈ دینے کا اعلان کیا اور حضرت سربراہ اعلیٰ کے ہاتھوں معتمد حافظ ملت علامہ نصیر الدین عزیزی سابق استاذ اشرفیہ اور مولانا

سراج احمد مصباحی امریکہ کو یہ ایوارڈ اور سپاس نامہ دیا گیا، ہم ذیل میں دونوں سپاس ناموں کے متن پیش کرتے ہیں:

سپاس نامہ حافظ ملت ایوارڈ

بخدمت گرامی نصیر ملت حضرت مولانا **نصیر الدین عزیزی** مصباحی بانی دار العلوم قادریہ نوریہ دودھی وسابق استاذ جامعہ اشرفیہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم* حامدا و مصلیا و مسلما

محترم حضرات! اس وقت ہم اور آپ جلالۃ العلم حضور حافظ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی ثم مبارک پوری علیہ الرحمۃ والرضوان کے عرس زریں کے مبارک و مسعود موقع پر فیضان عزیزی کی بہاروں سے سرشار ہو رہے ہیں۔ فرزندان اشرفیہ کی تحریک تنظیم ابنائے اشرفیہ، جامعہ اشرفیہ مبارک پور اپنی سابقہ روایت کے مطابق جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے سابق موقر استاذ نصیر ملت حضرت مولانا نصیر الدین عزیزی مصباحی کی خدمت میں ان کی تدریسی و تعلیمی، تبلیغی و دعوتی خدمات کے اعتراف میں حافظ ملت ایوارڈ تفویض کر رہی ہے۔

موصوف کی ولادت باسعادت ایک تخمینے کے مطابق 1949ء میں صوبہ بہار کے مشہور و معروف ضلع گڑھوا کی ٹائی ڈیری نامی گاؤں میں ہوئی، حضرت کے والد ماجد ذاکر حسین مرحوم کا شمار گاؤں کے زمیندار اور معززین میں ہوتا تھا۔ مولانا موصوف نے مقامی مکتب میں ناظرۂ قرآن کریم اور اردو کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد نگر اونٹاری کے اسکول میں داخلہ لیا اور وہاں درجہ پنجم و ششم کی تعلیم حاصل کی پھر بڑے والد الحاج قدرت علی مرحوم نے مدرسہ عین العلوم گیا بہار میں ان کا داخلہ کرایا۔ وہاں حضرت مولانا تجمل ہدیٰ رحمہ اللہ اور دیگر اساتذۂ کرام سے اعدادیہ تا اولی تعلیم حاصل کی۔

1962ء میں صوبہ بہار کی مشہور و معروف خانقاہ آستانہ بیت الانوار کے سجادہ نشین علامہ سراج الہدیٰ مصباحی گیاوی علیہ الرحمہ نے استاذ العلما جلالۃ العلم ابوالفیض سید ناسرکار

حافظ ملت علیہ الرحمہ سے درخواست فرما کر ملک کی عظیم ترین درس گاہ جامعہ اشرفیہ میں آپ کو داخل کرایا۔ تقریباً نو سال تک جامعہ اشرفیہ کے مؤقر اور بافیض صاحبان علم و فضل، بالخصوص حضور حافظ ملت، نائب حافظ ملت علامہ حافظ عبدالرؤف بلیاوی، بحرالعلوم علامہ مفتی عبد المنان اعظمی، علامہ محمد شفیع احمد اعظمی اور پیر طریقت الحاج علامہ سید حامد اشرف اشرفی علیہم الرحمۃ والرضوان سے درجۂ ثانیہ تا فضیلت اور تخصص فی المعقولات کی تعلیم حاصل کی اور 1971ء میں علماو مشائخ کے مقدس ہاتھوں دستار و سند عطا ہوئی۔

فراغت کے بعد درس و تدریس کو اپنا مشغلہ بنالیا اور مدرسہ شمس العلوم گھوسی میں بحیثیت صدر المدرسین تشریف لے گئے اور تقریباً چھ ماہ اس عہدے پر فائز رہ کر خدمت انجام دی پھر حضور حافظ ملت قدس سرہ العزیز کے ایک اور حکم پر ملک کی عظیم دینی و مرکزی درس گاہ جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں بحیثیت مدرس آپ کا تقرر ہوا جہاں آپ نے تقریبا 45 سالوں تک مسند تدریس پر متمکن رہ کر طالبان علوم نبویہ کو فیضیاب کیا۔ 1986ء میں سون بھدر یوپی کی سرزمین پر جامعہ قادریہ نوریہ اور کلیۃ البنات اور دارالقضا قائم کیا۔

جلالۃ العلم حضور حافظ ملت قدس سرہ کے دست حق پرست پر بیعت ہوئے حضور حافظ ملت نے آپ کو مختلف اعمال و وظائف اور تعویذات کی اجازت بھی عطا فرمائی۔ اس وقت دعوت و تبلیغ، ارشاد وہدایت کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ موصوف کی انہی خدمات کے اعتراف میں تنظیم ابنائے اشرفیہ آپ کو حافظ ملت ایوارڈ تفویض کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی جملہ خدمات کو قبولیت سے سرفراز فرمائے اور آپ کو درازی عمر بالخیر عطا فرمائے۔ آمین

بموقع عرس عزیزی	عبدالحفیظ عفی عنہ
یکم جمادی الآخرہ 1446ھ	سرپرست تنظیم ابنائے اشرفیہ
3 دسمبر 2024ء بروز منگل	وسربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

سپاس نامہ حافظ ملت ایوارڈ

بخدمت فاضل اشرفیہ حضرت مولانا حافظ **سراج احمد مصباحی**، خطیب و امام مدینہ مسجد ٹیکساس، یو ایس اے

بسم اللہ الرحمن الرحیم* حامدا و مصلیا و مسلما

انتہائی مسرت و شادمانی کا مقام ہے کہ امسال پچاسویں عرس حضور حافظ ملت (جشن زریں) کے پر بہار موقع پر تنظیم ابنائے اشرفیہ، مبارک پور جن دو اہم شخصیات کو حافظ ملت ایوارڈ تفویض کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے اُن میں ایک نام عزیز گرامی مولانا حافظ سراج احمد بستوی مصباحی کا ہے۔

مولانا حافظ سراج احمد بستوی مصباحی کی پیدائش 5 اپریل 1974ء میں یوپی کے ضلع بستی (موجودہ سنت کبیر نگر) کے ایک گاؤں سواں بازار پوسٹ ہٹوا میں ہوئی۔ گھر کا ماحول دینی تھا جس کا اثر آپ کی پوری زندگی پر مرتب ہوا، شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی دینی تعلیم کے حصول کے لیے آپ کا داخلہ گاؤں کے ایک مدرسہ صدر العلوم میں ہوا، جہاں پرائمری درجات اور حفظ قرآن مجید سے درجہ اولیٰ تک کی تعلیم مکمل کی، پھر اعلیٰ تعلیم کے۔ لیے ملک کی عظیم علمی دانش گاہ مرکز علم و فن آبروے اہل سنت الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور میں داخلہ لیا اور ثانیہ سے دورۂ حدیث تک نہایت جاں فشانی اور عرق ریزی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1995ء میں عرس حضور حافظ ملت کے مبارک موقع پر علما و مشائخ کے ہاتھوں دستار فضیلت سے نوازے گئے۔

فراغت کے بعد سب سے پہلے شہر اناؤ کے معروف و مشہور ادارہ دار العلوم فیض عام میں بحیثیت صدر المدرسین جنوری 1996ء سے 1997ء تک خدمات انجام دیں۔ شہر اناؤ میں قیام کے دوران دار العلوم کے جونیئر ہائی اسکول کے شعبہ انگریزی سے بھی منسلک رہے۔ 1997ء میں آپ کا تقرر عروس البلاد ممبئی میں دار العلوم ضیاء القرآن میں ہوا اور وہیں سنی

رضوی ہری مسجد کرلا گارڈن میں بحیثیت خطیب و امام بھی منتخب ہوئے، کچھ دنوں بعد ممبئی کے معروف ادارہ دار العلوم محبوب سبحانی سے منسلک ہوئے جہاں جماعت رابعہ سے لے کر دورہ حدیث تک کی کتابیں آپ کے زیر تدریس آئیں۔

3 مئی 2003ء میں فجی، مسجد سان فرانسکو (San Francisco) گئے اور پھر 2004ء میں وہاں سے مدینہ مسجد آف کیرلٹن ٹیکساس (Madinah Masjid of Carrolton Texas) گئے۔ آپ ایک عمدہ خطیب، مدرس اور داعی و مبلغ ہیں۔ آپ کے خطابات انگریزی اور اردو زبان میں یکساں ہوتے ہیں اور بڑی دل چسپی سے سنے جاتے ہیں۔

امریکہ میں امامت و خطابت کے علاوہ آپ کی مصروفیات میں دو شنبہ سے جمعرات تک بچوں کو دینی تعلیم دینا، یک شنبہ کو اسلامک اسکول کا نظم و نسق دیکھنا، ہفتہ سے بدھ تک بعد نماز مغرب درس حدیث دینا ہے۔

ہر جمعہ کو بذریعہ ایف ایم ریڈیو مدینہ مسجد سے آپ کا پروگرام بنام ''ہمارا اسلام'' نشر کیا جاتا ہے جس سے بیک وقت ہزاروں لوگ مستفید ہوتے ہیں۔ آپ مختلف ذرائع سے موصول ہونے والے اسلامی سوالات کے تشفی بخش جوابات بھی عنایت فرماتے ہیں۔

آپ کی انھی عظیم دینی سماجی اور تبلیغی خدمات کے اعتراف میں ''تنظیم ابنائے اشرفیہ'' حافظ ملت ایوارڈ پیش کر رہی ہے۔ رب کریم کی بارگاہ میں دعا ہے کہ آپ کی خدمات جلیلہ کو شرف قبول عطا فرمائے، صحت و سلامتی کے ساتھ درازی عمر کی برکات سے نوازے اور تا عمر دین متین کی نشر و اشاعت کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین بجاہ النبی الامین الکریم علیہ الصلوات والتسلیم۔

بموقع عرس عزیزی
یکم جمادی الآخرہ 1446ھ
3 دسمبر 2024ء بروز منگل

عبد الحفیظ عفی عنہ
سرپرست تنظیم ابنائے اشرفیہ
و سربراہ اعلیٰ الجامعۃ الاشرفیہ

سات فاضلین ومعاونین کو بھی اشرفیہ ایوارڈ اور اعترافیہ پیش کیا گیا۔ دو درجن کے قریب علما و مصباحی برادران کی خدمت میں شال اور پچاسویں عرس پر خاص طور پر تیار کیا گیا چاندی کا سکہ بطور یادگار پیش کیا گیا، گیارہ بج کر پچپن منٹ پر قل شریف کی روحانی تقریب منعقد ہوئی اور جانشین حضور حافظ ملت حضرت سربراہِ اعلیٰ صاحب قبلہ نے رقت انگیز دعائیں کیں۔

اس اجلاس میں بھی کئی اہم کتابوں کی رسم اجرا عمل میں آئی بطور خاص مولانا اختر حسین فیضی کی مرتبہ جہان حافظ ملت کی دو جلدیں، مولانا افتخار ندیم کی مرتبہ ڈاکٹر محمد شکیل اعظمی شخصیت اور فن اور 50ویں عرس پر بطور خاص منظر عام پہ آنے والی کتاب حافظ ملت اور جانشین حافظ ملت قابل ذکر ہیں۔ اسی اجلاس میں جامعہ اشرفیہ کے مختلف شعبوں سے فارغ ہونے والے چھ سوانیس طلبہ کو سند و دستار سے نوازا گیا، جن میں 286 کو دستار و سند دی گئی اور بقیہ کو صرف سند سے نوازا گیا، فارغین کی اجمالی فہرست حسب ذیل ہے:

تحقیق فی الحدیث	8	
تحقیق فی الفقہ	8	
تحقیق فی الادب	7	
فضیلت	175	
فضیلت خصوصی	66	
حفظ	22	
میزان	286	ان کو دستار دی گئی
مولوی و قاری (روایت حفظ)	175	
عالم	158	
میزان	333	انھیں صرف سند دی گئی
کل فارغین کی تعداد	619	

اخیر میں حضرت سربراہ اعلیٰ جامعہ اشرفیہ نے اپنے مختصر خطاب میں تمام علما، مشائخ اور زائرین کا شکریہ ادا کیا اور ناصحانہ کلمات ارشاد فرمائے۔ دونوں شب اجلاس کی نظامت مولانا محمد قیصر اعظمی نے کی۔ اہم شرکا میں اساتذہ اشرفیہ کے علاوہ مولانا محمد حنیف خان رضوی، بریلی شریف، مفتی عبد المنان کلیمی، مرادآباد، ڈاکٹر غلام یحیی انجم، ڈاکٹر محمد افضل مصباحی، بنارس ہندو یونیورسٹی، مولانا محمد عمر نورانی، مولانا اللہ بخش عزیزی، مولانا فتح احمد بستوی، مولانا محمد طارق مصباحی، مولانا سید ارشد اقبال مصباحی، افریقہ، مولانا سید سیف الدین اصدق مصباحی جمشید پور، قاری محمد ناصر شیری، مولانا فروغ احمد اعظمی، مولانا مختار الحسن بغدادی، قاری اسلام اللہ عزیزی، مفتی محمد حنیف برکاتی قاری رئیس احمد خان، مولانا ملک شبیر احمد مصباحی، مولانا طارق حسین مصباحی اور دیگر علما و مشائخ شریک بزم رہے، تقریباً سوا چار بجے شب میں یہ اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ جنوری 2025ء)

تحریر: 1/ جنوری 2025ء

اکیاون ویں عرس عزیزی کی فکری بازگشت

حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان ایک ایسے جامعِ صفات مرشد تھے جنھوں نے محض ایک درس گاہ قائم نہیں کی، بلکہ امتِ مسلمہ کے فکری تشخص، علمی ارتقا، دینی استقامت اور روحانی بالیدگی کے لیے ہمہ جہتی تحریک کی بنیاد رکھی۔ ان کا طرزِ فکر، علمی بصیرت، اخلاص اور للّٰہیت آج بھی اشرفیہ کی دیواروں میں سانس لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ جامعہ اشرفیہ کی بنیاد دراصل حافظ ملت علیہ الرحمہ کی دوراندیشی، حکمتِ نظر اور امت دوستی کا اظہار تھی۔ یہ ادارہ صرف ایک مدرسہ نہیں بلکہ ایک ایسی روحانی درس گاہ ہے جہاں قرآن وحدیث کی روشنی کے ساتھ عصری شعور اور اخلاقی تربیت کے چراغ بھی روشن و تابندہ نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر میں پھیلے ہوئے اشرفیہ کے فارغین جس خلوص اور وقار کے ساتھ دین کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں وہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کا لگایا ہوا یہ پودا ایک تناور درخت بن چکا ہے۔

حافظِ ملّت کی شخصیت میں وہ جامعیت تھی کہ ایک ماہر استاد، کامل مرشد اور دیانت دار منتظم کی تمام خوبیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے تھی۔ وہ صرف اشرفیہ کے سرپرست و مربّی نہ تھے بلکہ پوری امت مسلمہ کے خیر خواہ تھے۔ ان کے نزدیک علم کا اس وقت مکمل ہوتا ہے جب وہ انسان کے اخلاق اور امت کی بھلائی میں ڈھل جائے، اسی لیے وہ اپنے شاگردوں اور اساتذہ تک محدود نہ رہے، بلکہ عوام الناس کے دکھ درد میں شریک رہنا اُن کی سیرت کا مستقل شعار تھا۔ بقول حضرت مولانا مسعود احمد برکاتی:

”انھیں صرف اشرفیہ کا نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کا بے پناہ خیال تھا“۔

یہی وہ روحانی وسعت تھی جس نے اشرفیہ کو محض ادارہ نہیں بلکہ ایک تحریک اور محض ایک فرد کا نہیں، بلکہ پوری امت کا سرمایہ بنا دیا۔ حافظِ ملّت نے جب اس درس گاہ کی بنیاد رکھی تو دراصل ایک ایسی تحریک کی بنیاد رکھی جس کا مقصد علمِ نافع، اخلاقِ صالحہ اور روحانی حکمت کی نئی راہیں کھولنا تھا۔

حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ نے اپنے وصال سے پہلے اپنی روحانی و علمی امانت اپنے لائق فرزند حضرت عزیز ملت علامہ عبدالحفیظ عزیزی کے سپرد کی۔ حضور عزیز ملت نے نہ صرف اپنے والد گرامی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا بلکہ نئے شعبہ جات کا اضافہ کرکے اشرفیہ کے افق کو مزید وسیع کیا۔ ان کے دور میں اشرفیہ کی تعلیمی خدمات مزید ہمہ گیر اور مؤثر ہوئیں، اور جامعہ اشرفیہ ایک بین الاقوامی مرکزِ تعلیم و تربیت بن کر ابھرا۔ عصر حاضر کی متعدّد معروف یونیورسٹیوں میں جہاں جدید علوم کے مختلف شعبے قائم ہیں، وہیں اشرفیہ کا امتیاز یہ ہے کہ یہاں کے شعبہ جات خالص دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت، تحقیق، افتا اور تبلیغ کے وسیع میدانوں میں کام کررہے ہیں۔ مختصر یہ کہ اشرفیہ کا نظم، اساتذہ کی دیانت داری، اور طلبہ کی اخلاقی و علمی تربیت ایک ایسا حسین امتزاج ہے جو اسے محض ایک ادارہ نہیں بلکہ ایک ”مدرسۂ اعتدال“ بناتا ہے۔ اشرفیہ کی ترقی، اس کی خاموشی میں چھپا ہوا وہ پیغام ہے جو علم کے وقار اور خدمت کی بلندی کو بیان کرتا ہے۔ بے شک اشرفیہ عظیم ہے مگر اس لیے عظیم نہیں کہ اس کے پاس عمارتیں یا انتظامی شعبہ جات ہیں، بلکہ اس لیے عظیم ہے کہ اس کے ہر شعبے میں اخلاص کی وہ تاب ناکی ہے جسے حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان نے اپنے کردار سے ثابت کیا۔

حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی ذات و صفات کو یاد کرنے اور ان کی بارگاہ میں عقیدتوں کی نذر پیش کرنے کے لیے 22، 23 نومبر 2025 کو جامعہ اشرفیہ مبارک پور میں حضرت جلالۃ العلم علیہ الرحمہ کے اکیاونویں عرسِ مبارک اور دو روزہ اجلاسِ عام کا انعقاد نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ہوا۔ دونوں شب کے وسیع اجتماعات میں علما، فضلا، مشائخ،

مختلف خانقاہوں کے سجادگان، سیاسی و سماجی شخصیات اور ہزاروں زائرین نے شرکت کی۔ پورا کیمپس روحانیت، نظم وضبط اور علمی جاہ وجلال کا حسین امتزاج پیش کر رہا تھا۔

پہلی شب کا اجلاس 22نومبر2025بعد نمازِ عشا جامعہ اشرفیہ کے وسیع و عریض صحن میں منعقد ہوا۔ مسندِ صدارت پر مفتی بدر عالم مصباحی (صدر المدرسین جامعہ اشرفیہ) متمکن تھے، جب کہ شہزادۂ حافظ ملت علامہ شاہ عبدالحفیظ عزیزی دام ظلہ العالی حسبِ سابق اپنے تمام تر روحانی جلال و جمال کے ساتھ اس تقریب کی سربراہی فرما رہے تھے، اور نبیرۂ حضور حافظ ملت مولانا محمد نعیم الدین عزیزی بحیثیت نگراں تشریف فرما تھے۔ سب سے پہلے قاری محمد معاذ مبارک پوری نے پُرسوز لب و لہجے میں کلامِ ربانی کی تلاوت سے دلوں میں گداز پیدا فرمایا۔ تلاوت کے بعد نبیرۂ سرکار مجلیٰ مفتی محمد احسن رضا رحمانی نے حافظِ ملت اور اشرفیہ کی خدمات کا جامع تذکرہ کیا۔ آپ نے فرمایا:

> "حافظِ ملت علامہ شاہ عبدالعزیز محدث مرادآبادی علیہ الرحمہ نے اشرفیہ جیسی عظیم دانش گاہ قائم فرما کر امتِ مسلمہ پر بڑا احسان کیا ہے۔ دنیا کی مشہور یونیورسٹیوں کے شعبوں کی اپنی اہمیت ہے لیکن الجامعۃ الاشرفیہ کے مختلف شعبہ جات کتنے اہم اور افادیت سے بھرپور ہیں اس کا اندازہ ان شعبوں کے فارغین سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ یہ اس درس گاہ کی عظمت ہے۔ اشرفیہ کے اساتذہ و منتظمین حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کے اس قول پر قائم ہیں کہ 'ہر مخالفت کا جواب کام ہے'۔ ورنہ وہ ہر مخالفت کا جواب اپنی زبان و قلم سے دینے کی اہلیت رکھتے ہیں لیکن ان کا خاموش کردار ان کے علمی و تعلیمی کاموں کو اہم بناتا ہے۔"

رحمانی صاحب کے خطاب کے بعد اشرفیہ کے نمایاں اساتذہ و نعت خوانوں نے یکے بعد دیگرے نعت و مناقت کے نذرانے پیش کیے۔ نعت خوانوں میں بالخصوص محمد صفقتین رضا، ساجد رضا زنگی پوری، مولانا حیدر رضا برکاتی، مولانا منظر حسین نیپالی، معراج زمن ادروی، فیضان رضا، قاری محمد جابر مبارک پوری، سفیان نوری، دانش ندیم، محمد یعقوب بریلوی، محمد عادل مصباحی، فرقان رضا، حافظ شہباز رضا مصباحی، تبریز اکرم اعظمی، حافظ محمد عاصم اعظمی اور حافظ عبدالوکیل چھپراوی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

جامعہ اشرفیہ کے قابلِ فخر طلبہ حافظ محمد انس، مولوی محمد سیف، مولانا فیضان رضا، مولانا نعمان ازہر سنبھلی اور مولانا محمد افضل نے مختلف علمی و سماجی موضوعات پر مدلل خطابات کیے۔ ان کے علاوہ مولانا دلکش ضیائی، مولانا محمد اذعان مصباحی مرادآباد، مولانا کمال مصطفیٰ ازہری رچھا بریلی، مفتی شہنواز عالم مصباحی ازہری کوشامبی، مولانا محمد عاقل مصباحی مرادآباد، مولانا قاری محمد شرف الدین مصباحی ممبئی، مولانا وقار احمد عزیزی بھیونڈی وغیرہ کے بھی ایمان افروز بیانات ہوئے۔

پہلی شب کے اجلاس میں ہی حضرت سربراہِ اعلیٰ دام ظلہ کے مبارک ہاتھوں سے فارغین و مصنفین کی **تقریباً پچاس کتابوں** کا اجرا عمل میں آیا۔ اجلاس کا اختتام حضرت جانشینِ حافظ ملت کے مشفقانہ اور دعائیہ کلمات پر ہوا۔

دوسری شب کا اجلاس 23 نومبر 2025 کو بعد نمازِ عشا منعقد ہوا۔ تلاوت قاری صفقتین رضا نے کی اور نوری میاں بنارسی نے حمد پیش کی، اس کے بعد متعدّد نعت خوانوں اور خطبا نے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کیا۔

مولانا محمد ہاشم کانپوری نے مسلمانوں، خصوصًا خواتین کے لیے نصیحت آمیز خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”مسلمان صبر و ضبط اور حکمت سے کام لے اور

اپنے دین پر مضبوطی سے قائم رہے۔ مسلم بیٹیاں اسلام
کے احسانات کو یاد کریں، جو عزت و وقار اور وراثت کا حق
دین اسلام نے انھیں دیا ہے اسے سمجھیں اور اسلام دشمن
طاقتوں کے جال میں نہ پھنسیں، ورنہ دین بھی ہاتھ سے
جائے گا اور دنیا کی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔“

آپ نے مزید فرمایا:

”ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرام
کی پاکیزہ زندگی سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ ان شاء اللہ
خوشی اور خوش حالی کا سورج ضرور طلوع ہوگا اور اسلام
کے ماننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔“

حضرت مولانا محمد ہاشم کانپوری کے علاوہ مولانا شکیل احمد مصباحی مدھوبنی، مولانا جنید احمد مصباحی کانپوری، مولانا محمد حسن نوری گونڈوی، مولانا خالد ایوب مصباحی (راجستھان)، مفتی منظور احمد عزیزی (سلطان پور)، مولانا اللہ بخش عزیزی (راجستھان)، مفتی عبد المنان کلیمی (مرادآباد)، مولانا حافظ عبید اللہ خان اعظمی وغیرہ کے بھی خطابات ہوئے۔

11 بج کر 55 منٹ پر قل شریف کے وقت یوں محسوس ہوا جیسے ایک صدی کا فیضان ایک شب میں سمٹ آیا ہو، اور پھر اپنے سفر پر روانہ ہو کر سینکڑوں دلوں میں وہ روشنی چھوڑ گیا ہو جو آنے والی نسلوں کو منزل تک پہنچائے گی۔

مولانا محمد نعیم الدین عزیزی نے اکیاون ویں عرس میں تشریف لانے والے خانقاہوں کے سجادگان کا مختصر مگر جذباتی تعارف پیش کیا اور اشرفیہ کے ساتھ ان خانقاہوں کے گہرے روابط کا انکشاف کیا۔ بعد ازاں حسبِ سابق اہل سنت و جماعت کی دو اہم ترین شخصیات (1) حضرت سید شاہ نجیب حیدر نوری مارہروی قبلہ اور (2) حضرت مفتی احمد

القادری مصباحی (امریکہ) کی بارگاہوں میں حافظ ملت ایوارڈ اور سپاس نامے پیش کیے گئے۔ الجامعۃ الاشرفیہ اور اہل سنت و جماعت کے لیے ہمہ دَم سینہ سپر پانچ اہم شخصیات؛ **مولانا ملک** شبیر مصباحی، مولانا قاری شرف الدین مصباحی، مولانا وقار احمد عزیزی، الحاج محمد شہنشاہ صاحب اور الحاج ریاض احمد صاحب کی خدمت میں "اشرفیہ ایوارڈ" پیش کیا گیا۔ اجلاس کے آخری حصے میں تین بزرگ سجادگان نے اپنے قیمتی تاثرات پیش کیے:

حضرت مولانا **سید اویس میاں واسطی بلگرامی** صاحب قبلہ نے فرمایا:

"اشرفیہ اہل سنت کی ناک ہے، میرا پورا خاندان اشرفیہ کے ساتھ ہے۔"

حضرت سید نجیب حیدر میاں مارہروی اطال اللہ عمرہ نے فرمایا:

"اشرفیہ تمام مدرسوں کا سردار ہے اور تمام برکاتی اشرفیہ کے لیے خون دینے کو تیار ہیں۔"

حضرت مولانا منان رضا خان بریلوی زَادَہُ اللہُ عِلماً نے فرمایا:

"ہم اشرفیہ کی نظیر نہیں پیش کر سکتے، اشرفیہ سنیت کی جان ہے۔"

جلسہ کے اخیر میں مختلف شعبوں کے فارغین کی دستار بندی کی گئی۔ **اس سال مجموعی فارغین کی تعداد 711** رہی، جن میں **314 کو سند و دستار** اور **397 کو صرف سند** عطا کی گئی۔ یہی وہ فیضانِ عزیزی ہے، یہی وہ وراثتِ حافظِ ملت ہے، اور یہی وہ روحانی روشنی ہے جس سے اشرفیہ آج بھی پوری دنیا کو روشن کر رہا ہے۔

تقریباً سوا چار بجے حضرت سربراہِ اعلیٰ کے دعا پر یہ عظیم الشان اجلاس اختتام پذیر ہوا۔ جامعہ اشرفیہ کی انتظامیہ، عرس کمیٹی، مجلسِ خیر خواہ، پولیس فورس اور مختلف تنظیموں نے امن، نظام اور وقار کا بہترین نمونہ پیش کیا۔

اصل میں **عرسِ عزیزی** محض ایک سالانہ تقریب نہیں، بلکہ روحانیت، علم، نسبت اور وفاداری کا ایسا ہمہ گیر اجتماع تھا جس نے ایک بار پھر ثابت کر دیا کہ حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کی علمی و روحانی وراثت آج بھی لاکھوں دلوں کی دھڑکن ہے۔ دو روزہ اجلاس کا ہر

لمحہ عقیدت، ہر خطاب بصیرت، ہر نعت سُرور، اور ہر دعا ایک تازہ روحانی برسات میں شرابور۔ اشرفیہ کا یہ منظر اس حقیقت کی گواہی دے رہا تھا کہ یہ درس گاہ محض ماضی کی یاد نہیں، بلکہ حال کی توانائی اور مستقبل کی امید ہے۔ یقیناً یہ عرسِ مبارک آنے والی نسلوں کے لیے بھی ایمان، اعتدال، خدمت اور اخلاص کی ایسی روشن علامت ثابت ہوگا جس کی ضیا سے علمی قافلے ہمیشہ منور رہیں گے۔

(اداریہ ماہ نامہ اشرفیہ جنوری 2026ء)
(تحریر نومبر 2025ء)

سپاس نامہ

بخدمت

حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی المصباحی دامت برکاتہم القدسیہ

سابق صدر المدرسین وصدر شعبۂ افتا الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور

صدر انجمن اہل سنت واشرفی دار المطالعہ، مبارک پور، اعظم گڑھ

الحمد للہ ربّ العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین، وعلی آلہ و أصحابہ اجمعین!

یہ محفلِ سپاس گویا ایک گلشن ہے، جہاں ہر پھول اپنی خوشبو کے ساتھ حضرتِ والا، عالی مرتبت حضرت علامہ مفتی محمد نظام الدین رضوی کی خدمات کو سلام کر رہا ہے۔ یہ بزمِ خلوص دراصل ایک آئینہ ہے، جس میں اہلِ علم اپنی عقیدت کے عکس دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ انجمنِ ارادت ایک چراغاں ہے، جو حضرت کے علم و فضل کی قندیلوں سے منور ہے۔

حضرتِ والا! آپ وہ چراغ ہیں جس کی لو نہ صرف اپنے عہد کے اندھیروں کو کاٹتی ہے بلکہ آنے والی صدیوں کے مسافروں کے لیے بھی روشنی کی نوید بن جاتی ہے۔ آپ وہ بارش ہیں جو بنجر دلوں پر برستی ہے اور انہیں گلزارِ علم و عرفان بنا دیتی ہے، آپ وہ ستارہ ہیں جو آسمانِ اہل سنت پر جگمگا کر اہلِ حق کو راستہ دکھاتا ہے۔

ہم سپاس گزار ہیں کہ ربّ کریم نے ہمیں ایسے دور میں زندگی عطا کی جس میں ہمیں آپ جیسی نابغہ روزگار ہستی کی زیارت وصحبت نصیب ہوئی۔ آپ کے قلم کی روشنائی گویا کوثر کا پانی ہے جو تشنگانِ علم کے دل و دماغ کو سیراب کرتا ہے۔ آپ کی زبانِ حق گویا صاعقۂ ربانی ہے جو باطل کے ایوانوں میں لرزہ بر اندام کر دیتی ہے، آپ کی بصیرت وہ آفتاب عالم تاب ہے جس کی کرنوں سے اہلِ حق کو روشنی ملتی ہے اور گمراہ فرقوں کے شبستانوں میں اندھیرا چھا جاتا ہے۔

حضرت والا ! آپ کے فتاویٰ صرف کاغذ پر لکھی تحریریں نہیں بلکہ اہلِ سنت کے ایمان کی حفاظت کرنے والی فصیلیں ہیں۔ آپ کی تقاریر محض الفاظ کا تسلسل نہیں بلکہ وہ تلواریں ہیں جو باطل کی گردن کاٹتی چلی جاتی ہیں۔ آپ کی تحریریں صرف جملے نہیں بلکہ وہ آبِ حیات ہیں جو مردہ دلوں میں زندگی کی لہریں دوڑادیا کرتے ہیں۔

ہم اپنی عقیدت کے سمندر میں ڈوب کر یہ عرض کرتے ہیں کہ آپ کی ذات میں ہمیں فکرِ احمد رضا کی خوشبو ملتی ہے، حافظِ ملت کی للکار سنائی دیتی ہے، اور صدر الشریعہ کی فقہی بصیرت کا عکس نظر آتا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ ساری تجلیات ایک ہی وجود میں مجتمع ہو کر امت مسلمہ کو منور کر رہی ہیں۔

محترم المقام سراج الفقہاء دام ظلہ ! آپ کی زندگی ہمیں یہ درس دیتی ہے کہ علم محض ورق گردانی کا نام نہیں، بلکہ باطل کے مقابلے میں سینہ سپر ہونے کا حوصلہ ہے۔ آپ کا وجود ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ فقہ محض قوانین کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک زندہ شعور ہے، جو زمانے کے نئے مسائل کو قرآن و سنت کی روشنی میں حل کرتا ہے۔

ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے کہ آپ کی صدارت میں انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مسلسل ارتقائی سفر پر گامزن ہے۔ یہ ادارہ آپ کے اخلاص، حکمت اور بصیرت کا پرتو بن کر علم و ادب کی وادیوں میں نئی منزلیں طے کر رہا ہے۔ آج اس انجمن کے قدم جس استقامت سے بڑھ رہے ہیں، وہ گویا آپ کی قیادت کے فیضان اور آپ کی نگاہِ تربیت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔

1500 ویں عید میلاد النبی ﷺ اور انجمن کے 92ر جلسہ و جلوس کے روح پرور موقع پر یہ محفلِ سپاس آپ کے سامنے اپنی عقیدت کے پھول نچھاور کرتی ہے۔ ہم سب کی دعائیں آپ کے گرد ایک حصار کی مانند ہیں۔ ہم سب کے دل آپ کی خدمتِ دین پر نازاں ہیں۔ انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ آپ کی کی مشقتوں کی قرض دار اور شبانہ روز کاوشوں

کی امین ہے، اور ہمارا یہ دل آپ کی دعاؤں کا محتاج ہے۔آخر میں ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکتیں عطا کرے، آپ کے علم و قلم کے فیضان کو تاقیامت جاری رکھے، اور آپ کی ذات کو ہمیشہ اہلِ سنت و جماعت کے لیے سایۂ رحمت بنائے۔آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم۔

28/ اگست 2025ء

سپاس نامہ

بخدمت

حضرت مولانا نعیم الدین عزیزی دامت برکاتہم العالیہ

الْـحَمْدُ للهِ الْكَرِيمِ الْوَهَّابِ، الَّذِي جَعَلَ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةَ الْأَنْبِيَاءِ، وَفَضَّلَهُمْ عَلَى ٱلْعَالَمِينَ بِفَضَائِلَ لَا تُحْصَىٰ وَلَا تُعَدُّ، وَالصَّلَاةُ وَٱلسَّلَامُ عَلَىٰ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَيْرِ مَنْ عَلَّمَ وَوَجَّهَ وَأَرْشَدَ، وَبَارَكَ عَلَىٰ آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

حضرت مولانا نعیم الدین عزیزی صاحب قبلہ! جہانِ اہل سنت و جماعت کے لیے یقیناً آپ کوئی عام شخصیت نہیں بلکہ آپ تو اس خانوادے کے درخشندہ گوہر ہیں جس نے برصغیر کی علمی و روحانی فضاؤں کو منور و تابناک کیا۔ آپ کی رگوں میں جلالۃ العلم حضور حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان کا خون گردش کر رہا ہے، وہی حافظ ملت جن کی للکار نے ملت کو حوصلہ عطا کیا، جن کی بصیرت نے اشرفیہ کی بنیادوں کو جلا بخشی، اور جن کے فیضان سے نہ جانے کتنی نسلیں نورِ ایمان سے سرفراز ہوئیں۔ آپ حضرت عزیز ملت علامہ عبد الحفیظ عزیزی مصباحی دام ظلہ کے فرزندِ رشید ہیں۔ آپ کی ولدِ گرامی کی قیادت نے جامعہ اشرفیہ کو بقا اور ارتقا کی راہوں پر گذشتہ نصف صدی سے بحسن و خوبی گامزن رکھا ہے اور حافظِ ملت کی وراثت کو اوجِ ثریا تک پہنچانے کے لیے مسلسل کوشاں ہیں۔ گویا آپ کی رگوں میں علم، تقویٰ، اور اخلاص کا وہ خون دوڑ رہا ہے جو صدیوں تک اہلِ سنت کے لیے چراغِ ہدایت بنا رہے گا۔

حضرت گرامی! آپ نے ایک طویل مدت سے الجامعۃ الاشرفیہ کے در و دیوار کو اپنی تدریسی خدمات سے مزین کر رکھا ہے۔ آپ کے دروس محض الفاظ کا بیان نہیں بلکہ علم و حکمت کا موج زن سمندر ہیں جس سے تشنگانِ علم سیراب ہوتے ہیں۔ آپ کی زبان سے

نکلنے والا ہر جملہ گویا ایک گوہرِ نایاب ہے، آپ کی ہر تقریر گویا طلبہ کے دلوں پر علم کی مہر ثبت کر دیتی ہے۔ آپ کی شخصیت اس درخت کی مانند ہے جس کی جڑیں علم و تقویٰ کی مٹی میں پیوست ہیں اور جس کی شاخیں شاگردوں کی صورت میں دُنیا بھر میں پھیل رہی ہیں۔ آپ کا درس، شاگردوں کے لیے وہ چراغ ہے جو نہ صرف کتابی معانی واضح کرتا ہے بلکہ زندگی کی راہوں کو بھی روشن کرتا ہے۔

نعیمِ ملت صاحب قبلہ! آپ اپنی خطابت میں بھی منفرد مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی تقریر کسی تیز و تند ندی کی مانند ہے جو دلوں کی زمین کو سیراب کرتی ہے، آپ کے الفاظ کسی شمشیر کی مانند ہیں جو باطل کے پردے چاک کر دیتے ہیں، اور آپ کی نصیحتیں کسی نسیمِ سحر کی مانند ہیں جو دلوں کو سکون اور روحوں کو تازگی بخشتی ہیں۔ آپ کا اندازِ خطابت دل کو جھنجھوڑ دیتا ہے، آنکھوں کو نم کر دیتا ہے، اور سامعین کو اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ کے بیانات صرف کانوں تک نہیں بلکہ روح کی گہرائیوں تک پہنچتے ہیں۔

حضور والا! آپ کی ہمہ جہت زندگے کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اللہ جل شانہ نے آپ کی شخصیت میں کئی اوصاف یکجا کر دیے ہیں:

○ آپ کی ذات میں علمی وراثت کے تقدس جھلک بھی نظر آتی ہے۔

○ آپ کی تدریس میں خلوص اور خدمت قوم و ملت کا رنگ بھی نمایاں ہے۔

○ آپ کے وعظ میں جلالۃ العلم کا جلال اور عزیز ملت کی متانت صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔

○ آپ کے وجود سے اشرفیہ کی فضائیں ہمیشہ معطر رہتی ہیں۔ یقیناً آپ اُس فرمانِ حافظ ملت ”زمین کے اوپر کام، زمین کے نیچے آرام“ کی عملی تصویر ہیں

آج 1500 / ویں عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر ہم ارا کین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ آپ کے حضور عقیدت کے نذرانے

پیش کرتے ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرتِ والا کی عمر میں برکت عطا کرے، آپ کے فیضانِ علم کو تا قیامت جاری و ساری رکھے، آپ یوں ہی صحت و عافیت کے ساتھ عوام اہل سنت و جماعت کی رہنمائی فرماتے رہیں۔ آمین بجاہ سید المرسلین علیہ الصلاۃ والتسلیم۔

28/ اگست 2025ء

نوٹ: منقولہ دونوں سپاس نامے لکھے تو گئے مگر کسی سبب ان حضرات کی خدمت میں پیش نہیں کیے گئے۔

(مہتاب)

سپاس نامہ

بہ خدمتِ گرامی عالیجناب الحاج سلیمان شمسی

الْـحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَفَّقَ عِبَادَهُ الصَّالِحِينَ لِخِدْمَةِ الدِّينِ وَالْقَوْمِ وَالْمِلَّةِ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ خَاتَمِ النَّبِيِّينَ، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

ہم اپنی خوش بختی اور سعادت مندی سمجھتے ہیں کہ آج ہمیں اس موقع پر اپنی زبانِ حال و قال سے ایک ایسے معزز و محترم شخصیت کے حضور سپاس گزاری کا شرف حاصل ہو رہا ہے، جنھیں باشندگانِ مبارک پور "خداترس"، "قوم پرور" اور "ملت نواز" کے القاب سے یاد کرتے ہیں۔

جی ہاں! ہم بات کر رہے ہیں محترم الحاج **سلیمان اختر شمسی صاحب**، پروپرائٹر **زیور محل مبارک پور** کی۔ آپ نہ صرف ایک کامیاب تاجر ہیں بلکہ اپنے ذاتی کردار و عمل سے سماج کے ہر طبقے کے لیے روشنی اور امید کے چراغ ہیں۔ آپ کی شخصیت میں مخلصانہ ایثار، دردِ دل، بے لوث خدمت اور ضرورت مندوں کی دل جوئی کے ایسے اوصاف جھلکتے ہیں جو حقیقی معنوں میں ایک صالح مومن کی پہچان ہیں۔

أَنْتُمْ يَا أَيُّهَا لْمُكَرَّمُ لَا تَزَالُونَ نَاصِرًا لِلضُّعَفَاءِ، مُؤَازِرًا لِلْمَظْلُومِينَ، وَمُعِينًا لِلْمُحْتَاجِينَ۔

مزید برآں، یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ **انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ بورڈ** کے مستقل رکن ہیں۔ آپ کی رکنیت صرف ایک نام کی حیثیت نہیں رکھتی، بلکہ قوم و ملت کی

تعمیر، دین کی سربلندی اور نعتیہ وراثت کے فروغ کے لیے آپ کی سنجیدہ فکر اور عملی تعاون کا زندہ ثبوت ہے۔

ہم 1500/ویں عید میلاد النبی ﷺ اور انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ کے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے موقع پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں، اور دعاگو ہیں:

جَعَلَ اللّٰهُ عُمْرَكُمْ مُمَدَّدًا، وَصِحَّتَكُمْ مُؤَيَّدَةً، وَأَعْمَالَكُمْ مَقْبُولَةً، وَخَطَوَاتِكُمْ مَسْدَّدَةً، وَزَادَكُمُ اللّٰهُ شَرَفًا وَمَجْدًا۔

اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ قوم و ملت کا سہارا، مظلوموں کا آسرا اور خدمتِ دین کا استعارہ بنائے رکھے۔

آمِيْنْ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ

سپاس نامہ

بہ خدمتِ گرامی عالیجناب الحاج محمود اختر نعمانی

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي شَرَّفَ عِبَادَهُ بِخِدْمَةِ الدِّينِ وَالْوَطَنِ وَالْمِلَّةِ، وَالصَّلٰوةُ وَلسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ سَيِّدِ الْبَشَرِ وَخَيْرِ مَنْ سَارَ عَلَى وَجْهِ الْأَرْضِ، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

ہمارے لیے یہ باعثِ سعادت ہے کہ آج ہم ایک ایسی شخصیت کے حضور سپاس کے نذرانے پیش کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں، جو علم، خدمت، تدبیر اور قیادت کا حسین امتزاج ہیں۔ وہ محترم الحاج **محمود اختر نعمانی** صاحب ہیں۔

آپ ایک ماہرِ طب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے حسنِ اخلاق، درد مندانہ طبیعت اور قوم وملت کے مسائل کے حل کے لیے مسلسل سرگرم عمل رہنے کے سبب عوام و خواص میں منفرد پہچان رکھتے ہیں۔ آپ کی علمی و پیشہ ورانہ بصیرت نے نہ صرف افراد کو صحت و عافیت عطا کی بلکہ سماج کو بھی راحت و سکون فراہم کیا۔ مزید برآں، آپ کو یہ شرف حاصل ہے کہ آپ الجامعۃ الاشرفیہ کی مجلسِ شوریٰ کے رکن ہیں۔ یہ منصب صرف ایک اعزاز نہیں بلکہ ملت کی فکری اور دینی رہنمائی میں آپ کی ذمہ دارانہ شرکت کا روشن استعارہ ہے۔

آپ کی قیادت کا دائرہ وسیع ہے۔ مختلف انجمنوں، تنظیموں اور مساجد میں بحیثیت صدر آپ کی رہنمائی نے عوام کو وحدت و یکجہتی کے ساتھ خدمتِ دین اور خدمتِ خلق کی راہوں پر گامزن کیا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ **انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ** بورڈ کے مستقل رکن ہیں۔ یہ وابستگی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ آپ دین کی امانت کے امین اور

نعتیہ وراثت کے علم بردار ہیں۔

أَنْتُمْ يَا أَيُّهَا الْمُكَرَّمُ دَائِمًا فِي خِدْمَةِ الْقَوْمِ وَالْمِلَّةِ، تَبْذُلُونَ جُهُودَكُمُ الْمُتَوَاصِلَةَ فِي التَّوْجِيهِ وَالْإِصْلَاحِ، وَاللّٰهُ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ.

ہم 1500 / ویں عید میلاد النبی ﷺ اور انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ کے 92 / ویں جلسہ و جلوس کے موقع پر آپ کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے دل کی گہرائیوں سے دعا گو ہیں:

بَارَكَ اللّٰهُ فِي أَعْمَارِكُمْ، وَنَفَعَ بِكُمْ الْعِبَادَ وَالْبِلَادَ، وَجَعَلَكُمْ ذُخْرًا لِلْإِسْلَامِ وَالْمُسْلِمِينَ-

اللہ تعالیٰ آپ کی مساعی جمیلہ کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے، صحت و عافیت کے ساتھ طویل عمر دے، اور قوم و ملت کے لیے آپ کو ہمیشہ مرکزِ خیر و برکت بنائے۔

آمِيْنْ يَا رَبَّ لْعَالَمِينَ

سپاس نامہ

بہ خدمتِ گرامی عالیجناب محمد سلیمان

الْـحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي جَعَلَ خِدْمَةَ الْعِبَادِ مِنْ أَفْضَلِ أَعْمَالِ الصَّالِحِينَ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ الرَّحْمَةِ لِلْعَالَمِينَ، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ-

آج کی یہ محفل اس لیے بھی باعثِ مسرت ہے کہ ہمیں ایک ایسی شخصیت کے حضور سپاس گزاری کا موقع مل رہا ہے جو عوامی خدمت، سماجی فلاح اور ملی ہمدردی کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے ہیں۔ وہ ہیں محترم جناب **محمد سلیمان صاحب**۔

آپ سیاسی میدان میں سرگرمِ عمل ہیں اور اپنے اخلاص و دیانت کے ساتھ ہمیشہ عوامی مسائل کو حل کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ کبھی براہِ راست اپنے وسائل و کوششوں سے عوام کی مشکلات آسان کرتے ہیں، تو کبھی انتظامیہ کے سامنے ان کے مسائل پیش کرکے ان کے حل کے دروازے کھولتے ہیں۔ یہ آپ کے اخلاص اور دردِ دل ہی کا نتیجہ ہے کہ عوام آپ کو اپنا مخلص نمائندہ اور سچا خیر خواہ تصور کرتے ہیں۔

آپ کی شخصیت کا امتیاز یہ ہے کہ آپ اپنی ذات کو کبھی محدود نہیں رکھتے، بلکہ ہر لمحہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے اور سہولت فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی وصف آپ کو عوامی محبت اور اعتماد کا مرکز بناتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ آپ **انجمن اہل سنت واشرفی دار المطالعہ بورڈ** کے مستقل رکن ہیں۔ اس وابستگی نے آپ کو دینی و علمی خدمات کے قافلے کا حصہ بنادیا ہے۔

أَنْتُمْ يَا أَيُّهَا لْمُكَرَّمُ قَدْ جَمَعْتُمْ بَيْنَ الْخِدْمَةِ الْعَامَّةِ وَالْعِمَادَةِ الْمِلِّيَّةِ، فَنَفَعَ اللّٰهُ بِكُمْ وَجَعَلَكُمْ دَائِمًا سَبَبًا لِلْخَيْرِ وَالصَّلَاحِ-

ہم 1500 / ویں عید میلاد النبی ﷺ اور انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ کے 92 / ویں جلسہ و جلوس کے موقع پر آپ کی بیش بہا خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اور دعا گو ہیں:

جَزَاكُمُ للّٰهُ خَيْرَ لْجَزَاءِ، وَبَارَكَ فِي جُهُودِكُمْ، وَجَعَلَكُمْ دَائِمًا عَوْنًا لِلْإِسْلَامِ وَلْمُسْلِمِينَ-

اللہ تعالیٰ آپ کی عمر میں برکت دے، آپ کی مساعی کو قبول فرمائے اور آپ کو ہمیشہ خدمتِ دین وخدمتِ خلق کا استعارہ بنائے۔ آمِيْنْ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ

سپاس نامہ

بہ خدمتِ گرامی عالیجناب الحاج محمود اختر ایڈوکیٹ

الْـحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَفَّقَ عِبَادَهُ لِخِدْمَةِ الْخَلْقِ وَالْمِلَّةِ، وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ، وَعَلٰى آلِهِ وَأَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ۔

ہمارے لیے یہ باعثِ مسرت اور موجبِ سعادت ہے کہ آج ہمیں ایک ایسی شخصیت کے حضور سپاس کے جذبات پیش کرنے کا موقع ملا ہے، جنہوں نے اپنی زندگی کو عوامی خدمت، سماجی بیداری اور ملی ہمدردی کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ وہ معزز ہستی ہیں **جناب حاجی محمود اختر ایڈوکیٹ صاحب**۔

آپ نہ صرف ایک کامیاب قانون دان ہیں بلکہ ایک سچے سماجی کارکن بھی ہیں۔ عوامی مسائل کو قریب سے جاننا، ان کے حل کے لیے جدوجہد کرنا اور معاشرتی سطح پر بیداری کی شمع روشن کرنا آپ کی زندگی کا مشن ہے۔ آپ ہمیشہ عوام کے دکھ درد کو اپنا دکھ سمجھ کر ان کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں، اور خدمتِ خلق کو اپنی شخصیت کا لازمی حصہ بنائے ہوئے ہیں۔

اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ آپ **انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ** کے رکن ہیں۔ یہ وابستگی آپ کے ملی شعور اور دینی لگاؤ کی مظہر ہے، اور اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ آپ صرف قانونی و سماجی سطح پر ہی نہیں بلکہ دینی و علمی تحریکات کے بھی فعال رکن ہیں۔

أَنْتُمْ يَا أَيُّهَا الْمُكَرَّمُ لَا تَزَالُونَ فِي خِدْمَةِ الْقَوْمِ وَالْمِلَّةِ، تُبَادِرُونَ إِلَى كُلِّ مَا فِيهِ صَلَاحُ الْمُجْتَمَعِ، وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔

ہم 1500 / ویں عید میلاد النبی ﷺ اور انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ کے 92 / ویں جلسہ و جلوس کے موقع پر آپ کی خدمات کا دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اعتراف کرتے ہیں اور دعا گو ہیں:

بَارَكَ للّٰهُ فِي أَعْمَارِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ، وَجَعَلَكُمْ دَائِمًا سَبَبًا لِلْخَيْرِ وَلصَّلَاحِ، وَنَفَعَ بِكُمُ لْعِبَادَ وَالْبِلَادَ-

اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و عافیت کے ساتھ دراز عمر عطا فرمائے، آپ کی کوششوں کو قبول فرمائے اور آپ کو ہمیشہ ملت کے لیے باعثِ رحمت و برکت بنائے۔ آمِيْنْ يَا رَبَّ الْعَالَمِينَ

منقولہ چاروں سپاس نامے عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر تحریر کیے گئے۔

سپاس نامے

بموقع 1500 ویں جشن عید میلاد النبی

حاجی سلیمان اختر شمسی صاحب کی فرمائش پر مبارک پور کی نعت خواں انجمنوں کی حوصلہ افزائی کے لیے یہ سپاس نامے تحریر کیے گئے اور انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ کی جانب سے پیش کیے گئے۔

(1)

انجمن فیضان عزیزی، پورہ خواجہ مبارک پور

انجمن فیضانِ عزیزی کا تذکرہ عشقِ رسول ﷺ کی اس کہکشاں کا ذکر ہے جس کے ہر ستارے سے عقیدت مندیوں کی روشنی پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ یہ انجمن مدتِ دراز سے مدحتِ مصطفیٰ ﷺ کے ذریعہ دلوں کو جِلا اور روحوں کو حلاوت عطا کرتی رہی ہے۔ اس کے اشعار جب سماعتوں پر اترتے ہیں تو قلوب میں عشق و ایمان کی لَو تیز تر ہو جاتی ہے۔

یہ انجمن محض نعت خوانی کی محفلوں تک محدود نہیں رہی بلکہ اس اپنے اخلاص، تنظیم اور اعلیٰ ذوق کے وہ نقوش چھوڑے ہیں جو کبھی مدھم نہ ہوں گے۔ فیضانِ عزیزی نے نعت کو محفلوں کی زینت نہیں، بلکہ حیات کی روشنی اور سفرِ عشق کا زادِ راہ بنا دیا ہے۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر دل کی گہرائیوں سے اس انجمن کے ہر رکن کو خراجِ عقیدت و تحسین پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنی صدائے دل نواز سے محفلوں کو جنتی فضاؤں سے ہمکنار کیا اور مصطفوی محبت کے پیغام کو نسل در نسل منتقل کرنے کا بیڑا اٹھایا۔

28/ اگست 2025ء

(2)

انجمن تنظیم ادب، کٹرہ، مبارک پور

ادب کی دنیا میں بعض قافلے ایسے ہوتے ہیں جو وقت کے دھارے میں بھی اپنی پہچان برقرار رکھتے ہیں۔ انجمن تنظیمِ ادب محلہ کٹرہ انہی قافلوں میں سے ایک ہے، جس نے نعتِ رسول ﷺ کو اپنی محفلوں کی جان اور اپنے وجود کی پہچان بنالیا ہے۔ ان کی محنت، ان کا ذوق اور ان کی ادبی لگن اس بات کا ثبوت ہے کہ عشقِ مصطفیٰ ﷺ جب قلم اور زبان سے منسلک ہو جائے تو محفلیں محض اجتماعات نہیں رہتیں بلکہ دلوں کے انقلاب کی بزم بن جاتی ہیں۔

یہ انجمن برسوں سے اپنے مخصوص ادبی انداز اور فکری تہذیب کے ساتھ نعتیہ خدمات انجام دے رہی ہے۔ ان کے اشعار اور ترانوں میں صرف محبت نہیں بلکہ فکری روشنی بھی جھلکتی ہے جو نئی نسل کو ماضی سے جوڑتی اور مستقبل کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت واشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ وجلوس کے حسین موقع پر اعتراف کرتے ہیں کہ انہوں نے نعت کی محفلوں کو علم وادب کی خوشبو سے سنوارا، اور یہ ثابت کیا کہ عشقِ رسول ﷺ جب ادب کے قالب میں ڈھلتا ہے تو معاشرہ جمال وکمال کی نئی راہیں اختیار کرلیتا ہے۔

28/ اگست 2025ء

(3)

انجمن فروغ اسلام، پرانی بستی، مبارک پور

انجمن فروغِ اسلام دراصل ایک مشعل ہے جو اندھیروں میں روشنی اور بے سمتی میں سمت عطا کرتی ہے۔ اس کا نام ہی اس کے مقصد کا آئینہ ہے یعنی ”دینِ مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو کو عام کرنا اور امت کے دلوں میں عشق و ایمان کے چراغ روشن رکھنا“۔ یہ انجمن برسوں سے نعت کی محفلوں میں وہ ساز پیش کر رہی ہے جس کے سُر اور تال روحوں کو بیدار اور دلوں کو قرار بخشتے ہیں۔

یہ انجمن صرف نعت خوانی تک محدود نہیں رہی بلکہ سماجی و دینی شعور کو بیدار کرنے کا ایک ذریعہ بھی بنی ہے۔ اس نے نعت گوئی اور نعت نگاری کو محض فن نہیں، بلکہ عہد و وفا کا پیمان بنا کر پیش کیا۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر اس انجمن کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے اسلام کے پیغام کو خوشبو کی طرح بستی بستی اور دل دل میں بانٹنے کا بیڑا اٹھایا، اور عشقِ مصطفیٰ ﷺ کو اپنی کاوشوں کا مرکز بنا کر معاشرے کو خیر و ہدایت کی روشنی دی۔

28/ اگست 2025ء

(4)

انجمن تنویرالاسلام، نیاپورہ، مبارک پور

محلہ نیا پورہ کی فضاؤں میں اگر کبھی عشقِ رسول ﷺ کی صدا گونجی ہے تو اس میں انجمن تنویر الاسلام کا بڑا حصہ رہا ہے۔ یہ انجمن ہمارے گلی کوچوں میں پھیلی ہوئی روشنی کی طرح ہے، اس نے ہمیشہ نعتوں کے رنگارنگ چراغ روشن کیے اور دلوں کو مصطفوی محبت سے گرمانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

یہ انجمن برسوں سے محفلوں کی رونق ہے، میلاد و جلوس کی جان ہے اور اہلِ محلّہ کے لیے ایمان کی ایک جیتی جاگتی علامت ہے۔ ان کے اشعار اور ترانے ہمارے گھروں در و دیوار تک کو نور سے بھر دیتے ہیں۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر انجمن تنویرالاسلام کے خلوص، محنت اور لگن کو سلام پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے صرف نعت نہیں پڑھی بلکہ دلوں میں عشقِ مصطفیٰ ﷺ کے بیج بوئے، جو آج نہیں تو کل ضرور تناور درخت کی صورت اختیار کریں گے۔

28/ اگست 2025ء

(5)

انجمن ملت اسلامیہ، پورہ صوفی، مبارک پور

انجمن ملتِ اسلامیہ محلہ پورہ صوفی کی تاریخ نصف صدی پر محیط ہے، اور یہ نصف صدی محض وقت کا گزر جانا نہیں بلکہ عشقِ رسول ﷺ کی مسلسل صداؤں کا سفر ہے۔ اس انجمن نے اپنی محفلوں میں وہ چراغ جلائے ہیں جن کی روشنی نہ صرف بستی بلکہ پورے صوبے میں محسوس کی جاچکی ہے۔ ایک زمانہ تھا جب مولانا عثمان ساحرؔ کے نعتیہ کلام ''بوجہ الرسول علیہ السلام'' کے سبب یہ انجمن صوبائی سطح پر مقبولیت کے آسمان کو چھو رہی تھی، اور آج یہی انجمن ہیچ مداں (مہتاب پیامی) کی ناتمام کاوشات کو اپنی اظہار عقیدت کا وسیلہ و ذریعہ بنائے ہوئے ہے۔

ملتِ اسلامیہ کی نعت خوانی روایات کی پاسداری کا دوسرا نام ہے۔ یہ انجمن اس بات کی دلیل ہے کہ جب محبتِ مصطفیٰ ﷺ کو محور بنالیا جائے تو نسلیں بدلتی ہیں، وقت بدلتا ہے، مگر جذبے کی تپش کبھی سرد نہیں ہوتی۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت واشرفی دار المطالعہ مبارک پور 100/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر انجمن کے ہر فرد کو عقیدت مندانہ سلام پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے نصف صدی سے عشق و ادب کی اس مشعل کو روشن رکھا ہے، اور آج بھی نعت کے رنگوں سے ایمان کی فضاؤں کو سنوارنے میں منہمک ہیں۔

28/ اگست 2025ء

(6)

انجمن ہاشمیہ، پورہ صوفی، مبارک پور

انجمن ہاشمیہ محلہ پورہ صوفی اس روحانی اور عرفانی محاذ کا نام ہے جہاں دلوں کی زمین پر ایمان کے پھول کھلتے ہیں۔ اس انجمن کی نسبت ہی ہمیں حضور ﷺ کے خانوادۂ ہاشمی کی یاد دلاتی ہے، اس کی نعتیہ محافل میں وہی انوار جھلکتے ہیں جو نسبت و محبت کے سنگم سے پھوٹتے ہیں۔

یہ انجمن برسوں سے اپنے خلوص، پابندی اور ذوقِ نعت سے اہلِ محلہ کے قلوب کو روشن کرتی رہی ہے۔ اس کے ترانے اور اشعار، ذکر و درود کی لہروں میں ڈھل کر سامعین کو ایک وجدانی کیفیت میں لے جاتے ہیں۔ ان کی نعتیں محض الفاظ کا لباس نہیں، بلکہ دل کی دھڑکن اور روح کا سکون ہوا کرتی ہیں۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت واشرفی دار المطالعہ مبارک پور 100/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر انجمن ہاشمیہ کی خدمات ک اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے عشقِ رسول ﷺ کی خوشبو کو محفلوں تک محدود نہیں رکھا بلکہ گھروں، گلیوں اور دلوں میں بھی عام کیا۔ یہ انجمن واقعی اُس چراغ کی مانند ہے جو اندھیروں کو روشنی میں بدل دینے کا ہنر جانتا ہے۔

28/ اگست 2025ء

(7)

انجمن اخلاقیہ، حیدر آباد، مبارک پور

انجمن اخلاقیہ محلہ حیدر آباد اپنے نام کی طرح کردار اور وقار کی انجمن ہے۔ یہ وہ قافلہ ہے جس نے نعت کو صرف لبوں کی مٹھاس تک محدود نہیں رکھا بلکہ اخلاق کی روشنی بنا کر پیش کیا۔ اس کے اراکین برسوں سے اس بات کے گواہ ہیں کہ عشقِ رسول ﷺ جب دل میں اترتا ہے تو کردار سنورتا ہے، زبان پاکیزہ ہوتی ہے اور سماج میں خیر و برکت اور بھلائی کی فصل لہلہانے لگتی ہے۔

یہ انجمن اپنی نعتیہ خدمات کے ساتھ ساتھ اپنے طرزِ عمل سے بھی امت کو سبق دیتی رہی ہے کہ نعت محض ایک فن نہیں بلکہ ایک ذمہ داری ہے، جو انسان کو اخلاقِ مصطفوی ﷺ کا پرتو بنا دیتی ہے۔ محفلیں سجیں یا جلوس نکلیں، اخلاقیہ کی شرکت ایک ایسی تازگی اور وقار کا احساس دلاتی ہے جو سامعین و ناظرین کے دلوں پر دیرپا اثر ڈالتی ہے۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر آج ہم اس انجمن کے ہر رکن کے اخلاص و خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے آداب و اخلاق کی خوشبو کو نعت کی محفلوں میں سمو کر بستی کو نہ صرف عشق بلکہ کردار کی روشنی سے بھی منور کیا۔

28/ اگست 2025ء

(8)

انجمن عزیزیہ، پورہ صوفی، مبارک پور

انجمن عزیزیہ محلہ پورہ صوفی کا نام دراصل اُس مردِ حق آگاہ کی یادگار ہے جسے دنیا ”حافظ ملت علیہ الرحمۃ والرضوان“ کے لقب سے جانتی ہے۔ یہ وہی شخصیت ہیں جنھوں نے اپنے علم و فضل، زہد و تقویٰ اور فکری بلندی سے ملت کے دلوں میں آگہی کے چراغ جلائے۔ ” عزیزیہ “کا وجود اسی نسبت کی برکت ہے، اور اسی نسبت نے اس انجمن کو عشق و وفا کے قافلے میں ایک الگ پہچان عطا کی ہے۔

یہ انجمن نصف صدی سے زیادہ عرصے سے نعت کی خوشبو عام کر رہی ہے۔ اس کی محفلیں گویا حافظِ ملت کے علمی و روحانی فیضان کی ایک جھلک ہیں، جن میں عشقِ رسول ﷺ اور خدمتِ دین کی روح موجزن رہتی ہے۔ یہاں پڑھی جانے والی نعتیں محض نغمے نہیں بلکہ وہ عہد اور میثاق ہیں جو نسلوں کو دین کی محبت اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے جوڑتے ہیں۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر ہم دل کی گہرائیوں سے انجمن عزیزیہ کے ہر فرد کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے حافظِ ملت کی نسبت کو زندہ رکھا، اور اپنی محفلوں سے یہ ثابت کیا کہ عشقِ رسول ﷺ ہی ملت کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔

28/ اگست 2025ء

(9)

انجمن رونق اسلام، نیاپورہ، مبارک پور

انجمن رونقِ اسلام محلہ پورہ باغ کا ذکر آتے ہی دل میں ایک ایسے گلشن کا تصور ابھرتا ہے جس میں نعت کے پھول کھلے ہوں اور عشقِ رسول ﷺ کی خوشبو فضا کو مہکا رہی ہو۔ یہ انجمن برسوں سے اپنی محفلوں اور جلوسوں کے ذریعے اسلام کی رونق اور ایمان کی بہار کو شاعرانہ انداز میں برقرار رکھے ہوئے ہے۔

رونقِ اسلام کی محفلیں دراصل اُس باغ کی کیاری ہیں جہاں ہر مصرع ایک پھول ہے اور نغمگی اس کی خوشبو۔ سامعین جب اس محفل میں شریک ہوتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے بہار اپنی تمام تر تازگی اور رنگینی کے ساتھ دلوں پر اتر آئی ہو۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر اس انجمن کو سلامِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے نعت کے ذریعے شہر مبارک پور میں اسلام کی رونق کو قافلہ در قافلہ، نسل در نسل منتقل کرنے کا کام کیا۔ الہم زد فزد

28/ اگست 2025ء

(10)

انجمن غنچۂ ہاشمیہ، پورہ صوفی، مبارک پور

انجمن غنچۂ ہاشمیہ محلہ پورہ صوفی ایک ایسے گلشن کا غنچہ ہے جو عشقِ مصطفیٰ ﷺ کی بہار سے ہمیشہ تر و تازہ رہتا ہے۔ یہ انجمن اپنے خلوص، وفاداری اور ایثار کے باعث محض ایک تنظیم نہیں بلکہ ایک ایسے احساس کی حیثیت اختیار کر چکی ہے جسے حرزِ جاں بنا کر فخر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

یہ انجمن خوش نصیب ہے کہ اپنی ناتمام کوششوں اور جہدِ مسلسل سے اس نے ایک الگ ہی مقام و مرتبہ حاصل کیا ہے۔ جب اس کے نعت خواں نعتیہ اشعار گنگناتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے لفظ لفظ غنچے کی طرح کھل رہا ہو اور ہر مصرع خوشبو بن کر فضا میں پھیل رہا ہو۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر دل کی پوری وارفتگی کے ساتھ انجمن غنچۂ ہاشمیہ کے ذمہ داران و اراکین کو سلام پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے خلوص و وفا کی بنیاد پر اس چراغ کو روشن رکھا اور ایثار کے جذبے سے مملو ہو کر عشقِ رسول ﷺ کی خوشبو کو عام کیا۔

28/ اگست 2025ء

(11)

انجمن فیضان مصطفیٰ، پورہ دیوان، مبارک پور

انجمن فیضانِ مصطفیٰ محلہ پورہ دیوان کا نام ہی اس کے مشن کا تعارف ہے۔ یہ انجمن اس چشمے کی مانند ہے جس سے عشق و وفا کی نہریں بہتی ہیں اور جس کا ہر قطرہ مصطفیٰ کریم ﷺ کے فیض کا آئینہ دار ہے۔

یہ انجمن برسوں سے نعت کی محفلوں میں اپنی عقیدت اور محبت کے رنگ بکھیر رہی ہے۔ اس کے ترانے جب فضاؤں میں گونجتے ہیں تو دلوں کو سرور اور روحوں کو قرار ملتا ہے۔ گویا ان کے یہاں نعت خوانی محض ایک فن نہیں بلکہ فیضانِ مصطفیٰ ﷺ کی جلوہ گری ہے، جو سننے والوں کو نورانی فضا میں ڈبو دیتی ہے۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت واشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر کلماتِ سپاس کرتے ہوئے اعتراف کرتے ہیں کہ انجمن فیضان مصطفیٰ نے اپنی محنت، خلوص اور عشق کی بدولت محلہ پورہ دیوان ہی نہیں بلکہ شہر بھر کی فضاؤں کو فیضانِ مصطفیٰ ﷺ کی خوشبو سے معطر کر دیا ہے۔

28/ اگست 2025ء

(12)

انجمن فیض عام، پورہ رانی، مبارک پور

انجمن فیضِ عام، محلہ پورہ رانی برکت و خیر کے اس دریا کی مانند ہے، جو سب کے لیے بہتا ہے اور کسی کو محروم نہیں رکھتا۔ یہ انجمن نعت کی محفلوں کو بھی فیض کا ذریعہ بناتی ہے، اور سماج میں خدمت و اخوت کا رنگ بھی بکھیرتی ہے۔

اس کی محفلوں میں پڑھی جانے والی نعتیں محض سامعین کی سماعتوں کے لیے تسکین کا سامان ہی فراہم نہیں کرتیں، بلکہ دلوں کی زمین پر ایمان و محبت کی تخم ریزی بھی کرتی ہیں۔ فیضِ عام کی خوبی یہی ہے کہ اس کی محنت اور کاوشوں کا چراغ ہر کسی کے دل تک روشنی پہنچاتا ہے، چاہے وہ قریب ہو یا دور۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر عقیدت و احترام کے ساتھ انجمن کے ہر فرد کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے نعت کے پرچم کو بلند رکھا اور ”فیضِ عام“ نام کی طرح اپنی محبت، اپنے اخلاص اور اپنی نعتیہ محنت کا فیض سب تک عام کیا۔

28/ اگست 2025ء

(13)

انجمن قادریہ، علی نگر، مبارک پور

انجمن قادریہ، محلہ علی نگر دراصل فیضانِ غوثِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ کی جھلک کا نام ہے، انجمن قادریہ اس نسبتِ غوثیہ کا فیضان جس نے صدیوں سے اہلِ دل کو عشق و معرفت کی روشنی عطا کی۔ اس انجمن کا وجود ایک روحانی پیغام ہے کہ قادری نسبت جہاں بھی ہوتی ہے وہاں عشقِ رسول ﷺ کی شمع ضرور روشن ہوتی ہے۔

یہ انجمن اپنے نعتیہ ذوق، خلوص اور استقامت کے باعث محفلوں میں ایک خاص پہچان رکھتی ہے۔ ان کے ترانے سننے والوں کو قادری فیضان کی یاد دلاتے ہیں، ان کے اجتماعات ایک ایسی روحانی فضا کی پرورش کرتے ہیں، جس میں اہلِ بصیرت کو مقاماتِ عجیبہ کی سیر ہوتی ہے۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے حسین موقع پر انجمن قادریہ محلہ علی نگر کے تمام ذمہ داران اور اراکین کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے عشقِ رسول ﷺ کی محفلوں کو نہ صرف سجایا بلکہ اپنے عمل سے سلسلۂ قادریہ کی روشنی کو بھی زندہ رکھا۔ یہ انجمن بلاشبہ ہمارے سماج میں ایمان، وفاداری اور روحانیت کا روشن مینار ہے۔

28/ اگست 2025ء

(14)

انجمن اسلامیہ، لال چوک، مبارک پور

انجمن اسلامیہ لال چوک کی خدمات اور اس کے شاندار ماضی کا تذکرہ کیے بغیر شہر کی علمی و ادبی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ انجمن ہے جس نے ایک وقت میں نہ صرف میلاد و نعتیہ مشاعروں کی محفلوں کو رونق بخشی، بلکہ علم دوستی کے چراغ بھی جلائے۔ "اسلامیہ لائبریری" اس کی سب سے روشن مثال ہے، جو کبھی اہلِ ذوق کا مرکز اور تشنگانِ علم کی سیرابی کا ذریعہ تھی۔ کتابوں کے اوراق سے اٹھتی خوشبو آج بھی ان خوش نصیبوں کے دلوں کو معطر کرتی ہے جنھوں نے اس لائبریری کے سائے میں بیٹھ کر علم و حکمت کا ذوق پایا۔

اگرچہ زمانے کے تغیر اور عوام میں مطالعے کی کمی کے باعث وہ لائبریری اب بند ہو گئی، مگر انجمن اسلامیہ کی عظمتِ رفتہ آج بھی اہلِ شہر کے دلوں میں زندہ ہے۔ یہ انجمن اپنی سابقہ شان و شوکت کے ساتھ اس بات کی دلیل ہے کہ ہماری بستیوں میں کبھی علم و عرفان کی محفلیں سجتی تھیں، اور دلوں میں کتابوں سے محبت کارَت جگا ہوا کرتا تھا۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے بابرکت موقع پر ہم اپنی جانب سے انجمن اسلامیہ کے ذمہ داران و اراکین کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں کہ وہ اب بھی خدمتِ دین و ملت کی روایت کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں پھر وہ توفیق عطا فرمائے کہ اسلامیہ لائبریری کی روایت زندہ ہو، اور ہمارے نوجوان ایک بار پھر کتابوں کی خوشبو سے اپنی زندگیاں معطر کریں۔ 28/ اگست 2025ء

(15)

انجمن گلشن رضا، پورہ دلھن، مبارک پور

انجمن گلشن رضا محلہ پورہ دلھن کا نام سنتے ہی ذہن میں عقیدت و محبت کے وہ خوش رنگ پھول کھل اُٹھتے ہیں جو رضائے مصطفیٰ ﷺ کے باغ میں پروان چڑھتے ہیں۔ یہ انجمن اپنے نام کی معنویت کے مطابق، عشقِ رسول ﷺ کی خوشبو کو بکھیرنے اور نعتیہ فضا کو تازگی عطا کرنے میں ہمیشہ نمایاں رہی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ کسی انجمن کی بقا اس کے ذمہ داران کے اخلاص، اراکین کے عزم اور کارکنان کی محبت سے ہوتی ہے۔ انجمن گلشن رضا اس لحاظ سے قابلِ تقلید ہے کہ اس کے ہر عمل میں شفافیت، ہر قدم میں وفا، اور ہر محفل میں خلوص جھلکتا ہے۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے بابرکت موقع پر ہم اپنی جانب سے انجمن کے تمام اراکین اور ذمہ داران کو تہِ دل سے خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے نعتیہ محافل کو ہمیشہ ایک شاداب گلشن کی صورت میں پیش کیا۔ جس طرح باغ کے ہر پھول کی الگ خوشبو اور الگ رنگت ہوتی ہے، ویسے ہی اس انجمن کے ہر فرد نے اپنی جداگانہ خدمات کے ذریعے اس گلشن کو معطر کیا ہے۔ دعا ہے کہ یہ انجمن ہمیشہ اپنی خوشبو پھیلائے، اور مصطفوی نسبت کی بہاریں اس گلشن کو تاقیامت سرسبز رکھیں۔

28/ اگست 2025ء

(16)

انجمن باغ فردوس، پورہ دیوان، مبارک پور

انجمن باغِ فردوس،، محلہ پورہ دیوان، اپنی نسبت اور اپنے نام سے ہی جنتی خوشبو اور روحانی لطافت کا پتہ دیتی ہے۔ یہ ادارہ دراصل اہلِ ایمان کی اس خواہش کا آئینہ دار ہے کہ دنیا کے شور و غوغا میں بھی ایک ایسا ماحول پیدا کیا جائے جہاں ذکرِ مصطفیٰ ﷺ کی روشنی اور عشقِ رسول کی معطر فضا میں روح کو سکون مل سکے۔ انجمن باغ فردوس کے ذمہ داران و کارکنان اپنی شب و روز کی محنت اور خلوص کے ذریعے اس بات کو یقینی بناتے ہیں کہ انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ کا ہر پروگرام ایمان کی تازگی اور محبتِ رسول ﷺ کے فروغ کا وسیلہ بنے۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے بابرکت موقع پر ہم اس انجمن کے معزز اراکین کے حضور اپنے قلبی جذباتِ تشکر پیش کرتے ہیں۔ ان کی محبت اور قدر دانی ہمارے لیے ایک سرمایہ ہے، اور اس یقین کو مزید مضبوط کرتی ہے کہ جب تک ایسی انجمنیں باقی ہیں، ذکرِ مصطفیٰ ﷺ کی روشنی کبھی مدھم نہ ہوگی۔

28/ اگست 2025ء

(17)

انجمن مظلومیہ، بڑی ارجنٹی، مبارک پور

انجمن مظلومیہ کا نام جب بھی آتا ہے تو قربانی، ایثار اور نعتیہ خدمات کی ایک روشن تاریخ ہمارے سامنے کھل جاتی ہے۔ اس انجمن نے صرف اپنے شہر نہیں بلکہ صوبائی سطح پر نعت کے چراغ روشن کیے ہیں۔ ماضی میں ”انجمن اہل سنت واشرفی دارالمطالعہ“ کے استحکام کے لیے اس انجمن کی خدمات کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس انجمن کی قربانیاں، شب و روز کی محنتیں، اور علمی وادبی سرگرمیاں آج بھی یادگار ہیں اور ہماری تہذیبی وراثت کا حصہ ہیں۔

مزید برآں، انجمن مظلومیہ نے صوبائی پیمانے نعت خوانی کے ذریعہ صرف مبارک پور کا نام روشن کیا۔ بڑے فخر کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اس انجمن کے ذریعہ پیش کیے گئے نعتیہ پروگراموں نے مبارک پور کو نعت کا گہوارہ بنادیا۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ویں جلسہ وجلوس کے بابرکت موقع پر دل کی گہرائیوں سے انجمن مظلومیہ کے ذمہ داران اور اراکین کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے خلوص و محبت سے نعت کی شمع کو روشن رکھا اور اپنی ثابت قدمی سے ایک قابلِ تقلید تاریخ رقم کی۔ دعا ہے کہ یہ انجمن ہمیشہ قائم و دائم رہے، عشقِ رسول ﷺ کے پرچم کو بلند رکھے اور آنے والی نسلوں کے لیے نعتیہ ذوق کی آبیاری کرتی رہے۔

28/ اگست 2025ء

(18)

انجمن فیضان اشرفیہ، شاہ محمد پور، مبارک پور

انجمن ”فیضانِ اشرفیہ“ کا نام سنتے ہی دل کو سکون اور ذہن کو اعتماد نصیب ہوتا ہے۔ یہ وہ انجمن ہے جس نے اپنی پوری وابستگی، وفاداری اور اخلاص کو اشرفی نسبت کے سائے میں پروان چڑھایا ہے۔ اس کی سرگرمیاں نہ صرف نعت و منقبت کی خدمت میں نمایاں ہیں بلکہ عقیدت و محبتِ رسول ﷺ کو عملی صورت میں پیش کرنے کی بہترین مثال بھی ہیں۔

اس انجمن نے حضور سیدنا اشرف جہانگیر سمنانی اور حضور حافظ ملت علیہما الرحمہ کے روحانی فیضان کو پورے خلوص سے آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے بابرکت موقع پر انجمن فیضان اشرفیہ کے تمام ذمہ داران اور کارکنان کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے اخلاص، استقامت اور محبت کو اپنی بنیاد بنایا۔ اللہ تعالیٰ انھیں مزید ترقی و رفعت عطا فرمائے اور انھیں چراغِ نعت جلائے رکھنے کی توفیق بخشے۔

28/ اگست 2025ء

(19)

انجمن مظہر حق، علی نگر، مبارک پور

انجمن مظہر حق محلہ علی نگر، اپنے وجود اور سرگرمیوں کے اعتبار سے اُس روشنی کی مانند ہے جو اندھیروں میں راستہ دکھاتی ہے۔ اس انجمن کے ذمہ داران نے ہمیشہ اخلاص، استقامت اور جراتِ عمل کو اپنا شعار بنایا ہے۔

یہ انجمن دینی، ادبی اور نعتیہ خدمات کے ساتھ ساتھ سماجی و ملی بیداری میں بھی اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ان کی محنتوں کے سبب محلہ علی نگر کے ماحول میں روحانی ذوق و شوق کی فضا قائم ہے۔ آج بھی یہ انجمن ادب و نعت کی روایت کو آگے بڑھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

ہم اراکین انجمن اہل سنت و اشرفی دار المطالعہ مبارک پور 1500/ سالہ جشن عید میلاد النبی ﷺ اور اپنے 92/ ویں جلسہ و جلوس کے بابرکت موقع پر انجمن کے تمام ذمہ داران و کارکنان کے جذبۂ خدمت اور استقامت کو سلام پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید حوصلہ و برکت عطا فرمائے، اور یہ چراغ ہمیشہ فروزاں رہے۔

28/ اگست 2025ء

سپاس نامہ

بخدمت

بخدمت ڈاکٹر محبوب اعظم صاحب (آئی سرجن)

امیدوار ایم ایل اے (مبارک پور) بہوجن سماج پارٹی

زندگی کے اجتماعی کارواں میں ایسے لمحات کم ہی نصیب ہوتے ہیں جب قیادت و بصیرت کے حامل شخصیات قدم رنجہ فرمائیں اور اپنی موجودگی سے اہلِ کارواں کو نیا حوصلہ، نئ توانائی اور نیا یقین عطا کریں۔ آج کا یہ لمحہ بھی اسی نوعیت کا ہے کہ ہم اپنے درمیان ایک ایسی شخصیت کا خیر مقدم کر رہے ہیں جنھوں نے علم و دانش، خدمتِ خلق اور سیاست کے میدان میں اپنے قدم مضبوطی سے جما رکھے ہیں—وہ شخصیت ہیں ڈاکٹر محبوب اعظم صاحب۔

ڈاکٹر محبوب اعظم صاحب صرف ایک سیاست داں ہی نہیں بلکہ ماہرِ طب بھی ہیں۔ بحیثیت آئی سرجن انھوں نے اپنی فنی مہارت سے نہ جانے کتنی آنکھوں کی بینائی لوٹائی ہے امید کی روشنی عطا کی ہے۔ وہ محض علاج کے ماہر نہیں بلکہ دلوں کے مسیحا ہیں جو ضرورت مند اور نادار مریضوں کا حسبِ استطاعت فری علاج کر کے اپنے علم و ہنر کو عین عبادت بنا دیتے ہیں۔ ان کی یہ خدمت دراصل ان کے کردار کی سب سے تابناک جھلک ہے—جہاں علم و فن کا امتزاج خدمت و ایثار سے ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر محبوب اعظم صاحب کا شمار اُن شخصیات میں ہوتا ہے جو محض ایک فرد نہیں بلکہ ایک تحریک اور ایک پیغام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اُن کی زندگی علم، خدمت، جدوجہد اور قیادت کے حسین امتزاج کا آئینہ ہے۔ وہ سماجی انصاف، مساوات اور عوامی حقوق کے پرچم بردار ہیں اور آنے والے الیکشن میں بہوجن سماج پارٹی کے امیدوار کی حیثیت سے میدانِ

سیاست میں اُترنے والے ہیں۔ یہ اقدام دراصل ایک فرد کی نہیں بلکہ ایک خواب کی تکمیل کی جانب بڑھتا ہوا قدم ہے — ایسا خواب جس میں ہر مظلوم کو آواز ملے، ہر پس ماندہ کو سہارا ملے اور ہر دبے کچلے طبقے کو اپنا مقام حاصل ہو۔

انجمنِ مظلومیہ کے اِس بامعنی اور بابرکت اجتماع میں آپ کی آمد ہمارے لیے باعثِ مسرت بھی ہے اور باعثِ افتخار بھی۔ آپ کی موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ سماج کے ان گوشوں تک رسائی رکھتے ہیں جہاں محرومی اور تنہائی نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ آپ کی ذات وہ چراغ ہے جس کی لو میں مظلوموں کو روشنی، محروموں کو سہارا اور مریضوں کو شفا کی نوید ملتی ہے۔

ہماری انجمن ہمیشہ سے اُن اصحابِ فکر و عمل کی قدردان رہی ہے جو اپنی شخصیت سے زمانے کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں، اور ڈاکٹر محبوب اعظم صاحب انہی روشن کرداروں میں سے ہیں۔ آپ کی آمد کو ہم اپنی خوش بختی سمجھتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ آپ کی جدوجہد سماجی انصاف کے سفر کو نئی جہتیں عطا کرے اور آنے والا وقت آپ کے لیے کامیابیوں اور فتوحات کا پیام لائے۔

آج ہم سب مل کر یہ عہد بھی کرتے ہیں کہ جس طرح ڈاکٹر محبوب اعظم صاحب عوام کی آواز بنے ہیں، ہم بھی اپنی انجمن کے پلیٹ فارم سے ان کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوں گے تاکہ ایک بہتر اور منصفانہ سماج کی تعمیر ممکن ہو۔

ڈاکٹر محبوب اعظم صاحب! انجمنِ مظلومیہ آپ کو دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید کہتی ہے اور آپ کی خدمت و قیادت کے سفر کے لیے نیک تمناؤں اور دعاؤں کے چراغ روشن کرتی ہے۔

20/ اگست 2025

نوٹ: انجمن مظلومیہ کے ذمہ داران کی فرمائش پر یہ سپاس نامہ تحریر کیا گیا، اور ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیا گیا۔



NAMAK PAARE

Mahtab Payami



Contact: +91 9235647041
payamee@gmail.com

Address (1)- Office Ashrafia Monthly, Jamia Ashrafia, Mubarakpur, Azamgarh U.P. INDIA 276404
Address (2)- Payami Computer Graphics, Chooti Argenty, Mubarakpur, Azamgarh U.P. INDIA 276404
Address (3)- Pura Rani, Near Iqra Public School, Mubarakpur, Azamgarh U.P. INDIA 276404
Address (4)- Pura Sufi, Near Bhonu Quraishi, Mubarakpur, Azamgarh U.P. INDIA 276404